٦
دنیازاد
کتابی سلسلہ
دنیا دنیا دہشت ہے
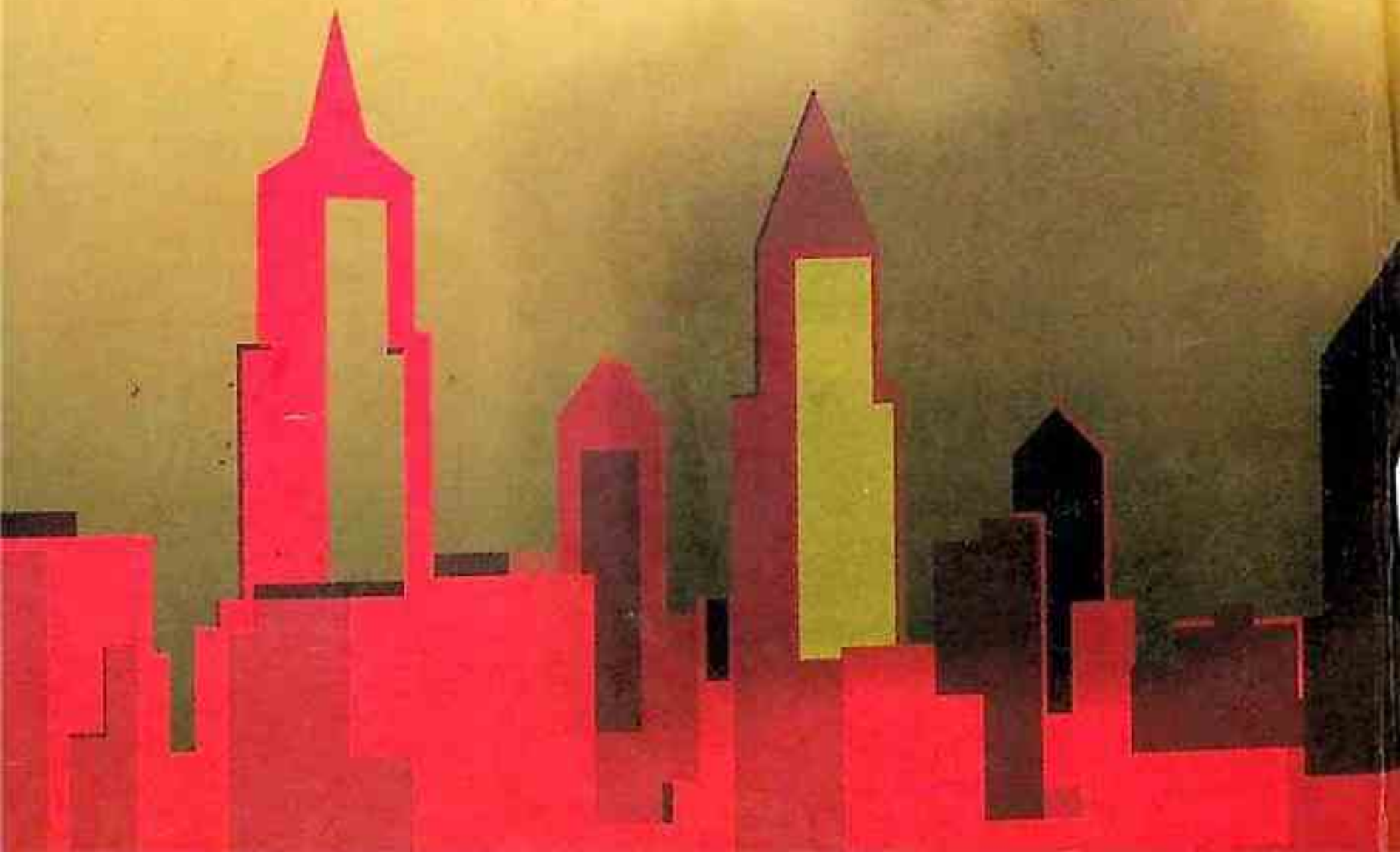
کتابی سلسلہ

دنیا زاد

دُنیا دُنیا دہشت ہے

ترتیب و تالیف

آصف فرّخی

کتابی سلسلہ ''دنیا زاد'': نمبر ٦

اشاعت: مئی ۲۰۰۲ء
کمپوزنگ: احمد گرافکس، کراچی
طباعت: فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی

بی۔ ۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی۔
scheherzade@ahmedgraf.com

فہرست

(۱)
دہشت گردی کے عناصر

(۲)
گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء: ڈر سے گھر تک

(۳)

دہشت کا حافظہ

(۴)

زخمی دنیا کے مراسلے

(۵)

طرزِ گفتارِ عہد نو

(٦)

میدانِ کار زار: افغانستان

(٧)

"حقیقت ازلی ہے رقابت اقوام..."

(۸)

جسم و زباں کی موت سے پہلے

(۹)

مستقل سلسلے

(۱۰)

جنگ سے رُخصت

محمود درویش
سمیح القاسم
غسان کنفانی
لیانہ بدر
سحر خلیفہ
فاروق وادی
ناجی عبدالعلی
یہودا امیخائی
لیلیٰ خالد
حنان اشراوی
ایڈورڈ سعید
ایموس اوز
نوم چومسکی
اقبال احمد
علی محسن صدیقی
محمد احمد سبزواری
ڈاکٹر مبارک علی
جمال الدین نقوی
مونس احمر
خالد سہیل
فاروق سرور
شکور نظامانی
اسلم خواجہ

دنیا زاد

خصوصی کتاب

عاشق من الفلسطین

تاریخی، سیاسی، سماجی تجزیہ

شعر و افسانے کے انتخاب کے ساتھ

ترتیب: آصف فرخی

دو جلدوں میں

قیمت: ۲۰۰ روپے فی جلد

اقبال
حسرت موہانی
فیض
شیخ ایاز
انتظار حسین
مسعود اشعر
الطاف فاطمہ
کشور ناہید
فہمیدہ ریاض
حسن عابدی
افضال احمد سید
شاہ محی الحق فاروقی
انور احسن صدیقی
انور سن رائے
شاہد حمید
انور زاہدی
تنویر انجم
مظفر اقبال
حمرا خلیق
ضمیر احمد
احمد صغیر صدیقی
رفاقت حیات
کاشف رضا

دُنیا دُنیا دہشت ہے

جو ہوا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ ہم میں سے کون اس کے لیے تیار تھا؟ سب بے خبری میں پکڑے گئے۔ اس طرح کے معاملات تو ٹھیٹھ امریکی ''اسٹائل'' کے ''بلاک بسٹر'' ناولوں کے صفحات میں پیش آیا کرتے ہیں۔ وہی کوڑیوں کے مول بکنے والے ناول جو روز مرّہ زندگی کے اکتا دینے والے معمول میں پھنسے ہوئے بے رنگ و بو لوگ پڑھتے ہیں کہ عقل کچھ دیر محوِ حیرت رہے اور زندگی میں سنسنی دوڑ جائے، چند لمحوں کے لیے سہی۔ مگر ہمارے زمانے میں سیاسی عمل، گھسے پٹے ناولوں، قصوں کی بے سلیقہ، بے ترتیب پیروڈی بن گیا ہے۔ ہم ان خوابوں میں زندگی کرنے پر مجبور ہیں جو دوسرے ہمارے لیے تھوک کے بھاؤ ''مینوفیکچر'' کرتے ہیں۔ آپ اس سے اتفاق نہ بھی کریں تو اسے پس از واقعہ عقلی توجیہہ تلاش کرنے کی کوشش سمجھ لیجیے۔ تجزیہ جو بھی حسب حال معلوم ہو، یہ واقعات اپنی جگہ حیرت انگیز اور افسوس ناک ہیں۔ مگر شاید ناگزیر بھی... انگریزی محاورے کے مطابق، مستقبل اب آن پہنچا ہے:

The future has just arrived.

دنیا نے تباہ کاری و تاراجی کے ایسے عبرت خیز مظاہرے دیکھے ہیں جن کے سامنے گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء ۸:۴۸ صبح، نیویورک شہر، ممکن ہے زیادہ بڑی حیثیت نہ رکھتا ہو۔ مگر بعض خصوصیات ایسی ہیں جن کی وجہ سے یہ حادثہ اور اس کے عواقب ہمارے زمانے کی ایک تشکیلی حقیقت (defining reality) بن گئے ہیں۔ ایک تو اس سلسلے کا طریقہ واردات، دوسرے اس کا پیمانہ اور اثر کا دائرہ کار۔ آہستہ آہستہ نمایاں ہوتے ہوئے واقعات نے ایسی لفظیات بلکہ اندازِ خطابت کو جنم دیا جس نے جنگی جنون اور تاریخ کے بوسیدہ صفحات میں خوابیدہ تعصبات سے قوّت حاصل کی اور جوابی کارروائی و انتقام نے بہت دور کے ایک چھوٹے

سے ملک کو اس طرح نشانہ بنایا کہ پرائے گھر کے شعلوں کی آنچ ہمارے آنگن تک آپہنچی۔ سات سمندر پار نیویورک شہرکی ایک عمارت کے مینار پر برپا تباہی کے اثرات نے قصّوں کے رسیا اور شاعری کے جویا "دنیا زاد" کے فوری منصوبوں کو تلپٹ کرکے رکھ دیا۔ ہمیں باقی ارادے طاق پر رکھ کر اس رنگ بدلتی دنیا کو سمجھنا سمجھانا ضروری معلوم ہوا۔ یہ خصوصی اشاعت اس سلسلے کی ایک ابتدائی کوشش ہے۔

"دنیا زاد" کی پچھلی اشاعت کے ابتدائیے میں یہ تاویل دی گئی تھی کہ "ایسی کوشش کی ضرورت ہر اس شخص کو پڑسکتی ہے جو دُنیا کی تفہیم کے اس سادہ حل پر مطمئن نہیں ہے جس کی ترویج ہمارے ذرائع ابلاغ سے ہوتی رہتی ہے۔" وہ اشاعت فلسطین کی صورت حال اور اس کے مضمرات کے حوالے سے تھی، یہ اشاعت اسی سے سلسلہ وار ہے۔ اس دائرے کے محیط سے ایک دائرہ اور پھوٹتا ہے، اس سے ایک دائرہ اور۔ ایک نیا پیچاک دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، سوال ابھرتے ہیں، پھیلتے ہیں، سمٹ جاتے ہیں۔ پوری دنیا اس وقت جیسے دم سادھے ان حالات کو دیکھ رہی ہے۔ یہاں اختیار کردہ طرزِ بیان کی وضاحت شاید مفید ہو لیکن موضوع کے انتخاب کی وضاحت ضروری نہیں... دہشت کا رنگ ہمارے ہوش و حواس پر چڑھتا جارہا ہے اور فالج جیسی نیند ذہن پر چھائی جارہی ہے۔ یہ سوال جان لیوا ہیں مگر ان کا سامنا مزید ملتوی نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے بعض مہربان ایک ادبی سلسلے کی ایسی سوالوں سے دلچسپی کو دخل در معقولات سمجھتے ہیں مگر ہمارے لیے یہ ادیب کی ذمہ داری کا لازمی شاخسانہ ہے۔ ذمہ داری کا احساس اس لیے بھی زیادہ ہے کہ یہ شاید وہ لمحہ ہے کہ دُنیا جس پر ٹکی ہوئی ہے، گائے وہ سینگ بدل رہی ہے۔ جس بحران کی گرفت میں ساری دُنیا ہے، پاکستان اس سے الگ نہیں۔ حالاں کہ ہم اپنے معاملات کو سب سے جدا سمجھ کر "غیروں کی سازش" قرار دیتے ہیں، پھر افسوس کرنے لگتے ہیں کہ نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔ ہم اس تلوار کو نہیں دیکھتے جو ہماری اجتماعی روح میں

چمک رہی ہے... زہر میں بجھی تلوار (اور اس زہر پر کوئی خدا کا نام پڑھ کر پھونک رہا ہے!)۔ بدلتے ہوئے حالات کی یہ کیفیت پاکستان پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے جہاں ہمیں دہشت گردی کی مختلف صورتوں کا سامنا ہے:

(۱) دہشت گردی کا نام ان منظم جرائم یا اس گروہی عمل کو بھی دینا چاہیے جو فلاکت زدہ محکوم عام آدمی کو، چاہے وہ پاکستان کے گاؤں میں رہ رہا ہو یا شہر میں، اپنا شکار بناکر بے آسرا کر ڈالتا ہے اور قانون یا سول سوسائٹی دور کے تماشائی بنے رہتے ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ اس ظلم کا نشانہ بننے والوں میں بڑی تعداد عورتوں کی ہے۔

(۲) منظم گروہی عمل جو چند افراد کی طرف سے نہیں بلکہ ریاست کی طرف سے کیے جاتے ہیں۔ ریاست نے خود اپنے ہی بعض لوگوں کے ساتھ جو قتل و غارت گردی کا سلوک کیاہے، اس کی مثالیں ۷۱ء کے مشرقی بنگال، اس کے کچھ عرصے بعد بلوچستان، ایم آر ڈی تحریک کے سندھ سے لے کر چند برس پیش تر کے اس کراچی تک بکھری ہوئی ہیں، جس کی راکھ میں سے اب تک رہ رہ کر دھواں اٹھتا ہے۔

(۳) اور پھر مذہب کے نام پر یا مذہب کے برخود غلط محرّکات کی بناء پر مارنے اور لوٹنے کا سلسلہ جس کی شکل ایک جیسی ہوتی ہے، مظلومین کے نام بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی یہ ستم رسیدہ احمدی ہیں تو کہیں عیسائی اور کہیں شیعہ۔

پاکستان میں لاکھوں افراد اب تک دہشت گردی کی ان مختلف صورتوں کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ اپنی یہ معمولی کاوش ہم ان کے نام منسوب کرتے ہیں، اس امید کے ساتھ کہ عالمی صورت حال کو بہتر طور پر سمجھنے سے اپنے ملک میں حل کی تلاش میں مدد ملے گی۔

یہ عالم دہشت کا

زیر نظر اشاعت کی ترتیب اس طور پر رکھی گئی ہے جس طرح واقعات ظاہر ہوئے اور حالات شکل اختیار کرتے گئے۔ "دہشت گردی کے خلاف جنگ" اس پورے سلسلے کو یہ نام دیا گیا۔ مگر جیسا کہ کسی دل جلے نے اعتراض کیا اس قسم کی جنگوں میں زبان و قواعد پہلے شہید ہوجاتے ہیں۔ یہ نعرہ جتنا سیدھا اور فوری اثر کا حامل معلوم ہوتا ہے، "دہشت گردی" کی اصطلاح میں اتنے ہی پیچ ہیں۔ پہلے حصے کے مضامین میں اس اصطلاح کو مزید کھولنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جو ہوا سو ہوا، اسے بیان کون کرے اور بیان کیسے کیا جائے؟ دوسرا حصّہ شخصی و ذاتی احوال پر مبنی ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی مگر ذاتی اور انفرادی آوازیں جو واقعات کے بہاؤ میں دب جاتی ہیں جن کی بازیافت اس لیے بھی لازمی ہے کہ عمومی تجزیوں کے مقابلے میں فرد کے احوال سے ادب کی بنیاد قائم رہتی ہے۔ واقعات کی یورش کے سامنے ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ خوف کا محیط بڑھتا جاتا ہے اور اس کی لپیٹ میں وہ لوگ بھی آجاتے ہیں جو اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ خوف کا یہ وسیع تر محیط، دہشت کی صورت حال کو ہمارے لیے نمایاں بھی کرتا ہے اور متعین بھی۔

جب خوف جاگتے ہیں تو جانے کب کب کے دبے ہوئے اندیشے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور روشنی کے نیم رُخ میں اندھیری دیوار پر پڑنے والی پرچھائیوں کی طرح مہیب شکلیں بنانے لگتے ہیں۔ الزام تراشی کی زد میں آئے ہوئے ایرانِ امروز سے لے کر ہمارے اس ماضی کے قصّوں تک جو ابھی بعید نہیں ہوا، تیسرے حصّے میں ایسے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ نظموں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ واقعات کے تار و پود، کچھ نئے پرانے اندیشوں سے الگ نہیں۔ سیاسی تجزیوں پر مشتمل حصّے کا عنوان ایک نئی کتاب سے اخذ کیا گیا ہے جو رپورٹوں اور دستاویزوں کا مجموعہ

ہے۔ مگر یہاں جن تحریروں کا انتخاب کیا گیا ہے ان میں واقعات کو ان کے اسباب و علل کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مختلف ممالک اور الگ الگ نقطۂ نظر رکھنے والے مبصرین کے تجزیوں سے عبارت ہے۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہوسکتا ہے کہ حالات اس قدر یک رُخے نہیں ہیں جس طرح امریکی (اور دوسرے مغربی) ذرائع ابلاغ سے ظاہر ہوتا ہے یا جیسے ہمارے بعض قومی رہنماؤں کو اس میں صرف اغیار کی شرارت اور سازش نظر آتی ہے، اپنے دامن کو دیکھنے اور اپنا تجزیہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ان حالات کے پس منظر میں ذرائع ابلاغ کے کردار کو اگلے حصّے کا موضوع بنایا گیا ہے۔ کاشف رضا نے اسْ حوالے سے تفصیلی جائزہ قلم بند کیا ہے۔ کشور ناہید نے ایک نظم میں ٹی وی چینل کو موضوع بنایا ہے۔ ان نظموں سے آپ یہ اندازہ بھی لگا سکتے ہیں کہ خبر، آگہی کیسے بنتی ہے۔

''دہشت گردی کے خلاف'' جس جنگ کا امریکا بہادر نے اس زور و شور سے اعلان کیا تھا، اس کا دائرہ سمٹ کر افغانستان پر مرتکز ہوگیا۔ افغانستان اسْ کتاب کے چھٹے حصّے کا مرکزی حوالہ ہے، یہ حصہ تاثر، یاد اور پھر افسانے سے شروع ہو کر موجودہ صورت حال تک آتا ہے۔ موجودہ تصادم کو بعض مفسّرین نے تہذیبوں کی جنگ قرار دیا ہے، تاہم اس حصّے میں تجارتی مقاصد کا ذکر اور اس پورے مباحثے پر ایڈورڈ سعید اور راہل مہاجن کے نقطۂ نظر کو پیش کیا گیا ہے جس سے یہ پورا paradigm ہی چیلنج ہوجاتا ہے۔

یہ تصادم ادب میں کس طرح منعکس ہوتا ہے، اس کا اندازہ آٹھویں حصّے سے لگایا جاسکتا ہے جس میں نظمیں اور افسانے شامل ہیں۔ ممتاز صحافی احفاظ الرحمٰن نے ان واقعات سے متاثر ہو کر کئی نظمیں لکھیں جو شائع بھی ہوئی ہیں، ان میں سے دو نظمیں یہاں شامل کی جارہی ہیں۔ فاطمہ حسن کی نظم بھی اس سے قبل شائع ہوچکی ہے مگر ایک خون آشام قیادت کی چہرہ کشائی کے حوالے سے اس وقت مزید معنی خیز معلوم

ہوئی۔ اس حصّے کا نقطۂ عروج انتظار حسین کے مضمون کو سمجھیے جو مزید گفتگو کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا ہے۔

جنگ اور دہشت گردی کے ساتھ ساتھ زندگی کے مستقل سلسلے جاری ہیں، اس لیے یہ عنوان اس مرتبہ بھی قائم رکھا جارہا ہے۔ ستمبر ۲۰۰۱ء میں انور خاں ہم سے بچھڑ گئے۔ ان کی یاد ہمارے لیے ریزۂ الماس ہے، ''دنیا زاد'' کے جن دوستوں کے رد عمل اور تحریری تعاون پر نظر رہتی تھی، ان میں سے ایک تعزیت نامے کی سرخی جماتے ہوئے ہم پر صدمے کا ایک عالم گزر گیا۔ نوبل انعام کے اعلان کو اس مرتبہ ہماری طرح اوروں نے بھی سیاست امروز سے منسلک کرکے دیکھا ہے۔ آخری حصّے میں رومن دیوتا جینس (Janus)کی طرح دو رُخ ہیں، ایک ماضی کی طرف اور دوسرا آئندہ کی طرف۔ ہمارا یہ زمانہ موجود، ہمارے مستقبل کو کیسی شکل دے گا، یہ ہم بھی دیکھیں گے۔

لفظ، لفظ، لفظ...... ہمارے چاروں اطراف موجود یہ دنیا اپنے آپ کو ان اصطلاحات اور تصوّرات کے ذریعے بیان کرنے لگی ہے جن کے مفہوم سے ہم پوری طرح واقف نہیں۔ دہشت گردی کا تصوّر بھی ایسا ہی لفظ ہے۔ اس میں پنہاں درد و اذیت کا ہم تصور کرسکتے ہیں مگر اس اصطلاح کا مفہوم کیا ہے؟ بہتر ہوگا کہ دہشت گردی کے جائزے کا آغاز اس مفہوم کی وضاحت سے ہی کیا جائے۔

دہشت گردی کی اجمالی تعریف، رائے گٹمین اور ڈیوڈ ریف کی تالیف ''جنگ کے جرائم'' (نیویورک، ۱۹۹۹ء) سے لی گئی ہے۔ اس قابل قدر کتاب میں مختلف صحافی، بین الاقوامی ماہرین قانون، عسکری تجزیہ نگاروں اور اساتذہ نے بین الاقوامی قوانین کے تحت جنگی جرائم کے بارے میں وہ معلومات اکٹھا کر دی ہیں جن تک عوام کی دسترس ہونا چاہیئے۔ ''دہشت گردی'' کی یہ وضاحتی تعریف رچ امکھنڈو (Rich Mkhondo) نے لکھی ہے۔ جنوبی افریقا کے یہ معروف صحافی، واشنگٹن میں نامہ نگار رہے ہیں۔ اپارتھائیڈ کے بعد جنوبی افریقا کے احوال پر کتابیں لکھ چکے ہیں۔ ان کی اس تحریر میں جنوبی افریقا کا حوالہ نمایاں ہے۔

سرج شمی مان (Serge Schmemann) صحافی ہیں اور نیویورک ٹائمز سے وابستہ رہے ہیں۔ وہ ماسکو، بون اور یروشلم میں بیورو چیف بھی رہے ہیں۔ ۱۹۹۱ء میں انہیں مشرقی اور مغربی جرمنی کے دوبارہ مل کر ایک مُلک بن جانے کی رپورٹنگ پر پلٹزر انعام ملا۔ روس اور جرمنی پر رپورٹنگ کے لیے اوورسیز پریس کلب کی جانب سے دو مرتبہ انعام بھی مل چکا ہے۔

رچ امکھنڈو

ترجمہ: آصف فرخی

دہشت گردی

جب ۱۹۸۰ء کی دہائی کے آخری برسوں میں، پولیس کی تفتیش کے دوران جوہانز ''سوئیٹ'' سامبو حادثاتی طور پر ہلاک ہوگیا تو کرنل یوجین ڈی کاک نے، جو سی ۱۰ یونٹ کے سربراہ تھے اور

یہ یونٹ جنوبی افریقا کی حکومت کا ایک خفیہ قاتل دستہ تھا، اپنے اعلیٰ افسران سے رابطہ کیا اور اس کے بعد اپنے ساتھیوں کو، جن میں میجر چیپز کلاپر بھی شامل تھے، حکم دیا کہ لاش اٹھالی جائے اور اسے ''بدھ'' بنادیا جائے (''Buddha it'')...... یہ فقرہ انہوں نے ہی گھڑا تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ آتش گیر مادّے سے کسی چیز کے پرخچے اڑا دیے جائیں۔ یہ لاش ایک فارم پر لے جائی گئی جہاں اسے آتش گیر مادّے کے درمیان ''سینڈوچ'' بنا دیا گیا اور پھر بھک سے اڑا دیا گیا۔ اس کے ٹکڑے پھر جمع کیے گئے، ایک ڈھیر پر لاکر ڈالے جاتے رہے اور پھر دوبارہ بھک سے اڑا دیے گئے۔

یہ عمل یہاں تک دہرایا جاتا رہا جب تک کہ تباہ کرنے کے لیے کچھ باقی ہی نہیں رہا۔ ڈی کاک کے مقدمے میں گواہی دیتے ہوئے، جس کے بعد اسے اپنی باقی ساری عمر قید خانے میں گزارنے کی سزا سنائی گئی، میجر کلاپر نے کہا کہ انہیں یہ امید تھی کہ باقی جو بچے گا اسے بڑی برق رفتاری کے ساتھ چیونٹیاں صاف کر دیں گی۔ جج نے ڈی کاک کو دو مرتبہ عمر قید اور اس کے دوسرے جرائم کے لیے مجموعی طور پر ۲۱۲ سال کی قید کی سزا سنائی۔

جب ڈی کاک کے مقدمے کے دوران حقائق سامنے آئے تو سی ۱۰ یونٹ کی کارروائی کو بالعموم دہشت گردی کے واقعات قرار دیا گیا جو جنوبی افریقا کی اپارتھائیڈ (نسل پرست تفریق کی سرکاری پالیسی) کے تحت سرانجام دیے گئے۔

''دہشت گردی'' کی اصطلاح کی کوئی عالمی طور پر متفقہ تعریف نہیں ہے مگر اس میں بار بار دہرائے جانے والے چند موضوعات ہیں، جن میں مندرجہ ذیل شامل ہیں: تشدد جو سیاسی یا سماجی مقصد کے تحت ہو، خوف زدہ کرنے کی کوشش ہو اور اس عمل کا رُخ شہریوں اور دوسرے ایسے لوگوں کی طرف کر دیا جائے جو لڑائی میں شریک نہیں ہیں۔ دہشت گردی سیدھے سادے تشدّد سے بڑھ کر ہے، جس میں صرف دو فریقین کی ضرورت ہوتی ہے، ایک جارحیت کرنے والے یا جارح اور دوسرا اس کا شکار (victim)۔ دہشت گردی کے لیے ایک تیسرے فریق کی بھی ضرورت پڑتی ہے، جو ان تمام واقعات سے مرعوب یا خوف زدہ ہوجائے جو جارحیت کے شکار کے ساتھ پیش آرہے ہیں۔

عام طور پر دہشت گردی قرار دیے جانے والے واقعات پر بین الاقوامی انسانی قوانین (International humanitarian law یا IHL) کے تحت پابندی عائد ہے۔ ان قوانین میں ۱۹۴۹ء کا چوتھا جنیوا کنونشن اور ۱۹۷۷ء کے دو اضافی پروٹوکول شامل ہیں۔ ان کے تحت

بین الاقوامی اور اندرونِ خانہ مسلح تصادم کے دوران دہشت گردی پر پابندی عائد ہے، کم از کم جہاں تک دہشت گردی سے مراد لی جائے شہریوں کے خلاف حملے۔ حالاں کہ "دہشت گردی" کی اصطلاح سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ یہ (انفرادی سے زیادہ) گروہی اعمال ہیں اور ان گروہوں کی جانب سے ہیں جو ریاست کا حصہ نہیں۔ لیکن دہشت گردی کی کارروائی کا ایک اہم درجہ ان کارروائیوں پر مشتمل ہے، جن پر عمل درآمد یا جن کی ہدایت و منصوبہ بندی، براہ راست یا بالواسطہ طور پر ریاست کی طرف سے کی گئی ہو۔ یا پھر ریاست نے اجازت دے دی ہو، چاہے اس ریاست کی اپنی فوج یا پولیس براہ راست ملوث نہ ہو، مگر یہ بعض قاتل دستوں کو تفویض کر دی گئی ہو۔

آئی ایچ ایل سے ہٹ کر بعض دوسرے معاہدوں میں بھی جرائم کے ان درجوں کو قائم کر دیا گیا ہے جنہیں عام طور پر دہشت گردی قرار دیا جاتا ہے اور جو مسلح تصادم کے سیاق وسباق سے باہر ہیں۔ ان معاہدوں میں ۱۹۷۹ء کا "یرغمالی بنانے کے خلاف بین الاقوامی کنونشن" اور ہوائی جہازوں کے اغوا کے خلاف کئی کنونشن شامل ہیں۔

اپارتھائیڈ کے دوران جنوبی افریقا میں جو کچھ ہوا وہ صرف اور محض اپارتھائیڈ پر عمل درآمد سے کہیں زیادہ تھا، جب کہ اپارتھائیڈ بذاتِ خود "انسانیت کے خلاف جرم" ہے۔ اپارتھائیڈ کے دفاع کے لیے دیگر مجرمانہ طریقے بھی استعمال میں لائے جا رہے تھے۔ اپارتھائیڈ ریاست کو وسیع اختیارات دے دیے گئے تھے کہ سیاہ فام جنوبی افریقیوں کی زندگی کو اپنی مرضی پر کاربند کرے اور انہیں بنیادی انسانی حقوق سے محروم رکھے۔ مگر یہ وسیع اختیارات بھی کافی نہیں تھے۔ ان کے ضمیمے اور اضافے کے طور پر عام قانون کے خلاف جرائم کی ہر قسم کو استعمال کیا گیا جن میں باقاعدہ اور منظم قتل، جعل سازی، اغوا اور اذیت رسانی شامل ہیں۔

اگر الفاظ کی درجہ بندی پر زور دیا جائے تو ان میں سے بہت سے جرائم سرکوبی کا حصہ تھے اور سیاسی معنی میں دہشت گردی نہیں تھے۔ جرم کی حیثیت سے ان کا گھناؤنا پن اسی قدر تھا۔ مگر یہ شاذ و نادر ہی کسی تیسرے فریق کو اس طرح سے متاثر کرنے کے لیے کیے گئے تھے جو دہشت گردی کے تصور میں شامل ہے۔

سرج شمی مان
ترجمہ: آصف فرخی

شہریوں کے خلاف دہشت گردی

تین آدمی ایک دوسرے سے لگ بھگ پچیس، پچیس گز کے فاصلے پر یروشلم کی بین یہودا شاہراہ کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے، ان میں سے ایک عورتوں کے لباس میں تھا۔ کسی ایک نے غالباً کوئی اشارہ دیا، شاید سر کی خفیف سی جنبش اور ان تینوں نے سوئچ کھول دیے جن سے ان کے کپڑوں میں چھپے ہوئے سارے بم پھٹ پڑے...... تقریباً پانچ پونڈ کا آتش گیر مادہ جس میں پیچ اور ڈھبریاں بھری ہوئی تھیں کہ نوک دار ٹکڑوں (شارپنل) کا کام دیں۔

جوں ہی ''دھپ'' کی پہلی آواز آئی، بہت سے لوگوں کو جبلّی طور پر پتہ چل گیا کہ یہ کیا ہے۔ لڑاکا طیارے یروشلم کے آسماں پر معمول کے مطابق، آواز کی حد توڑ دیتے ہیں مگر یہ آواز بجلی کڑکنے جیسی ہوتی ہے۔ پھر بھی لوگ اپنی جگہ بت بنے رہیں گے جب تک کہ وہ اس دھیمی ہوتی گڑگڑاہٹ کو نہ سن لیں جس سے جیٹ طیارے کی تصدیق ہوجاتی ہے۔ بم کی آواز اس سے مختلف ہوتی ہے، گھٹی گھٹی اور قریب سے آنے والی دھپ۔ جن لوگوں نے یہ آواز سُنی ہے، اسے فوراً پہچان جاتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ۴ ستمبر ۱۹۹۷ء کو دوسرے اور تیسرے دھماکے کی آواز آئے، بہت سے لوگوں نے اس آواز کے ہولناک مانوس پن کو محسوس کیا۔

میں اپنی بیوی کو اسکول سے لانے کے لیے راستے میں تھا جہاں وہ پڑھاتی ہے اور ابھی بین یہودا کو پار ہی کیا تھا کہ میں نے دھماکا سنا۔ حالانکہ میں نے اس سے پہلے یہ آواز نہیں سنی تھی مگر مجھے بھی پتہ چل گیا کہ یہ کیا ہے۔ اسرائیل میں دو برس کے دوران میں نے نو مرتبہ خودکش حملوں کی باقیات کی رپورٹنگ کی تھی اور ہر شخص کی طرح میں بھی اس مسلسل انتظار میں تھا کہ اگلی باری کب آتی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اب کیا ہوگا۔ سب سے پہلے ایک محتاط وقفہ — دہشت گردوں کے بارے میں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ اس وقت کا انتظار کرتے ہیں جب تک ایمرجنسی سروسز جمع نہ ہوجائیں، پھر اگلا بم پھینکتے ہیں۔ پھر اس کے بعد زخمیوں اور خوف زدہ لوگوں کی چیخ پکار، سائرن،

انتشار کے عالم میں ان سب لوگوں کا جتھا بنا کر آنا جن میں صحت کے کارکن، پولیس، سراغ رساں، سپاہی اور سیاہ داڑھیوں والے ثقہ یہودی شامل ہوتے ہیں جو یہودی کی ایک ایک ہڈی بوٹی چن چن کر جمع کر لیں گے کہ اسے مناسب طور پر دفن کیا جا سکے۔ سیل فون پر غلبہ طاری ہو جاتا ہے اور لوگ دیوانہ وار ٹیلی فون کی جستجو کرتے ہیں کہ اپنے گھر والوں کی تسلی کرا سکیں۔

اور ہر شخص وہ ہولناک لاچاری، بے یار و مددگار ہونے کا احساس اور بے کار غیظ و غضب محسوس کرتا ہے۔ ''یہ تقریباً اس احساس کی طرح ہے کہ اس حقیقت کے ساتھ ہمیں زندگی گزارنا ہے'' ایک نوجوان وکیل جوناتھن شف نے بین یہودا پر کھلنے والی اپنی کھڑکی سے یہ ہنگامہ دیکھتے ہوئے کہا۔

خودکش بم باری، تشدد کی کسی بھی اور صورت سے مختلف ہے۔ ایک ایسے حملے کے خلاف کوئی دفاع ممکن نہیں جو فی الاصل اتفاقی ہو یا کسی ایک آدمی کے خلاف...... اسرائیل میں اب تک تمام خودکش بم بار مرد ہی ہوئے ہیں...... جو مذہب اور مایوسی کے سبب اس قدر حواس باختہ ہو گیا ہو کہ مرنے پر تیار ہو جائے۔ بعد میں جو مراسلے سامنے آئے ان میں کٹر اسلامی گروہ حماس نے بم باروں کو شہید اور سپاہی قرار دیا۔ وہ واقعتاً محض خودکش اور جان لینے والے تھے۔ بارہ سال کی لڑکی جو ان کی بم باری سے مر گئی، سپاہی تھی نہ ان کی دشمن۔ نہ ان کے دوسرے شکار ایسے تھے، ایک مرد اور دو عورتیں جو ہلاک ہوئے۔

اپنے طریقے اور مقصد میں دہشت گردی، انسانی عمل، قانون اور تصادم کے اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔ اس کا مقصد ہے۔ حادثاتی و سرسری سفاکی کے مظاہرے کے عمل کے ذریعے سے ہمت کو توڑنا، غیر انسانی بنانا، تذلیل کرنا اور خوف زدہ کرنا۔

اور فوراً ہی، بالکل جبلی طور پر، انسانی روح اس کے خلاف نبردآزما ہو جاتی ہے اور اسی جذبے کی تصدیق کرتی ہے جس کو دہشت گردی مٹانا چاہتی ہے۔ گھڑی بھر میں شہر کی سڑکوں پر سے خون اور شیشے کی کرچیاں صاف کر دی گئیں اور اگلی صبح تک ہزاروں اسرائیلی، جن میں سے کئی بہت دور سے آئے تھے، سر اٹھائے ہوئے بین یہودا پر گھوم رہے تھے، اسے اپنے عزم اور زندگی سے بھر رہے تھے۔

مارک لیوائن یونیورسٹی آف کیلی فورنیا، راروائن میں تاریخ کے اسسٹنٹ پروفیسر اور ٹکن میگزین کے شریک مدیر ہیں۔ شاہ محی الحق فاروقی کے کئی تراجم کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں جن میں غالب اور کراچی کے شہری مسائل پر کتابیں شامل ہیں۔

مارک لیوائن
ترجمہ: شاہ محی الحق فاروقی

دہشت گردی کے بارے میں جاننے کے لیے دس باتیں

ا۔ دہشت گردی کیا ہے؟

دہشت گردی کی تعریف بیان کرنا مشکل ہے۔ ایک وسیع مفہوم میں ہم دہشت گردی کو شہریوں کے خلاف طاقت کے ایک ایسے استعمال یا استعمال کی دھمکی کے طور پر سمجھ سکتے ہیں جو سیاسی اور معاشرتی تبدیلی لانے کی غرض سے عام شہریوں کے خلاف کیا جائے۔ علاوہ ازیں اگر ایک طرف ہم دہشت گردی کو ایک سیاسی عمل اور خلافِ عقل کام (خاص طور سے خودکشی والی دہشت گردی) سمجھ سکتے ہیں تو دوسری جانب ہم دہشت گردی کو بطور خاص اس سے نمودار ہونے والے اثرات یعنی خوف، ابتری اور اطاعت گزاری کی بنا پر ایک معقول فعل بھی سمجھ سکتے ہیں۔

امریکی حکومت کے اس عہد کے پیشِ نظر کہ وہ دہشت گردی کے خلاف ایک جنگ لڑے گی ہمارے لیے دہشت گردی کی تعریف پر غور کرنا اور بھی اہم ہوگیا ہے۔ امریکی محکمۂ دفاع اور وفاقی تحقیقاتی بیوریو (ایف بی آئی) دونوں ہی کے مطابق ''کسی حکومت کو دھمکانے یا خوف زدہ کرنے اور اپنے سیاسی اور معاشرتی مقاصد کو آگے بڑھانے کے لیے اس حکومت کی شہری آبادی یا اس کے کسی حصے کی جان و مال کے خلاف طاقت یا تشدد کا غیر قانونی استعمال'' دہشت گردی ہے۔'' محکمۂ دفاع نے دہشت گردی کی جو تعریف کی ہے اس میں اتنا اضافہ اور کیا گیا ہے کہ دہشت گردی کی خاطر کیے جانے والے فعل میں ''خوف بھی شامل'' ہوسکتا ہے۔ (یعنی نفسیاتی رخ) جب کہ امریکی وزارت خارجہ کی تعریف زیادہ واضح ہے جس کے مطابق دہشت گردی میں حیاتیاتی، کیمیائی یا جوہری ترکیبوں کے علاوہ سیاسی بنیاد پر کیے جانے والے قتل بھی شامل ہیں۔

بعد والی تشریح سے یہ ظاہر ہوگا کہ اس لفظ کی ہماری تعریف کے مطابق بن لادن کو قتل کرنے کا فعل دہشت گردی میں شمار ہوگا جب کہ پہلے والی تعریف سے یہ ظاہر ہوگا کہ ڈریسڈن میں شہر پر آتش گیر بمباری کر کے اتحادی افواج اور خاص طور سے دوسری جنگ عظیم کو ختم کرنے کی غرض سے جوہری ہتھیار اور ویت نام میں کیمیائی ہتھیار استعمال کر کے امریکا پہلے ہی دہشت گردی کی کارروائیوں میں مبتلا ہو چکا ہے حالاں کہ ان سرگرمیوں کے لیے دشمنوں مثلاً نازی جرمنی کی دہشت گردی وغیرہ کا نام لے کر ہر قسم کا اخلاقی جواز فراہم کیا گیا ہے۔

دہشت گردی کی تعریف کرنے میں یہ صورت حال دراصل ایک معمے کی حیثیت رکھتی ہے۔ دہشت گردی کو جنگی کارروائیوں سے، خواہ کوئی جنگ جائز ہو یا ناجائز، الگ کرنا بہت دشوار ہے۔ ہم سب نے یہ قول بار بار سنا ہے کہ ''ایک شخص کے نزدیک جو دہشت گرد ہے وہ دوسرے شخص کے نزدیک آزادی کا سپاہی ہے'' اور یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں جب ڈک چینی جیسے سیاست داں نیلسن مینڈیلا کو دہشت گرد قرار دے رہے تھے اس وقت امریکی حکومت اسامہ بن لادن اور اس کے ساتھیوں کو جنگِ آزادی کے سپاہی کہہ کر ان کی تعریف کر رہی تھی۔

علاوہ ازیں دہشت گردی کے سلسلے میں اقوام متحدہ کی تعریف میں یہ کہا گیا ہے کہ ان تمام جنگی جرائم کو دہشت گردی کی کارروائی سمجھا جائے گا جن میں دنیا کی اکثر حکومتوں (خاص طور سے بڑی فوجی طاقتوں مثلاً پاکستان، اسرائیل، بڑی بڑی مسلم حکومتوں اور اکثر لاطینی امریکی حکومتوں) نے دہشت گردی کا ارتکاب کیا ہے حالاں کہ ان میں سے بہت کم کو اپنی ان کارروائیوں کے لیے کسی عدالت انصاف یا عوامی رسوائی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

۲۔ دہشت گردی کی تاریخ کیا ہے؟

دستاویزات کے مطابق ''دہشت گردی'' یا ''دہشت گرد'' کے لفظ کو پہلی بار اس ''عہدِ دہشت'' کے لیے استعمال کیا گیا تھا جسے (مارچ ۱۷۹۳ء سے جولائی ۱۷۹۴ء تک) فرانسیسی حکومت نے برپا کیا تھا۔ حکومت مخالف سرگرمیوں کے اظہار کے لیے ''دہشت گرد'' کا لفظ ۱۸۶۶ء میں آئرلینڈ اور ۱۸۸۳ء میں روس کے حوالے سے تحریری شکل میں سامنے آیا۔

انسانوں کی تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ انھوں نے اپنے پڑوسیوں میں خوف پیدا کرنے اور ان کے رویوں میں تبدیلی لانے کے خاطر انھیں ہمیشہ دہشت زدہ کیا ہے۔ چین کے استعماری عہد کی ابتدا میں پہلے چینی جنرل اور عسکری حکمت عملی کے نظریات کے بانی تائی کنگ نے ''شہری

جارحیت کے پھیلاؤ'' کے بارے میں کہا تھا کہ اس کا مقصد اختلاف و افتراق کے بیج بونا، عوام کے حوصلے پست کرنا اور حکومت کو ناکارہ بنانا ہے۔

جدید زمانے میں تمام باضابطہ فوجوں نے ''بے ضابطہ افراد'' کو اس لیے بھرتی کیا ہے کہ وہ ان کے لیے گندے کام کریں۔ قزاقوں، طالع آزما افراد اور کرائے کے سپاہیوں کو اسی کام کے لیے استعمال کیا جاتا تھا کہ وہ خود دیہاتوں اور شہروں میں گھروں کے اندر گھس کر لوٹ مار اور بدکرداری کریں اور اپنے آقاؤں کے افعال پر پردہ ڈالے رکھیں۔ (خوب بات ہے یہ بھی کہ روس کے مسلمان علاقوں کو مغلوب کرنے کے لیے آئیون اوّل نے جن قزاقوں کو استعمال کیا تھا انہیں کو بعد میں اسے زیر بھی کرنا پڑا اور آج امریکا ان مسلمانوں کو زیر کرنے پر مجبور ہے جنھیں اس نے روس کو مغلوب کرنے کے لیے استعمال کیا تھا)

آج دہشت گردی کو جدید قومی ریاست کے سیاق وسباق میں دیکھنا ضروری ہے۔ دراصل غیر جمہوری ریاستوں کے عروج کا سبب یہی ہوا کہ اسے اس رہنما کی موت کے باوجود تباہ نہ کیا جا سکا جس نے دہشت گردوں کو عوام میں بے چینی پیدا کرنے اور حکومت پر سے اعتماد اٹھانے کے لیے اپنی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کرنے پر مجبور کیا اور یہ حقیقت لوگوں کے دلوں پر گزشتہ سو سال کی اس دہشت گردی کی وجہ سے پختہ ہو چکی ہے جس میں حکومت دشمن انتشار پسندوں کی جانب سے کیے جانے والے قتل سے لے کر ہوائی جہازوں کے اغوا اور خودکش بموں کے حملے تک شامل ہیں۔

۳۔ دہشت گرد آج کون ہیں اور کہاں ہیں؟

امریکی وزارت خارجہ کے مطابق کم از کم ۴۵ دہشت گرد گروہ امریکا سے باہر موجود ہیں۔ فی الحال امریکا سات ''بدمعاش ریاستوں'' عراق، ایران، شام، لیبیا، شمالی کوریا، کیوبا اور اب افغانستان...... پر ''دہشت گردی کی حمایت'' کرنے کا الزام لگاتا ہے۔

لیکن اس بات کی نشان دہی اب بھی نہیں کی جاسکتی کہ کون دہشت گرد ہے اور کون نہیں۔ فلسطین کے رہنما یاسر عرفات دہشت گرد تھے اور اب وہ دہشت گرد نہیں ہیں۔ آئرلینڈ کی سن فین (Sinn Fein) کے جیری آدمس اور جنوبی افریقا کے نیلسن منڈیلا دہشت گرد تھے اور اب وہ بڑے عظیم مدبّر اور رہنما ہیں۔ کم از کم تین اسرائیلی وزرائے اعظم یا تو خود اپنے اعتراف کے مطابق دہشت گرد تھے یا ان پر دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوّث ہونے کا الزام قانونی طور پر لگایا جاسکتا تھا۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ہمارے سب سے نئے حلیف، روس کے صدر ولا

ڈیمیر پوٹین آج بھی چیچنیا میں ایک ایسی غلیظ جنگ لڑ رہے ہیں جسے شہریوں کے خلاف بہیمانہ مظالم کی وجہ سے دہشت گردی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

تیس سال قبل نوم چومسکی نے ہمیں یاد دلایا تھا کہ قومی تحفظ کے نام پر اذیت اور دہشت گردی کے آلات استعمال کرنے والی حکومتوں کی دو تہائی تعداد امریکا کی گاہک ہیں۔ مزید برآں مشرق وسطیٰ کی تقریباً ہر حکومت جس میں ہمارے سب سے مضبوط حلیف شامل ہیں، اپنے عوام اور اپنے پڑوسیوں کے خلاف ریاستی دہشت گردی میں ملوث ہیں۔

۴۔ اسامہ بن لادن اور دوسرے دہشت گردوں کے آغاز کا سراغ کہاں سے ملتا ہے؟

ہم تو ابھی اسامہ بن لادن اور ان جیسے دوسرے لوگوں کے ناقابل یقین حد تک پیچیدہ نیم فوجی، مالی اور انفرادی روابط کو سمجھنے کے ابتدائی مرحلے پر ہیں۔ اس پیچیدگی کا عالم یہ ہے کہ جتنا بھی گہرا ہم کھودتے جا رہے ہیں اتنا ہی زیادہ اس کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ جو چیز بہت دنوں پہلے واضح ہو چکی ہے وہ یہ ہے کہ بن لادن کو اصل تعاون پاکستان اور سعودی عرب سے مل رہا ہے جو دونوں امریکا کے بڑے حلیف ہیں۔

اور یہ تعاون ہمارے مشرقی وسطیٰ اور مرکزی ایشیا کے تحفظاتی نظام کے گرد چکر کاٹتا ہے۔

امریکا آج بھی سعودی حکومت کا سرپرست اور اسے ہتھیار کا سب سے بڑا فراہم کنندہ ہے اور یہی امریکا افغان جنگ کے دوران میں پاکستان کے بہت قریب تھا جب وہاں آمر ضیاء الحق (دنیا کے بڑے سنگ دلوں میں سے ایک) برسر اقتدار تھا۔ سی آئی اے تین ارب ڈالر سے بڑی اس رقم کا خاص فراہم کنندہ تھا جو موجودہ دہشت گردی کے روابط میں مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔ اسی طرح سوویت یونین بھی عرب دہشت گردوں کی پچھلی نسل کی، جیسے ابوندال جو آزادیٔ فلسطین کا مقبول عام فرد تھا، سرپرست تھی۔ سعودی شاہی خاندان کے ساتھ امریکی اتحاد کی تاریخ کی ابتدا ۱۹۴۰ء کے عشرے سے ہوتی ہے جب روز ویلٹ کی انتظامیہ نے اس وقت تک کے لیے شاہی خاندان کی بقا کی ضمانت دی جب تک سعودی عرب امریکا کو سستے تیل کی فراہمی یقینی بنائے۔ اس طرح پیٹرو ڈالر اور اسلحوں کا چکر شروع ہوا جس میں تیل کی قیمت کے طور پر سعودی عرب کو بھیجا جانے والا امریکی ڈالر اسلحوں کی خریداری کے ضمن میں دوبارہ امریکا واپس آ جاتا تھا۔ دہشت گردی کے مالی وسائل کو سمجھنے کے لیے اس پیٹرو ڈالر چکر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے جس کی وجہ سے تیل

کی قیمت کا بڑا حصہ بدعنوان حکومتوں کے ہاتھوں میں اور اس علاقے کے اکثر شہریوں کی دسترس سے باہر رہتا ہے۔

اگر ہم اس سوال پر توجہ دیں کہ دہشت گردوں کو تحفظ اور مالی مدد کون مہیا کر رہا ہے تو ہمیں ایک بار پھر مغربی طاقتیں اور مشرقِ وسطیٰ اور جنوب میں ان کے حلیف ہی ملزم نظر آئیں گے۔ خود امریکا اپنی بیرونی امداد اور سرد جنگ کے دوران اور اس کے بعد اسلحے کی فروخت کے ذریعے سیکڑوں ارب ڈالر کے کاروبار میں ملوث رہا ہے۔ اس عرصے میں (صرف ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۷ء تک) امریکی حکومت نے روئے زمین پر عملاً ہر قوم کو ایک سو نوے ارب ڈالر کا اسلحہ فروخت کیا یا اس کی منظوری دی یا بلا قیمت بانٹ دیا۔ یہی صورت حال چھوٹے پیمانے پر سوویت یونین کی بھی تھی۔ لاطینی امریکا، افریقا، ایشیا، مشرقِ وسطیٰ غرض کوئی بھی جگہ ہو جہاں کہیں بھی دہشت گرد حکومتیں دہشت گردی میں مشغول رہی ہیں وہ ان دونوں اعلیٰ طاقتوں (اور اب صرف ایک) اور ہمارے جی۔۸ کے حلیفوں کے تعاون کے بغیر پنپ ہی نہیں سکتی تھیں۔

لیکن الزام صرف اعلیٰ طاقتوں ہی کو نہیں دیا جاسکتا۔ اگر بن لادن طالبان کے بغیر نہیں پنپ سکتا تھا تو طالبان کا بھی وجود باقی نہیں رہ سکتا تھا اگر اسے پاکستان کے ان سیکڑوں دینی مدارس کی سرپرستی اور تعاون حاصل نہ ہوتا جو ہزاروں نوجوانوں کو اس سے زیادہ کچھ نہیں سکھاتے کہ وہ خدا کے نام پر لوگوں سے نفرت کریں اور انھیں قتل کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ بن لادن کو بڑا سرمایہ فراہم کرنے والوں میں سعودی خفیہ ایجنسی کا محکمہ اور ممتاز سعودی افراد مثلاً ریاض کے گورنر اور ملک کے مفتیِ اعظم شامل ہیں۔ عجیب بات ہے کہ بن لادن کا رشتہ صدام حسین سے جوڑ دیا گیا ہے۔

بہر حال اس معاملے میں صرف شاہزادے اور شیوخ ہی ملزم نہیں ہیں بلکہ اوسط آمدنی والے لوگوں نے بھی اپنے چھوٹے چھوٹے چندوں کے ذریعے لاتعداد دہشت گرد تنظیموں کو زندہ رہنے میں مدد دی ہے، خواہ یہ عرب ہوں جو مبارزت میں مشغول اخوان المسلمین اور بیک وقت سماجی خدمات مہیا کرنے والے اور ساتھ ہی پرتشدد سرگرمیوں کی بھی سرپرستی کرنے والے حماس کی مالی مدد کرتے ہیں یا یہ غریب پاکستانی ہوں جو اب بھی روپیہ دو روپیہ کرکے بن لادن کو کروڑوں روپے فراہم کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ فرانس، اسرائیل اور امریکا میں اوسط درجے کے شہری بھی وہی کچھ ٹیکس کی مد میں ادا کرنے والے ان ڈالروں کے ذریعہ کرتے ہیں جن سے ہماری پالیسیوں کی تشکیل میں مدد ملتی ہے۔

۵۔ صیہونیت، عیسائیت اور اسلام دہشت گردی کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

دہشت گردی کا تصور تینوں مذاہب کی کتب سماوی کے انسانوں تک پہنچنے کے صدیوں بعد پیدا ہوا لہٰذا اس مفہوم میں دہشت گردی کے تصوّر پر بحث کرنا مشکل ہے بہر حال براہیمی عقائد کے تینوں مذاہب جنگ کی اجازت دیتے ہیں اور تحریر اس پر قائم کرتے ہیں کہ کب، کہاں اور کس کے خلاف جنگ کی جائے۔ اگر ہم ابتدا صیہونیت سے کریں تو ہم دیکھیں گے کہ توریت کے دس احکام میں یہ بات شامل ہے کہ ''تو قتل نہیں کرے گا۔'' ظاہر ہے یہ حکم غیر مسلح افراد کے خلاف ہر قسم کے تشدد کی ممانعت کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اشعیاء نبی نے اسرائیلیوں کو متنبہ کیا تھا کہ ''تمہارے گناہوں کے باعث تمہارے اپنے آدمیوں کے درمیان جنگ برپا ہوجائے گی اور تمہارے سارے قلعے زمیں بوس ہوجائیں گے...... مائیں اپنے بچوں کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں گی۔'' لیکن وہی توریت مالکِ کل (خدا) کو ایک ''مردِ جنگ'' کے طور پر پیش کرتی ہے جو اسرائیلیوں کو حکم دیتا ہے کہ تم ''جاؤ اور عمالقہ پر حملہ کردو، ان کو اور ان کی تمام املاک کو تباہ و برباد کردو۔ کسی کو بھی نہ چھوڑو۔'' ''سب کو قتل کردو، مردوں کو بھی، عورتوں کو بھی اور بچوں کو بھی، شیر خواروں کو بھی۔ بھیڑ بیلوں کو بھی اور اونٹوں، گدھوں کو بھی۔'' ایک لحاظ سے یہ حکم دہشت گردی کے زمرے میں نہیں آتا کیوں کہ اس کا مقصد سیاسی نہیں ہے۔ تاہم عمالقہ کو مثال بنا کر اسرائیل کے دشمنوں کو سبق سکھانے کے وسیع سیاق وسباق میں یہ حکم بھی دہشت گردی کے تمام معیارات کو پورا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر تمام عبرانیوں (بنی اسرائیل) کی پہلی اولاد کو قتل کرنے کی مصری پالیسی پر اور اسی طرح مصر سے بنی اسرائیل کے خروج سے پہلے دسویں طاعون کی صورت میں مصریوں کے ساتھ خدا کے سلوک پر غور کریں تو دہشت گردی کی موجودہ تعریف پر یہ دونوں پورے اتریں گے کیوں کہ ان میں سیاسی مقاصد کی خاطر...... یعنی دونوں طرف رویّوں اور حکمت عملیوں کو تبدیل کرنے ...... بے گناہ غیر مسلح افراد کا قتل شامل تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ اپنی تعریف کے لحاظ سے خدا کسی برے کام میں شامل نہیں ہوسکتا لیکن اس کے باوجود جب ایوبؑ نے خدا سے سوال کیا تو اس نے براہ راست جواب نہیں دیا بلکہ یہ کہا ''تم اس وقت کہاں تھے جب میں زمین کی بنیاد رکھ رہا تھا؟ بتاؤ، اگر تم سمجھتے ہو۔ کیا تم میرے انصاف کو رسوا کرو گے؟ کیا تم اپنی بات کا جواز مہیّا کرنے کے لیے میری مذمت کرو گے؟'' خود پیغمبران بھی خدا کے تصور میں پیدا کی جانے والی دنیا میں برائی اور بے قصور مصیبتوں کے بارے میں سوالوں

کے جواب نہ دے سکے۔

اگر ہم عیسائیت کا مطالعہ کریں تو امن سازوں کے لیے یسوع مسیحؑ کی برکت والی اور ایک گال کے جواب میں دوسرا گال پیش کرنے کے حکم نے آج تک امن پسند تحریکوں کو بہت متاثر کیا۔ ''آنکھ کے بدلے آنکھ'' کی جگہ یسوع مسیحؑ نے کہا ''اپنے دشمنوں سے محبت کرو اور جو تم پر ظلم کریں ان کے لیے دعا گو ہو۔'' تاہم انھوں نے روم کے سپاہیوں کو یہ حکم نہیں دیا کہ وہ اپنا پیشہ ترک کر دیں حالاں کہ ان کے پیشے میں عام طور سے دہشت گردی یقیناً شامل تھی، جب کہ رومیوں کے درمیان پال نے یہ نعرہ لگایا کہ ''وہ تلوار بلاوجہ نہیں اٹھاتا کیوں کہ وہ خدا کا وزیر ہے۔ وہ ایک منتقم ہے۔ ان لوگوں کو سزائے موت دینے کے لیے جو گناہ کے کام کرتے ہیں۔''

جوں جوں عیسائی دینیات آگسٹائن اور اکوناس کے ساتھ ترقی کرتی گئی، ''منصفانہ جنگ'' کے نظریے نے بھی جنگ کے قوانین اور حدود کی وضاحت کر دی اور اب ویٹیکن کی پاپائیت انھیں قانون اور حدود کو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اپنے تعاون کے اظہار کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ آگسٹائن نے کہا ''ہم امن اس لیے تلاش نہیں کرتے کہ ہم برسرِ جنگ ہوں بلکہ ہم جنگ کرتے ہیں تا کہ ہمیں امن ملے لہٰذا حالتِ جنگ میں پُرامن رہو تا کہ تم ان لوگوں کو نیست و نابود کر دو جن کے خلاف تم جنگ کرتے ہو اور انھیں امن کی برکتوں کی طرف لا سکو۔''

کسی قسم کی بربریت کا جواز پیش کرنے کے لیے اس نوعیت کی خود آگاہی کو آسانی کے ساتھ مسخ کر دیا جاتا ہے حتیٰ کہ منصفانہ جنگ کے نظریئے نے آگسٹائن کے الفاظ میں ''نجی افراد'' (جیسے اسامہ بن لادن) کو لوگوں کو مجتمع کرنے سے روکا۔ اس کے باوجود آگسٹائن ہی کے الفاظ میں منصفانہ جنگ کی اس تعریف سے کہ ''یہ برائیوں کا بدلہ اس وقت لیتی ہے جب کسی قوم یا حکومت کو سزا دینا مقصود ہو کیوں کہ اس کے عوام کی غلطیوں کی اطلاع کرنے سے یا جو کچھ اس نے غیر منصفانہ طور پر غصب کر رکھا ہے اسے واپس کرنے سے انکار'' سے وہ جواز ظاہر ہوتا ہے جو دہشت گردوں نے ہر جگہ اپنی شدید کارروائیوں کے لیے پیش کیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ایک منصفانہ جنگ کے لیے عام طور سے قابلِ قبول معاصر معیار...... یعنی ''صحیح اجازت'' کے ''ایک منصفانہ معاملے'' کے لیے نہ کہ ذاتی مفاد اور توسیع پسندی کی خاطر، جنگ کرنا، یہ تمام وہ معیارات ہیں جن کا دعویٰ دہشت گرد کرتے ہیں اور'' اور انصاف پسند حکومتیں بھی۔ آخری بات یہ کہ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ صلیبی جنگوں اور عدالتی احتساب دونوں کی اجازت براہ راست کلیسا سے ملی تھی۔

اور جب ہم اسلام کی طرف آتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ جہاد کا تصور گزشتہ چند دہائیوں میں مسلمانوں کی دہشت گردی کی کارروائیوں کو دینی جواز دینے کے لیے استعمال کیا گیا ہے حالاں کہ روایتی طور پر اس کے معنی ہیں کسی انفرادی مسلمان مرد یا عورت کی اپنی فاسقانہ رجحانات کے خلاف روحانی اور اخلاقی جدو جہد۔ اس سے کم تر جہاد یعنی دوسرے انسانوں کے خلاف جنگ کو مسلمانوں کی دینی کتابوں میں ایک ''مدافعانہ جنگ'' کہا گیا ہے جس کی حدود مقرر ہیں جنھیں اس وقت بھی توڑا نہیں جاسکتا جب ''تم ایسے لوگوں کے خلاف لڑ رہے ہو جو تمہیں اس امر پر مجبور کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ تم دوسرا مذہب قبول کر لو یا اپنے گھر سے نکل جاؤ۔'' درحقیت ایران کے قدیم الخیال آیت اللہ خمینیؒ نے صرف دہشت گردی کے خلاف جنگ کو ایک ''مقدس جنگ'' یعنی جہاد کہا تھا۔

چناں چہ اگر قرآن پاک میں متعدد آیتیں ایسی موجود ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے خلاف بھی امن کی بات کرتی ہیں تو دوسری طرف ایسی آیتیں بھی موجود ہیں جو جنگ اور تشدد کی تائید کرتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن پاک کی سورۃ ۸، آیت ۱۲ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''میں ابھی ان کافروں کے دلوں میں رعب ڈالے دیتا ہوں پس تم ان کی گردنوں پر ضرب اور جوڑ جوڑ پر چوٹ لگاؤ۔'' مزید برآں اگر قرآن پاک نے ایک طرف خودکشی کو منع کیا ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلح افراد اور عورتوں اور بچوں کے قتل کو اور جائیدادیں تباہ کرنے کو حتیٰ کہ کنوؤں میں زہر ڈالنے کو (جسے کیمیائی جنگوں کی ابتدائی شکل کہا جاسکتا ہے) واضح طور پر منع کیا ہے تو دوسری طرف ایسی احادیث بھی ہیں جو جہاد کو سب سے بلند مذہبی فریضہ قرار دیتی ہیں، حج سے بھی بلند جو اسلامی عقیدے کے پانچ ارکان میں سے ایک ہے۔ اگر چہ یہ بات ہمیشہ تو واضح نہیں ہوتی کہ کس جہاد کی بات کی جارہی ہے لیکن اس حقیقت سے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ بات منقول ہے کہ مال غنیمت ''جہاد فی سبیل اللہ'' کا انعام ہوگا اور یہ کہ عورتیں جہاد کے بجائے حج کریں، یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ کم از کم بعض اوقات جہاد کا فوجی مفہوم ہی لینا مقصود ہے۔

آخری بات یہ کہ دہشت گردی، یا عام طور پر جنگ، کی مذہبی بنیاد ایک نزاعی بات معلوم ہوگی کیوں کہ مذہب کو بہت دنوں تک سیاست یا جنگ وجدل کے جواز کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود جن دہشت گردوں نے نیویارک کے عالمی تجارتی مرکز اور واشنگٹن کے پنٹاگن پر حملے کیے انھیں خود کو اچھا مسلمان سمجھنے میں یہ صورت حال مزاحم نہیں ہوتی اور نہ ان یہودیوں نے

جنھوں نے فلسطینیوں کو بے گھر کیا اور نہ ان سربوں نے جنھوں نے بوسنیا میں مسلمانوں کو قتل کیا خود کو اچھا یہودی یا عیسائی سمجھنا چھوڑا۔ ان لوگوں سے ان کے مذہب کی ''صحیح'' حقیقت پر بحث کرنا محض تضیع اوقات ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ لوگ ''اچھے'' عیسائی، مسلمان یا یہودی ہوں لیکن قطعی بات یہ ہے کہ وہ لوگ انسان برے ہیں۔

۶۔ دہشت گردی کی اکثر مشترک سرگرمیاں کیا ہیں؟

۱۹۶۸ء سے جب سے امریکی حکومت نے اس قسم کے اعداد و شمار رکھنے شروع کیے، دنیا بھر میں دہشت گردی کی سات ہزار سے زیادہ بمباری کی وارداتیں ہو چکی ہے۔ امریکی محکمہ خارجہ نے تیس ''نامزد بیرونی دہشت گرد تنظیموں'' کی اور چودہ ''دوسری دہشت گرد تنظیموں'' کی فہرست بنا رکھی ہے۔ مکمل فہرست کے لیے دیکھیے رپورٹ۔

امریکہ محکمۂ خارجہ کے مطابق ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۹ء تک کے عرصے میں دہشت گردی کی کارروائیاں فی سال ۳۰۰ سے ۵۰۰ تک رہی ہیں۔ یہ بات تعجب خیز ہے کہ دہشت گردی کی تمام کارروائیوں کا دو تہائی حصہ تجارتی اداروں کے خلاف رہا ہے اور یہ تعداد سفارت کار، فوجی یا سرکاری ملازم یا جائیداد سے پانچ گناہ زیادہ رہی ہے۔ مزید برآں، اگرچہ ذرائع ابلاغ پر دہشت گردی کی خبروں میں غلبہ مشرقِ وسطیٰ کا رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۹۹ء میں لاطینی امریکہ اور روس کے بعد سب سے زیادہ حملے مغربی یورپ نے برداشت کیے ہیں (مجموعی طور پر ۱۶۹/۲ میں بالترتیب ۹۶ اور ۳۰) اور ان میں سب سے زیادہ مقبول طریقہ بمباری کا رہا ہے۔ اس کے بعد آتش گیر بمباری اغوا، آتش زنی اور ہائی جیکنگ کا نمبر آتا ہے۔

بہر حال امریکی محکمۂ خارجہ کے اعداد و شمار گمراہ کن ہیں کیوں کہ کسی حادثے کو بین الاقوامی دہشت گردی کے زمرے میں صرف اس وقت شامل کیا جاتا ہے جب اس میں ایک سے زیادہ ملکوں کے شہری یا علاقے شریک ہوں۔ اسی طرح ملکوں کے اندر کوئی ایسی دہشت گردی جس سے غیر ملکی شہریوں کو نقصان نہ پہنچے شمار میں نہیں لائی جاتی۔ اس سے زیادہ حساب ''پنکرٹن کا خطرات کا سالانہ تحفظاتی جائزہ'' سے ملتا ہے جس نے گزشتہ دہائی میں اوسطاً تقریباً ۵۰۰۰ حادثات فی سال دکھائے ہیں جن میں دہشت گردی کسی ایک ملک تک محدود تھی۔ تاہم اس جائزے میں بھی ان کارروائیوں کو حساب میں نہیں رکھا جاتا جو حکومتیں خود کرتی ہیں۔ یہ تو صحیح ہے کہ سب سے زیادہ توجہ ہائی جیکنگ اور خودکش بم کو ملتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دہشت زدگی کی سب سے عام

کارروائی وہ اذیت ہے جو حکومتیں خود اپنے شہریوں کو پہنچاتی ہیں جیسا کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے رپورٹ دی ہے کہ اذیت رسانی اور ماورائے قانون قتل کے لاکھوں واقعات ہر سال ہوتے ہیں (اور ایمنسٹی نے یہ شکایت بھی کی ہے کہ ان واقعات میں سے اکثر کے لیے امریکا الزام میں شامل ہے)۔

۷۔ دہشت گردی کے بہت معروف واقعات کون سے ہیں؟

دہشت گردی کی اب تک کی کارروائیوں میں سب سے مشہور کارروائی ۱۱ر ستمبر کے حملوں کی ہوسکتی ہے اور ان کا تعلق ان حملوں سے جوڑا جاتا ہے جو افریقا میں امریکی سفارت خانوں اور یمن میں امریکی مفادات پر بظاہر بن لادن نے کرائے تھے، تاہم موجودہ زمانے میں انفرادی سیاسی رہنماؤں پر حملے دہشت گردی کے سب سے مشہور واقعات تھے۔ بیسویں صدی کا پورا زمانہ آج ہی کی طرح دہشت گردی کے واقعات سے بھرا ہوا تھا جیسا کہ انارکسٹوں کے ہاتھوں فرانس اور اسپین کے وزرائے اعظم (سادی کارنوٹ اور انٹونیو کینوورس) آسٹریا کی ملکہ الزبتھ اور اٹلی کے شاہ امبرتو اول کے قتل اور ۲۸ جون ۱۹۱۴ء کو آرچ ڈیوک فرڈینڈ کے اس قتل سے ظاہر ہوتا ہے جس نے پہلی عالمی جنگ کا شعلہ بھڑکایا۔ امریکا میں انارکسٹوں کے ڈاک بموں نے ۱۹۲۰ء میں پامر حملوں کی ابتدا کی جو امریکی تاریخ میں امریکی حکومت کی جانب سے شہری آزادیوں کی بدترین خلاف ورزیاں تھیں۔

بعد از جنگ کے زمانے میں دہشت گردی کے واقعات میں ۱۹۷۲ء میں میونخ اولمپک کا قتل عام، ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کے پورے عشروں میں ہوائی جہازوں کی ہائی جیکنگ اور ہوائی اڈوں پر گولیاں چلنے کے واقعات، ۱۹۹۳ء میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ، اوکلا ہوماسٹی میں وفاقی حکومت کی عمارت پر بمباری اور ''ٹیڈ کا زنسکی'' نامی اکلوتے بمبار کے قاتلانہ حملے شامل تھے۔ آخری تین واقعات نے امریکی سرزمین پر ایک بڑے پیمانے پر دہشت گردی کی بطور ایک مستقل حقیقت ابتدا کی نشان دہی کردی۔

آخر میں ۱۹۹۵ء میں ٹوکیو کی زیر زمین ٹرین پر آم شن رک یو کے حملے نے دہشت گردی کے ایک نئے دور کا آغاز کیا جس میں ۱۱ر ستمبر کے حملوں کو ایک تاج کی حیثیت حاصل ہے۔ تاہم جب ہم اعلیٰ فنی مسائل اور ان کے ردّعمل پر توجہ مرکوز کرتے ہیں تو ان حملوں میں ہمیں جاں نثار جنگجو افراد کے ساتھ ساتھ دہشت انگیزی کی نئی نئی ترکیبیں نظر آتی ہیں اور اکثر صورتوں میں یہ جنگجو

تعلیم یافتہ افراد تھے۔ جنھوں نے بلا لحاظ اور انتہائی تشدد کا مظاہرہ نسبتاً ابتدائی طریقوں سے کیا۔

۸۔ کیا دہشت گردی اپنا کام پورا کر دیتی ہے؟
اگر ہاں، تو اسے کیسے روکا جاسکتا ہے؟

آئی آر اے، پی ایل او اور دوسرے فلسطینی گروہ، سکھ، تامل، باسک، فلی پینو مسلمان...... ان میں سے کسی کی دہشت گردی بھی اپنی متعلقہ حکومتوں کی پالیسیاں تبدیل نہ کرا سکی اور نہ بد معاش حکومتوں کی دہشت گردیوں سے کسی دشمن کو شکست ہوئی۔ بہر حال یہ بات صحیح ہے کہ اگر اپنی کارروائیوں سے دہشت گردوں کا مقصد امن اور مصالحت کی کارروائیوں کو روکنا تھا تو پھر یہ دہشت گردیاں کامیاب رہی ہیں۔ اس لیے کسی دہشت گردی کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کرنا ایک غیر متعین اور پیچیدہ عمل ہے۔ غالباً اس لیے یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ کسی تصادم میں مضبوط فریق ہی دہشت کے ذریعہ اپنے کم سے کم جانی نقصان کے ساتھ زیادہ تیزی سے کامیابی حاصل کرسکتا ہے (ناگاساکی اور ہیروشیما پر بمباری یا ۱۹۴۸ء میں فلسطین کے قتل عام کی حکمت عملی اس کی مثالیں ہیں) تاہم اگر دہشت گردی کے مرتکبین کا کوئی گروہ اپنے واحد مقصد (جیسے شمالی آئر لینڈ اور فلسطین کو آزاد کرنا) سے آگے بڑھ جاتا ہے اور عالمی بنیاد پر جنگ شروع کرنے کے لیے اسامہ بن لادن کی طرح روحانی طور پر زیادہ پُر امید ہو جاتا ہے تو کامیابی کے تعین کا معیار بدل جاتا ہے کیوں کہ اس صورت میں ہر طرف سے بدترین امکانات وہی ہوں گے جن کی توقع کی جاسکتی ہے۔

ایسی صورت حال میں یہ بات مغرب کے تمام شہریوں اور رہنماؤں اور مسلم دنیا میں ان کے اتحادیوں کے لیے — بلکہ درحقیقت پوری دنیا میں تمام لوگوں کے لیے — اہم ہو جاتی ہے کہ وہ دہشت گردوں کی ایک نئی نسل کے پیدا کرنے میں اپنی پالیسیوں کے کردار کو سمجھیں۔ بہر حال نئی دہشت گردی سے پیدا ہونے والے تشدد کا خوف انسان کی دروں بینی کو ممکن بنا دیتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ممکن ہے کہ اسامہ بن لادن اور پوری دنیا میں پھیلے ہوئے اس کے ساتھی اس قسم کی بربادی سے اپنا مقصد حاصل کرلیں۔

۹۔ کیا تشدد دہشت گردی کو روک دیتا ہے؟

ہمیں صرف یہ کرنا ہوگا کہ اسرائیلی فلسطینی تقسیم کے دونوں رخ پر یہ سمجھنے کے لیے نظر ڈالیں کہ کسی حکومت یا مقبوضہ آبادی کی دہشت گردی سمیت کوئی تشدد، مزید تشدد کو اس وقت تک نہیں روک سکتا جب تک اسے متحرک کرنے والی شکایت دور نہ کردی جائے۔

اس سلسلے میں آج سے پندرہ سال پہلے کا نز کروز اور برائن نے متنبہ کیا تھا کہ ”آزاد یا سرمایہ دار دنیا دہشت گردوں کی بھرتی اور ان کی سرگرمیوں کے لیے بڑی سازگار فضا مہیا کرتی ہے۔“ ایسا کیوں ہے؟ ایسا اس لیے ہے کہ جس لحاظ سے لوگوں میں اس بات کا احساس بڑھتا جاتا ہے کہ صرف چند لوگوں کے لیے زندگی کتنی عمدہ اور بہتر ہے اس لحاظ سے مایوس اور محروم افراد کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ دس سال بعد بل کلنٹن نے نئے انتخاب میں اپنی کامیابی کے لیے ”دہشت گردی کے خلاف اعلان جنگ“ کو بطور ایک ہتھیار اس طرح استعمال کیا جس طرح ان کی عالمگیریت والی نوآزاد مثال نے بین الاقوامی پالیسی سازی میں غیر متوازی طاقت حاصل کر لی تھی۔ لہٰذا اس بات پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ ”خلائی جنگوں“ کے فنڈ کی مہم کو آگے بڑھانے میں امریکی خلائی کمان والے ”۲۰۲۰ء کی پیش بینی“ کے پمفلٹ میں یہ کہا گیا ہے کہ ”عالمی معیشت کی عالمگیریت“ مراعات یافتہ اور غیر مراعات یافتہ طبقات کے درمیان خلیج کو وسیع تر کر دے گی لہٰذا امریکی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ امریکا کو بقیہ دنیا سے محفوظ رکھنے کے لیے ”فوجی کارروائیوں کے خلائی حدود پر تسلّط قائم رکھے۔“

عالمی بنیاد پر کیے جانے والے ایک محتاط جائزے کے مطابق جب یہ بات سامنے آئی کہ آدھی انسانی آبادی دو ڈالر روز سے بھی کم پر گزارہ کرتی ہے تو پھر سی آئی اے یا دوسری فوجی ایجنسیوں سے یہ کہنے کا غالباً کوئی فائدہ نہیں ہوگا کہ وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کریں کیوں کہ ایسی پالیسیوں کے نتائج جو مختلف ملکوں کے درمیان یا کسی ایک ملک کے اندر امیر اور غریب کے درمیان فرق کو وسیع تر کر دیں کم از کم اتنے خراب ضرور ہوں گے جتنا خراب وہ جوابی مُکا تھا جس کے ذریعہ ۱۹۵۳ء میں سی آئی اے نے مصدق حکومت کا تختہ الٹ کر شاہ ایران کو دوبارہ تخت نشین کر دیا تھا۔

عملی سطح پر بھی سی آئی اے کے ایک سابق افسر اوئی مارک گیریش نے ۱۱رستمبر والے حملوں سے چند ہی مہینے پہلے لکھا تھا کہ یہ بات ناممکن ثابت ہوگئی ہے کہ بہترین تربیت یافتہ مسلمانوں کو بھی ان مضبوط ڈھانچوں میں فعّال کیا جا سکتا ہے جو دہشت گردی کی موجودہ تنظیموں کی تشکیل کرتے ہیں۔ جہاں تک امریکا کی تکنیکی برتری کا تعلق ہے، صدر کلنٹن نے بن لادن کے تعاقب میں درجنوں کروز میزائل بھیجے لیکن کوئی بھی اپنے ہدف تک نہ پہنچ سکا۔

ایک وسیع تر تناظر میں دیکھیے تو ہتھیاروں کی روز افزوں عالمی تجارت نے جو ہر سطح پر تشدد کو تیز کرتی ہے ایسے لوگوں کی شکایتوں میں اضافہ کر دیا ہے جنھیں تشدد کے خلاف شکایت ہے، تاہم

ہمارے (امریکا) فوجی صنعتی نظام کی بنیاد بڑے پیمانے پر اسلحے کی تجارت پر قائم ہے جو ہمارے دفاعی بجٹ میں رقم فراہم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ آخری بات یہ کہ بقیہ دنیا کے بڑے حصے کو خصوصاً جنوبی دنیا کو امریکا کے خلاف اس کے "ثقافتی حملوں" کی وجہ سے اتنی ہی شکایت ہے جتنی اس کی معاشی اور خارجہ پالیسیوں کی وجہ سے ہے اور دہشت گردی کے خلاف جنگ میں بڑے پیمانے پر تشدد کی یک طرفہ کارروائیاں اس نفرت میں اضافہ کردیں گی۔

۱۰۔ دہشت گردی پر ہماری موجودہ پالیسیوں کے متبادلات کیا ہیں؟

دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ کے دوادوار ہیں۔ پہلا دور ۱۱رستمبر سے پہلے تک جو "دفاعی انداز کا دور تھا (جسے ضد دہشت گردی بھی کہتے ہیں)۔ اس دور نے ہوائی اڈوں پر بڑھتے ہوئے حفاظتی اقدامات اور خفیہ ایجنسیوں کے مابین تعاون کے ذریعہ دہشت گردی کے خلاف تحفظ مہیا کیا۔ دوسرا دور ۱۱رستمبر کے حملے کے ساتھ ہی شروع ہوا۔ اس دور میں امریکا نے اپنی پالیسی کو سرکاری طور پر ایک زیادہ "جارحانہ انداز" میں تبدیل کردیا (جسے جوابی دہشت گردی کہتے ہیں)۔ اس طریق کار میں توجہ" تشدد کے ذرائع پر یعنی خود دہشت گردوں پر اور ان لوگوں پر مرکوز رہتی ہے جو انھیں پناہ مہیا کرتے ہیں۔ ۱۔ دہشت گردی کے خلاف جدو جہد کا قانون ۲۔ انسداد دہشت گردی کا قانون اور ۳۔ عوامی تحفظ اور سائبر کے تحفظ میں اضافے کے قانون سمیت دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے متعدد مودات قانون تجویز کیے گئے ہیں تاہم ان تمام قوانین کے متعلق آزادی پسند لوگوں کا خیال ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگی کارروائیوں کی ضرورت ہے یہ ان سے بہت آگے تک جاتے ہیں۔

بہر حال بین الاقوامی قانون کے لحاظ سے اس قسم کے حالات سے نمٹنے کے لیے ایک واضح طریق کار موجود ہے یعنی اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل کے ذریعہ کارروائی کیوں کہ بین الاقوامی قانون کے تحت یہ واحد ادارہ ہے جو کسی فوجی کارروائی کی اجازت حتیٰ کہ بین الاقوامی سطح پر گرفتاری کے پروانے کا اختیار بھی دے سکتا ہے۔ مزید برآں دہشت گردی کے خلاف تو ایسے بین الاقوامی کثیر الجہتی معاہدے موجود ہیں جنھیں یک طرفہ جنگ کی بجائے بین الاقوامی قانون کے ذریعہ دہشت گردی کے خلاف قانونی جنگ کی بنیاد بنانے کے لیے امریکا استعمال کرسکتا ہے۔

اس طرح ہیگ میں ایک بین الاقوامی فوجداری عدالت بھی موجود ہے جسے اس طریق کار میں داخل ہونے کے لیے اخلاقی اور قانونی جواز حاصل ہے خواہ جن پر دہشت گردی میں مشغول

ہونے یا اس کی پشت پناہی کرنے کا الزام لگایا گیا ہو وہ کوئی حکومتی کردار ہو یا غیر حکومتی۔ یہ صورت حال دہشت گردی کے خلاف کارروائی کرنے میں امریکی حکومت کے دائرہ عمل پر قدغن لگاتی ہے لیکن اقوام متحدہ کا مقصد بھی بلا کم وکاست یہی ہے یعنی بین الاقوامی امن اور تحفظ کے حصول کے لیے رُکن ملکوں کی جانب سے کیے جانے والے تشدّد کے استعمال پر پابندی۔

آخری تجزیے کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ دہشت گردی کے چکر کو اور اسے تقویت بہم پہنچانے والے ناقابل قیاس تشدد کو ختم کرنے کے لیے عالمی نظام پر ایک ایسے معقول نظر ثانی کی ضرورت ہے جو اپنے ارکان کی نصف تعداد کو انتہائی قابل نفرت غربت میں زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے بلکہ زمین کے اس بیشتر حصے کو برباد کردیتا ہے جو اسے سہارا مہیا کرتے ہیں۔ آج ہم سب استعمار پسند اور استعمار کا شکار، استحصال پسند اور استحصال کا شکار، دونوں ہی گروہ کے لوگ عدل وانصاف کے سامنے حاضر ہیں جیسا کہ فلسفی سلیووج ژزک نے ۱۱ ستمبر کے حوالے سے لکھا تھا کہ ''اس امر کو یقینی بنانے کے لیے کہ وہ سب کچھ یہاں (امریکا میں) دوبارہ نہ ہوگا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے کسی دوسری جگہ ہونے سے روک دیا جائے۔ صرف اسی صورت میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کو کامیابی نصیب ہوگی۔
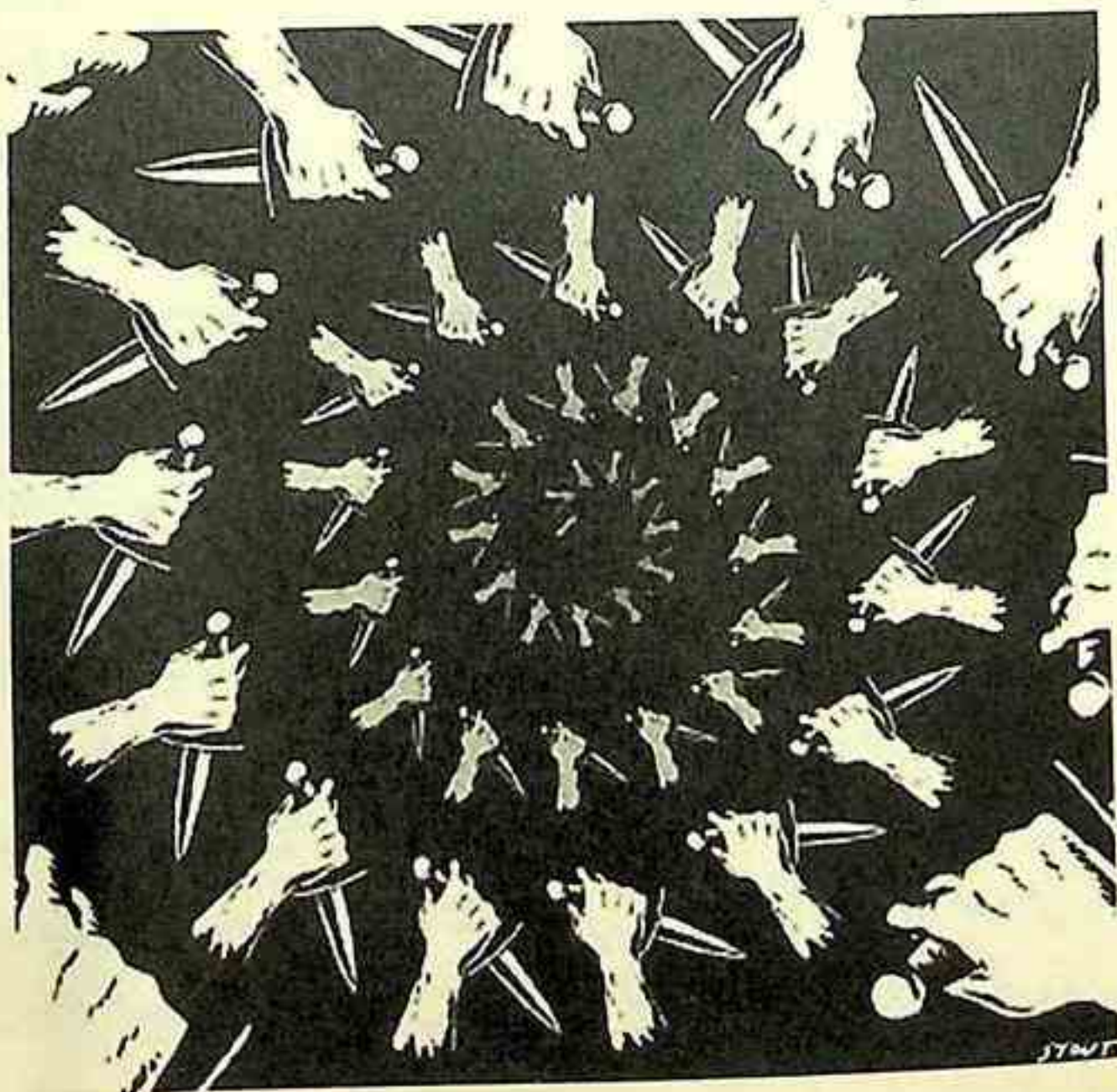
اپنی ناوقت وفات سے چند ماہ قبل اکتوبر۱۹۹۸ء میں نامور ماہر تعلیم اور سیاسی مبصر اقبال احمد نے کولوریڈو یونیورسٹی کے ایک سیمینار میں بین الاقوامی دہشت گردی کے اسباب اور اس سے نمٹنے کے موثر طریقوں کے بارے میں ایک لیکچر دیا، اسے یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

اقبال احمد
ترجمہ: حمرا خلیق

بین الاقوامی دہشت گردی

سن تیس اور چالیس کی دہائیوں میں فلسطین میں زیر زمین کام کرنے والے یہودیوں کو ''دہشت گرد'' کہا جاتا تھا۔ پھر نئی باتیں ہونے لگیں۔ ۱۹۴۲ء کے آتے آتے دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کے دوران خاص طور پر یہودیوں کو جن اذیت ناک مصائب سے دو چار ہونا پڑا ان کے باعث مغربی دنیا میں ان سے ہمدردی کے جذبات ابھرنے لگے اور ۴۵۔۱۹۴۴ء کے آتے آتے فلسطین کے دہشت گرد، جو صیہونی تھے، اچانک دہشت گرد کے بجائے مجاہدین آزادی کہلائے جانے لگے۔ کم از کم دو اسرائیلی وزرائے اعظم، جن میں بیگن بھی شامل ہیں، ان کے بارے میں آپ کو کتابوں میں بھی مل سکتا ہے اور وہ پوسٹرز بھی، جن میں ان کی تصویر کے ساتھ یہ عبارت درج ہے ''دہشت گرد، انعام اتنی رقم۔'' میں نے سب سے بڑی رقم جو نوٹ کی ہے، ۱۰۰۰۰۰ برطانوی پاؤنڈ کی رقم ہے جو دہشت گرد بیگن کے سر کی قیمت تھی۔

پھر ۱۹۶۹ء سے ۱۹۹۰ء تک تنظیم آزادی فلسطین پی ایل او نے دہشت گردی کی مرکزی تنظیم کی حیثیت اختیار کرلی۔

امریکی صحافت کے مردِ دانا نیویورک ٹائمز کے ولیم سیفائر (William Safire) نے یاسر عرفات کو دہشت گردوں کے سردار کا لقب دیا۔ لیکن ابھی ۲۹ ستمبر ۱۹۹۸ء کو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک تصویر میں یاسر عرفات اور صدر بل کلنٹن ایک ساتھ کھڑے ہیں۔ تصویر میں دائیں جانب یاسر عرفات ہیں اور بائیں جانب بنجامن نیتن یاہو ہیں۔ کلنٹن عرفات کی طرف دیکھ رہے

ہیں جو ایک سہمے ہوئے چوہے کی طرح لگ رہے ہیں۔ ابھی کچھ سال پہلے تک یاسر عرفات کے چہرے پر ایک خطرناک تاثر ہوتا تھا اور اس کی پیٹی میں ایک بندوق لٹکی ہوتی تھی۔

۱۹۸۵ء میں صدر ریگن سے چند داڑھی والے لوگ ملنے آئے۔ یہ بہت تند خو نظر آنے والے داڑھی اور پگڑی والے لوگ جو لگتا تھا کسی اور صدی سے آئے ہیں۔ صدر ریگن نے ان سے وہائٹ ہاؤس میں ملاقات کی۔ ان سے ملاقات کرنے کے بعد ریگن نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ اس نے ان لوگوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ امریکا کے بنیاد گزار آباؤ اجداد (founding fathers) کے مساوی اخلاقی درجہ رکھتے ہیں۔ وہ افغان مجاہدین تھے۔ اس وقت ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں وہ چونکہ سوویت یونین کے خلاف جنگ کر رہے تھے جو امریکا کی نظروں میں بدی کا علمبردار تھا۔ اس لیے وہ امریکا کے آباؤ اجداد کے مثیل تھے! اگست ۱۹۹۸ء میں امریکا کے ایک اور صدر نے بحر ہند سے اسامہ بن لادن اور اس کے ساتھیوں پر افغانستان کے کیمپوں میں حملہ کرنے کا حکم دیا۔ یہی لوگ جو چند سال پہلے جارج واشنگٹن اور تھامس جیفرسن کے مساوی درجہ رکھتے تھے! سو وہ اپنے غصّے کا اظہار مختلف طرح سے کر رہے تھے۔ میں تھوڑی دیر میں اس موضوع پر سنجیدگی سے بات کروں گا۔

آپ جانتے ہیں کہ میں نے ان واقعات کی یاددہانی کیوں کرائی ہے۔ اس لیے کہ میرے خیال میں دہشت گردی کا مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے۔ دہشت گرد تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ کل کا دہشت گرد آج کا ہیرو ہے۔ یہ امیجز کی مسلسل بدلتی ہوئی دنیا کا ایک اہم اور سنجیدہ مسئلہ ہے۔ جس میں ہمیں اپنے سر کا زاویہ سیدھا رکھنا چاہیے تاکہ ہم یہ جان سکیں کہ دہشت گردی کیا ہے اور کیا نہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ جانا جائے کہ دہشت گردی کے اسباب کیا ہیں اور اسے کس طرح ختم کرنا چاہیے۔

دوسرا نکتہ دہشت گردی کے بارے میں یہ ہے کہ جس خیال یا تصور میں استقلال نہ ہو اس کی تعریف یعنی تشریح اور وضاحت کرنا بہت مشکل ہے، اگر آپ مستقل مزاجی نہ دکھائیں تو تعریف وضع نہیں کر سکتے۔

میں نے دہشت گردی پر تقریباً بیس سرکاری دستاویزات دیکھی ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی ایک میں بھی لفظ دہشت گردی کی تعریف معنی نظر نہیں آتی۔ وہ اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ اس کی تفصیل بتاتے ہیں اس کے ذریعے ہمارے جذبات ابھارتے ہیں لیکن ہمارے ذہن کو صحیح مطلب

نہیں سمجھاتے۔ میں آپ کو صرف ایک مثال دیتا ہوں۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو جارج شلز نے جو اس وقت امریکا کے وزیر داخلہ (سیکریٹری آف اسٹیٹ) تھے، نیویورک پارک ایونیو کے سنا گوگ میں دہشت گردی پر ایک طویل تقریر کی۔ یہ تقریر سات صفحات پر مشتمل تھی لیکن اس میں ایک جگہ بھی لفظ دہشت گردی کی وضاحت نہیں کی گئی تھی۔ ہم جو کچھ اس سے سمجھ سکے وہ یہ تھا:

تعریف نمبرا: ''جدید وحشیانہ پن کو ہم دہشت گردی کہتے ہیں۔''

تعریف نمبر ۲: ''دہشت گردی دراصل سیاسی تشدد کی ایک شکل ہے۔''

تعریف نمبر ۳: ''دہشت گردی مغربی تہذیب کے لیے ایک دھمکی کا نام ہے۔''

تعریف نمبر ۴: ''دہشت گردی مغربی اخلاقی اقدار کے لیے ایک خطرہ ہے۔''

آپ نے غور کیا کہ ان سب وضاحتوں سے صرف ہمارے جذبات کو ابھارا جاتا ہے۔

یہ لوگ دہشت گردی کی تعریف بیان نہیں کرتے اس لیے کہ تعریف بیان کرنے کا مطلب ہے تجزیے، گرفت یا کسی قسم کی مستقل مزاجی سے وابستگی۔ یہ دہشت گردی سرکاری مواد کی دوسری خصوصیت ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ تعریف کے فقدان کے باوجود سرکاری حکّام عالم گیر معیار کی گفتگو سے باز نہیں آتے۔ ''ہم دہشت گردی کی وضاحت نہیں کر سکتے لیکن یہ مغربی اقدار کے لیے خطرہ ہے۔ یہ انسانیت کے لیے بھی خطرہ ہے۔ یہ اچھے نظام کے لیے خطرہ ہے لہذا ہمیں اسے تمام دنیا سے ختم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ہماری پہنچ عالمگیر ہونا چاہیے۔ جارج شلز نے مزید کہا کہ ہماری اہلیت کے بارے میں شک کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہم جب بھی ضرورت پڑے دہشت گردی کے خلاف طاقت استعمال کر سکتے ہیں۔ کوئی جغرافیائی قدر نہیں ہے۔ میزائل سے ایک ہی وقت میں سوڈان اور افغانستان دونوں پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ دونوں ممالک ایک دوسرے سے ۲۳۰۰ میل کے فاصلے پر ہیں اور ان دونوں پر ایک ایسے ملک سے بیک وقت میزائل پھینکے گئے جو تقریباً ۸۰۰۰ میل دور تھا۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ طاقت صرف عالمگیر نہیں ہوتی بلکہ ہمہ گیر ہوتی ہے۔ ہمیں پتہ ہوتا ہے کہ کہاں حملہ کریں۔ ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کے ذرائع ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس معلومات حاصل کرنے کے آلات بھی ہیں۔ ہم سب کچھ جانتے ہیں۔ شلز نے کہا'' ہم آزادی کے لیے

لڑنے والوں اور دہشت گردوں کے درمیان فرق جانتے ہیں۔ ہم چاروں طرف نظر ڈالیں تو بتا سکتے ہیں کہ کون کیا ہے؟''صرف اسامہ بن لادن نہیں جانتا کہ وہ ایک دن دوست تھا اور دوسرے دن دشمن۔ یہ اسامہ کے لیے بڑی الجھن کی بات ہے۔ میں اس قصّے کا آخر میں ذکر کروں گا جو ایک سچی کہانی ہے۔

پانچ۔ سرکاری رویے سے اسباب معلوم نہیں ہوتے۔ آپ یہ نہیں جان سکتے کہ کسی کے دہشت گرد بننے کی کیا وجہ تھی؟ دہشت گرد ہم سے صرف ہمدردی کی توقع کرتے ہیں۔

ایک اور مثال۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۸۵ء کو نیویورک ٹائمز نے ایک خبر دی کہ یوگوسلاویہ کے وزیر داخلہ نے (یہ ان دنوں کی بات ہے جب ایک یوگوسلاویہ ہوا کرتا تھا) امریکا کے وزیر داخلہ سے درخواست کی کہ وہ فلسطین میں دہشت گردی کی وجوہات پر غور کریں نیویورک ٹائمز کے مطابق یوگوسلاویہ کے وزیر داخلہ امریکا آئے ہوئے تھے۔ ان کی اس درخواست پر امریکی وزیر داخلہ کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور ایک گیا۔ انہوں نے میز پر ہاتھ مارا اور مہمان وزیر داخلہ کو بتایا کہ کسی وجہ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم وجوہات پر کیوں غور کریں۔

نمبر چھ: دہشت گردی کے خلاف اخلاقی نظریہ بڑا مختلف ہوتا ہے۔ ہم ان گروہوں کو دہشت گرد گردانتے ہیں جنہیں ہماری سرکار ناپسند کرتی ہے اور ان کی تعریف کرتے ہیں جنہیں ہمارے افسران پسند کرتے ہیں۔ لہٰذا ذرائع ابلاغ پر دہشت گردی کی وہی نظریاتی چھاپ ہوتی ہے۔ یہ نقطۂ نظر دوست حکومتوں کی دہشت گردی سے بھی صرف نظر کرتا ہے جس کی ذاتی طور پر میرے لیے بہت اہمیت ہے۔

اس نقطۂ نظر کے تحت پنوشے چلی کے ڈکٹیٹر کی دہشت گردی کو معاف کر دیا گیا۔ پنوشے نے جن بے شمار لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا ان میں میرا ایک بہت قریبی دوست بھی تھا۔ اس نقطۂ نظر کے تحت ضیاء الحق کی دہشت گردی کو معاف کر دیا گیا جس کے حکم پر لاتعداد افراد قتل کر دیے گئے جن میں بہت سے میرے دوست تھے۔ میں نے حساب لگایا ہے کہ دنیا کی دہشت گرد حکومتوں اور تنظیم آزادی فلسطین پی ایل او اور اس جیسی دوسری تنظیموں کے ہاتھوں جتنے لوگ قتل ہوئے ان کا تناسب علی الترتیب ایک ہزار اور ایک کا ہے۔ یعنی اگر پنوشے اور ضیاء الحق اور دوسری بدمعاش حکومتوں کی دہشت گردی نے ایک ہزار افراد کو موت کے گھاٹ اتارا تو اس کے مقابلے میں آزادی اور انسانی حقوق کی جدوجہد کرنے والوں کے ہاتھوں ایک شخص مارا گیا۔

ہمارے زمانے میں، وہ زمانہ جو کولمبس ڈے سے شروع ہوا، غیر معمولی اور نامعلوم تباہ کاریوں کا زمانہ ہے۔ بڑی بڑی تہذیبیں مٹ گئیں۔ مایا، انکا، آزٹیک، امریکی انڈین، سب صاف کردیے گئے۔ ان کی آوازیں آج تک پوی طرح نہیں سنی گئیں۔ اب یہ آوازیں سنی جانے لگی ہیں، مگر پوری طرح نہیں۔ ہاں، یہ آوازیں تب سنی جاتی ہیں جب غالب قوت کم زور پڑنے لگتی ہے یا مزاحمت قیمت طلب کرنے لگتی ہے۔ جب کوئی کسٹر مار دیا جاتا ہے یا گورڈن محصور ہوجاتا ہے۔ تب ہی آپ کو پتہ چلتا ہے کہ انڈین لڑ رہے تھے، عرب لڑ رہے تھے، مر رہے تھے۔

بدقسمتی سے تاریخ طاقت کو پہچانتی ہے کمزوری کو نہیں۔ لہٰذا تاریخی اعتبار سے غالب گروہوں کی پہچان زیادہ آسان ہے۔

اس حصے کا میرا آخری نکتہ یہ ہے کہ امریکا کی سرد جنگ کی پالیسی نے دہشت گردی کو مسلسل ہوا دی ہے۔ ساموزا، باتستا، یہ سب دہشت گرد امریکا کے دوست رہے ہیں۔ یہ آپ جانتے ہیں اور اس کا سبب بھی جانتے ہیں۔ ہم اور آپ مجرم نہیں ہیں۔

اب اس کا دوسرا پہلو۔ اگر آپ نے اذیت اٹھائی تو اور اذیت اٹھایئے۔ یعنی دوسری جانب بھی کوئی اچھائی نہیں ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں دوسری جانب والوں کی تعریف کررہا ہوں۔ اپنے ذہن میں توازن قائم رکھیں۔ پھر خود سے سوال کریں کہ دہشت گردی کیا ہے؟ میں آپ کا ساتھ دوں گا۔

ہمارا پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ اس منحوس چیز کی تعریف بیان کریں۔ اس کو کوئی نام دیں، کسی قسم کی تعریف بتائیں جو محض یہ نہ ہو ''بنیاد گزار آباؤ اجداد کے اخلاقی مساوی'' یا ''مغربی تہذیب کے لیے اخلاقی خطرہ''۔ میں ویبسٹر کالجیٹ ڈکشنری کا پابند رہوں گا کہ اس مفہوم کے ساتھ ''دہشت ایک گہرا اور مسلط ہوجانے والا خوف ہے۔''

اس آسان سی تعریف میں ایک خوبی ہے وہ یہ کہ یہ انصاف پر مبنی ہے۔ یہ جبر کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس تشدد کو جو غیر قانونی طور پر کیا جاتا ہے۔ ''غیر آئینی جبر و استبداد'' یہ اصطلاح صحیح ہے کیونکہ یہ دہشت گردی کا صحیح رخ دکھاتی ہے، چاہے وہ حکومت کرے یا غیر سرکاری لوگ۔

آپ نے ایک بات پر غور کیا ہے؟ دہشت گردی کے اسباب کو نظر انداز کردیا گیا ہے۔ ہم اس امر پر بات نہیں کرتے کہ دہشت گردی کی وجوہ کیا تھیں اور وہ صحیح تھیں یا غلط۔ اس کے بجائے ہم بات کرتے ہیں اتفاق رائے، توثیق، اقرار کی غیر موجودگی، قانون، قانون کی کمی، آئینی حیثیت،

آئینی حیثیت کی کمی۔ہم نے اس کے اسباب کو کیوں بھلا دیا ہے۔شاید اس لیے کہ اسباب مختلف ہیں اور ان کے مختلف ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے پانچ قسم کی دہشت گردی پر بحث کی ہے۔

۱۔حکومت کی دہشت گردی۔

۲۔ مذہبی دہشت گردی۔ مثلاً کیتھولک پروٹسٹنٹ کو مار رہے ہیں۔ سنی شعیوں کو، شیعہ سنیّوں کو۔ خدا، مذہب، مقدس دہشت گردی آپ چاہیں تو اسے یہ نام دے سکتے ہیں۔ ایک مافیا چل رہا ہے۔

ہر قسم کے جرائم دہشت پھیلاتے ہیں یہ ایک بیماری ہے اور آپ اس بیماری کا شکار ہیں۔ آپ پوری دنیا کی توجہ چاہتے ہیں۔ آپ ایک صدر کو مارنا چاہتے ہیں اور ماریں گے۔آپ خوف پھیلا رہے ہیں۔ آپ ایک بس کو پکڑتے ہیں۔ اسے جلاتے ہیں۔

پانچویں قسم یہ ہے کہ کسی ایک مخصوص گروہ کی سیاسی دہشت گردی۔ مختلف گروہوں کی تنظیمیں دہشت پھیلا رہی ہیں چاہے وہ انڈین ہوں یا ویت نامی، فلسطینی ہوں یا الجیرین۔ بادر مخاف ہوں یا ریڈ بریگیڈ، یہ مخالفین کا پھیلایا ہوا خوف ہے۔

ان پانچ کو ذہن میں رکھیے۔ ایک اور بات یاد رکھیے۔ یہ پانچ ایک دوسرے میں مدغم ہوجاتی ہیں۔ آپ احتجاج دہشت سے شروع کرتے ہیں۔ پھر پاگل ہوجاتے ہیں۔ بیمار ذہن کے مالک ہوجاتے ہیں۔ سرکاری دہشت گردی بھی نجی ہوسکتی ہے۔ حکومت اپنے مخالفین کے قتل کے لیے بعض افراد کو معاوضے پر رکھتی ہے۔

دہشت کی ان پانچ اقسام میں سے، توجہ اس وقت ایک پر ہے۔ جو انسانی جان و مال کے نقصان کے لحاظ سے سب سے کم اہم ہے۔ ان لوگوں کی سیاسی دہشت گردی جو اپنی بات دوسروں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ سب سے زیادہ مہنگی دہشت گردی حکومت کی دہشت گردی ہے۔ اس کے بعد مذہبی دہشت گردی کا نمبر ہے۔ حالاں کہ اگر دیکھا جائے تو بیسویں صدی میں یہ دہشت گردی نسبتاً کم ہوئی ہے۔ اس کے بعد بیماری کی دہشت گردی۔ ایک تحقیق کے مطابق ۵۰ فیصد دہشت گردی کسی سیاسی وجہ کے بغیر کی گئی تھی۔ محض جرائم اور مجرمانہ ذہن۔

تو یہاں توجہ صرف ایک ہی پر ہے، سیاسی دہشت گرد، پی ایل او، اسامہ بن لادن، آپ جس کا بھی نام لے دیں۔ انہوں نے یہ سب کیوں کیا؟ دہشت گرد کس وجہ سے کام کرتے ہیں؟

میں یہ جلدی سے آپ کے سامنے دہرادوں۔ سب سے پہلے، اپنی آواز پہچاننے کی ضرورت ہے۔ تصور کیجیے کہ ہم ایک اقلیتی گروہ کی بات کررہے ہیں، سیاسی، نجی دہشت گرد۔ ان کو ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگ ان کی بات سنیں۔ لوگ سن نہیں رہے ہیں۔ اقلیت عمل کرتی ہے، اکثریت داد دیتی ہیں۔

پانچ قسم کی دہشت گردیوں میں سے یہاں ہم صرف ایک پر بات کریں گے یعنی جو انسانی زندگیوں اور انسانی ملکیت کو کم سے کم نقصان پہنچائے۔ اُن لوگوں کی دہشت گردی جو خود کو نظروں میں لانا چاہتے ہیں۔ مملکت یا حکومت کی دہشت کی سب سے زیادہ قیمت ہوتی ہے۔ دوسرا نمبر مذہبی دہشت گردی کا ہے۔ حالانکہ بیسویں صدی میں مذہبی دہشت گردی مقابلتاً کم ہوگئی تھی۔

ہمارے دور کے فلسطینی دہشت گرد، جو سب سے بڑے دہشت گرد کہلاتے تھے، ۱۹۴۸ء میں ان کو وطن سے محروم کردیا گیا۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۸ء تک وہ دنیا کی ہر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتے رہے۔ انہوں نے ہر ملک کے در پر دستک دی لیکن انہیں بتایا گیا کہ ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور عرب ریڈیو کے ذریعے انہیں چلے جانے کا حکم دیا گیا۔ کوئی شخص سچائی سننے کو تیار نہیں تھا۔ آخرکار انہوں نے دہشت گردی کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا۔ وہ ان کا اپنا ایجاد کردہ تھا۔ اور وہ تھا جہازوں کو اغوا کرنا۔

۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۵ء کے درمیان انہوں نے دنیا کو ششدر کردیا۔ سب کو ہلا کر رکھ دیا کہ ''سنو ہماری بات سنو۔'' ہم نے ان کی بات سنی لیکن آج تک انہیں انصاف نہیں دلا سکے۔ لیکن کم از کم سب سچائی کو جانتے ہیں۔ حتیٰ کہ اسرائیلی بھی اس سچائی کو جانتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں اسرائیلی وزیرِ اعظم گولڈا میئر کی تقریر یاد کیجیے: ''یہاں کسی فلسطینی کا وجود نہیں تھا۔ لیکن اب وہ پیدا ہورہے ہیں۔ ہم اوسلو میں انہیں دھوکہ دے رہے ہیں۔ کم از کم کچھ لوگ تو موجود ہیں جنہیں ہم دھوکہ دے سکتے ہیں۔ ہم انہیں دھوکا دے کر نہیں بھگا سکتے۔ ان کی آواز سننا ضروری ہے۔

ایک محرک یہاں موجود ہے۔ غصے اور بے چارگی کا امتزاج، مارنے اور وار کرنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ آپ غصے میں ہیں، آپ بے یار و مددگار ہیں۔ آپ کفارہ چاہتے ہیں۔ آپ تلافی پر مبنی انصاف چاہتے ہیں۔ طاقت ور جماعت کے تشدد کے تجربے نے تاریخی طور پر مظلوموں کو دہشت گردوں میں تبدیل کردیا ہے۔ مار کھانے والے بچے بڑے ہوکر پرتشدد بالغ اور سزائیں دینے والے والدین بن جاتے ہیں۔ یہی کچھ لوگوں اور قوموں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب ان کو مار پڑتی ہے تو وہ جواب میں ہاتھ اٹھانے لگتے ہیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ ریاستی دہشت گردی، اجتماعی

دہشت گردی کو جنم دیتی ہے۔

آپ کو یہ حقیقت یاد ہے کہ یہودی کبھی دہشت گرد نہیں ہوا کرتے تھے؟ یہودیوں کے بارے میں معلوم تھا کہ ہولوکاسٹ کے دوران اور اس کے فوراً بعد کو چھوڑ کر انہوں نے دہشت گردی کی وارادت نہیں کی۔

تحقیقی مطالعوں سے یہ علم ہوا ہے کہ اسرائیل اور فلسطین میں بدترین دہشت گردوں کی کثیر تعداد یعنی اسٹرن اور ارگوں گروہ، وہ لوگ ہیں جو سامی النسل لوگوں کے مخالف ملکوں سے تھے یعنی یورپ اور جرمنی سے آئے تھے۔ اسی طرح لبنان کے نوجوان شیعہ اور پناہ گزین بستیوں کے فلسطینی وہ لوگ ہیں جن کی پٹائی ہوئی ہے۔ وہ بہت تشدد پر اتر آئے ہیں۔

''گیٹو'' (Ghetto) اندرونی طور پر پُرتشدد ہیں۔ یہ لوگ بیرونی طور پر تشدد کرنے لگے۔ کیونکہ ان کے پاس ظاہری ہدف موجود تھا۔ ایسا دشمن جس کے بارے میں کہہ سکیں کہ ''اس نے، ہاں اسی نے میرے اوپر ظلم کیا ہے'' تب ہی وہ جواباً حملہ کر سکتے ہیں۔

مثالیں بری چیز ہیں۔ مثالیں پھیل جاتی ہیں۔ ٹی ڈبلیو اے کے طیارے کو بیروت میں اغوا کیا گیا تو اس کی بڑی پیمانے پر تشہیر ہوئی۔ اس اغوا کے بعد نو مختلف امریکی ہوائی اڈوں پر اغوا کی کوشش کی گئی۔ اس سے زیادہ بڑا مسئلہ حکومت کی قائم کردہ مثالیں ہیں۔ جب حکومت دہشت پر اتر آتی ہے اور وہ بہت بڑی مثال قائم کرتی ہے۔ جب وہ دہشت کی حمایت کرتی ہے، تب ایک اور طرح کی مثال قائم کرتی ہے۔ مارکسی ہمیشہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ انقلابی دہشت گردی معاشرتی اور نفسیاتی انتخاب پر مبنی ہوتی ہے۔ ''جہاز اغوا نہ کریں۔ یرغمالی نہ بنائیں۔ خدا کے واسطے بچوں کو نہ ماریں۔'' کیا آپ کو بڑے بڑے انقلاب یاد نہیں۔ مثلاً چینی انقلاب۔ ویت نامی، الجیرین، کیوبن، جو کبھی اغوا کرنے یا یرغمالی بنانے کے چکر میں نہیں پڑے۔ انہوں نے تشدد کیا لیکن بہت مختلف۔

میرا آخری سوال یہ ہے کہ یہ حالات عرصہ دراز سے موجود ہیں تو پھر نجی سیاست کی دہشت گردی کی ہلچل کیوں؟ اب یہ اتنی زیادہ اور اتنی نمایاں کیوں؟ اس کا جواب ہے جدید صنعتی ترقی۔ آپ کے پاس ایک وجہ ہے۔ آپ ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے اسے دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔ اگر آپ ایک ہوائی جہاز اغوا کر لیں جس میں ڈیڑھ سو امریکی سوار ہوں تو یہ سب آپ کو گھیر لیں گے۔ سب آپ کی بات سنیں گے۔

آپ کے پاس جدید ہتھیار ہے جس سے آپ ایک میل دور تک مار سکتے ہیں۔ آپ کے

پاس رسل و رسائل کے جدید طریقے ہیں تو وہ آپ تک نہیں پہنچ سکتے۔ جب آپ سبب کے طریقے اور ابلاغ کے ذرائع کو ایک ساتھ رکھ دیں تو سیاست کی بنیاد پڑتی ہے۔ ایک نئی قسم کی سیاست کا امکان سامنے آتا ہے۔

ایک کے بعد ایک ملک کے حکمران اس چیلنج کا ایک روایتی طریقے سے جواب دے رہے ہیں۔ اس کو روایتی انداز میں ختم کرنے کا طریقہ چاہے وہ میزائل کے ذریعے ہو یا کسی دوسرے ذریعے سے۔ لیکن صاف بات یہ ہے کہ ایسا ہوگا نہیں۔ اسرائیلیوں کو اس بہت فخر ہے۔ امریکیوں کو اس پر بہت فخر ہے۔ فرانسیسیوں کو اس پر بہت فخر ہے۔ اب پاکستانی اس پر فخر کرنے لگے ہیں۔ پاکستانی کہتے ہیں کہ ہمارے کمانڈو بہترین ہیں۔ ہمارے زمانے کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ سیاسی دماغ اپنی جڑیں ماضی میں رکھتے ہیں اور جدید زمانہ نئی نئی حقیقتیں سامنے لا رہا ہے۔

لہٰذا امریکا کو نتیجتاً میری چند نصیحتیں ہیں۔

پہلی: دوغلے معیار کی انتہا پسندی ختم کرے۔ اگر آپ دوغلے معیار اختیار کریں گے تو جواب میں آپ کو بھی دوغلے معیاروں سے سابقہ پڑے گا۔ اسے استعمال نہ کریں۔ ایک طرف اسرائیلی دہشت گردی، پاکستانی دہشت گردی، نکاراگون دہشت گردی ایل سلواڈور دہشت گردی کو نظر انداز نہ کریں۔ اور دوسری طرف افغان اور فلسطینی دہشت گردی کی شکایت نہ کریں۔ اس طرح کام نہیں چلے گا۔ متوازن ذہن رکھنے کی کوشش کریں۔ ایک سپر طاقت کو یہ زیب نہیں دیتا کہ ایک طرف وہ دہشت گردی کی تائید کرے اور دوسری طرف تردید۔ اس سکڑتی ہوئی دنیا میں یہ ممکن نہیں ہے۔

اپنے حلیفوں کی دہشت گردی کو معاف نہ کریں۔ ان کی بھی مخالفت کریں اور سزا دیں۔ مخفی نقل و حرکت اور چھوٹے چھوٹے حملوں سے باز رہیں کیونکہ اسی طرح دہشت اور نشہ آور دواؤں کی پرورش ہوتی ہے۔ تشدد اور منشیات یہیں پروان چڑھتی ہیں۔ جہاں بھی مخفی نقل و حرکت شروع ہوئی ہے وہاں منشیات کا مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ یہ علاقے ان منشیات کی تجارت کا مرکز بھی بنے ہیں۔ کیونکہ افغانستان، ویت نام، نکاراگوا اور وسطی امریکا اس کی تجارت کے لیے بہترین علاقے ثابت ہوئے۔

اسباب پر غور کریں اور ان کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ مسائل کو حل کریں۔ فوجی حل پر توجہ نہ دیں۔ فوجی حل کی کوشش نہ کریں۔ دہشت گردی سیاسی مسئلہ ہے۔ ڈپلومیسی سے کام ہوتا ہے۔

اسامہ بن لادن پر پچھلے حملے کی مثال یاد کریں۔ آپ نہیں جانتے کہ آپ کس پر حملہ کر رہے

ہیں؟ آپ قذافی کو مارنے کی کوشش کر رہے تھے مگر اس کی چار سالہ بیٹی کو مار دیا۔ اس معصوم بچی نے تو کچھ نہیں کیا تھا۔ قذافی آج بھی زندہ ہے۔ آپ نے صدام حسین کو مارنے کی کوشش کی تھی آپ نے لیلیٰ بن عطار کو جو ایک مشہور فنکار اور معصوم خاتون تھی مار دیا۔ آپ نے بن لادن اور اس کے ساتھیوں کو مارنے کی کوشش کی لیکن اس کے بجائے پچیس لوگ مارے گئے۔

آپ نے سوڈان میں دوائیں بنانے والے ایک کارخانے کو تباہ کرنے کی کوشش کی۔ اب آپ اعتراف کر رہے ہیں کہ آپ نے دواؤں کا کارخانہ تباہ کر دیا جس کی وجہ سے سوڈان میں تیار ہونے والی دواؤں میں سے پچاس فیصد تباہ ہوگئیں۔

آپ نہیں جانتے مگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ جانتے ہیں۔ خدارا بین الاقوامی قانون بنانے والے اداروں کو مضبوط کریں۔ روم میں ایک فوجداری عدالت تھی تو آپ وہاں کیوں نہیں جاتے۔ وہاں سے اسامہ کا وارنٹ کیوں حاصل نہیں کرتے۔ اگر آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے تو اس کو پکڑنے کی کوشش کریں۔ بین الاقوامی سطح پر یہ یک طرفہ کوشش احمقانہ لگتی ہے اور نسبتاً بہت چھوٹی بھی۔

امریکا کے خلاف ویت نام میں لڑنے والا سپاہی بشکریہ: جنگ کے جرائم

دہشت گردی اپنے جلو میں جو تباہی لاتی ہے، وہ پوری دُنیا دیکھتی ہے۔ تباہی کا نشانہ بننے والوں کا حال احوال ہم دیکھتے ہیں یا پڑھتے ہیں۔ لیکن اس تباہی کے لانے والوں پرکیا گزرتی ہے، ان کے محرّکات کیا ہوتے ہیں اور کن تبدیلیوں سے گزر کر ان کی ذہنی کیفیت یا mind-set کار فرما ہوتی ہے، اس مضمون میں یہی جائزہ لیا گیا ہے۔ خالد سہیل سائیکائٹری کی پریکٹس کرتے ہیں۔ ان کا یہ مضمون کینیڈا میں شائع ہوا اور ان کی اجازت سے ''دنیازاد'' کے لیے ترجمہ کیا گیا ہے۔ خالد سہیل نے شمالی امریکا کی ''پہلی اقوام'' (جنہیں ریڈ انڈین کہا جاتا رہا ہے) کے شعر و ادب کے تراجم کیے ہیں جو ''دنیا زاد'' میں شائع ہوں گے۔

خالد سہیل
ترجمہ: آصف فرخی

دورِ جدید کے دہشت گردوں کی نفسیات

کون لوگ دہشت گرد حملوں میں ملوّث ہو جاتے ہیں؟ کوئی بھلا کس لیے ہزاروں بے گناہ شہریوں کو مار ڈالے گا؟ اس طرح کے لوگوں کی شخصیت اور فکر وفلسفہ کیا ہوتا ہے؟ گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات کے بعد سے دہشت گردی کی کارروائی آج کی دنیا میں ایک نئے عہد میں داخل ہوگئی ہے، جس کے لیے ضروری ہے کہ دنیا میں برپا ئی سیاسی، معاشرتی اور مذہبی تبدیلیوں کی روشنی میں ان کا فوری طور پر جائزہ لیں۔ زیادہ تر لوگ ابھی تک اس بات پر حیرت کے صدمے میں ہیں کہ وہ انیس افراد، جنہوں نے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے ٹوئن ٹاورز اور پینٹا گن کا ایک حصہ تباہ کر دیا، درمیانی طبقے کے تعلیم یافتہ اور اعلا تربیت یافتہ افراد تھے۔ انہوں نے امریکا کے مختلف حصوں میں موجود فلائٹ اسکولوں سے طیارے اُڑانے کی تعلیم حاصل کی تھی۔ یہ حملہ اس قدر راز داری کے ساتھ اور غیر معمولی ''ہتھیاروں'' کے ذریعے سے کیا گیا کہ سپر پاور کی ساری خفیہ ایجنسیاں بھی اس المیے کو روک نہ سکیں۔ یہ اغوا کنندگان کوئی اَن پڑھ، انتہائی مایوس اور ناراض نوجوان نہیں تھے جو اپنے جسموں سے

چند بم باندھ کر کسی شاپنگ مال میں داخل ہو جائیں، جیسے کہ اور جگہ ہوا ہے۔ جو لوگ ان انیس افراد کو جانتے تھے، وہ ان کو ''عام''، ''اوسط درجے کے'' اور ''صحیح دماغ'' سمجھتے تھے اور کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایسے ہولناک کاموں کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں گے۔ ان لوگوں کی نفسیات سمجھنے کے لیے، ہمیں اپنے آپ کو ان سے جذباتی فاصلے پر رکھنے اور منطقی، استدلالی اور معروضی نقطۂ نظر سے ان کے عمل کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں بہت سے عوامل کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے جو اس المیے کی تہہ میں کارفرما رہے ہوں گے اور چھوٹے چھوٹے اجزاء پر غور کی ضرورت ہے جو ایک ساتھ جڑ کر اس معمّے کو مکمل کرتے ہیں۔ جب میں ان ''دہشت گردوں'' اور یہ ہمارے لیے جو معمّہ چھوڑ گئے ہیں، اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو اس کے مندرجہ ذیل اجزا میرے ذہن میں آتے ہیں۔

پہلا جزو ان لوگوں کی نفسیات ہے جو دوسروں کی جان لینے کے لیے رضا کارانہ طور پر اور ضمیر کی خلش کے بغیر تیار ہو جاتے ہیں۔ ان میں ایسے لوگ شامل ہیں جو سلسلہ وار قاتل، کئی افراد کے قتل کے مرتکب ہوتے ہیں اور وہ لوگ جن کی شخصیت اس طرح فروغ پاتی ہے کہ وہ اپنے ماضی کے صدمہ انگیز واقعات کی وجہ سے اس قدر تباہ کن اور منتقم مزاج بن جاتے ہیں کہ اجنبیوں کو بھی مار ڈالنے سے دریغ نہیں کرتے، یعنی ان لوگوں کے قاتل جن سے وہ پہلے کبھی نہیں ملے۔ جس دوران مَیں جاوید اقبال پر کتاب کے لیے تحقیق کر رہا تھا، جو پاکستان میں ایک سو بچوں کے سلسلہ وار قتل کا ملزم ہے، تو اس موضوع پر دنیا بھر کے مواد پر تحقیق کرتے ہوئے میں یہ بات جان کر حیران رہ گیا کہ پچھلے تیس سال میں سلسلہ وار قتل اور قتلِ انبوہ کی سب سے بڑی تعداد ریاست ہائے متحدہ امریکا میں ہے۔ ''انسان کا شکار'' نامی کتاب میں مصنف ایلیٹ لیٹن نے نکتہ اٹھایا ہے کہ ''تناسب کے اعتبار سے امریکا، دنیا کے کسی بھی ملک سے زیادہ'' قاتل پیدا کرتا ہے۔ ''ہوسکتا ہے کہ ان قاتلوں کے ذاتی، سیاسی اور مذہبی نظریات ہوں مگر یہ نہ تو کسی منظم سیاسی یا مذہبی جماعت کے رکن ہوتے ہیں اور نہ ان کی سرگرمیاں کسی پارٹی کے ایجنڈے کا حصّہ، جیسا کہ آج کل کے دہشت گردوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

ان سلسلہ وار قاتلوں اور قتل انبوہ کے مجرموں کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے مجھ پر یہ بات واضح ہوئی کہ یہ دو الگ طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ پہلے وہ اشخاص ہیں جو ''برباد کن'' (Abusive) گھرانوں میں پلے بڑھے اور ان کے خاندانوں نے تشدّد بھرا سلوک کیا۔ ان لوگوں کی شخصیات ابتداء ہی میں بیمار (Psychopathic) بن گئیں اور وہ ساری دنیا کے خلاف اس قدر

غصّہ اور تلخی محسوس کرنے لگے کہ زندگی کے کسی مرحلے پر انہوں نے ''بے گناہ'' مردوں اور عورتوں سے انتقام لینے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کے بر خلاف دوسرے گروہ میں درمیانی طبقے کے تعلیم یافتہ گھرانوں کے لوگ ہیں جو کسی مخصوصی مذہبی، یا جنسی یا حیاتیاتی یا نسلی رجحان کے حامل افراد کے خلاف غصّے میں آجاتے ہیں۔ ان کا تشدّد معاشرے کے اس مخصوص ٹکڑے تک مُرتکز ہے۔

معمّے کا دوسرا جزو سیاسی تنظیم سے وفاداری ہے۔ ایسی تنظیم کے قومی اور مذہبی محرکات بھی ہوسکتے ہیں۔ پچھلی چند دہائیوں میں ہم نے ایسے کئی گروہوں کے بارے میں پڑھا ہے جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور لوگوں کو ''دہشت گرد'' حملوں کے لیے تیار کرتے ہیں۔ ایسے گروہوں کا بڑا باقاعدہ اور تنظیمی ڈھانچہ ہوتا ہے اور یہی جان سے وابستہ ہوجانے والے نوجوانوں کو چن لیتے ہیں، صرف نوجوان مردوں کو۔ ان میں سے بیش تر لڑکے اَن پڑھ اور غریب ہوتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے لڑکے دشمنوں کی قید میں رہے ہیں یا ان کے رشتہ دار پُر تشدّد تصادم میں مارے گئے ہیں یا بری طرح زخمی ہوئے ہیں۔ یہ لڑکے اور نوجوان اپنے ملک یا اپنے مقصد کے لیے موت کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ایک مرتبہ تیار ہو جانے کے بعد ان کو ایک ''مشن'' پر نام زد کردیا جاتا ہے، مگر اکثر اوقات اس کی تفصیلات اس نو آموز سے خفیہ رکھی جاتی ہیں۔ کسی مخصوص دن، ان کو مقرّرہ مقام پر پہنچا دیا جاتا ہے اور پھر اپنا کام پورا کرنے کا حکم جاری کردیا جاتا ہے۔ واپسی کا کوئی سوال نہیں۔ ان میں سے کئی لوگ ''خودکش بم بار'' بن کر نکلتے ہیں۔

اس معمّے کا تیسرا ٹکڑا، وہ شدّت پرستانہ مذہبی عقیدہ ہے جو ان کے پورے وجود کا جواز بن جاتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان کو 'حیات بعدِ موت' پر ایمان ہے بلکہ یہ یقین بھی ہے کہ اپنے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار کر، جو ان کی نظر میں ''خدا کے دشمن'' بھی ہیں، وہ سیدھے جنت میں جگہ پائیں گے اور شہید کے طور پر یاد رکھے جائیں گے۔ اکثر اوقات یہ مقدّس جنگ یا جہاد کے لیے اپنی خدمات رضاکارانہ طور پر پیش کردیتے ہیں مگر بعض اوقات وہ مذہبی انتہا پسندوں کے کسی گروہ میں شامل ہوکر ان کے خصوصی مشن کا حصّہ بن جاتے ہیں۔

یہ سمجھنا ضروری ہے کہ بیش تر مذہبی فرقے، چاہے وہ مسلمان ہوں، یہودی، عیسائی یا دنیا کے دوسرے مذاہب کے پیروکار، بے گناہ، مردوں اور عورتوں کے مار دیے جانے پر یقین نہیں رکھتے۔ مذہبی یا صلیبی جنگ یا مقدس جنگ یا جہاد پر ان کا ایمان ہوسکتا ہے۔ یہ فرق کرنا ضروری ہے کہ ایک طرف وہ سپاہی ہیں اپنے ملک کی سرحدوں پر جو اپنے دشمن کی افواج سے اپنے ملک کی

سلامتی کی بقا کے لیے لڑتے ہیں۔ اس کے برخلاف ''دہشت گرد'' بے گناہ لوگوں کو مار ڈالنے کی اخلاقی گراوٹ پر پلٹ کر سوچتے بھی نہیں۔

اس معّمے کا چوتھا ٹکڑا گوریلا جنگ ہے۔ بہت سے ''فوجی'' بڑی سخت تربیت سے گزرتے ہیں تاکہ دشوار گزار حالات کا سامنا کر سکیں۔ انہوں نے اپنی زندگیوں کو مقصد کے لیے وقف کر دیا ہے اور کسی وقت بھی موت کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ گوریلا تنظیم کا حصہ بن کر وہ دشمن کے اسلحے اور افواج تک رسائی کا طریقہ سیکھ جاتے ہیں اور پھر اس کو انہی کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ ماضی میں وہ شب خون مارا کرتے تھے، بندوقیں بلکہ ٹینک تک چوری کر لیا کرتے تھے۔ جدید دور میں ان کی رسائی دشمن کی یونی ورسٹیوں اور تربیت گاہوں تک ہو جاتی ہے اور وہ ہر طرح کے فوجی ہتھیاروں کا استعمال بھی سیکھ جاتے ہیں۔

ان انیس ہائی جیکرز کے معاملے میں شاید یہ ٹکڑے اتنی آسانی سے ایک دوسرے کے ساتھ جڑ نہ سکیں۔ ان کی شخصیت کی تفصیلات (پرسنلیٹی پروفائل) اور فیملی انٹرویوز تک دسترس کے بغیر، جیسے کہ سائیکٹری کی پریکٹس میں ہوتا ہے، ہم ان کے محرّکات کے بارے میں صرف اصولی بحث کر سکتے ہیں۔

''لوگ دہشت گرد حملوں پر کیوں اتر آتے ہیں؟'' یہی وہ سوال ہے جو پچھلے دنوں بہت سے ذہنوں پر طاری رہا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ جب لوگ اپنے کو کم زور، بے بس اور مجبور محسوس کرتے ہیں، خاص طور پر ایک طاقت کے سامنے جو ان سے کہیں زیادہ طاقت ور ہے، تو وہ غصّے میں پھٹ پڑتے ہیں اور دہشت گرد حملوں پر اتر آتے ہیں۔ دہشت گرد دراصل تضاد کی علامت ہیں، بیک وقت کم زور بھی ہیں اور بہت طاقت ور بھی۔ وہ گم نام بھی رہنا چاہتا ہے اور یہ بھی چاہتا ہے کہ اپنی برادری کی تاریخ میں ہیرو بن کر رہے۔ وہ موت کو گلے بھی لگانا چاہتا ہے اور حیات جاودانی کا خواہش مند بھی ہے۔ وہ اپنے حملے کی منصوبہ بندی کرنے میں نہایت منطقی ہے۔ اور اس کے باوجود، اپنے آپ کو اور اپنے ساتھ دوسروں کو تباہ کرنے کے معاملے میں عقل سے قریں حرکت کرتا ہے۔

ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ انیس آدمی کسی ایسے وسیع تر گروہ کی نمائندگی کرتے ہیں جو ان کی سی سوچ رکھتا ہے اور ان ہی کی سی نفسیات کا حامل ہے مگر منطقی انجام تک پہنچنے کے لیے اپنی زندگی داؤ پر نہیں لگانا چاہتا۔ اگر ہم نے ان کو سنجیدگی سے نہ لیا تو شاید ہم اگلے چند برسوں میں پھر کسی اور

گروہ کو نمودار ہوتے دیکھیں گے جو گیارہ ستمبر کے المیے جیسے مزید حملوں کی منصوبہ بندی اور عمل درآمد کر سکے۔ اس بات کا وقت آ گیا ہے کہ اقوام متحدہ جیسا کوئی بین الاقوامی ادارہ ان گروہوں کو ڈھونڈ نکالے تا کہ تمام ملکوں کے بے گناہ شہریوں کے جان و مال کی حفاظت ہو سکے۔

ان انیس ہائی جیکرز نے اپنے عمل کے ذریعے سے عمداً ایک بیان دیا ہے۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم سب جدید دنیا کے غیر حل شدہ سیاسی تنازعوں کے بارے میں سنجیدگی سے سوچیں۔ عین ممکن ہے کہ اگر یہ مسائل منصفانہ طور پر حل نہ ہوئے تو مشرق و مغرب، اسلام و غیر مسلم دنیا کے درمیان یہ تصادم جاری رہے گا۔ ایک مستقل تناؤ رہے گا اور دونوں جانب سے وقتاً فوقتاً تشدد بھی ہوتا رہے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں انتقام اور بدلے کی نفسیات سے آگے نکلنا ہوگا اور تعاون کو مستقل توسیع دینے کے راستے ڈھونڈنا ہوں گے۔ بے لوث خدمت کے ذریعے سے ہمیں غصّے اور مخاصمت اور تلخی کی دیواروں کو توڑنا ہوگا اور فہم و ہم دردی کے پُل تعمیر کرنے ہوں گے۔ انسانیت لڑکپن کے تلاطم سے گزر رہی ہے۔ ٹین ایجرز کی طرح ہم، شناخت کے بحران سے گزر رہے ہیں۔ ہم جاننا چاہتے ہیں کہ ہم کون ہیں اور کہاں کے ہیں۔ پریشان حال نوعمروں کی طرح ہم خودکشی اور قتل کے رجحانات محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایسا صرف نوجوانی میں ہوتا ہے کہ انسان کامیاب خودکشی کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے۔ انسان کی تاریخ میں ایسا نہیں ہوا کہ ہم ساری کی ساری بنی نوع انسان کو مار ڈالیں۔ یہ تو پچھلی صدی کے بعد سے جوہری اسلحے کی تیاری سے ہوا ہے کہ ہم نے پوری کی پوری انسانیت کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالنے کی صلاحیت حاصل کر لی ہے۔ ہم ایسے مرحلے پر پہنچ گئے ہیں جہاں اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کے راستے پر چل پڑیں اور اجتماعی خودکشی کر لیں، یا پھر پوری پختہ عمر کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے تسلیم کر لیں کہ ہم سب دھرتی ماں کے بچے ہیں اور انسانی خاندان کے افراد۔ پختگی تک پہنچنے کی ہماری یہ ضرورت بڑی اہم ہے، کہ جس کے ذریعے سے ہم اپنے پُر تشدد روّیے سے آگے جا سکتے ہیں، جس کا اظہار چاہے قومی جنگوں میں ہو، مذہب کے نام پر مقدس جنگوں میں، علیحدہ علیحدہ دہشت گرد حملوں میں یا گوریلا جنگ میں۔ اور ان سب سے آگے نکل کر پُر امن شعور تک پہنچ سکتے ہیں۔ آگے بڑھانے کا یہ عمل انقلاب سے نہیں ارتقاء سے ہوگا، وعظ سے نہیں بلکہ تعلیم سے اور سماجی ماحول میں مددگار خاندانوں اور اسکولوں کے ذریعے سے کہ جن میں مثبت رول ماڈل ہوں۔ عورتوں اور مردوں کو فوجی بیرکوں میں ٹھونس دینے سے نہیں ہوگا۔ اجتماعی طور پر ہمیں یہ احساس ہونا چاہیے کہ دنیا کی دو تہائی آبادی غریب اور ان پڑھ اور بیمار ہے اور جب تک ایسا ہے،

خوش وخرم کمیونٹی کے لیے زیادہ امید نہیں رکھی جاسکتی۔ ہمیں ان پناہ گزینوں کے لیے بھی کچھ کرنا ہے جو ساری دنیا میں پھیلی ہوئی خیمہ بستیوں میں بیٹھے ہوئے راہ دیکھ رہے ہیں کہ اقوام متحدہ اور دولت مند، ترقی یافتہ مغربی ممالک کے وعدے کب پورے ہوتے ہیں۔ ہم سب کو ان لاکھوں پناہ گزینوں کا صدمہ محسوس کرنا چاہیے جو بنگلہ دیش کے کیمپوں میں پچھلے تیس سال سے اپنے لیے باعزت مقام کا انتظار کر رہے ہیں جہاں زندہ رہ سکیں اور کام کرسکیں۔

وقت آگیا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے دل میں جھانک کر دیکھے۔ دور جدید کے دہشت گرد برف کے سمندری پہاڑ کی صرف چوٹی ہی کی نمائندگی کرتے ہیں، کہ جس میں مختلف گروپوں کے درمیان تناؤ اور دنیا کے مختلف حصوں کے درمیان غیر حل شدہ تصادم کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ہمیں ایسی کمیونٹی کی تخلیق کرنے سے اپنے آپ کو وابستہ کرنا چاہیے جہاں لوگ برابری اور امن کے ساتھ رہ سکیں، جہاں ثقافتی اور مذہبی تفریق سے یہ سب متاثر نہ ہو ورنہ ہم مقدس جنگ اور خانہ جنگی کے راستے پر چلتے رہیں گے۔ ہمیں اصرار کرنا چاہیے کہ ہمارے رہ نما ہمارے لیے صحیح راستے کا انتخاب کریں جو امن، فہم، انسانی حقوق اور تعاون کا راستہ ہے۔

چہرہ سوختہ: ویت کانگ کی حمایتی ہونے کے شک کی سزا یافتہ زخمی عورت، جس کی شناخت نہیں، صرف ایک امریکی لیبل باقی ہے

بشکریہ: جنگ کے جرائم

اس حصّے کی ابتداء شاعری سے۔ مگر "شاعر نہیں ہے جو غزل خواں ہے آج کل ......" بحران کے زمانوں میں غزل کی روایات کی پاس داری میں انھی طے شدہ علائم و رموز کو برتنے والے شاعروں کو یہ طعنہ ملتا رہا ہے۔ مگر یہ سوال اپنی جگہ کہ غزل کی یہ روایات بجائے خود ادبی قدر کی حامل ہیں اور انسان کی ابدی و آفاقی افتاد کا وہ اظہار جو امتداد زمانہ سے ماورا ہے، یا یہ کہ ان دائمی کیفیات کے بیان میں بھی ستم ہائے روزگار کے حساب سے تبدیلی کا ہنگامہ برپا کیا جانا چاہیے۔ غزل خوانی پر طعنہ دینے والے خود بھی غزل گو تھے اور یہ اعتراض بھی غزل کی صورت میں کیا گیا تھا۔ غزل اگر کامیاب ہے تو اس طرح کے اعتراضات کا جواب بھی غزل کے اندر ہی موجود ہوتا ہے۔ شاہدہ حسن امریکا میں مقیم ہیں اور ان کی یہ غزل بھی امریکا میں محسوس کیے جانے والے خوف کا فوری تاثر ہے۔ شاہدہ حسن نے اس غزل کا پس منظر بتانے کے لیے اس پر نوٹ لکھا ہے اور یہ غزل گیارہ ستمبر کے حالات و واقعات پر شاعرہ کا تاثر یا تبصرہ ہے اور شاید ان واقعات سے ماورا بھی، کہ اس کو کسی حوالے کے بغیر بھی پڑھا جاسکتا ہے۔

عدنان ستّار نے حال ہی میں شاعری شروع کی ہے۔ وہ ایک بین الاقوامی ادارے سے وابستہ ہیں اور اسلام آباد میں مقیم ہیں۔ وہ انگریزی میں لکھتے ہیں۔ ان کی یہ نظم نئی دہلی سے نکلنے والے رسالے "لٹل میگزین" کے تازہ شمارے میں شامل ہے۔ شاعر نے یہ نظم گیارہ ستمبر کے فوراً بعد لکھی تھی جب ہمارے ہاں اس خبر کے ساتھ ساتھ لوگوں کے رد عمل سامنے بھی آرہے تھے جن میں ایک رنگ خوشی کا بھی تھا۔

شاہدہ حسن

☆

ہلاکت کی گھڑی سے ڈر رہی ہے
یہ دنیا آدمی سے ڈر رہی ہے

عجب اک سانحہ گزرا کہ خلقت
ابھی تک زندگی سے ڈر رہی ہے

سکوں آثار کل تک تھی جو بستی
دلوں کی برہمی سے ڈر رہی ہے

کوئی بیگانگی دیکھی ہے ایسی
نظر اب ہر کسی سے ڈر رہی ہے

کسی افتادِ غم پر دل کی وحشت
کسی اگلی خوشی سے ڈر رہی ہے

حقیقت اور بیاں میں ربط کم ہے
زباں شاید کسی سے ڈر رہی ہے

تری دوری کے دن گنتی ہوئی شام
مری افسردگی سے ڈر رہی ہے

(گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء ٹوئن ٹاورز کی تباہی پر امریکا کی دہشت زدہ زندگی کو دیکھ کر)

عدنان ستار
ترجمہ: آصف فرخی

ان سب کے نام جو آج ہنس رہے ہیں
(نیویورک کے المیے پر)

ملبے کے نیچے ان کو ملیں
ننھی منی انگلیاں
جن کا گوشت تک اُدھڑا،
نکلا ہوا
جس کی گرفت میں
بس نیستی۔

اب خاک میں مل کر خاک ہوئے
خواب جو وہ دیکھ سکتے تھے
شعر جو وہ لکھ سکتے تھے
تصویر جو وہ بنا سکتے تھے

ہاں، زور و شور سے مناؤ اس کا جشن
اپنی نفرت بھر دو قہقہوں میں
(وہ بچہ تمہارا نہیں تھا)
ظلمت میں رقص کرو
ظلمت کے گرد رقص کرو
زندگی کے مرگھٹ پر رقص کرو
ان سبھی پرندوں کی ایک نہ سنو
جو یہ سرگوشیاں کرتے پھڑ پھڑا رہے ہیں:
یہ بچہ تمہارا بھی ہو سکتا تھا۔

''گیارہ ستمبر نے ہمیں دہشت کی نئی لفظیات سکھائیں— مابعد مکاشفاتی لغت جس میں اجنبی فقروں (کی بھرمار تھی) ان ہی میں سے ایک فقرہ ایسا تھا جو سرد جنگ کے زمانے کی حفاظتی فلموں کی طرح متروک معلوم ہوتا تھا: گراؤنڈ زیرو......''

''گراؤنڈ زیرو سے مراسلے'' اس ویب سائٹ کا نام ہے جو نیویارک یونیورسٹی کے شعبہ صحافت نے تیار کی اور جس کے ہوم پیج کے تعارفی جملے اوپر درج ہیں۔ ''گیارہ ستمبر کی صبح جاگ کر ہم نے جو بھیانک خواب دیکھا یہ اس کے بارے میں شعبہ صحافت کی دستاویزی شہادت اور رد عمل ہے'' شعبے کے اسسٹنٹ پروفیسر مارک ڈیری بتاتے ہیں۔ اس میں چشم دید احوال، مختلف زاویوں سے واقعات کی دید و دریافت، خصوصاً وہ پہلو جن پر میڈیا کی نظر نہیں پڑی رائے پر مبنی کالم اور تبصرے شامل ہیں جنہیں شعبے کے اساتذہ اورطلباء نے قلم بند کیا ہے۔ تدریسی موقع اور صحافتی ذمہ داری کے امتزاج سے جنم لینے والی اس ویب سائٹ سے درج ذیل رپورٹ حاصل کی گئی ہے۔ اس کا مصنفہ ریبکا اسکاروف، صحافت کو ''میجر'' مضمون کے طور پر اختیار کرنے والی انڈر گریجویٹ طالب علم ہیں۔
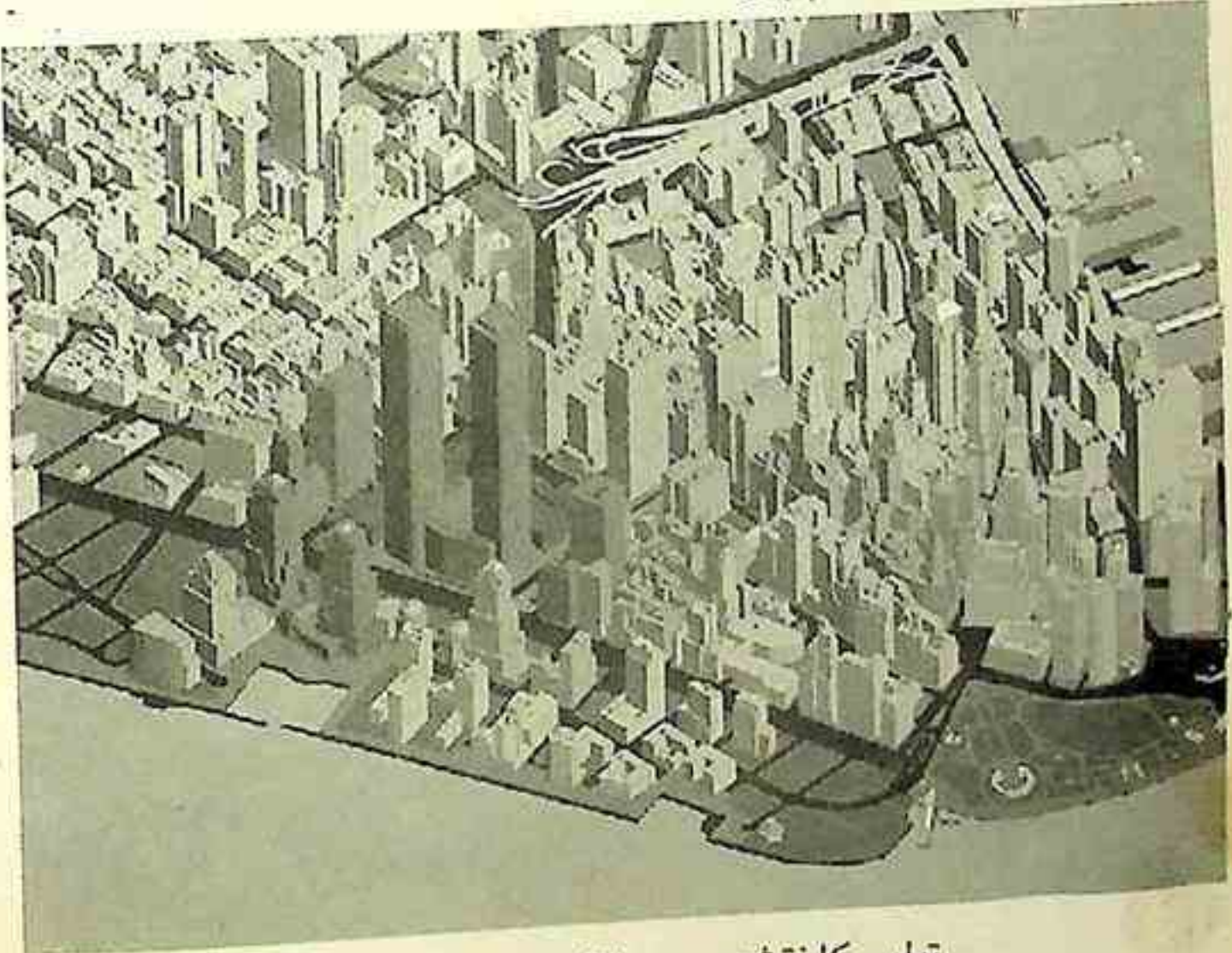
تباہی کا نقشہ بشکریہ: سی این این

گیارہ ستمبر کے گرتے ہوئے برج و مینار سے گرد ابھی تھمنے بھی نہ پائی تھی کہ بعض لوگوں کے سامنے یہ سوال آیا: اس کو بیان کس طرح کیا جائے؟ اس کی دستاویزی شہادت کس طرح محفوظ رکھی جائے کہ تباہی کے پیمانے کا اندازہ بھی ہوسکے اور مرگِ انبوہ میں دب کررہ جانے والی شخصی آوازیں بھی سنی جاسکیں۔ یہ سوال بڑھ کر رپورٹنگ اور میڈیا کی ذمہ داری سے جڑ گیا، جس پر گفتگو کا ایک الگ دائرہ درکار ہے۔ سانحے کے اُنیس دن کے اندراندر، اس بات میں پوری ایک کتاب تیار ہوگئی جس میں چشم دید واقعات اور تاثرات شامل ہیں۔ اس کتاب کا پیش لفظ جے روزین (Jay Rosen)نے تحریر کیا۔ روزین نیویارک یونیورسٹی میں صحافت کے صدر شعبہ ہیں اور انہوں نے اس واقعے کے حوالے سے دستاویزی ویب سائٹ بھی تیار کی ہے، جس کا ذکر اگلے صفحات میں موجود ہے۔

اس دن کی یہ ''زبانی تاریخ'' زندہ بچ جانے والوں، عینی گواہوں اور دور کھڑے رہ کر بے یارومددگار دیکھنے والوں کی آوازوں پر مبنی یہ کتاب "۹/۱۱......۸:۴۸ صبح" جس کا ذیلی عنوان ہے ''امریکا کے سب سے بڑے المیے کی دستاویز کی تیاری'' ایتھن کیسی (Ethen Casey) نے مرتب کی ہے۔

جے روزین
ترجمہ: آصف فرخی

۹/۱۱۔۔۔۸:۴۸ صبح:

امریکا کے سب سے بڑے المیے کی دستاویز کی تیاری

گیارہ ستمبر کی دہشت کے بعد کے بحران کے شروع ہی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ نیویارک اور واشنگٹن میں تباہ کاری ایک نئی قسم کا بین الاقوامی واقعہ ہے۔ صرف یہی نہیں کہ دنیا بھر کے لوگوں کا اس سے سروکار تھا، بلکہ کسی ایسے طریقے سے جسے ابھی تک سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں، یہ پوری دُنیا کے لوگوں کو "درپیش" آیا۔ وہی نیٹ ورک جن کی ہم مدح سرائی کر رہے تھے کہ ایک نئے عالمی

دور کی تجسیم ہیں، ان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اُلٹے چل پڑے۔

چوں کہ ہم سب ایک دوسرے سے مربوط ہیں، اس لیے ہم ذاتی طور پر اس دہشت کو محسوس کر سکتے تھے، چاہے وہ آپ کا اپنا شہر نہ ہو جو اگلے دن دھواں دیتا ہوا اور ہیبت زدہ رہ گیا ہو۔ جس رات دیوارِ برلن گری، ہم سب نے جشن منایا...... اور اس میں ہم حق بجانب تھے۔ جس دن ورلڈ ٹریڈ سینٹر گرا، ہم سب نے اپنے آپ کو کچلا ہوا محسوس کیا...... ایک بار پھر حق بجانب۔ اگر اس ''عہدِ اطلاعات'' کا کوئی تاریک رُخ ہے تو ہمیں اس وقت تک نہیں معلوم تھا کہ وہ کس قدر تاریک ہے جب تک کہ وہ طیارے آ کر ٹکرا نہیں گئے اور سارے نیٹ ورک خبروں سے جل اٹھے، اپنے پھیلاؤ میں ہمارے جذبات شامل کر کے دہشت کی اس کارروائی کو ''پایہ تکمیل'' تک پہنچانے لگے۔

''گلاس نوسٹ'' سے پہلے یہ ممکن تھا کہ آپ ایروفلوٹ کے طیارے کو اغوا کر لیں۔ مگر سوویت یونین کے عوام کو دہشت زدہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اس کی سیدھی سادی وجہ یہ ہے کہ ریاست اس واقعے کی خبر کو دبا سکتی تھی اور اس کے پھیلاؤ کو روک سکتی تھی۔ اس زمانے میں، حکام اعلا دہشت کے ایک باضابطہ ردِعمل پر عوام الناس میں گفتگو کو روک سکتے تھے، جیسی بحث ۱۲ ستمبر ۲۰۰۱ء کے فوراً ہی بعد ساری دُنیا میں شروع ہو گئی تھی۔ یہ بحث بھی دراصل دہشت کا حصہ ہے اور اس بحث پر برانگیختہ کرنا اس واقعے کے مجرموں کے مقصد کا ایک جزو۔

ہالی وڈ کی فلم ''ڈائی ہارڈ'' (۱۹۸۸ء) میں پولیس کے سپاہی ہیرو کا کردار بروس ولس نے ادا کیا ہے۔ وہ اس وقت ایک بھیانک غلطی کر بیٹھتا ہے جب وہ ایک ایسے گروہ سے وائرلیس رابطہ قائم کر لیتا ہے جس نے ایک فلک بوس عمارت پر قبضہ کر لیا ہے اور پچاس لوگوں کو یرغمال بنا لیا ہے جن میں وہ عورت بھی شامل ہے جس سے یہ محبت کرتا ہے۔ ایک مرتبہ جب ان لوگوں کو پتہ چل گیا کہ سپاہی ان کی آواز سُن سکتا ہے تو مجرم اس عورت کی جان لینے کی دھمکیاں دے کر ولس کو مجبور کر سکتے تھے کہ ایسے کام کرے جن کا خطرہ وہ پہلے مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ رابطے میں آ گیا اور مجرموں نے اسے ان حقائق کی اطلاع دی جن سے اس کی دہشت کو فروغ ہوا اور اسے ایک شخصی جہنم میں گھسیٹ لائے۔ میرا منشا یہی تھا جب میں نے کہا کہ نیٹ ورک اُلٹے چل پڑے تھے۔ انھی لائنوں پر جو اطلاعاتی خبر لے کر آتی ہیں، اب صدمہ پہنچانے والا اطلاعاتی شر رواں تھا۔

زیریں مین ہٹن کے اس تباہ کن واقعے کے کوئی دس دن بعد، لاس اینجلز کے شہر نے ''نیویارک ٹائمز'' میں پورے صفحے کا اشتہار دیا کہ ایل اے کے شہری نیویارک کے شہریوں کے ساتھ یک جہتی

محسوس کرتے ہیں۔ نیدر لینڈز نے اپنے آپ کو پورے تین منٹ کے لیے ساکت کرلیا کہ ڈچ لوگ ایک ساتھ مل کر سوچ سکیں کہ امریکا میں کیا ہوا ہے۔ موم بتی کی روشنی میں دعائیں سمندروں اور براعظموں کے پار ایک دوسرے سے مکالمہ کر رہی تھیں۔ پارلیمانی ایوانوں نے قراردادیں منظور کیں۔ ادیبوں نے قلم اٹھالیا۔ موسیقاروں نے ساز سنبھالے اور امریکی دھن بجانے لگے۔

احساس ہم دردی کے اس تاثر انگیز اظہار سے اندازہ ہوا کہ کچھ نہ کچھ ہوا ہے، ہمارے اس تکلیف دہ سبق کے بعد کہ ''عالمگیریت'' اور ذرائع ابلاغ کا دور صحیح معنوں میں کس طرح کام کرتا ہے۔ دُنیا کے آزاد شہری اظہار کرنے لگے امریکی سرزمین پر بپا ہونے والے اس جرم پر اپنے غصے، نیویورک اور واشنگٹن کے شہریوں کے ساتھ غم گساری، چھ ہزار سے زیادہ زندگیوں کے ضیاع، اپنے اس عزم کو کہ دہشت گردوں کو ''فتح یاب'' نہ ہونے دیں گے، یہ تکلیف دہ احساس کہ اس حملے کا ہدف صرف وہی لوگ نہیں تھے جو اس کی زد میں آ کر فوری طور پر شکار بنے۔ اس دن واقع ہونے والی ہر بات سے اپنی جذباتی وابستگی اور تعلق کا اور امریکا میں وہ جنگی جنون، بدلہ لینے کی خواہش، شدید خوف کے ساتھ رلی ملی، عوامی سطح پر بدحواسی، کھلے تعصب اور ایک فطری و فوری قومی اتحاد کا بھی اظہار شامل تھا۔

دُنیا کے آزاد شہریوں نے وہ مکالمے اور مباحثے بھی شروع کر دیے جن کے بارے میں ان کو معلوم تھا کہ اس واقعے کے بعد انہیں قائم کرنے ہیں، نتیجے اخذ کرنے کا وہ عمل جو برس ہا برس جاری رہے گا۔ حد سے بڑھ کر ردِعمل نہ دکھانے کا انتباہ اسی وقت جاری ہونے لگا جب لوگوں کے ردِعمل کا انداز سامنے آیا اور یوں عالمی نیٹ ورک فوراً ہی ایک بار پھر اطلاعاتی سامان سے جل اٹھے جن کو پہچان لینا آسان ہوگیا تھا۔ اس سے ہم اس کتاب کی طرف آتے ہیں۔

جو تحریریں یہاں اکٹھا کی گئی ہیں، ان میں آنکھوں دیکھا حال، برسرزمین رپورتاژ، شخصی مضامین، سیاسی دلائل، عوامی مباحثے، زبانی تاریخ اور کئی دوسری اصناف شامل ہیں۔ مگر ان کا موضوع ایک ہی ہے: جو کچھ ہوا ہے، خاص طور پر نیویورک کے شہر میں، خاص طور پر یہاں کے شہریوں کے ساتھ، جن میں سے ہزاروں لوگ ایک گھنٹے کے اندر اندر مر گئے، اس کے انسانی معنی و مفہوم کو سمجھا جائے کہ مین ہٹن میں تباہ کاری اور جانی نقصان کے بارے میں بات کرتے ہوئے ہم ''ناقابلِ تصوّر'' اور ''ناقابلِ یقین'' جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں مگر ان اصطلاحوں میں کوئی بات ایسی ہے جو پوری طرح درست نہیں ہے...... اس کتاب کے لیے درست نہیں ہے۔

صحافت کا بنیادی عمل، صحافیوں کو حاصل ذرائع کے مطابق، اس وقت سامنے آتا ہے جب کوئی ہم سے کہتا ہے: ''میں وہاں موجود تھا، مگر آپ نہیں تھے۔ آیئے، میں آپ کو اس کے بارے میں بتاؤں۔'' یا تقریباً اتنی ہی بار: ''میں وہاں پر ہوں، آپ نہیں ہیں، اس لیے میں آپ کو بتاؤں۔'' اطلاعات ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک پہنچتی ہے مگر یہ وہ لمحہ بھی ہے جب ذہن تصور کرنے لگتا ہے۔ ٹیلی وژن (اور تمام دہشت ٹیلی وژن کے لیے ہے) حقیقت کے ساتھ طلسماتی تبدیلیاں کرنے کی اس خواہش کی پیش بینی کر لیتا ہے یہ امیجز ''وہاں'' ہیں، جیسے ٹھیک وہاں پر۔ آپ یہ کر سکتے ہیں...... اور درحقیقت آپ نے یہ کہا بھی...... کہ اسکرین کی طرف اشارہ کر کے کہا: دیکھو! مگر ایسا کتنی بار ہوا ہے کہ اس سیاہ دوشنبہ کے بعد کے دنوں میں ہم نے ایک دوسرے سے پوچھا ہو: ''کیا تم تصور کر سکتے ہو؟......''

اصل میں، یہ بڑا اہم سوال ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ اس کا جواب ہاں میں ہے، ہم یعنی وہ لوگ جنھوں نے اس کتاب کو تحریر کیا اور اس کی تدوین کی۔ مگر ہم اس بات کو محض اتفاق پر نہیں چھوڑ رہے ہیں۔ کتاب میں کوئی بات ایسی ہوتی ہے جو محض ردِعمل (recation) سے زیادہ تفکر (reflection) کو دعوت دیتی ہے۔ ہم اس ''کتابیت'' پر اعتبار کر رہے ہیں کہ وہ یہاں اپنا اثر دکھائے۔ زندگی اس وقت تک اپنے معمول پر واپس نہیں آئی ہے جس وقت یہ کتاب، ان واقعات کے انیس دن بعد، پریس جا رہی ہے۔ وہ غیر معمولی عالمگیر لمحہ جو ان حملوں کے بعد سامنے آیا، ابھی تک ہمارے ساتھ چل رہا ہے۔ اس میں شائع ہونے والی تحریریں اور دستاویزیں اسی لمحے کا حصہ ہیں اور اسی لمحے میں شمولیت کے لیے ارسال کی جا رہی ہے۔ ان میں سے ہر ایک، کسی نہ کسی جدوجہد کرنے والے کا کام ہے اور ان میں سے بہت سے جدوجہد کرنے والے نیویارک کے جاگتے ہوئے بھیانک خواب کے گواہ بھی ہیں۔

نیویورک یونی ورسٹی کے شعبہ صحافت کے اساتذہ اور طلباء بھی وہاں موجود تھے، تاکہ آپ کو اس کے بارے میں بتا سکیں۔ جس جگہ کو اب ''گراؤنڈ زیرو'' کہا جا رہا ہے، اس کے قریب شعبۂ صحافت، نیویورک یونی ورسٹی ہے۔ اس شعبے کے سربراہ کی حیثیت سے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ یہ شعبہ، دستاویزات کے اس مجموعے کو تحریر میں لانے اور مرتب کرنے میں مدد دے۔ آپ جب بھی طالب علموں کو عالمی گواہ بننے کا موقع دے سکتے ہیں، آپ پر لازم ہے کہ ایسا کریں...... چاہے ان میں سے بعض طالب علم اس کے لیے پوری طرح تیار نہ ہوں۔ آپ کو جب بھی وہ لکھنے کا موقع ملے

جو یہ لوگ اب لکھ رہے ہیں، کسی ایسے ہی جذبے کے محل وقوع سے، آپ کو یہی کرنا چاہیے۔ اس میں شامل طلباء تحریروں میں سے بیشتر یہ کہہ رہی ہیں: میں وہاں موجود تھا، اپنی نسل کے ساتھ، آپ وہاں نہیں تھے۔ میں آپ کو اس کے بارے میں بتاؤں اور آپ کو یہی کرنا چاہیے۔ ہم نے ان طالب علموں کو وہاں بھیجا کہ تباہی کی دستاویز تیار کریں مگر جس سبب سے ہم نے انہیں وہاں بھیجا اس کا اسی قدر سروکار دوبارہ جوڑنا اور شفا سے بھی ہے۔

آخر میں، یہ کتاب انٹرنیٹ کے دور کی کتاب ہے۔ زیادہ تر قاری اسے نیٹ سے خریدیں گے یا اس کے بارے میں نیٹ پر پڑھیں گے۔ یہاں شامل تمام کام نیٹ سے ہی شروع ہوا، نیٹ پر تبادلہ خیالات کے ذریعے آگے بڑھا اور نیٹ پر بھیجا گیا تاکہ اس کی اشاعت ممکن ہو سکے۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ ایک مصنف کی حیثیت سے میرے لیے انٹرنیٹ کبھی بھی اس قدر معجزاتی طور پر انسانی نہیں معلوم ہوا جتنا کہ ان حملوں کے بعد کے دو ہفتوں میں معلوم ہوا۔ رابطے میں رہنا کس قدر پراسرار اور اچھا ہے، میرے اندازے سے ہم اس کا دسواں حصہ بھی نہیں سمجھتے۔ مجھے بس اتنا ہی معلوم ہے کہ اس سے میرے ''ساتھ'' پہلے سے کہیں زیادہ لوگ تھے اور نیویارک کے لوگوں نے بھی اس سے ملتی جلتی کیفیت محسوس کی۔ نہیں، شہری یک جہتی محض ''سینڈ'' کا بٹن دبا دینے سے نہیں آجاتی۔ مگر لوگ جب یہ جذبہ محسوس کرتے ہیں تو پہلے سے زیادہ آسانی کے ساتھ رابطہ کرتے ہیں۔ دہشت گردی کا توڑ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔
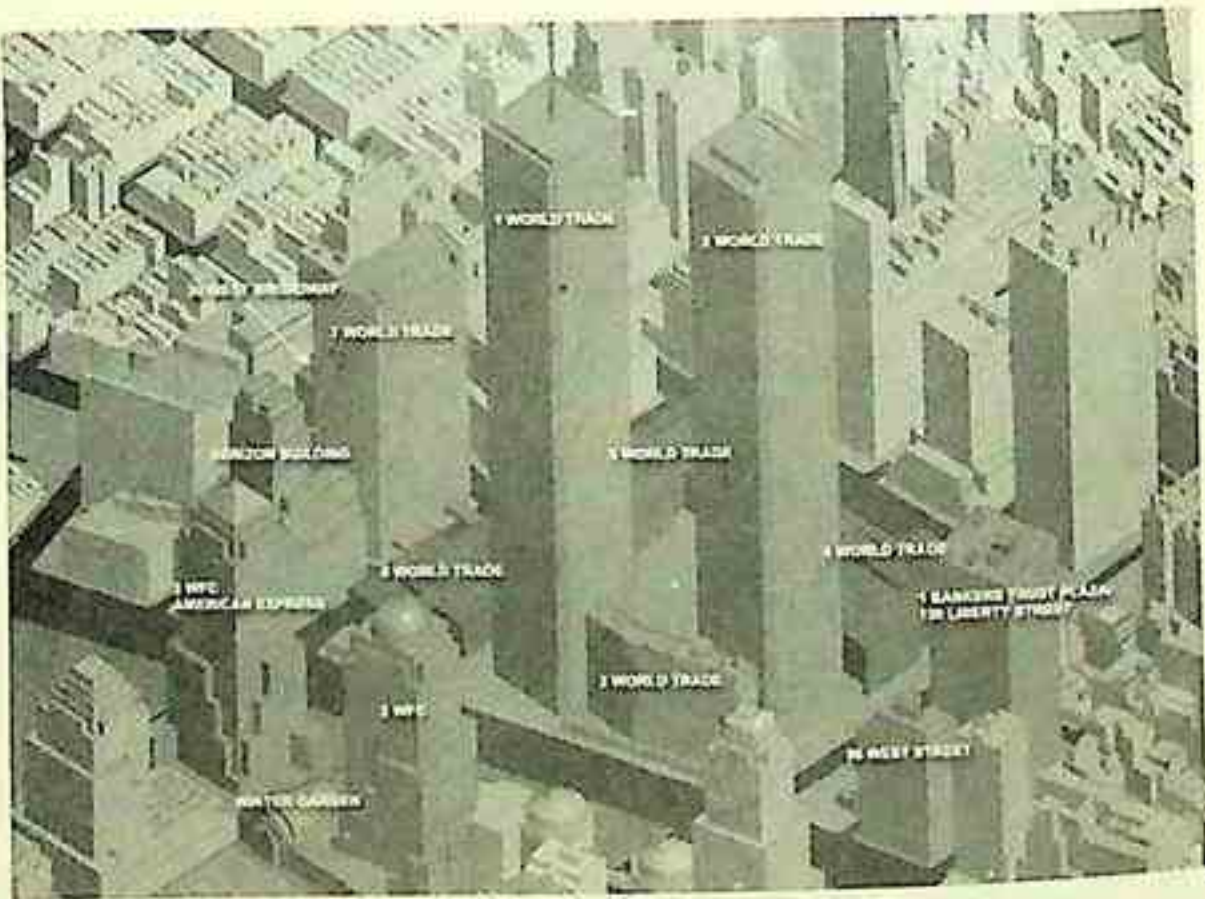
''کیا عمارت بموں نے ڈھائی ہے...''　　بشکریہ: سی این این

پیٹر کیری انگریزی کے مستند ناول نگاروں میں سے ایک ہیں۔ اور ان کو اس سال کا بوکر ادبی انعام ملا ہے۔ بوکر ادبی انعام کے علاوہ بھی ان کو کئی انعام مل چکے ہیں۔ ان کا تعلق آسٹریلیا سے ہے مگر ادھر کافی عرصے سے نیویورک میں رہ رہے ہیں۔ گیارہ ستمبر کے واقعات کے بارے میں انہوں نے برطانوی اخبار "دی آبزرور" کے ادبی مدیر رابرٹ میکرم کے نام ایک خط لکھا جو "دی آبزرور" میں ۲۳ ستمبر ۲۰۰۱ء کو شائع ہوا۔ اس خط میں شہر کے واقعات پر ایک دل خراش مایوسی، پھر شہر پر اپنے فخر کا اظہار ہوا ہے جو معاصر افسانوی ادب کی اس زندہ و توانا شخصیت کے ذاتی احوالِ واقعی سے عبارت ہے۔

پیٹر کیری

ترجمہ: آصف فرخی

دعا کس سے مانگیں

پیارے رابرٹ،

پچھلا ہفتہ ایک بڑا سا دھبا ہے جس میں دن اور رات کے درمیان کوئی تقسیم نہیں۔ وقت ٹوٹ چکا ہے۔ پہلے دن کے واقعات کا لہو رس کر دوسرے دن میں شامل ہو جاتا ہے اور ان سارے طاقت ور جذبات اور پریشان کن نظاروں کو ایک مناسب تسلسل میں رکھ کر دیکھنا مشکل ہے۔

میں یہاں اس دفتر میں بیٹھا ہوا تھا جسے تم خوب اچھی طرح جانتے ہو، اس چھوٹے سے باغیچے کی طرف کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے ایک مسافر بردار طیارے کو پرواز کرتے سنا۔ بہت بڑا طیارہ اور بہت نیچی پرواز۔ لمحاتی طور پر میں پریشان ضرور ہوا۔ ہوائی حادثہ میرے ذہن میں آیا، مگر ایک لمحے کے لیے۔ اس کے بعد شاید دس منٹ ہوئے ہوں گے کہ میں باہر سڑک پر نکل کر آیا اور وہ بھی اس لیے کہ ایک فاقہ زدہ بلّی کے لیے بلّیوں والے کھانے کا ڈبا خرید لوں۔ میں گھومتا ہوا کونے پر کھانے پینے کی دکان (ڈیلی/deli) پہنچا۔ جب میں داخل ہوا تو ایک نوجوان ایشیائی

امریکی خاتون میری طرف دیکھ کر مسکرائی، جس طرح نیویورک والے اس وقت مسکراتے ہیں جب کوئی عجیب بات ہو رہی ہو۔ میں حیران ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ میری کوئی شاگرد ہے جسے میں بھول گیا ہوں۔

میں نے بلّی کا کھانا لیا اور اچانک احساس ہوا کہ ڈیلی کا ریڈیو بہت زور سے بج رہا ہے۔ کیا بات ہے؟ میں نے لڑکی سے پوچھا۔ اس نے کہا: ایک طیارہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں کریش کر گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دہشت گردوں کا حملہ ہے۔ مجھے ذرا بھی تامّل نہیں تھا۔ چھوٹے سے دروازے میں نصب لاؤڈ اسپیکر کے پاس ایک بھیڑ اکٹھا ہونے لگی تھی۔ وہ بڑھ کر سڑک تک آگئے اور ڈبلیو ٹی سی کی طرف دیکھنے لگے۔ اوپر کی منزلوں سے دھواں اٹھنے لگا تھا۔

بازیافت میں یہ لہجہ معصوم اور امیر پرستانہ لگتا ہے۔ ہمیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ یہ کتنا بڑا حادثہ ہوا ہے۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ میری بیوی اس عمارت میں ہے، اس لیے نہیں کہ اس نے مجھے یہ بتایا تھا یا بچوں کو بتایا تھا کہ وہ کدھر جا رہی ہے مگر اس لیے کہ ہم تینوں مردوں کو معلوم تھا کہ یہ اس کا پسندیدہ وقت تھا جب رعایتی قیمت والے کپڑے تلاش کرنے کے لیے ''سنچری ۲۱'' میں جاتی تھی، شمالی ٹاور سے سڑک کے پار۔ وہاں جانے کے لیے ٹریڈ سینٹر کا نکارس (concourse) کے اندر سے ا اور ۹ سب وے میں سے جانا پڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ تمہیں ٹی وی کے ذریعے سے سنچری ۲۱'' کا پتہ ہوگا...... حادثے کا جل کر راکھ ہوا، ٹوٹا پھوٹا جگ سا (jig-saw) جو ابھی تک گرا نہیں ہے۔

میں فون کے پاس ایلی سن کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔ مگر میں سڑک پر جانا بھی چاہتا تھا۔ میں اپنی بیوی کو چھٹی ایونیو سے آتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا، بچوں کے کپڑوں سے بھرے، خریداری کے پلاسٹک کے تھیلے اٹھائے ہوئے۔ ہماری رہائشی عمارت کی لینڈنگ پر مجھے اپنا پڑوسی اسٹو روتا ہوا ملا۔ اس نے جہاز کو عمارت میں گھستے ہوئے دیکھا تھا۔ بہت سے دوست اسی لمحے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے دماغ کے گودے میں یہ بھیانک خواب داغ دیا گیا ہے۔

میرا دوست کاز ویسٹ سائیڈ ہائی وے پر جاگنگ کر رہا تھا اور اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ خالص شر۔ راکی گیارہویں اسٹریٹ میں ایک چھت پر کام کر رہا تھا۔ جب یہ ۷۵۷ جہاز اس کے سر پر سے گزرا تو وہ دوہرا ہو گیا پھر اٹھ کر کھڑا ہوا تو اس نے تباہی کے جہنم کو سڑک پر برپا ہوتے دیکھا۔ اب وہ سو نہیں سکتا۔ اب ہم میں سے کوئی سو نہیں سکتا۔ راکی ساری رات بدن پٹختا اور کراہتا رہتا ہے۔ ہمارا گیارہ سالہ بیٹا چارلی سو نہیں سکتا۔ اس نے جہاز کو آتے ہوئے نہیں دیکھا مگر

وہ بروکلین ہائٹز میں اسکول میں تھا اور اس کے دوستوں نے کھڑکی سے باہر نظر اٹھائی اور وہ سب دیکھ لیا جو انہیں کبھی نہیں دیکھنا چاہیے تھا اور پھر مین ہٹن کے سارے بچّے اخراج کی مشکل اور بے یقینی سے گزرے۔ مین ہٹن جل رہا تھا۔ پل بند کر دیے گئے تھے۔ ان کو نہیں معلوم تھا کہ ان کے ماں باپ کہاں ہیں۔ اب چارلی صبحوں کا سامنا کرتا ہے تو تھکا ماندہ، آنسو بھرا چہرہ لیے ہوئے اور ادھ کھائے سیریل کا نم خوردہ پیالہ میز پر چھوڑ دیتا ہے۔

ہماری سڑک نے ہم سب کو باہر بلالیا۔ ہماری اپنی برادری ٹیلی وژن سے کہیں زیادہ اہم تھی۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ سمٹ آئے، عمارت کی لینڈنگ پر، کپڑے دھونے والے کمرے میں، نکڑ کی ڈیلی پر۔

اپنی راہ داری سے میں نے سڑک پار والی میری این کو دیکھا۔ وہ بچّے کو گود میں لیے ٹہل رہی تھی۔ جس طرح وہ بچّے کو پیار کر رہی تھی، اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے اپنے شوہر کی موت کا اندیشہ ہے۔ اس کے کرب کو محسوس کرتے ہوئے ہم نے چھٹی ایونیو کی طرف دیکھا جہاں آگ بجھانے والے انجن بہت بڑی تعداد میں جمع ہونے لگے تھے۔ وہ شاہراہ پر غلط سمت چلتے ہوئے آرہے تھے اور ان کے ساتھ سیاہ رنگ کی 4WD جن کی چھتوں پر بتیاں نصب تھیں۔

میری این کا شوہر سڑک پر داخل ہوا۔ ہم سب اسے زندہ سلامت دیکھ کر اتنے خوش ہوئے۔ ''لائڈ، لائڈ۔'' ہم نے اسے پکارا مگر اس نے ہماری آواز تک نہ سنی۔ یہ وہ آدمی تھا جو کوئی بہت ہی بری چیز دیکھ آیا تھا۔ اب ہم دوسری عمارت پر حملے کی خبریں سن رہے تھے، پھر پینٹا گن۔ میں کبھی سڑک کی طرف بھاگتا اور کبھی چپ چاپ ٹیلی فون کی طرف، جیسے زنجیر سے بندھا کوئی جنونی ہو۔ میں کہیں بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ ٹیلی فون مجھ سے رہ جائے۔ اپنے پڑوسیوں سے دور بھی نہیں رہ سکتا تھا۔

آخر کار: ٹیلی فون۔ یہ ہماری دوست بی (Bea) ہے جو لوئر براڈوے میں اپنے فلیٹ سے فون کر رہی ہیں، سٹی ہال کے نزدیک۔ اس نے میری بیوی سے بات کی ہے۔ ایلی سن نے سڑک پر سے صدر دروازے کی گھنٹی بجائی تھی، تقریباً اسی وقت جب دوسرا طیارہ ساؤتھ ٹاور سے ٹکرایا تھا، یہاں کے بالکل پاس پڑوس میں۔ بی حواس باختہ تھی۔ اس نے اپنی کھڑکی میں سے لاشوں کو گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ میری بیوی کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے گی مگر نیچے سڑک میدانِ حشر کا نمونہ تھی، دھوئیں کے مرغولے امڈ رہے تھے، پھیل رہے تھے کہ جو گرے یا لڑکھڑائے اسے دبوچ لیں۔ بی نے

کہا کہ وہ ہمارے گھر تک پہنچنے کی کوشش کرے گی، جو ہیوسٹن کے شمال میں صرف پندرہ منٹ کا پیدل راستہ ہے۔

تو مجھے اب یہ معلوم تھا کہ ایلی سن پہلی عمارت سے نکلنے میں کامیاب ہوگئی تھی مگر کیا وہ محفوظ تھی؟ مجھے کیسے معلوم ہوسکتا تھا؟ میں اسی طرح ٹہل رہا تھا جیسے میری این ٹہلتی رہی تھی مگر باہر سڑک پر ہجوم تھا۔ پیدل لوگ شہر سے بھاگ رہے تھے۔ تم ان لوگوں کو فوراً ہی پہچان لیتے، آنکھوں میں جلتا، بھلتا شدید خوف، چہرے سپاٹ مگر بعض دفعہ انسانی رابطے کی کھلی درخواست۔ وہ بڑھتی ہوئی تعداد میں اب بیڈفورڈ اسٹریٹ کی طرف سے بہتے ہوئے آنے لگے۔ ان لوگوں نے شدید خوف کو محسوس کیا ہے، میں نے اس طرح کا کوئی ہجوم کبھی نہیں دیکھا۔

ان ہی کے درمیان، آخر کار، میری بیوی چلی آرہی ہے، صدمے کے کسی نشان سے عاری ہونے کے سبب نمایاں۔ مجھے یہ سمجھنے میں تھوڑا وقت لگتا ہے کہ وہ عمارت کے اندر تھی جب اس پر حملہ ہوا۔ جب میں اس کا تحریر کردہ حال پڑھتا ہوں تب میں پوری طرح سمجھ سکتا ہوں کہ وہ بال بال بچی ہے اور ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ وہ زندہ بچ گئی۔

ہمارے دو بیٹے ہیں جو بروکلن کے الگ الگ اسکولوں میں پڑھتے ہیں اور آج ہم خوش ہیں کہ وہ وہاں ہیں۔ ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہمارا روّیہ مین ہٹن کے بہت سے والدین سے یکسر مختلف ہے جو فوراً ہی برباده شده شہر میں سے ہوتے ہوئے، بند پلوں اور سڑکوں اور زیرزمین ریلوں کے مسائل سے لڑتے ہوئے، اپنے بچوں کو بلانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

بی کا شوہر جان ان میں سے ایک ہے۔ تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟ میں اس پر چیختا ہوں۔ "You're fucking nuts"۔ اسے وہیں چھوڑ دو۔ وہ وہاں محفوظ ہے۔ مگر اس کی بیٹی گھر واپس آنا چاہتی ہے اور وہ باپ ہے اور وسطی شہر میں ٹریفک کے انتشار میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔

حالاں کہ ہم سمجھ رہے ہیں کہ ہمارے بچے بروکلن میں محفوظ ہیں مگر وہ، اسی قدر، اپنے اپنے اسکولوں میں اپنے صدمے جھیل رہے ہیں، یہ جانتے ہوئے کہ ان کی ماں غالباً اسی عمارت میں ہے، اپنے ان دوستوں کو روتے ہوئے دیکھ رہے ہیں جن کے ماں باپ کے دفتر ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں تھے۔ ان میں سے بعض کہانیوں کا انجام بخیر ہوگا، مگر سب کا نہیں۔

ہمارے محلے کو اب سارے شہر سے کاٹ کر بند (Cordon-off) کر دیا گیا۔ اب شناختی نشانی کی ضرورت ہے کہ ہیوسٹن کے آگے سے گزر سکیں یا ۱۴ ویں سڑک سے واپس جاسکیں۔ ۵۹

ویں پل سے گزر کر اور بروکلن کوئنز ایکسپریس وے سے بروکلن ہائٹز تک جان اپنے باولے سفر میں کامیاب رہا۔ وہ اپنی بٹی لیہ کو ایک ایسی ریل پر واپس لے آیا جو خبروں کے مطابق، چل نہیں رہی تھی۔ بی اور جان اور لیہ اپنے فلیٹ میں کئی دن تک واپس نہیں آسکے۔ ہم نے ان کے لیے پاستا پکایا، بستر لگا دیئے اور اس کے بعد جو شامیں آئیں، بی کی باتیں سنتے رہتے جب وہ بیلیے ویو میں غم گساری کا روزانہ صدمہ جھیل کر واپس آتی...... یہ بی ہی تھی جو ان سب لوگوں سے بات کرتی جو اپنی شوہر، بیوی، بچوں اور محبوبوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔

اس رات دیر گئے ہمیں پتہ چلا کہ ایف نمبر کی ریل چل رہی ہے۔ چارلی اپنے عزیز ترین دوست میتھیو کے ساتھ مین ہٹن واپس آیا۔ میں اسے پیدل گھر لے گیا۔ اس نے کہا کہ خالی سڑکیں اسے ''سہار رہی ہیں۔''

ہماری بروکلن کی دوست بیٹسی بھی اپنی کھٹارا گاڑی اور بلّی کے ساتھ مین ہٹن میں پھنس گئی تھی اور اس نے بھی ۵۹ ویں سڑک کے پل کی طرف رُخ کیا جیسے جان نے کیا تھا مگر اب ایکسپریس وے بند ہو چکا تھا اور اس نے ایک گھومتا گھامتا، بھٹکتا ہوا سفر شروع کیا۔ کوئنز اور بروکلن کی گلیوں میں سے گزرتے ہوئے، یہاں تک کہ اس نے اپنے آپ کو...... ہائے، موہ مایا کا جلتا ہوا الاؤ...... ایک اکیلی سفید فام یہودی خاتون کو مشرقی نیویورک کے سخت اور سیاہ فام علاقے میں پایا۔ ''وہ میرے ساتھ اس قدر پیار سے پیش آئے'' اس نے بتایا۔ ''یہ نوجوان راستہ دکھاتے ہوئے مجھے حفاظت سے لے آئے، اس ننھی منّی سفید لڑکی کو اس کے اپنے لوگوں تک پہنچا دیا۔''

اب ہمارا محلّہ کمانڈ سینٹر بن گیا ہے۔ اس شام ہم ہیوسٹن اور چھٹی ایونیو کے کونے پر کھڑے ہوئے، مٹی اٹھانے کی دیوقامت مشینوں اور بھاری بھرکم ٹرکوں کو حرکت میں آتے دیکھ رہے تھے، ایک کے بمپر سے دوسرے کا بمپر لگا ہوا، تباہی کے مرکز تک ختم نہ ہونے والے ایک جلوس کی صورت۔ یہاں ہے امریکا کی ناختتم طاقت اور دولت۔ یہ ہیں ڈرائیورز، جو سپاہیوں کی طرح ہیروز ہیں۔ یہ فوجی گاڑیاں نہیں ہیں بلکہ کنکٹی کٹ اور نیوجرسی، برگن اور ہیکن سیک کی چھوٹی چھوٹی کمپنیوں کی بڑی بڑی گاڑیاں ہیں۔ ان تمام افراد کو بحران کے لیے اٹھ کر مستعد دیکھ کر، کہ امریکی جھنڈے اپنی کھڑکیوں سے لٹکائے ہوئے ہیں اور کان ریڈیو کے ایریل سے چپکائے ہوئے ہیں، مجھے ڈنکرک یاد آ گیا۔ میں متاثر ہو گیا ہوں۔ ہم سب متاثر ہو گئے ہیں۔ ہجوم باہر جمع ہوتا ہے اور ان کے لیے نعرۂ تحسین بلند کرتا ہے۔ میں بھی کسی ہچکچاہٹ کے بغیر یہی کرتا ہوں۔

یہ وہی کونا ہے جہاں جلد ہی ہم ہلاک شدگان اور گم شدگان کے لیے موم بتیاں جلائیں گے، جہاں گیارہ سالہ چارلی اور میں بیس منٹ تک خاموش کھڑے ان تصویروں کو دیکھتے رہیں گے جو واپس نہ آنے والے آگ بجھانے والوں، بیویوں، ماؤں، شوہروں اور بیٹوں کی ہیں۔ آنسو روکنا مشکل ہے۔ ہم اس دردناک طریقے کو دیکھتے ہیں جس طرح ہمارے پڑوسی پھول رکھ رہے ہیں اور شمعوں کو ترتیب دے رہے ہیں۔ ہم تصویروں کے ان سارے لوگوں کو نہیں جانتے مگر آگ بجھانے والوں کو جانتے ہیں۔ ہم ان کے ساتھ خریداری کرتے آئے ہیں۔ ہم سپر مارکیٹ میں قطار میں منتظر کھڑے رہتے ہیں جب وہ اپنے کھانے کے لیے اطالوی بیج اور پاستا خریدتے ہیں۔

خوش مزاج اور رندھی ہوئی آواز والا جیری جو لانڈری میں کام کرتا ہے، اس کونے پر موجود ہے۔ وہ ہمیشہ سڑک پر ہی ہوتا ہے مگر آج رات وہ ستارے اور دھاریوں والا رومال سر سے باندھے ہوئے ہے اور نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔ اس کے تین جوان بیٹے ہیں جو ڈاؤن ٹاؤن میں موجود ہیں، لکڑی کے اٹھائے جانے والے ٹکڑوں کے خطرناک ڈھیر میں کام کر رہے ہیں۔ جیری سے میں گلے ملتا ہوں، اس لیے کہ اس کے علاوہ اور کیا کروں؟ جب اس کے ایک بیٹے کا ہاتھ ضائع ہوتے ہوتے رہ جاتا ہے تو اسے معجزاتی طور پر خورد جراحی کے ذریعے سی دیا جاتا ہے۔ میں دعا مانگ رہا ہوں، جیری کہتا ہے، مانگنے کو بہت سی دعائیں ہیں۔

ہر جگہ موت لوگوں کو چھوکر گزری ہے۔ سڑک پار ہمارے دوست ڈیوڈ نے اپنے بہترین دوست کو کھودیا ہے، جو ایک نومولود بچے کا باپ تھا۔ ریستوران کے مالک سلوانو نے آگ بجھانے والے ایک دوست کو کھودیا ہے، اور چارلی اور میں ویسٹ تھرڈ اسٹریٹ کے منحنی سے فائر اسٹیشن کے باہر پھولوں کے بڑے ڈھیر دیکھ کر رنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ اسٹیشن اس قدر مختصر سا تھا کہ عجائب گھر معلوم ہوتا تھا۔ مگر اب ہم وہاں کھڑے ہیں، چارلی اور میں اور ہم آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور دُعا مانگتے ہیں، حالاں کہ مجھے نہیں معلوم میں کس سے دُعا مانگ رہا ہوں۔ میرے لیے کوئی خدا نہیں ہے۔

ایلی سن کو گھر پر ٹھہرنے کی ضرورت ہے۔ وہ گھر داری کرتی ہے، صفائی ستھرائی اور گھر کے روزمرہ کاموں میں گھنٹوں گزارتی ہے۔ پھر آخرکار وہ اپنے زندہ بچ جانے کے بارے میں ایک پراثر مضمون لکھنا شروع کر دیتی ہے۔ وہ سارا دن کام کرتی ہے اور ساری رات، وہ رُک نہیں سکتی اور رہا میں، تو مجھے باہر ہونا ہے، لوگوں کے درمیان۔ بس اسی سے مجھے سکون ملتا ہے۔ میں ڈیلی میں

ریڈیو کے پاس کھڑے رہنا چاہتا ہوں۔ اس طرح میں اپنے پڑوسیوں کے ساتھ رہ سکتا ہوں۔ ہم ایک دوسرے کو چھوکر دیکھتے ہیں، گلے ملتے ہیں، روتے ہیں اور غصّے کے مارے نیم وحشی ہو رہے ہیں۔ سارے جذبات سطح پر ہیں۔

ایک رات میرا ۱۵ سالہ سیم کہتا ہے کہ اسے شہر میں گھومنا ہے۔ وہ یونین اسکوائر دیکھنا چاہتا ہے جہاں شمعوں اور یادگاروں کا سب سے بڑا ڈھیر ہے۔ ہم ہیوسٹن اسٹریٹ کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں جو اب جنگی علاقہ ہے۔ نیویورک ہاؤسنگ اتھارٹی کے بڑے بڑے ٹرک ملبہ اٹھانے کے لیے تیاری کی حالت میں کھڑے ہیں۔ ہم پہلے مشرق کی جانب اور پھر شمال کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ وہ اب قد میں مجھ سے بڑا ہے اور پدرانہ جذبے کے تحت میرے کندھے پر بازو رکھنا چاہتا ہے۔ ہم چل رہے ہیں تو اس دوران کسی خاص حوالے کے بغیر، وہ مجھ سے کہتا ہے: ''مجھے اس شہر سے محبت ہے۔''

ہم چلتے ہوئے یونین اسکوائر کی طرف آتے ہیں اور مجھے فخر ہے کہ سیم کس پیچیدہ اور کثیر پہلو طریقے سے ان واقعات کے بارے میں بات کر رہا ہے۔ اسے فکر ہے کہ ہمارے غصّے کی وجہ سے مقامی مسلمان نشانہ نہ بن جائیں، انتقامی بم باری کے ذکر پر محتاط ہے مگر بہت غصّے میں ہے، جیسے میں بھی ہوں۔ ہم یونین اسکوائر کی اس غیر معمولی یادگار پر لوگوں کے درمیان کھڑے ہیں جہاں ایٹمی بم کے پاگل پرستار امن پسندوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہیں، غم کی یک جہتی کے عالم میں۔ اس دھماکے کی جلا دینے والی، جان لیوا گرمی ہم سب کو ساتھ لے آئی ہے۔

ہم اتنے بہت سے لوگوں کو دیکھتے ہیں جنھیں ہم جانتے ہیں۔ ہمارے ڈاک خانے کا خوش مزاج چہرے والا آدمی جس کی جھکی جھکی آنکھوں نے اسے ایک پرمذاق اور تقریباً حسین سا انداز بخشا ہے، اندھیرے میں سے نکل کر آتا ہے اور مجھ سے لپٹ جاتا ہے۔

میں اپنے بیٹے سے زیادہ منتقم مزاج ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جوابی حملہ کروں، تباہی مچاؤں، قتل کروں، فنا کردوں ہر اس شخص کو جس نے میرے اس شہر کو یہ صدمہ پہنچایا ہے۔ میں اس خطرناک امریکی کی طرح بن گیا ہوں جس سے دُنیا کو سب سے زیادہ ڈرنا چاہیے۔ یہ مرحلہ جلد ہی گزر جاتا ہے اب یہ گزر چکا ہے۔ مگر ان اوّلین راتوں اور دنوں میں، میں ہلاکت خیز غیظ و غضب سے مغلوب ہو رہا تھا۔

جو کچھ ہوا ہے اس نے ہم سب کو تبدیل کیا ہے۔ بعض تبدیلیاں قطعاً غیر متوقع ہیں۔ ایک

مرتبہ، کوئی سال بھر پہلے، میں نے اپنے بیٹے کو کہتے سنا: ''جب ہم نے عراق پر بم باری کی۔''

''نہیں'' میں نے کہا، ''جب انہوں نے عراق پر بم باری کی۔''

''نہیں'' اس نے کہا۔ ''ہم''۔

اس سے میرے اندر ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ میں اسے نیویورکر بنتے دیکھ کر تو خوش تھا مگر مجھے یقین نہیں کہ مجھے اس کے امریکن بن جانے کی کوئی خواہش ہو۔

مگر ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کے بعد دوسرے دن، جس دن سیم پورے ۱۵ سال کا ہوا، میں نے اس کے لیے ایک بڑی سی سفید ٹی شرٹ خریدی جس کے سامنے کے رُخ پر امریکی جھنڈا بنا ہوا ہے۔ سیم کے لیے ٹی شرٹ خریدنا بہت مشکل ہے مگر وہ یہ ٹی شرٹ فوراً ہی پہن لیتا ہے اور پھر جب ہم دوبارہ ساتھ باہر نکلتے ہیں، لوگوں کے درمیان، اپنے آپ کو ایک عجیب اور خوبصورت سی تسلّی دینے کے لیے ان واقعات کے بیچ جو ہماری زندگیوں میں آن پڑے۔

''مجھے اس شہر سے محبت ہے، ڈیڈ۔ مجھے پہلے سے بھی زیادہ اس سے محبت ہے۔'' میں اس سے اختلاف نہیں کرتا۔

تمہارا

پیٹر۔

بشکریہ: روزنامہ گارجیئن

"سندیپ جوہر نیویورک شہر کے ڈاکٹر ہیں۔" اس یک سطری تعارف کے ساتھ یہ مختصر تحریر "نیو یورک ٹائمز" کی خصوصی اشاعت میں شامل ہے۔ اس تحریر کا عنوان مترجم نے قائم کیا ہے۔

سندیپ جوہر
ترجمہ: آصف فرخی

مُردہ خانہ

یہ مردہ خانہ "بروکس برادرز" (مشہور دکان) کے اندر تھا۔ میں کھلی فضا کے اس حادثاتی مرکز پر کھڑا تھا جو چرچ اور ڈے اسٹریٹ کے کونے پر بن گیا تھا، ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے ملبے کے بالکل برابر کہ اتنے میں پولیس کے ایک سپاہی نے پکار کر آواز دی کہ نمبر ایک لبرٹی بلڈنگ کے اندر مردانہ کپڑوں والے حصّے میں ڈاکٹروں کی ضرورت ہے۔ وہاں لاشیں ڈھیر ہوئی جا رہی ہیں، اس نے کہا اور ملبے کے دوسری طرف ایک عارضی مردہ خانے کو بند کرنا پڑا ہے۔ میں نے رضا کار کے طور پر اپنے آپ کو پیش کر دیا اور بکھرے ہوئے ملبے سے بھری اس سڑک پر چل پڑا۔

یہ حملے کا اگلا دن تھا۔ دھواں اور جلتے ہوئے پلاسٹک کی بو منگل کے دن سے بھی زیادہ تیز تھی۔ سڑک پر کیچڑ تھی اور چوں کہ میں احمقانہ طور پر کلاگ جوتے پہنے ہوئے تھا، اس لیے کیچڑ نے میرے موزوں کو گیلا کر دیا۔

میں اس عمارت میں پہنچا۔ لابی میں، ٹوٹے شیشوں کے درمیان، تھکے ہارے آگ بجھانے والے اور ان کے جرمن شیپرڈ کتے بیٹھے تھے۔ ایک سپاہی دکان کے دروازے پر کھڑا تھا، جس کے اندر سپاہیوں کا ایک ہجوم منڈلا رہا تھا۔ "ڈاکٹروں کے سوا کسی کو مردہ خانے میں اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔" اس نے کہا۔

میں ایک سیاہ پردے سے گزر کر ہچکچاتا ہوا داخل ہو گیا۔ میڈیکل اسکول میں بھی لاشوں سے مجھے گھن سی آتی تھی۔ اناٹومی کی تجربہ گاہ میں بھی میں زیادہ تر دیکھتا ہی رہا جب کہ دوسرے قطع

(ڈائی سیکشن) کرتے رہے۔ قریب کے کونے میں ڈاکٹروں اور نرسوں کا ایک چھوٹا سا گروہ موجود تھا اور ان کے قریب پلاسٹک کا خالی اسٹریچر پڑا ہوا تھا۔ اس گروہ کے پیچھے لکڑی کی میز تھی جس پر ایک نرس اور دو طالب علم اُترے ہوئے چہرے لیے بیٹھے تھے جیسے وہ کسی ہولناک عدالت کے ارکان ہوں۔ دیوار میں بنے ہوئے خانوں میں بروکس برادرز کی قمیصیں بڑے سلیقے سے تہہ کی ہوئی رکھی تھیں۔ وہ خاک دھول میں اٹی ہوئی تھیں، مگر پھر بھی ان کے سرخ اور نارنجی اور زرد رنگ پتہ چل رہے تھے۔ دور کے کونے میں، اس جگہ کے قریب جو دھماکے میں پھٹ پڑنے والا دروازہ معلوم ہو رہی تھی، لاشوں کے نارنجی تھیلوں کا ڈھیر تھا۔ سپاہی اس پر پہرہ دے رہے تھے۔ دکان کے ڈریسنگ روم میں خالی تھیلوں کے پلندے رکھے ہوئے تھے۔

یہ گروہ لاشوں کو اٹھانے کا لائحہ عمل طے کر رہا تھا۔ ایک نوجوان خاتون ڈاکٹر نے کہا کہ ان کا نہیں خیال کہ کسی کو بھی کسی طرح کے فارم پر دستخط کرنے چاہئیں تاکہ کوئی یہ سمجھ نہ لے کہ ہم نے بوریوں کے مندرجات کی تصدیق کر دی ہے، جس کے ہم اہل نہیں ہیں۔ یہ کام، اس نے کہا کہ طبی معائنہ کرنے والے کا ہے۔ کسی نے پوچھا کہ کیا الگ الگ اعضا کے لیے الگ تھیلوں کی ضرورت ہے، مگر کسی کو جواب نہیں معلوم تھا۔ اس گروہ کا سربراہ ایک شخص تھا جو پچاس کے پیٹے میں ہوگا۔ میں نے اس کے بیج پر نظر ڈالی۔ اس پر لکھا تھا: PGY-3۔ وہ تیسرے سال کا ریزی ڈینٹ ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ غالباً میں ہی اس کمرے میں موجود سب سے زیادہ تجربہ کار ڈاکٹر تھا اور اس خیال نے مجھے بے پناہ تشویش میں مبتلا کر دیا۔ میں نے انٹرنل میڈیسن میں ریزی ڈینسی ابھی جون میں ہی ختم کی تھی۔

اس مقام پر آ کر نیشنل گارڈز ایک تھیلا لے کر آئے اور اسے اسٹریچر پر ڈال دیا۔ خاتون ڈاکٹر نے تھیلے کی زپ کھولی اور اس کے مندرجات کا جائزہ لیا۔ ''خداوند کی مادرِ مقدس!'' اس نے کہا اور منھ موڑ لیا۔

اس تھیلے میں ایک داہنی ٹانگ اور پیٹرو کا ایک حصہ پڑا ہوا تھا جس کے ساتھ عضوِ تناسل ابھی تک جڑا ہوا تھا۔ ٹانگ تو زخمی نہیں لگتی تھی مگر پیٹرو کا ٹھنٹھ سا، کچے گوشت جیسا لال تھا اور کٹی ہوئی آنتیں اس میں سے نکلی پڑ رہی تھیں۔ پتلون کی جیب ابھی تک پیٹرو کو ڈھانپے ہوئے تھی اور ریزگاری سے خالی کر لی گئی تھی۔ اس جیب کو ایک الگ تھیلے میں رکھ لیا گیا۔ ایک سپاہی نے کہا کہ اس لاش کے بعض اعضا پہلے لائے گئے تھے اور ان کے ساتھ سیل فون بھی تھا۔ یہ اچھی خبر تھی۔ اگر

اس فون کے اسپیڈ ڈائل پر اہل خاندان کے نمبر موجود ہوئے تو اس کی شناخت جلدی ہو جائے گی۔
مگر شناخت میرا کام نہیں تھا۔ میرا کام پروسیسنگ تھا۔

پانچ منٹ کے بعد تھیلے کی زپ چڑھا دی گئی۔ عمر رسیدہ مرد ڈاکٹر جو کئی گھنٹے سے وہاں کام کر رہا تھا، کہنے لگا کہ اسے جانا ہے۔ دوسری ڈاکٹر نے کہا کہ اسے بھی گھنٹے بھر کے لیے جانا ہے۔ ''کیا آپ فزیشن ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ ''ہاں،'' میں نے جواب دیا۔ ''بہت عمدہ'' وہ بولی۔ ''اب آپ کام سنبھال لیں۔'' پھر وہ مجھے ہدایات دینے لگی کہ جسمانی اعضا کی فہرست کیسے بنائی جائے۔ بنیادی طور پر میرا کام یہ تھا کہ تھیلے کے مندرجات میں سے نکال کر اعضا کے نام پکارتا جاؤں اور ایک نرس انہیں فارم پر لکھ دے گی۔ بس اتنا کام تھا۔

میں دُھند میں تھا۔ میں اس طرح کے کام کرنے کی صلاحیت بالکل نہیں رکھتا تھا۔ میں نے اپنے ان دوستوں کو یاد کیا جنھوں نے افریقا میں میڈیکل کلارک شپ کی تھی۔ انہوں نے مجھے ہولناک المیوں اور مناسب ادویات اور ساز و سامان کی کمی کی گہری مایوسی و بے زاری کے بارے میں بتایا تھا۔ مگر یہاں ہم سامان کی کمی کا شکار نہیں تھے۔ یہ تیسری دُنیا کی میڈیسن نہیں تھی۔ یہ عالم اسفل کی میڈیسن تھی، اصولوں سے عاری۔

ایک اور تھیلا لایا گیا۔ اس میں ایک تلی، انتڑیاں اور جگر کے کچھ حصے تھے۔ یہاں میں افسر اعلا تھا مگر میں پیتھالوجسٹ نہیں تھا۔ میں بس فوری عمل کر رہا تھا۔ اس تھیلے کے اجزا کو ترتیب دینے کے بعد میری طبیعت خراب ہونے لگی۔ میں سَروں سے عاری پُتلوں کے پاس سے گزر کر دھواں بھری کھلی ہوا میں نکل آیا۔

گیارہ ستمبر کے واقعات کو امریکی پریس نے مختلف طریقوں سے ریکارڈ کیا۔ ''نیویورکر'' اپنے ''اشرافیہ'' مزاج کے لیے مشہور ہے اوراس میں شائع ہونے والی تحریروں کو شستہ نثر کا معیار سمجھا جاتا ہے۔ ان واقعات کے حوالے سے اس رسالے نے خصوصی تصاویر اور مضامین شائع کیے۔ چوبیس ستمبر کے شمارے میں نیویورکر کے مستقل عملے اور اس کے قلم کاروں کی تحریریں شائع ہوئیں جن میں اس حملے اور اس کے نتائج کو موضوع بنایا گیا تھا۔ رسالے کے مستقل سلسلے ''ٹاک آف دی ٹاؤن'' میں جان اپڈائیک، جوناتھن فرین زن، ڈینس جانسن، ایرن ایبل فیلڈ اور دوسرے ممتام ادیبوں کی تحریریں شامل ہیں۔ امیتا وگھوش اور سوزن سونٹیگ کی زیر نظر تحریریں یہیں سے لی گئی ہیں۔

انگریزی میں لکھنے والے ہندوستانی ناول نگاروں میں امیتا وگھوش امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ تاریخ، ثقافت اور عصر حاضر کی چپقلش اس کی دلچسپی کے موضوعات رہے ہیں۔ ہندوستان اورپاکستان کے ایٹمی دھماکوں کے حوالے سے گھوش نے بڑا اہم مقالہ لکھا ہے، جس کی تیاری کے لیے وہ لاہور بھی آیا۔ لاہور کے اس سفر میں اس کی ملاقات ممتاز افسانہ نگار اور صحافی مسعود اشعر سے بھی ہوئی جنھوں نے اس مضمون کا ترجمہ کیا ہے۔

امیتاو گھوش

ترجمہ: مسعود اشعر

فیصلہ

۱۹۹۹ء میں ابھی ہم نے بروکلن کے علاقے فورٹ گرین میں رہنا شروع ہی کیا تھا کہ میری اور میری بیوی کی دوستی تعمیرات کے ماہر میاں بیوی فرینک اور نکول دی مارتینی سے ہوگئی۔ فرینک ورلڈ ٹریڈ سینٹر کا کنسٹرکشن منیجر تھا۔ شمالی ٹاور کی اٹھاسیویں (۸۸) منزل پر اس کا دفتر تھا۔ نکول اس انجینئر فرم میں ملازم ہے جس نے ورلڈ ٹریڈ سینٹر تعمیر کیا ہے۔ اس فرم کا نام لیزلی ای رابرٹس ایسوسی ایٹس ہے۔ نکول کو وہاں سرویلنس انجینئر کی حیثیت سے ملازم رکھا گیا تھا۔ وہ اس ٹیم کی ممبر تھی جس

کا کام سارا سال جڑواں ٹاورز کے ڈھانچے کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ اس کا دفتر جنوبی ٹاور کی پینتیسویں منزل پر تھا۔

فرینک گٹھے ہوئے جسم، گھنگھریالے کھچڑی بالوں والا انچاس برس کا امریکی تھا۔ اس کی دونوں آنکھوں کے کونوں پر ایسی گہری لکیریں تھیں جو ہر وقت ہنستے رہنے سے پڑ جاتی ہیں۔ وہ جب بھی ملتا ایسی گرم جوشی سے ملتا جیسے وہ ہمارا رشتے دار ہو۔ جڑواں ٹاور اس کی روٹی روزی کا ذریعہ بھی تھے اور اس کا عشق بھی۔ یہ وہی جذباتی لگاؤ تھا جس کے ساتھ شاعر حضرات دانتے کے عشقیہ گیتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ نکول نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں والی بیالیس برس کی عورت ہے۔ اس کی آنکھوں سے دوستانہ چمک اور ایک قسم کی تیزی جھلکتی ہے جیسے وہ جلدی میں ہو۔ وہ سوئٹزر لینڈ میں بیسل کے مقام پر پیدا ہوئی۔ نیویارک میں عمارتی ڈیزائن کی تعلیم حاصل کر رہی تھی کہ اس کی ملاقات فرینک سے ہوئی۔ ان کے دو بچے ہیں دس سال کی سبرینا اور آٹھ سال کا ڈومینیک۔ ہمارے اور ان کے بچوں نے ہی ہمارے دونوں گھرانوں کی دوستی کرائی۔

۱۹۹۳ء میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے تہہ خانے میں بم کا دھماکا ہوا تو اس کے فوراً بعد ہی فرینک کو وہاں نقصان کا اندازہ لگانے کا کام سونپا گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ چند مہینے کا کام ہے اس کے بعد وہ فارغ ہو جائے گا۔ لیکن اس کام میں وہ ایسا مگن ہوا کہ اس کی یہ نوکری اس کا عشق بن گئی۔

''وہ ان عمارتوں کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے،'' ایک بار نکول نے مجھے بتایا تھا۔ ''اس کی نظر میں یہ عمارتیں انسان کا ایک ناقابل یقین کارنامہ ہیں۔ ان کی جسامت، ان کی تدریجی بلندی اور ابھار، ان کے ڈیزائن اور پھر عمارتی سامان کے استعمال میں جس مہارت اور جس جزرسی کا ثبوت دیا گیا ہے اس نے فرینک کو مبہوت کر دیا ہے۔ وہ ان کی تعریف کرتے نہیں تھکتا۔ ایک بات جو وہ بار بار کہتا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ دونوں ٹاور اتنے مضبوط اور اتنے ٹھوس بنائے گئے ہیں کہ ہوائی جہاز کی ایک ہلکی ٹکر بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔''

منگل کی صبح فرینک اور نکول نے اپنے بچوں کو بروکلین ہائیٹس میں اسکول میں چھوڑا اور ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی جانب روانہ ہوئے۔ سڑک پر لوگوں کا ہجوم کم تھا اس لیے وہ بہت پہلے ہی وہاں پہنچ گئے۔ نکول نے سوچا ابھی دفتر کا کام شروع ہونے میں کافی وقت ہے کیوں نہ فرینک کے دفتر میں بیٹھ کر کافی کا ایک کپ ہی پی لیا جائے۔ وہ دونوں اوپر فرینک کے دفتر پہنچے تو سوا آٹھ بجنے والے تھے۔ آدھ گھنٹے بعد وہ اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھی۔ ابھی وہ باہر نکل ہی رہی تھی کہ اچانک فرش اور دیواریں لرزنے لگیں۔ ایسا لگا جیسے عمارت کو بہت بڑا جھٹکا لگا ہو۔ سامنے کھڑکی سے اونچے اونچے شعلے لپکتے نظر آرہے تھے، جیسے آگ کے ڈیم کا سیلابی پھاٹک کھل گیا ہو۔

صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ شعلے اس کے اوپر والی منزل سے اٹھ رہے ہیں۔ یک دم اسے خیال آیا کہ شاید بم پھٹا ہے۔ وہ اور فرینک دونوں کچھ زیادہ پریشان نہیں ہوئے کیونکہ ان سے زیادہ کون جانتا تھا کہ یہ عمارت کتنی مضبوط ہے اور کتنے چھوٹے موٹے دھماکے برداشت کرسکتی ہے۔ انہوں نے سوچا، جو ہونا تھا ہوگیا۔ خطرہ ٹل گیا ہے اور اس عمارت نے یہ دھماکا برداشت کرلیا ہے۔ اور سچی بات بھی یہی تھی کہ ابتدائی جھٹکوں کے بعد چند سیکنڈ کے اندر ہی اس منزل پر سکون سا چھا گیا تھا۔ اب فرینک نے نکول اور بیس پچیس دوسرے لوگوں کو گھیر کر اس کمرے میں بھر دیا جہاں کم دھواں تھا۔ اس کے بعد وہ سیڑھیاں اور وہ راستے دیکھنے چلا گیا جو آگ لگنے کے وقت بھاگنے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور بتایا کہ اس نے ایک زینہ تلاش کرلیا ہے جو ابھی محفوظ ہے۔ ہم ملبے کے ڈھیر پر سے گزر کر آسانی سے باہر جاسکتے ہیں۔

ملبے کے جس ڈھیر نے سیڑھیوں کا راستہ روک تھا تھا وہ گھٹنوں گھٹنوں اونچا تھا۔ نکول اس ڈھیر پر چڑھ رہی تھی تو اس نے دیکھا کہ فرینک ساتھ نہیں آرہا ہے۔ وہ پیچھے ہی ٹھہر گیا ہے۔ اس نے فرینک کو آواز دی کہ وہ کیوں نہیں آتا۔ مگر وہ وہیں کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ نکول نے اس کی بڑی خوشامد کی، بہت آوازیں دیں مگر وہ نہیں مانا۔ وہ انکار میں سر ہلاتا رہا اور کہتا رہا تم چلی جاؤ۔ اس نے کہا، یہاں کچھ لوگ زخمی ہوگئے ہیں ان کی دیکھ بھال کے بعد وہ فوراً ہی نیچے آجائے گا۔

اس کے بعد فرینک ضرور اپنے دفتر چلا گیا ہوگا کیونکہ اس نے نو بجے کے قریب وہاں سے فون کیا تھا۔ یہ فون اس نے اپنی بہن نینا کو کیا تھا جو مین ہٹن کی ۹۳ نمبر مغربی گلی میں رہتی ہے۔ اس نے کہا فکر نہ کرنا میں اور نکول خیریت سے ہیں۔

نکول بتاتی ہے کہ وہ اور دوسرے لوگ نہایت آرام کے ساتھ نیچے اتر آئے تھے۔ آگے

پیچھے ایک ایک کر کے وہ نیچے اترتے تھے۔ آگ بجھانے والے دوسری طرف بھاگ رہے تھے۔ بہت سی منزلوں پر ایسے لوگ کھڑے تھے جو جان بچا کر بھاگنے والوں کو راستہ بتا رہے تھے۔ عمارت کی نچلی منزلوں میں تو بجلی بھی تھی۔ نیچے اترنے میں انہیں کوئی آدھ گھنٹہ لگا۔ نیچے پہنچتے ہی نکول بروکلن برج کی طرف چل پڑی۔ ابھی وہ پل کے سودو سوفٹ قریب ہی پہنچی تھی کہ پہلا ٹاور گرا۔

''ایسا لگا جیسے ایٹم بم پھٹ پڑا ہو'' اس نے بتایا۔ ''یکلخت چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ بالکل خاموشی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم ایسی دھند میں گھر گئے ہوں جو تیز دھوپ میں آنے والے برفانی طوفان کی چُندھیا دینے والی چمک کی طرح ہمیں اندھا کیے دے رہی ہو۔''

نکول فورٹ گرین پہنچی تو شام اتر رہی تھی۔ بہت سے لوگوں نے اسے فون پر بتایا کہ انہوں نے فرینک کو سیڑھیوں سے اترتے دیکھا تھا لیکن کسی کی اس سے بات نہیں ہوئی تھی۔ اس رات ان کے بچے ہمارے ساتھ رہے۔ نکول خود فرینک کی بہن نینا کے گھر ٹیلی فون کے پاس بیٹھی رہی۔

دوسری صبح نکول نے سوچا کہ اب بچوں کو سچی بات بتا دینا چاہیے کہ ان کے باپ کی کوئی خبر نہیں ہے۔

جس وقت وہ ہمارے گھر آئی اس وقت وہ اور نینا دونوں پُرسکون تھیں حالانکہ وہ دونوں رات بھر جاگتی رہی تھیں۔ نکول کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ لیکن جب اس نے بچوں کو بتانا شروع کیا کہ کل کیا ہوا تھا تو اس کی آواز میں ذرا سی بھی لرزش نہیں تھی۔

بچے پہلے تو منھ پھاڑے اپنی ماں کی باتیں سنتے رہے پھر اپنے کھیل میں مگن ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد میرا بیٹا آیا اور کہنے لگا، پتہ ہے ڈومینیک کیا کر رہا ہے؟

کیا کر رہا ہے؟ میں نے اپنا دل کڑا کر کے پوچھا۔

وہ کان ہلانے کی کوشش کر رہا ہے۔

میں نے سوچا ایسے موقع پر میرے بچے۔ یا کسی کے بھی بچے ایسا ہی کرتے۔ کسی بری خبر کو اپنے دماغ میں پوری طرح جگہ دینے سے پہلے بچے اپنی توجہ بٹانے کے لیے کچھ اور کرنے لگتے ہیں۔

دوپہر کے وقت ہم بچوں کو پارک لے گئے۔ خاصا روشن دن تھا، خوب دھوپ نکلی ہوئی تھی، بچے فوراً ہی سائیکل چلانے میں لگ گئے۔ میں اور میری بیوی ڈیبرا نکول کے ساتھ ایک سائبان کے نیچے بینچ پر بیٹھ گئے۔

"فرینک چاہتا تو آسانی کے ساتھ وہاں سے نکل سکتا تھا۔ پہلے دھماکے اور ٹاور کے گرنے کے درمیان کافی وقت مل گیا تھا۔" نکول بولی۔ "میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ وہ صرف دوسرے لوگوں کو وہاں سے نکلنے کے لیے رک گیا ہوگا۔ اس عمارت کو جتنا وہ جانتا تھا اور کوئی نہیں جانتا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ وہی لوگوں کی مدد کرسکتا ہے۔ اسے ہی یہ کام کرنا چاہیے۔"

نکول نے کچھ سوچا اور پھر بولی "میں سمجھتی ہوں جب فرینک نے اچھی طرح تسلی کرلی کہ میں حفاظت کے ساتھ وہاں سے نکل گئی ہوں تو اس نے وہاں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ میں محفوظ ہوں۔ بچوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی ہے۔ اس لیے اس نے سوچا کہ اسے واپس جاکر لوگوں کی مدد کرنا چاہیے۔ وہ ٹاور سے محبت کرتا تھا۔ اسے ان پر پورا بھروسا تھا۔ خیر، جو بھی ہوا۔ میں تو سمجھتی ہوں یہ اس کا اپنا سوچا سمجھا فیصلہ تھا۔"

یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے؟ بشکریہ: روزنامہ گارجیئن
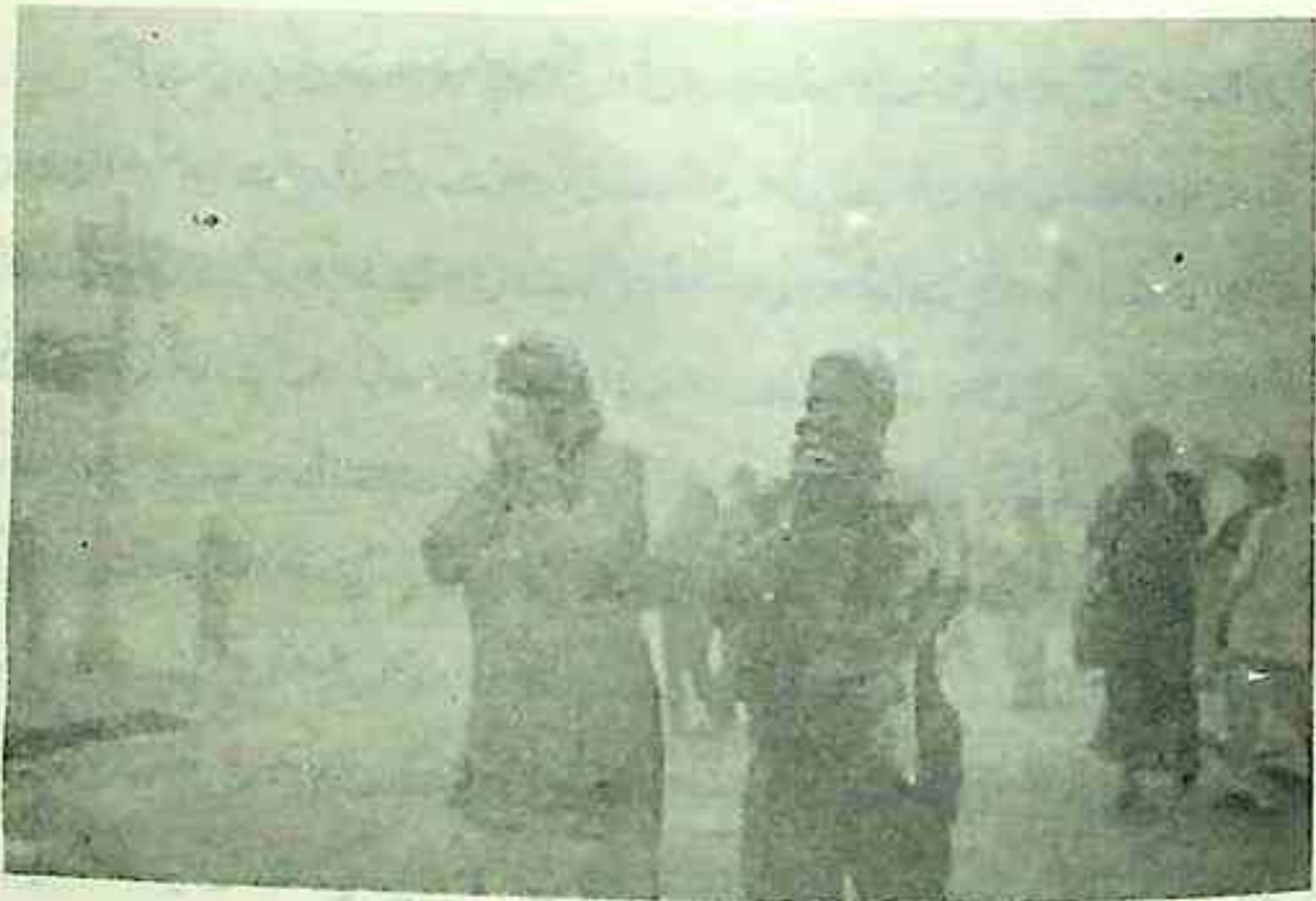
سوزن سونٹیگ کو رجحان ساز ادبی نقاد سمجھا جاتا ہے۔ اس کی کتاب Against Interpretation کو بہت شہرت ملی۔ اس کے بعد اس نے بیماری اور اس کے ادبی مضمرات پر بھی کتاب لکھی۔ اس نے ناول اور افسانے بھی لکھے ہیں۔ جنگی بحران کے دنوں میں انسانی اقدار کی حفاظت کے لیے ادیب کو کس طرح میدانِ عمل میں اترنا پڑتا ہے، اس کا مظاہرہ اس وقت ہوا جب سوزن سونٹیگ نے بوسنیا کے شہر سرائیوو میں بیکٹ کا ڈرامہ "گوڈو کے انتظار میں" اسٹیج کیا۔ سونٹیگ کا شمار امریکا کے ممتاز ترین ادیبوں میں ہوتا ہے۔ تاہم نیویورکر میں اس تحریر کی اشاعت پراس کے خلاف اعتراضات کا طومار بندھ گیا۔

سوزن سونٹیگ
ترجمہ: آصف فرخی

شہر میں چرچا

حقیقت کی دیوپیکر مقدار جو پچھلے منگل کو ملی اور وہ برخود لاف زنی اور صریح فریب کاری جس کی دکان اہم شخصیات اور ٹی وی کے مبصرین نے لگائی ہوئی ہے، ان دونوں کے درمیان بے تعلقی چونکا دینے والی اور افسردہ کردینے والی ہے۔ جن آوازوں کو واقعات پر تبصرہ کرنے کی اجازت ملی ہوئی ہے، ایسا لگتا ہے کہ وہ ایک ایسی مہم میں ایک دوسرے کی شریک ہوگئی ہیں جس کا مقصد عوام کو بچہ بنا کر رکھ دینا ہے(infantilize)۔ اس بات کا اعتراف کہاں ہے کہ یہ "تہذیب" اور "آزادی" اور "انسانیت" اور "آزاد دُنیا" پر "بزدلانہ" حملہ نہیں ہے بلکہ یہ خود اعلان کردہ عالمی سُپر پاور پر حملہ ہے جو امریکا کے بعض مخصوص اتحاد اور اعمال کے نتیجے میں کیا گیا ہے۔ کتنے امریکی شہری ہیں جو عراق پر مسلسل امریکی بم باری سے باخبر ہیں؟ اور اگر "بزدلانہ" کے الفاظ استعمال ہی کرنے ہیں، تو بہتر یہ ہوگا کہ یہ ان کے لیے زیادہ مناسب ہیں جو جوابی کارروائی سے دور، آسمان کی اونچائی سے مارتے ہیں، بجائے ان کے جو دوسروں کو مارنے کے لیے خود مرجانے کے لیے تیار ہیں۔ بہادری

کے معاملے میں (جو اخلاقی طور پر غیر جانب دار خوبی ہے): منگل کے قتلِ عام کے ذمے دار افراد کے بارے میں جو بھی کہا جائے، وہ بزدل نہیں تھے۔

ہمارے رہنما ہمیں یہ یقین دلانے پر مُصر ہیں کہ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ امریکا خوف زدہ نہیں ہے۔ ہمارا جذبہ قائم ہے، حالاں کہ یہ دن ایسا ہے کہ رسوائی کے عالم میں یادگار رہے گا اور امریکا اب حالتِ جنگ میں ہے۔ مگر سب ٹھیک ٹھاک نہیں ہے اور یہ پرل ہاربر نہیں تھا۔ مشینی پتلے جیسا ہمارا صدرِ مملکت ہے جو ہمیں باور کرا رہا ہے کہ امریکا سربلند کھڑا ہے۔ عوامی شخصیات کی ایک وسیع تعداد، وہ بھی جو عہدے پر قائم ہیں اور وہ بھی جو اب منصب پر نہیں رہے، جو اس انتظامیہ کی اختیار کردہ ان بیرونِ ملک پالیسیوں کے شدید مخالف ہیں، بظاہر اس کے سوا کچھ کہنے کے مختار نہیں ہیں کہ وہ صدر بش کے پیچھے متحد ہیں۔ امریکی جاسوسی نظام کی نا اہلی، امریکی خارجہ پالیسی کے سامنے موجود راستے، خصوصاً مشرقِ وسطیٰ میں اور یہ کہ فوجی دفاع کا "اسمارٹ" پروگرام کن اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے، ان سب پر بہت زیادہ غور و فکر کی ضرورت ہے اور شاید واشنگٹن اور دوسری جگہوں پر جاری بھی ہے۔ مگر عوام سے حقیقت کے اس بوجھ کو سہارنے کے لیے نہیں کہا جا رہا۔ سوویت پارٹی کانگریس کے یک آواز سراہے جانے اور اپنے ہی آپ کو خراجِ تحسین پیش کرنے والے بروماٹڈ قابلِ حقارت معلوم ہوا کرتے تھے۔ حالیہ دنوں میں امریکی حکام اور ذرائع ابلاغ کے مبصرین کی ریاکارانہ اور حقیقت کش خطابت ایسی معلوم ہوتی ہے جو کسی پختہ کار جمہوریت کے شایانِ شان نہیں۔

سرکاری اہل کاروں نے ہمیں بتا دیا ہے کہ وہ اپنے منصب کے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ تدبیر اور تحریف پر مبنی ہے: اعتماد سازی اور غم کا بندوبست۔ سیاست، اور ایسی جمہوریت کی سیاست جو اختلاف رائے کی حامل ہو، جو بے لاگ پن کی ترویج کرے، اس کی جگہ نفسیاتی مشورے (سائیکوتھیراپی) کو دے دی گئی ہے۔ آیئے ہم سب ساتھ مل کر غم کا اظہار کریں۔ مگر ہم سب ساتھ مل کر احمق نہ بنیں۔ تاریخی شعور کی ایک آدھ رمق ہمیں یہ سمجھنے میں شاید مدد دے سکے کہ ابھی جو ہوا وہ کیا تھا اور کیا ہوتے رہنے کا امکان ہے۔ ''ہمارا ملک بہت طاقت ور ہے'' ہمیں بار بار بتایا جاتا ہے۔ کم از کم مجھے اس بات سے پوری طرح تشفی نہیں ہوتی۔ اس پر کسے شبہ ہے کہ امریکا طاقت ور ہے؟ مگر امریکا کو بس یہی تو بن کر نہیں رہ جانا۔

بشکریہ: نیویورکر

نیویورک کی تباہ کاری نے کئی پاکستانیوں کو بھی براہ راست متاثر کیا۔ اس میں سے ایک شخص کی یہ روداد انٹرنیٹ پر کئی جگہ درج کی گئی۔ مگر اس کے مصنّف کے بارے میں مزید کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔

عثمان فرمان
ترجمہ: شجاعت علی

پاکستانی امریکن کے قلم سے
ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی کا آنکھوں دیکھا بیان

میری عمر بائیس سال ہے۔ میں پاکستانی اور مسلمان ہوں۔ دس ستمبر ۲۰۰۱ء تک میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی بلڈنگ نمبر ۷ میں کام کرتا تھا۔ میرے بہت سے دوست اور ساتھی ٹریڈ سینٹر کے ٹاور نمبر ا ایک میں کام کرتے تھے۔ کچھ تو اس تباہی سے بچ نکلے مگر اب تک کئی ایک لاپتہ ہیں۔ میں بھی ان خوش نصیبوں میں شامل ہوں جو اتنی بڑی آفت آنے کے باوجود بھی زندہ ہیں۔

میں اس امید کے ساتھ کہ ہم سب ایک ساتھ رہیں گے آپ کے ساتھ اس خوفناک دن کے متعلق اپنے خیالات کا تبادلہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں ذات، مذہب اور وطن کی تفریق سے بالاتر ہوکر اپنے احساسات کو بیان کروں گا۔

میں روزانہ نیوجرسی سے ٹرین کے ذریعے نیویورک آتا جاتا ہوں۔ مجھے اب بھی یقین نہیں ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس دن میں صبح جاگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے ایسی ٹرین پر جانا چاہیے جو مجھے وقت پر وہاں پہنچا دے۔ میں صبح ۷:۴۸ پر روانہ ہونے والی ٹرین پر بیٹھ گیا جس نے مجھے ۸:۲۰ پر ہوبوکن میں اتار دیا۔ وہاں اتر کر میں نے سوچا کہ کچھ کھا لینا چاہیے، لیکن پھر ارادہ ملتوی کر کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر جانے والی ٹرین پر سوار ہو گیا۔ میں صبح ۸:۴۰ پر ورلڈ ٹریڈ سینٹر پہنچ گیا۔ میں ۸:۴۵ پر اس عمارت کی لابی میں موجود تھا اور یہی وہ وقت تھا جب پہلا طیارہ ٹریڈ سینٹر سے آ کر ٹکرایا۔

اگر میں ٹریڈ سینٹر دیر سے پہنچتا یا کھانے کے لیے کہیں بیٹھ جاتا تو مجھے پانچ منٹ کی تاخیر

ہو جاتی اور عمارت سے کچھ فاصلے پر چل رہا ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں اب آپ سے یہاں بیٹھ کر باتیں نہ کر رہا ہوتا بلکہ ملبے اور آگ کی بارش مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ میں مرگیا ہوتا لیکن میں لابی میں تھا اور میں نے پہلے دھماکے کو سنا۔ باہر تعمیرات ہو رہی تھیں اور دھماکا سن کر میں سمجھا شاید کوئی چیز ٹوٹ کر گری ہے۔ میں لفٹ کی مدد سے ۲۷ ویں منزل پر واقع اپنے دفتر میں پہنچا تو وہ خالی تھا۔ شمالی اور جنوبی ٹاورز کے بہت قریب تھے، اتنے کہ اگر میں اپنے دفتر سے ٹاور پر پتھر پھینکتا تو وہ سیدھا اس پر جا کر لگتا۔

میں نے اپنی ماں کو فون کر کے بتایا کہ میں دفتر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اسی وقت میں نے دوسری عمارت میں دھماکے کی آواز سنی۔ میں نے بوسٹن میں فون کر کے اپنے دوست کو جگایا اور اس سے کہا کہ سب کو بتا دو، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں عمارت سے باہر نکلنے والا ہوں۔ میں نے آخری مرتبہ کھڑکی سے نیچے جھانکا تو مجھے ہر چیز ملبے کے ڈھیر تلے دبی ہوئی دکھائی دی۔ جب میں لفٹ کی جانب بڑھا تو میں نے کام کرنے والے لوگوں کو سیڑھیوں کے راستے سے نیچے اترتے ہوئے دیکھا۔ میں نیچے آیا تو لوگ خاموش تھے اور ایک دوسرے کی مدد کر رہے تھے۔ ایک حاملہ عورت کو لوگ سیڑھیوں کے راستے انتہائی احتیاط سے اتار رہے تھے۔

میں نے جو کچھ دیکھا اسے بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ میں اس واقعے کو زندگی بھر فراموش نہیں کرسکتا۔ میرا دل ان لوگوں کے لیے روتا ہے جن کی جانیں اس روز ضائع ہوگئیں اور جو بچ گئے ہیں ان کی تلخ یادوں سے پہلو تہی کرنا کبھی ممکن نہیں ہوگا۔ میرے جو ساتھی ٹریڈ سینٹر سے زندہ نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے وہ طویل انسانی زنجیر بنا کر اس تباہی سے نکل سکے تھے کیوں کہ دھوئیں کے باعث کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اس دن ہر آدمی ہیرو تھا۔

ہم عمارت نمبر ۷ کے شمالی دروازے سے باہر نکلے۔ سیکورٹی اہل کاروں نے ہمیں بتایا کہ شمال کی سمت چلتے رہیں اور پیچھے مڑ کر دیکھنے سے گریز کریں۔ جب میں کچھ آگے جا کر رکا اور میرے ساتھ ایک ہزار افراد نے دیکھا تو پہلے ٹریڈ ٹاور کو گرتا دیکھ کر ہمیں شدید صدمہ ہوا۔ کسی کو بھی اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اب تک یہ منظر تصوراتی معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ پچاسویں منزل سے شیشے اور ملبے کا بادل ہمارے سروں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نے مڑ کر پوری قوت سے بھاگنا شروع کر دیا۔ بھاگتے ہوئے میں گر پڑا اور ایک دن بے ہوش رہنے کے بعد میری آنکھ کھلی۔

جب میں بھاگ رہا تھا تو ٦٠٠ فٹ کی بلندی سے ایک بہت بڑا بادل میری طرف بڑھ رہا تھا۔ بھاگتے ہوئے میں خوف سے گر گیا میرے گلے میں ایک تعویز پڑا ہوا تھا جس پر قرآن کی آیت تحریر تھی۔ ایک یہودی میرے قریب آیا۔ اس نے تعویز پر درج عربی عبارت کو اونچی آواز میں پڑھا اور مجھ سے کہا کہ میں یہ زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ اس نے بروکلن کے لہجے میں مجھ سے کہا کہ شیشے کا بادل ہماری طرف بڑھ رہا ہے، میرا ہاتھ پکڑو، ہمیں جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ اس نے کھڑے ہونے میں میری مدد کی اور پھر ہم نے پیچھے دیکھے بغیر دوڑ لگا دی۔ اگر وہ یہودی میری مدد نہ کرتا تو شیشے کا ملبہ یقیناً مجھے ہلاک کر دیتا۔

میں ٹریڈ سینٹر سے ٢٠ بلاک کے فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا اور دہشت سے ٹریڈ ٹاور نمبر ٢ کی عمارت کو نیچے آتے ہوئے دیکھنے لگا۔ میں خوف زدہ ہو گیا کیوں کہ کچھ لوگ ٹریڈ ٹاور سے ملحقہ گلیوں میں کھڑے ہوئے تھے۔ کسی نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہو گا کہ یہ عمارتیں ملبے کا ڈھیر بن جائیں گی۔ یہ دیکھ کر وہاں کھڑے سب لوگ شدید صدمے اور غیر یقینی کیفیت سے دوچار ہوئے اور انہوں نے ایک مرتبہ پھر پناہ گاہ کی تلاش میں اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا۔ تھرڈ ایونیو میں سنتالیسویں اسٹریٹ پر واقع اپنی بہن کے دفتر تک پہنچنے میں مجھے تین گھنٹے لگے۔ ساری گلیاں ویران تھیں، ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی صرف سائرن کی آوازیں ہر طرف گونج رہی تھیں۔ میں نے گھر پر فون کر کے بتایا کہ میں خیریت سے ہوں اور میں نے اپنے ساتھ کام کرنے والے دوستوں اور کام کرنے والوں کو فون کیے جن کے متعلق مجھے شبہ تھا کہ وہ گم ہو چکے ہوں گے۔

نیو جرسی تک پہنچنے کے لیے مجھے گاڑی مل گئی۔ جارج واشنگٹن برج سے جب میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے دونوں ٹاور صفحۂ ہستی سے مٹ چکے تھے۔ یہ خواب نہیں بلکہ حقیقت میں ایسا ہو گیا تھا۔

اس عظیم المیے کے اثرات ختم ہونے میں بہت وقت لگ جائے گا۔ امریکا کی گلیوں میں لوگوں نے مسلمانوں کے خلاف انتقامی کارروائیاں شروع کر دی ہیں۔ میرے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک پاکستانی عورت کو کچل دیا گیا۔ اس کا قصور صرف یہ تھا کہ اس نے پاکستانی لباس پہنا ہوا تھا اور سر اسکارف سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہمارے خاندان کو بھی یہاں شدید خطرہ ہے۔ میری بہن دفتر جانے کے لیے سب وے کو استعمال کرنے سے ڈرتی ہے۔ میری آٹھ سالہ بہن کے اسکول پر تالا پڑا ہے اور پولیس اس کی نگرانی کر رہی ہے۔

تشدد صرف تشدد کو ہی جنم دیتا ہے اور ایک دوسرے کے خلاف نفرت کا مظاہرہ کرنے سے ہم میں اور ان دہشت گردوں میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہے گا جنہوں نے یہ تباہی پھیلائی تھی۔ اگر اس شخص نے میری مدد نہ کی ہوتی تو میں اس وقت اسپتال میں ہوتا اور اگر مر نہیں گیا ہوتا تو زخمی حالت میں ضرور پڑا ہوتا۔ میری مدد ایسے شخص نے کی جس سے مجھے اچھائی کی توقع نہیں تھی اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذہب، نسل اور رنگ سے بالاتر ہوکر ہم سب اس المیے میں برابر کے شریک ہیں اور یہی وہ اصول ہیں جن پر اس ملک کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

برائے مہربانی ایک لمحے کے لیے اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھیں۔ وہ آپ کے دوست ہیں یا اجنبی۔ کیوں کہ بحران کے وقت اگر آپ کو مدد کی ضرورت پڑی تو آپ سب سے قریبی شخص کو پکاریں گے۔ میری مدد ایک ایسے شخص نے کی جس کے متعلق مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ میری مدد کرے گا۔ اب آپ خود سے یہ پوچھیں کہ آپ کس طرح نیویورک اور واشنگٹن کے لوگوں کی مدد کریں گے؟ آپ خون کا عطیہ دے سکتے ہیں، خوراک، نقد رقم اور کپڑے بھجوا سکتے ہیں۔ پولیس اہلکاروں، آگ بجھانے والے عملے اور امدادی ورکرز کے خاندانوں کی مدد کے لیے نیویورک میں فنڈز قائم کیے جا رہے ہیں۔ لیکن اگر ہم آپس میں لڑتے رہیں گے تو اس سے ہمیں نقصان ہوگا اور دہشت گرد بھی یہی چاہتے تھے کہ ہمارے درمیان خلیج وسیع تر ہو جائے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی اسے پسند نہیں کرے گا۔

میرا نام عثمان فرمان ہے اور میں نے بینٹلے سے فنانس میں گریجویشن کیا ہے۔ میری عمر ۲۲ سال ہے، میں پاکستانی مسلمان ہوں اور میں بھی اس تباہی کی زد میں آیا ہوں۔ اگلی مرتبہ جب ایسا کوئی واقعہ پیش آئے اور آپ غصے میں اس کے خلاف ردعمل کا اظہار کریں تو ان الفاظ کو ضرور یاد رکھیے گا:

''بھائی، شیشے کا بادل ہماری طرف بڑھ رہا ہے، میرا ہاتھ تھام لو اور آؤ، ہم اس تباہی سے دور نکل جائیں۔''

ریبکا اسکاروف
ترجمہ: آصف فرخی

افغان کباب ہاؤس

افغان کباب ہاؤس، سیکنڈ ایونیو اور اے ویں اسٹریٹ کے پُررونق دوراہے پر یورک ویل میں واقع ہے جہاں اطالوی، چینی اور جاپانی ریستورانوں میں دوبارہ زندگی لوٹ کر آ رہی ہے جوں جوں نیویورک گیارہ ستمبر کے حملوں کے صدمے سے جاگ رہا ہے۔ مگر یہ کباب ہاؤس اپنے پڑوسیوں کی طرح نہیں بھر رہا اور اس کی وجہ دل کشی کی کمی نہیں ہے۔ اس ریستوراں کے اندر داخل ہونا، ایک ایسے تہہ خانے میں قدم دھرنے کی طرح ہے جو آپ کو اندر آنے کی دعوت دے رہا ہو۔ یہاں کی ہوا میں نمی کے ساتھ مصالحے کی خوشبو رچی ہوئی ہے جو اس کے نیم تاریک، عجائبات جیسے اندرونی حصے سے مناسبت رکھتی ہے۔ ہر میز پر سرخ سرپوش بچھا ہوا ہے اور گلاس سجے ہوئے ہیں جن میں احتیاط کے ساتھ تہہ کیے ہوئے نیپکن ہیں اور گل دان جن میں سُرخ اور گلابی کارنیشن کے پھول ہیں۔ ٹین برلیپ، فرش سے لے کر چھت تک دیواروں کو ڈھکے ہوئے ہیں۔ کونے کی ایک دیوار پر رنگ دار، پوسٹر کے حجم کے کپڑے پر افغانستان کا نقشہ ٹنگا ہوا ہے۔ کمرے کے دوسری طرف ایک اور نقشہ ہے اور یہ لکڑی کا ریلیف ہے جس میں افغانستان بنا ہوا ہے۔ ان دونوں نقشوں کے درمیان، کھڑکیوں کی دیوار پر امریکی جھنڈا ہے۔ منگل کی شام ساڑھے پانچ بجے ہیں مگر ریستوراں میں ایک ہی گاہک موجود ہے۔

ریستوراں کا مالک از مار ژالائی کہتا ہے کہ اسے اپنے کاروبار کے مستقبل سے خوف آنے لگا ہے۔ ''میں نے پچھلے دو ہفتوں میں ۶۰ سے ۷۰ فیصد کی کمی دیکھی ہے،'' ژالائی نے کہا۔ ''میں آج شام اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھوں گا اگر رات کے کھانے کے لیے چھ، سات یا آٹھ لوگ بھی آ گئے۔''

اگر یہ کاروبار اسی رفتار سے چلتا رہا جس طرح گیارہ ستمبر سے چل رہا ہے تو ژالائی کو اندیشہ ہے کہ وہ اپنے واجبات ادا نہیں کر سکے گا اور دکان بند کرنا پڑے گی۔ ''میرا کاروبار اچھا تھا اور خوب

گاہک تھے" ژالائی کہتا ہے۔ "اب لوگ ہم سے کترا رہے ہیں، اور وہ 'افغان' کے نام کی وجہ سے۔"

کاروبار میں مندی کو یہ بات اور بھی پیچیدہ بنا رہی ہے کہ لوگ ٹیلی فون کر کے ژالائی کو اور اس کے ہوٹل کو دھمکیاں دے رہے ہیں۔ ایسے ہی ایک فون کال میں پوچھا گیا کہ کیا یہ ریستوراں طالبان کا حصہ ہے۔ بعض اور ٹیلی فون کال زیادہ سنگین ہوتے ہیں۔ "دفع ہو جاؤ، ورنہ ہم تمہارے ریستواں کو جلا دیں گے، تمہیں اور تمہارے خاندان کو مار ڈالیں گے" ایک ٹیلی فون کال پر دھمکی ملی۔ ژالائی کا خیال ہے کہ کوئی اسے ذاتی طور پر نقصان نہیں پہنچائے گا مگر اس نے تسلیم کیا کہ "یہاں، پاگل لوگ بھی ہیں" اور اس نے کہا کہ وہ اپنی ٹیکساس نژاد بیوی اور آٹھ سال کے بیٹے کی طرف سے پریشان ہے۔

خوف زدہ زندگی ژالائی کے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ وہ بیس برس پہلے افغانستان سے فرار ہوا تھا جب روس سے جنگ کے دوران اس کا سارا خاندان قتل کر دیا گیا تھا۔ ژالائی افغانستان کے جیل میں بند رہا اور اپنے ملک سے بھاگنے پر مجبور ہو گیا اور آخرکار امریکا جا پہنچا۔ اس نے پھر واپس مڑ کر نہیں دیکھا۔ "میں نے اس پورے وقت کو اپنے ذہن سے محو کر دیا ہے" ژالائی کہتا ہے۔ "افغانستان میں کسی سے بھی میرا رابطہ نہیں ہے۔ میں اب یہاں ہوں اور یہی میرا ملک ہے۔" امریکا اور افغانستان میں جنگ کی صورت میں، ژالائی کا کہنا ہے کہ وہ اپنے سابق وطن کے خلاف ہتھیار اٹھا لے گا، حالاں کہ وہ اپنے ملک اور اس کے لوگوں کو اپنائیت کے ساتھ یاد کرتا ہے۔

"افغانستان کے لوگ بہت اچھے ہیں" اس نے کہا۔ "ہم ہمیشہ سے آزاد قوم رہے ہیں۔ جب آزادی کے مجاہدین نے روس کے خلاف کامیابی حاصل کر لی تو وہ اقتدار کی خاطر آپس میں لڑنے لگے۔ اس بیچ میں طالبان آن پہنچے۔"

ژالائی کی نوجوانی کے زمانے کا افغانستان اب باقی نہیں رہا۔ "طالبان مذہبی جنونی ہیں" اس نے کہا۔ "یہ تو اسی طرح ہے جیسے ایک ہزار سال پہلے تھا۔ کسی کے کوئی حقوق نہیں ہیں۔ عورتیں کام نہیں کر سکتیں، سڑکوں پر چل پھر نہیں سکتیں۔ ہر روز بھوک سے اور بم باری کے نتیجے میں لوگ مر رہے ہیں۔"

ژالائی مسلمان ہے اور اس طرح کے جہاد کے خلاف ہے۔ "اسلام بے گناہ شہریوں کے خلاف جنگ کی تلقین نہیں کرتا۔" اس نے کہا اور اسامہ بن لادن کو "عقل سے عاری" قرار دیا۔

''بن لادن جیسے لوگوں سے برسوں پہلے نمٹ لینا چاہیے تھا'' ژالائی کہتا ہے۔''اگر آپ کے پاس سیبوں سے بھری ٹوکری ہو اور اس میں سے ایک سیب داغی نکل جائے تو اس سے ساری ٹوکری تو خراب نہیں ہو جاتی۔ ایسے وقت میں لوگوں کو اتحاد قائم کرنا چاہیے، نفرت اور تقسیم نہیں۔''

ژالائی کو قوی احساس ہے کہ امریکی حکومت کو کچھ کرنا چاہیے تاکہ ہر شخص اپنے آپ کو محفوظ سمجھ سکے، اس لیے کہ بقول اس کے،''اگر لوگ خوف کے عالم میں زندہ رہیں، ہوائی سفر سے خوف زدہ رہیں، گھر کے باہر نکلنے سے خوف زدہ رہیں تو معیشت برباد ہو جائے گی۔''

اس کے باوجود جب نیویارک بحال ہو جائے گا تو کیا وہ افغان کباب ہاؤس کو باقی بچ جانے والوں میں شمار کر سکے گا؟

بشکریہ: روزنامہ گارجیئن

صحافی تو صحافی، نیویورک کے سانحے نے تخلیقی فن کاروں پر گہرا اثر مرتّب کیا ہے۔ ''نیویورک ٹائمز'' میں ۲۰/ ستمبر ۲۰۰۱ء کو شائع ہونے والا یہ مضمون امریکی ناول نگاروں کے حوالے ہے جن کے تخیل پر ارد گرد کی حقیقت نے عجیب انداز سے شب خون ماردیا۔ کیا حقیقت واقعی افسانے سے عجیب تر ہوتی ہے؟

ڈینیشیا اسمتھ

ترجمہ: رفاقت حیات

ناول نگار اپنے مواد کو دوبارہ جانچتے ہیں

پچھلے ہفتے کے دہشت گرد حملوں کے بعد کے گھنٹوں میں، امریکی ناول نگار، جو چاہے ان دہشت ناک واقعات سے دور دراز کے موضوعات میں الجھے ہوئے ہوں یا نہ ہوں، انہوں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں، غیر متعلّق ہو کے تو نہیں رہ گیا؟

اس ہفتے نامور ادیبوں کے ایک نمائندہ حلقے نے اس بات کو ظاہر کیا کہ بہت سوں نے عارضی طور پر اپنے کام کے بارے میں خود سے سوال کیے، لیکن آخر کار یہ ہوا کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کی قدر و قیمت اور افادیت کا اثبات کیا۔

جان اپڈائک فن کی دنیا کے بارے میں ایک ناول لکھ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جب انہوں نے سانحے کے متعلق سنا تو اپنا کام اور اس کا پورا موضوع بالکل معمولی محسوس ہوا۔ وہ بولے کہ پھر انہیں احساس ہوا کہ لکھنے کے عمل کو جاری رکھنا ہی میری واحد پناہ گاہ ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس میں گم کر سکتے تھے۔ اپڈائک نے کہا کہ ناول نگار ہونے کی حیثیت سے شہری نظم و نسق کے لیے یہ میرا عطیہ ہے۔

زیادہ تر ادیبوں نے یہ کہا کہ اگرچہ اب دُنیا ہمیشہ کے لیے بدلی ہوئی محسوس ہوتی ہے لیکن وہ روایتی قسم کے مواد یا عام زندگی کے موضوع سے دست بردار ہونے کی طرف مائل نہیں ہیں۔
روزی لین براؤن، جنہوں نے اپنا حالیہ ناول ''صرف آدھا دل'' گھریلو زندگی پر شہری حقوق کی

تحریک کے اثرات کے بارے میں لکھا ہے، یہ کہا کہ ''میں نہیں سمجھتی کہ اس بارے میں لوگ کہانیاں کہنے میں اپنی دلچسپی کھو دیں گے کہ عام لوگ کس طرح زندگی گزارتے ہیں''۔ ''جب ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے پہلا جہاز ٹکرایا'' انہوں نے کہا ''عام لوگ اپنی زندگی گزار رہے تھے۔ اپنی کافی میں کریم ڈالتے ہوئے، ٹیلی فون اٹھا کر دن آغاز کرتے ہوئے ان زندگیوں کا عامیانہ پن ہی وہ عنصر ہے جو ہمیں گرفت میں لے لیتا ہے۔''

''لیکن کوئی بھی ادیب پچھلے ہفتے کی دہشت گردی کے شدید اثر سے پوری طرح بچ نہیں سکتا،'' ٹم اوبرائن نے کہا جو اپنے ناول ''جولائی'' کے درمیان میں ہیں۔ اس کا تعلق بھی ان کے اکثر ناولوں کی طرح ویت نام سے ہے۔ ''جب کسی اعصاب شکن واقعے کی یاد ناول میں پوری طرح نمایاں نہ ہوتو وہ اس میں پنہاں ہے۔'' اوبرائن نے کہا۔

''ویت نام صرف کوئی عارضی چیز نہیں تھی'' انہوں نے کہا۔ ''ویت نام ہمیشہ ہمارے ساتھ ہے۔ جیسے ٹروجن لڑائی ہمیشہ ہمارے ساتھ ہے اور دوسری جنگ عظیم بھی۔''

انہوں نے کہا کہ پچھلے ہفتے کے حملوں سے پہلے ان کے ناول میں خدا ایک ضمنی کردار کی طرح، ایک فرشتے اور ایک آواز کی طرح ظاہر ہوا۔ پچھلے ہفتے کے بعد انہوں نے خدا کو ایک پورا باب دینے کا فیصلہ کیا۔ ''صرف خدا جانتا ہے کہ کیا وہ اس کتاب میں شامل بھی ہوگا کہ نہیں،'' انہوں نے مزید کہا۔

کچھ ادیبوں نے قیاس آرائی کی کہ یہ سانحہ چپ چاپ دھیرے دھیرے ان کے کام میں داخل ہوگا۔ جون ڈڈئین(Didion) نے کہا، جس کے ناول اور مضامین ہمیشہ اپنے اندر خوف کا احساس رکھتے ہیں، کہ ہوسکتا ہے، اس کے کام میں تشوتش کی دوسری کوئی سطح چھپی ہو اور بوبی این میسن نے جنہوں نے ویت نام کی جنگ کے ناقابل تلافی اثر کے بارے میں ایک ناول ''دلیس میں'' لکھا ہے، اس خیال کا اظہار کیا کہ انہیں بالکل مختلف طرح سے ان مناظر کو لکھنا پڑے گا جن میں کردار جہاز میں سفر کر رہے ہیں۔ کوئی کردار اس طرح خوفزدہ ہوسکتا ہے، جیسے وہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا ہو۔ میسن نے کہا کہ کہانی جو بھی ہو، اگر یہ منظر اس میں شامل ہوا تو کردار کی واضح اور مکمل پریشانی کا احساس بھی ہوگا۔

وارڈ جسٹ نے نکتہ اٹھایا کہ تشدد کی یادیں جس طرح پڑھنے والے کے شعور میں رہیں گی اسی طرح ناول نگار کے شعور میں بھی ہوں گی۔ جسٹ اپنے نئے ناول کی کاپی ایڈیٹنگ کے مرحلے

میں مصروف ہیں۔ اس ناول کا نام ''موسم، برلن میں'' ہے جو جرمنی کی تیسری جمہوری حکومت اور عالمگیر بربادی کے متعلق ہے۔ اس نے کہا کہ گزشتہ ہفتے کے واقعات مستقبل کے Pentimento میں رہیں گے۔ تصویر کے سائے میں چھپی ہوئی تصویر میں، بالکل اسی طرح جب آپ ماتیس Matisse کی پینٹنگ کو دیکھتے ہیں اور خوبصورت منظر کو تصویر اکثر پچھلے کام پر بنائی گئی ہوتی ہے۔ آپ اسے دیکھ نہیں سکتے لیکن وہ وہیں پر موجود ہوتی ہے۔

موجودہ سانحے کی روشنی میں کاپی ایڈیٹنگ کا گھسا پٹا مرحلہ بہت معمولی محسوس ہوا، جسٹ نے کہا۔ ''آپ سوچتے ہیں، کیا فرق پڑتا ہے اگر فل اسٹاپ یہاں وہاں لگ جائے۔ ایک معنی میں آپ سوچ رہے ہیں کہ چیزوں کی بھرمار میں یہ کوئی اطمینان بخش معاملہ نہیں ہے۔ اس نے کہا ''لیکن پھر احساس ہوگیا میں اس کتاب کی اشاعت سے ناخوش نہیں ہوں۔'' اگرچہ ناول کا واقعہ ۱۹۹۹ء میں ان حملوں سے بہت پہلے رونما ہوتا ہے، ''لیکن اسے سانحوں کے بارے میں ایک آدھ لفظ ضرور کہنا ہے کس طرح کردار اس سے ملتے ہیں اور اسے یاد رکھتے ہیں۔''

''اور ناول کی بُنت کے حوالے سے، اپنے زمانے اور حال کو فکشن کا موضوع بنانے کے متعلق ناول نگاروں کو پریشان ہونا چاہیے'' رابرٹ اسٹون نے کہا۔ ۱۹۹۸ء میں شائع ہونے والی ان کی کتاب ''دمشق گیٹ'' ایک صحافی کے بارے میں ہے۔ جو پہاڑی گرجا گھر کو بم سے اڑاتے وقت یروشلم میں اسرائیلی فلسطین کے تنازعے میں ملوث ہوگیا تھا۔

''آپ کو بہت محتاط رہنا پڑتا ہے جب آپ اہمیت کے حامل بڑے واقعات سے براہ راست رجوع کرتے ہیں'' اسٹون نے کہا۔ ''کیوں کہ وہ بے ہودہ تحریر بن سکتی ہے۔ اس نے یاد کیا کہ دمشق گیٹ میں ''نسل کشی'' کے لفظوں کو استعمال کرتے ہوئے اسے کس طرح اپنے آپ سے کشتی لڑنی پڑی تھی۔

''میں نے اسے ہر وقت صفحے پر دیکھا ہے۔ میں نے سوچا، کیا میں اپنے عہد پر سواری گانٹھ رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ یہ لفظ مناسب ترین ہیں کیونکہ اس کا کردار ایک صحافی ہے جو براہ راست اپنے زمانے کے واقعات میں ملوث ہے۔

اس ہفتے کچھ ادیبوں نے آرٹ کی انیسویں صدی کی جمالیات کو دہرایا (جو ان دنوں کی حمایت سے عاری ہے) جو انتہائی مفید، اخلاقی طور پر بلند کرنے والی اور انسان کی عام صحت کے لیے کسی طرح فائدہ مند ہے جوائس کیرل اوٹس نے المیے کے کلاسیکی فن کے بارے میں گفتگو کی۔

ان کے مطابق ''فن تشدّد کی تصویر کشی کرتے ہوئے اسے انسانی بنانے کی کوشش کرتا ہے اور انسانی جذبے کو اس میں شریک ہونے کی دعوت دیتا ہے۔''

مس براؤن نے کہا کہ اخباری بیانات کے برعکس ایک ناول لوگوں کو اعلیٰ سطح کا سچ فراہم کرتا ہے۔ ''یہ لوگوں کو یاد دہانی کرواسکتا ہے کہ ہر چیز کتنی پیچیدہ ہوتی ہے اور کتنا نازک ترین فرق رکھتی ہے۔ یہ چیزیں میڈیا پیش نہیں کرسکتا۔'' اس نے کہا'' کوئی سوچتا ہے: میرے خدا میں جو کچھ کر رہا ہوں کتنا معمولی ہے؟ اس کی ضرورت کس کو ہے؟ لیکن شاعر کا کام ہمیں دھیما کر دیتا ہے اور ہمیں چیزوں پر ایک مختلف رفتار و آہنگ کے ساتھ نظر ڈالنے پر اکساتا ہے۔''

اوبرائن، سوفوکلیز اور کیساندرا جیسی شخصیات کے نام لے کر ادیب کی پیغمبرانہ قوت کی بات کرتا ہے۔ ''میں محسوس کرتا ہوں کہ ان تمام برسوں میں، میں ویت نام کے بارے میں لکھتا رہا ہوں'' اس نے کہا۔ ''ہم ابھی تک واقعی وہیں پر ہیں۔''

اوٹس نے بھی فکشن کی پیغمبرانہ قوت کا حوالہ دیا۔ وہ محسوس کرتی ہیں کہ گزشتہ ہفتے کے واقعات کے بعد ان کے فکشن کی المناک فضا آج کی صورت حال سے مطابقت رکھتی ہے۔ ''میں تشدّد پر حیران نہیں ہوتی'' انہوں نے کہا۔ ''وہ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتا ہے۔''

وہ ان دنوں نیاگرا فال اور لَو کینال کے ماحولیاتی سانحے کے بارے میں ضخیم ناول لکھ رہی ہیں۔ ''اس کا موازنہ دہشت گردی کے عمل سے نہیں کروں گی،'' مس اوٹس نے کہا۔ ''خاص طرح کے کیمیکل بنانے والوں اور سیاست دانوں کی لاتعلقی اور سفاکی تشویش ناک ہے، جنہیں شہریوں کو بچانے کے لیے کچھ کرنا چاہیے تھا۔'' پچھلے ہفتے کی دہشت گردی نے غالباً میرے احساس کی تصدیق کردی کہ جو کچھ میں لکھ رہی ہوں تھوڑی بہت اہمیت رکھتا ہے'' انہوں نے کہا۔ اسٹیفن کنگ نے کہا کہ انہیں فکشن کی پیغمبرانہ، معالجانہ یا کسی دوسری قوت کے بارے میں خوش فہمی نہیں ہے۔ ''ادیب، فٹ بال کھیلنے والے، اداکار، گلوکار، ہمیں دوسروں کے لیے کھیلنے کے پیسے ملتے ہیں'' اس نے کہا۔ ''میں دنیا کو بہتر جگہ بنانے کی کوئی کوشش نہیں کر رہا تھا۔

بہت زیادہ بسیار نویس ناول نگار کنگ، اپنا صبح کا کام شروع کرنے والا تھا جب ٹیلی وژن پر یہ خبر آئی۔ ''میں نے سوچا، میں یہ نہیں کرسکتا'' اس نے کہا۔ ''لیکن اگر میں کام نہیں کر سکا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کیوں کہ جو کچھ میں کرتا ہوں، اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے'' اس نے مزید کہا۔

وہ اپنے دفتر میں جا بیٹھا اور اس نے کانوں میں روئی ٹھونس لی کہ اس کی بیوی نچلی منزل پر

ٹی وی دیکھ رہی تھی اس کی آواز نہ سنی پڑے۔ ''میں نے اپنا کام کرلیا'' کنگ نے بتایا۔
الیے کے بعد سے اب تک وہ مسلسل لکھ رہا ہے، اس نے کہا۔ ''اس لیے نہیں کہ میں کچھ بانٹنا چاہتا ہوں۔ بلکہ اس لیے کہ اگر ہر کوئی اپنا کام کرتا رہا تو دہشت گرد کبھی نہیں جیتیں گے۔''
کنگ پیر کی شب کو اٹلانٹا بریوز اور فلاڈیلفیا فلیز کے مابین ہونے والے بیس بال کے میچ کو دیکھنے سے خود کو نہیں روک سکے۔ ''پچھلی رات بیس بال کے کھلاڑی اپنا کام کرتے رہے'' اس نے کہا'' چپر جونز نے اننگز کا پہلا شارٹ لگایا اور فلاڈیلفیا کے حمایتی اس کا حوصلہ بڑھاتے رہے: یہی ان کا کام ہے اور تماشائی اپنے کام پر واپس آرہے ہیں۔''

بشکریہ: روزنامہ گارجیئن

اجتماعی غم و غصے کو شخصی وارات سے منسلک کرکے دیکھنے سے واقعات اور مسائل کو سمجھنے، گرفت میں لانے کے لیے جو زاویہ نظر فراہم ہوسکتا ہے، اس کا اندازہ رچرڈ فورڈ کی اس تحریر سے ہوسکتا ہے جو ۱۱/ستمبر کے چند ہی دنوں بعد لکھی گئی۔ کاٹ دار نثری اسلوب اور واقعیت پسندی کی وجہ سے رچرڈ فورڈ کو ہم عصر امریکی افسانہ نگاروں میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ افسانوں کے مجموعوں کے علاوہ سال بھر کے بہترین افسانوں کے انتخاب اور تنقیدی مضامین بھی شائع ہوئے ہیں۔ اس مضمون کے مترجم افسانہ نگار ہیں اور آج کل اپنے پہلے ناول پر کام کر رہے ہیں۔

رچرڈ فورڈ

ترجمہ: رفاقت حیات

آفت کے ماروں سے یہ حملہ ان کی زندگیوں سے زیادہ ان کی اموات بھی لے گیا

وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میرے والد کا انتقال ہوا۔ ۱۹۶۰ء میں وہ ہفتے کی ایک صبح تھی۔ میں سولہ برس کا تھا، میرے والد کی عمر پچپن سال تھی۔ میں ان کی تیز ناہموار سانسوں کی آواز سن کر جاگ اٹھا تھا، لمبی لمبی سانسیں، واقعی لمبی اور میرے ساتھ والے کمرے سے آتی اپنی ماں کی آواز سن کر۔ ہم مس سی پی کے نواح میں ایک نئے گھر میں رہتے تھے۔ ''کیرل''...... میں نے اپنی ماں کو کہتے ہوئے سنا، ''کیرل؟ اٹھ جاؤ۔'' ان کی آواز میں غیریقینی ہوتی ہوئی اور خوف کھاتی ہوئی التجا تھی۔ میرے والد کی لمبی لمبی ناہموار سانسیں جاری تھیں۔ میں اٹھ بیٹھا اور مختصر ہال میں چل کر ان کے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر کی طرف جھانکا۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے اس لیے مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ میری امی بستر پر جھکی ہوئی تھیں یا اس پر بیٹھی تھیں، وہ ابو کو جھوڑ رہی تھیں یا ان کے پاس کھڑی چیخ رہی تھیں۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میرے پاؤں ٹھنڈے تھے کیوں کہ وہ فروری

کا مہینہ تھا اور مجھے اپنے رات کے کپڑوں کا نیلا رنگ یاد ہے اور مجھے یاد ہے کہ میں گھٹنوں کے بل بستر پر چڑھا تھا اور انہیں ہلایا تھا۔ ان کے کندھے کو جھٹکا دیا تھا، چہرے کو تھپتھپایا تھا۔ وہ سوئے ہوئے لگ رہے تھے، شاید خوفناک خواب دیکھ رہے ہوں۔ میں نے انہیں آواز دی، ''ڈیڈی، ڈیڈی۔ اٹھ جائیے۔'' میں ان کے لمبے اور پسینہ بھرے جسم کی خوشبو سونگھ سکتا تھا، ان کے ملائم وجود کو محسوس کرسکتا تھا۔ ان کے ڈھیلے اور نرم اعضاء، ان کے پرسکون گال اور منہ، ان کی لمبی سانسیں بند ہوچکی تھیں۔ میں نے ان کا منہ کھولنے کی کوشش کی تاکہ وہ سانس لے سکیں۔ میں نے ان کی چھاتی کو زور سے دبایا۔ میں نے انہیں حرکت دینے کی کوشش کی۔ میں نے اپنے بازو ان کے کندھوں کے گرد ڈالے اور انہیں ہلایا۔ میں نے اپنی ماں کو کہتے سنا ''اف، میرے خدا۔ نہیں، نہیں'' اور میں نے خوف اور دہشت کو محسوس کیا۔ پیار اور وحشت کو، الجھن اور جسمانی کوشش کو، خوش طبعی کی ضرورت کو، ایک بڑی صلاحیت پر قابو پانے کے لیے اور میں نے ناکامی کو محسوس کیا۔ مختصراً میں نے ایک بیٹے کے تمام چھوٹے بڑے تجربوں کو جھیل لیا۔

ظاہر ہے میں آپ کو اس محبت کے تمام واقعات اور احساسات کے متعلق سب کچھ بتا سکتا ہوں۔ کیوں کہ میرے والد کا انتقال کھڑکی سے جہاز کے ٹکراتے ہوئے گزرنے کی وجہ سے نہیں ہوا تھا، جو انہیں کسی خیال کے بغیر ختم کر دیتا۔ وہ بہت سے اجنبیوں کے سامنے کسی اجنبی کے ہاتھوں مضحکہ خیز طور پر قتل نہیں ہوئے تھے۔ نہ وہ کھڑکی سے کود کر اور نہ نوّے منزلہ عمارت سے چھلانگ لگا کر ہلاک ہوئے تھے۔ نہ وہ پیٹھ میں اڑتا ہوا بم لگنے سے پھٹ کر اور ٹکڑوں میں بٹ کر ہلاک ہوئے تھے کہ اس بات کی خبر ہی نہ ہو کہ کیا ہونے والا ہے، بس صرف امید کرتے رہیں، کرتے رہیں کہ جو کچھ ہوگا، بہتر ہوگا اور میں خود ان کی تصویر تھامے بم سے تباہ شدہ گلی میں کھڑا نہیں رہ گیا۔

نہیں، یقینی طور پر نہیں۔ میرے والد فوت ہوئے، بالکل ویسے ہی جو مرنے کا طریقہ ہے، اپنے گھر میں، اپنے بستر پر، نیند کے عالم میں، اس سے پہلے کہ وہ تیار ہوتے، انہیں یقین ہوتا۔ لیکن وہ میری بانہوں میں تھے اور ان کی اکلوتی بیوی بھی ان کے پاس تھی۔ تقریباً ہر روز میں اس ٹھنڈی صبح کے واقعات کو حیرانگی سے اور غمگینی سے، اعتماد سے اور پچھتاوے سے یاد کرتا رہتا ہوں کہ ان کی مدد کے لیے میرے بس میں جو کچھ تھا، میں نے کیا اور اس بات کو وہ بھی جانتے تھے۔

آڈن کی نظم "Musee des Beaux Art" میں تقدیر سے عاری اڑنے والا اکارس (Icarus) سمندر میں جا گرتا ہے جب کہ نزدیک ہی کھیت میں ایک کسان کو پتہ ہی نہیں چلتا۔ شاید

کسان نے دھماکا سنا ہو۔

آڈن نے لکھا: ایک بچھڑی ہوئی چیخ مگر اس کے لیے یہ کوئی خاص واقعہ نہیں تھا۔ سورج چمکتا رہا۔ جس طرح اسے سمندر میں گم ہوتی سفید ٹانگوں پر چمکنا تھا۔ پانی اور مہنگا نفیس بحری جہاز، جسے لازماً دیکھا گیا ہوگا۔ ایک حیرت ناک منظر کہ ایک لڑکا آسمان سے گرتا ہوا کہیں تو پہنچا ہوگا اور سکون سے تیرتا رہا ہوگا۔

ایک ناول نگار کی تسلیم شدہ حقیقت کہ موت کی اہمیت کی پیمائش اس زندگی کی اہمیت سے کی جاتی ہے جو ختم ہو چکی ہے۔ لہٰذا مرنے کے عمل کو، جیسے کہ گیارہ ستمبر کو بہت سے لوگ مر گئے، ان کے انفرادی وجود پوری طرح تاریکی میں گم ہو گئے، اس نے ایک بادل کی طرح پوری زندگی کو باطل قرار دے دیا۔ ابھی تک ان کی زندگیاں، گرچہ حیرت انگیز طور پر غائب ہو چکی ہیں، ہمیشہ لازوال رہیں گی اور سادہ موت سے دوبارہ ختم نہیں کی جائیں گی۔ وہ زندہ ہیں، ابھی تک، اور خاص طور پر سب کے اندر، پورے لغوی معنوں میں۔

لیکن ابھی تک، زندگی کو چُرانے کا عمل، جس طرح ان کی زندگیاں چوری ہو گئیں، بے دردی کے ساتھ، تشدد کے ساتھ، غیر شخصی طور پر، بدمزگی کے ساتھ، نامناسب طریقے سے، یہ عمل نہ صرف ان کے قیمتی آخری لمحوں کو حیرت زدہ بناتا ہے بلکہ ہم سب پر غلبہ پانے کی دھمکی دیتا ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ہمیں آڈن کے کسان کی جگہ لاکھڑا کرتا ہے جو اپنی زندگی کے دائرے میں ٹھیک طرح سے گواہی بھی نہیں دے سکتا۔ اس طریقے سے، اور ہم جانتے ہیں کہ یہ ہولناک اور ناشائستہ ارادے کے سبب ہے، قیمتی زندگی کو گھٹیا بنا دیا گیا، ہمارے لیے کہ جو یہاں موجود ہیں، جن میں زندگی تھرتھرائے گی، نشان زدہ اور معنی خیز کرے گی ورنہ سب کھو جائے گا۔

غم میں غصّے کے رنگ نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ دہشت کی کارروائی میں زندہ بچ جانے والے، دوسرے زندہ بچ جانے والوں کے ساتھ دہشت کا عمل دہرانا چاہتے ہیں، خاص طور پر اگر دوسروں کا رنگ فرق ہو۔ اگلی چند تحریروں میں یہی عمل نظر آتا ہے۔ ہندوستانی صحافی شو بھان سکسینہ کا یہ مضمون اخبار ''انڈین ایکسپریس'' میں شائع ہوا۔

شو بھان سکسینہ
ترجمہ: حمرا خلیق

جسبیر سنگھ کی کہانی

جسبیر سنگھ کے لیے ۱۹۸۴ء کے ہنگامے ایک بار پھر سے آ گئے۔ دوبارہ خوف و ہراس نے اسے گھیر لیا تھا۔ اس کا عقیدہ ایک بار پھر متزلزل ہو رہا تھا۔ لیکن کچھ امید ابھی باقی تھی۔ ''میں دوبارہ اپنے بال نہیں کاٹوں گا۔ پچھلی مرتبہ جب میں نے بال کاٹے تھے تو میں ۲۰ سال کا تھا۔ وہ میں نے خود کو بچانے کے لیے کیا تھا۔ اب پھر میں ایسا نہیں کر سکتا۔''

وہ ٹیکسی ڈرائیور بتا رہا تھا جو دہلی کے مغربی علاقے اندر پوری سے بچ کر یہاں پہنچا تھا جہاں اس کا پورا خاندان قتل کر دیا گیا تھا۔

''میں امریکی ہوں...... اور میرا خیال ہے کہ امریکی بھی یہ سمجھ گئے ہیں۔''

جمعہ کے روز وہ بروکلن سے ایک مسافر کو چھوڑ کر واپس آ رہا تھا۔ تین آدمیوں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رکی تو وہ تینوں گالیاں دیتے ہوئے اس پر ٹوٹ پڑے۔ اُن میں سے ایک نے اس کی پگڑی اتارنے کی کوشش کی۔ باقی دو نے اُسے ٹیکسی سے گھسیٹ کر باہر لانا چاہا۔ جسبیر سنگھ کو ایک موقع ملا اس نے ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھا اور تیزی سے بچ نکلا۔

''انہوں نے میرا پیچھا کیا۔ میں انہیں گاڑی کا تعاقب کرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔'' وہ یہ یاد کر کے اب بھی خوف زدہ ہو رہا تھا۔ اس نے گاڑی روکی اور اتر کر سب وے اسٹیشن کے اندر چلا گیا۔ وہاں اس نے اپنے دوستوں کو تلاش کیا۔ آخر آدھے گھنٹے کے بعد اسے ایک دوست مل گیا۔ جب وہ

دونوں سب وے اسٹیشن سے باہر نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ جسبیر کی ٹیکسی توڑی جاچکی ہے۔ اس کے شیشے چکنا چور ہو چکے ہیں۔ سیٹیں پھٹی ہوئی ہیں اور میٹر توڑ دیا گیا ہے۔

جسبیر سنگھ پیچھے کی سیٹ پر ایک تولیہ منہ پر ڈال کر لیٹ گیا۔ اس کے دوست نے ڈرائیور کی سیٹ سنبھال لی۔ ''میں گھر پہنچ گیا لیکن کئی دن تک باہر آنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ مگر اتوار کو پھر کچھ کمانے کی خاطر سڑک پر آنا پڑا۔''

وہ پرانی یادیں جو اس نے دفن کر دی تھیں ایک بار پھر سیلاب کی طرح امنڈ امنڈ کر آنے لگیں۔ وہ مین ہٹن کی دھندلی فضا کو تک رہا تھا۔ ''انہوں نے مجھے تقریباً مار ڈالا تھا۔ ہنگاموں میں انہوں نے میرے پورے گھر کو قتل کر دیا تھا۔ اندر پوری میں میرے پیچھے بیس آدمی لاٹھیاں اور پیٹرول کے ڈبے لے کر دوڑ رہے تھے۔ میری نظروں کے بالکل سامنے انہوں نے ایک شخص کو زندہ جلا دیا تھا۔ پھر میرے پیچھے دوڑے۔ میں اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ لیکن وہ جل رہا تھا۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ میرا پورا خاندان قتل کیا جا چکا تھا۔ میں پانی کے زیر زمین ٹینک میں کود گیا اور چھ گھنٹے اس میں چھپا رہا۔ اس کے بعد مجھے بچا لیا گیا۔''

پرانا قصہ دُہراتے ہوئے جذبات کی شدت سے اس کی آواز رندھی جا رہی تھی۔ اسے اس کے ایک ہندو دوست نے بچایا تھا۔ جسبیر سنگھ کو اپنے سر کے بال اور داڑھی منڈوانا پڑی۔ ''بغیر پگڑی اور داڑھی کے سکھ کیا؟ میں اپنے بال کٹتے وقت کس قدر رویا تھا'' اس نے کچھ دنوں بعد دہلی کو خیر باد کہا اور پنجاب چلا گیا۔ پھر دو سال بعد ایک نئی زندگی کی تلاش میں امریکا آ گیا۔

''میں یہاں بہت سی امیدیں لے کر آیا تھا۔ میں ہندوستان سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔''

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اب سکھوں کو نشانہ کیوں بنایا جا رہا تھا۔ سکھوں کی تو الگ شناخت ہے۔ ''ہمیں عامہ کے ساتھ ملانا بے حد غلط حرکت ہے'' ''جب میں نے ڈبلیو ٹی سی کی عمارت کو گرتے دیکھا تو مجھے بے حد دکھ ہوا۔ میں گردوارے گیا اور متاثرین کے لیے چندہ دیا اور اب وہی لوگ مجھے مارنا چاہتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ میں پگڑی باندھتا ہوں اور داڑھی رکھتا ہوں۔''

''یہ بالکل ۱۹۸۴ء کے دہلی کے واقعہ کی طرح ہے'' وہ پھر بولا۔ ''لیکن ایک بات مختلف ہے۔ اُن ہنگاموں میں کم از کم ہم یہ جانتے تھے کہ ہمیں کون مارنا چاہتا ہے۔ لیکن یہاں تو کوئی بھی، بلکہ ہر شخص حملہ کرنے کا اہل ہے۔ میں گاڑی لے کر نکلتے ہوئے بہت ڈرتا ہوں۔ لیکن خالی گھر پر بھی تو نہیں بیٹھ سکتا۔ آخر ہماری حفاظت کون کرے گا؟''

حسنین جاوید امریکا میں مقیم پاکستانی طالب علم ہیں جن کا یہ احوال ''دی نیوز'' میں مظفر اقبال کے کالم میں شائع ہوا۔ اس کالم کا حوالہ رابرٹ فسک نے بھی دیا ہے۔ مظفر اقبال صاحب نے دنیا زاد کو یقین دلایا ہے کہ یہ تفصیلات اور شخصیت فرضی نہیں ہیں۔ حسنین جاوید کے بارے میں مزید تفصیلات، ان کی حفاظت کے خیال سے میڈیا میں جاری نہیں کی گئی ہیں۔

حسنین جاوید

ترجمہ: آصف فرخی

نفرت کے شکار کا روزنامچہ

پہلا دن: ۱۹/ستمبر ۲۰۰۱ء

میں بیس سالہ پاکستانی طالب علم ہوں اور ہیوسٹن (ٹیکساس، امریکا) میں اپنے اہل خانہ سے ملنے کے لیے آیا ہوا ہوں۔ میں ۱۸ ستمبر کو گرے ہاؤنڈ بس کے ذریعے نیویارک کے لیے روانہ ہوا۔ موبائل، الباما میں بس کے پہلے اسٹاپ پر مجھے بارڈر پیٹرول نے امریکا میں زیادہ قیام کرنے کے الزام میں پکڑ لیا۔ مجھے امیگریشن کے دفتر لے جایا گیا جہاں سے میں نے اپنی خالہ کو فون کر کے بتایا کہ مجھے بارڈر پٹرول نے پکڑ لیا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ اس دستے نے مجھے بتایا ہے کہ مجھے دو تین گھنٹے میں نیواورلینز کے پیرش جیل لے جایا جائے گا اور وہ میرے لیے ایک وکیل کا بندوبست کر سکتی ہیں جو (ضمانت کا) بانڈ بھر سکے۔

جب ساری کاغذی کارروائی پوری ہوگئی تو دستے کے افسر نے مجھے بتایا کہ مجھے عدالت میں پیش ہونا پڑے گا جہاں جج یہ فیصلہ کرے گا کہ مجھے بے دخل کر دیا جائے یا امریکا میں مزید رکنے کی اجازت دے دی جائے۔ اس کے بعد اچانک اس افسر نے ہمیں بتایا کہ ہم اب نیواورلینز نہیں جا رہے بلکہ اس کے بجائے ہم وگنز، مس سی پی میں ''مس سی پی اصلاحی سہولت'' جا رہے ہیں۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ ہم وہاں رات بھر کے لیے ہوں گے اور پھر اگلی صبح نیواورلینز کے پیرش جیل میں منتقل کر دیے جائیں گے۔ دوپہر کے دو بجے کے لگ بھگ، ہم (میرے علاوہ وہ لوگ بھی جن کو

نظر بند کیا گیا تھا) وگنز، مس سی پی کے جیل میں پہنچ گئے۔

مجھے اس اقامت گاہ (''ڈورم'') میں بھیج دیا گیا جہاں دوسرے لوگ بھی رہ رہے تھے۔ کل ملا کر بارہ کے قریب تھے۔ ہمیں چھ چھ کے دو گروہوں میں بانٹ دیا گیا۔ باقی تمام لوگ میکسیکن تھے، سوائے ایک تھائی کے اور ان سب پر وہی الزام تھا جو مجھ پر لگایا گیا تھا۔ اس گروہ میں، میں واحد پاکستانی تھا۔ جوں ہی میں دوسرے لوگوں کے ساتھ اقامت گاہ میں داخل ہوا، وہاں موجود لوگوں نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔ میں واحد آدمی تھا جسے عجیب نظروں کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے پھر گھر فون کیا۔ جوں ہی میں نے فون ختم کیا، ایک سفید فام آدمی نے مجھ سے کہا، ''یہاں آؤ۔'' پھر اس نے کہا، ''بہتر ہوگا کہ اپنی ...... کو یہاں سے باہر لے جاؤ'' اور مجھے مارنا شروع کر دیا۔ وہ اس شدّت کی ساتھ مجھے گھونسے مار رہا تھا کہ میرا سامنے کا دانت ٹوٹ گیا۔ ایک اور آدمی اس کے ساتھ شامل ہوگیا اور دونوں پانچ منٹ تک مجھے مارتے رہے۔ کسی نہ کسی طرح میں گھنٹی تک پہنچ گیا اور بٹن دبایا کہ مدد کے لیے اطلاع کر سکوں۔ ایک عورت اسپیکر پر آئی۔ میں نے کہا، ''مہربانی کر کے مجھے یہاں سے نکالو، مجھے مار رہے ہیں، مہربانی کرو، مہربانی۔''

مجھے پوری طرح ہوش بھی نہیں تھا۔ وہ دونوں رُکے کہ ان میں سے ایک مجھ سے یہ کہہ سکے، ''اے، بن لادن، یہ پہلا راؤنڈ ہے۔ اس طرح کے دس راؤنڈ ہوں گے۔'' میں نے انہیں بتایا کہ میرا اس شخص سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس آدمی نے کہا، ''بہت برا ہوا، تم پاکستانی ہو اور اس کے بہت نزدیک ہو۔'' وہ پوری شدت کے ساتھ میرے سر کو کوٹھڑی کی سلاخوں سے ٹکرا رہے تھے اور میرے دائیں کان سے خون بہنے لگا۔ مجھے ایسا لگا کہ میں مر جاؤں گا۔ مدد کے لیے کوئی افسر وہاں نہ آیا حالاں کہ میں نے کافی دیر پہلے گھنٹی بجا دی تھی۔

ایک افریقی امریکی (سیاہ فام یا حبشی نژاد امریکی) میرے پاس آیا اور تھوڑی سی ہم دردی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ تیسرا سفید فام شخص آیا اور مجھے زور سے گھونسا مارا۔ پھر انہوں نے مجھے بستر تک جانے دیا۔ جوں ہی میں لیٹنے لگا، انہوں نے مجھے گھسیٹ لیا اور کہا، ''کپڑے اتارو، بن لادن۔'' میں بری طرح مدد کے لیے چلانے لگا۔ انہوں نے میری قمیص اُتاری، پھر پتلون اور جانگھیہ، وہ چیخنے لگے، ''بھاگو، ہم تمہاری...... (گالی حذف)......'' انہوں نے سفید فام نے مجھے فرش پر لٹا کر سر کے بل دبا دیا۔ پھر پہلے آدمی نے پوری طاقت کے ساتھ میرے پچھائے پر مارنا شروع کر دیا۔ میں مادرزاد ننگا تھا اور نیم غشی کی حالت میں۔ دوسرے قیدی سب ہنس رہے تھے، ان

کو جوش دلا رہے تھے اور کہہ رہے تھے، ''اسے مار ڈالو!''

تھوڑی دیر کے بعد میں نے اس آدمی کو دھکیل دینا چاہا جو مجھے سر کی طرف سے پکڑے ہوئے تھا۔ میں نے چہرہ موڑ کر دیکھا تو نظر آیا کہ چار افسر دروازے کے سامنے کھڑے ہیں۔ وہ میرے پاس نہیں آئے، وہیں کھڑے رہے۔ اچانک ان آدمیوں نے مجھے مارنا بند کر دیا۔ میں بھاگتا ہوا ان افسروں کے پاس گیا۔ میں نے کہا، ''مہربانی کر کے مجھے یہاں سے نکالو، مہربانی ہے۔'' ان میں سے ایک افسر نے میرے کپڑے لا دیے اور میں نے وہ کپڑے پہن لیے۔ مجھے نرس کے کمرے میں لے جایا گیا جہاں کوئی موجود نہ تھا۔ مجھے بڑی دیر انتظار کرنا پڑا۔ پھر مجھے برف کی تھیلی دے دی گئی۔ میرا سر خون سے سُرخ ہو رہا تھا۔ مجھے بہت شدید درد ہو رہا تھا۔ اس لیے میں نے ان سے کہا کہ کیا وہ مجھے اسپتال لے جاسکتے ہیں۔ کسی نے جواب نہیں دیا۔ نرس نے دو گولیاں دے دیں۔ میں جب وہاں تھا تو میجر سامنے سے گزرا۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ مجھے علیحدہ کوٹھری میں رکھا جائے۔ اس نے کہا کہ وہ کوشش کرے گا، پھر بولا ''تمھیں اپنا منھ بند رکھنا چاہیے۔'' مجھے عورتوں کی کوٹھری میں بھیج دیا گیا۔ وہاں صرف ایک بستر تھا، اوڑھنے کے لیے کچھ نہیں۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد مجھے علیحدہ کوٹھری میں بھیج دیا گیا۔ میرے پاس اس وقت کچھ بھی نہیں تھا اور میں سردی سے بے حال ہو رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد مجھے اوڑھنے کے لیے کچھ مل گیا۔ میں اتنی تکلیف اور درد میں تھا کہ سو بھی نہیں سکتا تھا۔

دوسرا دن: ۲۰/ستمبر ۲۰۰۱ء

صبح کے وقت آئی این ایس کے لوگ آ گئے اور سب کو نیو اور لینز لے جانے لگے۔ مجھے بھی باہر لے جایا گیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میں بھی جاسکوں گا اس لیے کہ میری خالہ اور میرا وکیل نیو اور لینز میں میرے منتظر ہوں گے۔ آئی این ایس کے افسر نے پوچھا کہ کیا میں ٹھیک ہوں اور ڈاکٹر سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے بری طرح مارا پیٹا گیا ہے، میں بس اب اپنی خالہ اور اپنے وکیل سے ملنا چاہتا ہوں اور اپنے ہی ڈاکٹر سے علاج کرواؤں گا۔ مجھے یہ محسوس ہوا ہے کہ اگر میں یہاں ڈاکٹر کو دکھانے لگوں تو شاید مجھے یہیں چھوڑ دیا جائے اور پھر نیو اور لینز نہ لے جائیں جہاں مجھے رہائی مل سکتی ہے۔

ہم روانہ ہونے ہی والے تھے۔ افسر فون پر اپنے سربراہ سے بات کر رہا تھا کہ اچانک

انہوں نے فیصلہ کیا کہ آخرکار مجھے اپنے ساتھ لے کر نہیں جائیں گے۔ میرے ساتھ باقی جو لوگ آئے تھے، انہیں اپنے ساتھ لے گئے۔ مجھے اس ''اصلاحی سہولت'' میں مزید ایک رات کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ ایک بار پھر مجھے قید خانے کی وردی پہنائی گئی اور اسی کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ میں بے حد دل گرفتہ تھا۔ مجھے فون کرنے کی اجازت بھی نہیں دی گئی اور اس سے مجھے تشویش ہونے لگی کہ میرا کیا بنے گا۔ اس دوران ایک شخص جو ''سہولیات'' کا ٹھیکے دار تھا، وہاں آیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ اس نے سنا ہے کہ کسی پاکستانی کے ساتھ مار پیٹ ہوئی ہے۔ جو کچھ ہوا، اس پر اسے افسوس تھا۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ فون کرنے میں میری مدد کرے۔ میں نے جتنی ٹیلی فون کالز کرنا چاہیں، اس نے کرنے دیں۔ وہ واحد بھلا مانس تھا جو مجھے اس جیل میں ملا۔

اسی دن بعد میں، میری خالہ (جن کی درخواست پر ان کا نام حذف کر دیا گیا ہے) شام ۵ بجے مجھ سے ملنے آئیں۔ انہیں مجھ سے ملاقات کی اجازت نہیں ملی اس لیے انہوں نے جیل کے میجر سے ملاقات کی۔ ۱۰ بجے کے بعد میں نے پھر افسر سے درخواست کی کہ مجھے فون کرنے دے۔ اس نے کہا کہ میجر مجھ سے ملنے کے لیے آنے والا ہے، اس کے بعد فون کر سکتا ہوں۔ میجر کوئی دس بج کر پچاس منٹ کے لگ بھگ میری کوٹھری میں آیا، میری خالہ کے آنے کے پانچ گھنٹے بعد، اور مجھے بتایا کہ وہ آئی تھیں اور میرے لیے رقعہ چھوڑ گئی ہیں کہ انہیں فون کرلوں۔

میجر نے مجھ سے کہا کہ مجھے فون کرنے کی اجازت مل جائے گی۔ جس کے لیے یہ شرطیں ہوں گی:

۱۔ تم اسپیکر فون پر بات کرو گے۔

۲۔ تمہیں صرف انگریزی میں بات کرنے کی اجازت ہوگی۔

۳۔ تم اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں کرو گے کہ تمہارے ساتھ کس طرح مار پیٹ ہوئی۔ اس نے کہا کہ اگر میں نے ان قوانین کی پابندی نہ کی تو وہ لائن کاٹ دے گا۔ میرے پاس ان شرائط کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ میں جب خالہ سے بات کر رہا تھا تو وہ سارے وقت میرے برابر کھڑا رہا۔

تیسرا دن: ۱۲ ستمبر ۲۰۰۱ء

جوں جوں دن گزرتا گیا، میری پریشانی بڑھنے لگی۔ سوا بجے کے قریب میجر مجھ سے ملنے کے لیے آیا اور کہنے لگا کہ آئی این ایس کے لوگ چل پڑے ہیں کہ مجھے یہاں سے لے جائیں اور میری

خالہ نیواورلینز میں میری آمد کی منتظر ہیں۔ مجھے نیو اورلینز میں امیگریشن آفس میں لے جایا گیا جہاں میری ضمانت بھری گئی اور میں اپنی خالہ سے مل سکا۔ میری چوٹیں دیکھ کر وہ دہشت زدہ ہوگئیں۔

میں اس ملک میں اس لیے آیا تھا کہ اپنے وطن میں ہونے والے تشدّد سے بچ سکوں، اس لیے نہیں کہ یہاں اس سے بھی بدتر سلوک کیا جائے۔ میں بس یہی چاہتا تھا کہ بہتر تعلیم حاصل کرلوں۔ امریکا کے صدر نے دوٹوک الفاظ میں کہا ہے کہ امریکیوں کو مسلمانوں کے خلاف نفرت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ میرے ساتھ جو ہوا وہ غیر انسانی ہے۔ میں اب بھی راتوں کو سو نہیں سکتا اس لیے کہ میرے ساتھ جو ہوا، اس کے بُرے بُرے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ مجھ پر زندگی بھر کے لیے اس صدمے کا داغ رہ جائے گا۔ میرے لیے بہت مشکل تھا کہ اب بھی اپنے آپ کو ظاہر کروں لیکن اگر اب میں نہیں بولا تو پھر دوسرے لوگ ایسے ہوں گے جنھیں چپ چاپ یہ سب سہنا پڑے گا۔ میں یہ ان لوگوں کے لیے کر رہا ہوں جنھیں شنوائی کا موقع نہیں ملا۔ امریکا کو اب اسامہ بن لادن کو پکڑنے کے لیے پاکستان کی مدد کی ضرورت ہے۔ مگر وقت آ گیا ہے کہ امریکی ان امن پسند اور بے گناہ پاکستانیوں کے لیے کچھ کریں جو بہتر زندگی کی تلاش میں یہاں رہ رہے ہیں۔ ان کو سب سے پہلے خود بہت سے امریکیوں کے اندر چھپے ہوئے چھوٹے چھوٹے اساماؤں کو ڈھونڈ کر پکڑنا چاہیے جو بے گناہوں کو آزار دینے پر تلے بیٹھے ہیں۔

نامعلوم شخص کی یہ سائیکل تباہی میں بچ گئی

بشکریہ: نیویورکر

۳۵ سالہ زرقا نواز اسکرین رائٹر ہیں اور چار بچوں کی ماں ہیں جن کی عمریں سات، پانچ، تین اور ایک سال ہے۔ وہ اور ان کے شوہر، راسخ العقیدہ مسلمان ہیں اور کینیڈا کے شہر ریجینا میں رہتے ہیں۔ زرقا نواز کی یہ ڈائری سی بی سی نیوز پر شائع ہوئی۔جس میں ان کے بارے میں محض اتنی ہی معلومات فراہم کی گئیں۔ اپنے گھر میں حفاظت کے دائرے کے اندر رہنے والی ایک پاکستانی نژاد مسلمان خاتون کی محفوظ و مامون دنیا کیسے بدلتی ہے، اس کا نقشہ اس رو نامچے میں بڑی تفصیل کے ساتھ درج ہے۔ زندگی کے معمول کی چھوٹی چھوٹی جزئیات سے بنائی گئی یہ تصویر بے حد نجی بھی ہے اور پر اثر بھی، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی صدمہ بتدریج اپنی شناخت کے بحران اور ذات کے اثبات کا پیش خیمہ بن گیا۔ اس کا ترجمہ حمرا خلیق نے کیا ہے، جن کے تراجم کا ایک مجموعہ شائع ہوچکا ہے۔ ان کی خود نوشت اور تراجم ''دنیا زاد'' میں ''عورت اور تقسیم'' کے خصوصی مطالعے کے تحت شائع ہوئے ہیں۔

زرقا نواز

ترجمہ: حمرا خلیق

درونِ خانہ خوف

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء صبح ۸ بج کر ۵ منٹ

میں اپنی ۷ سالہ بیٹی کو ناشتہ ختم کرانے کے لیے جلدی کر رہی ہوں۔ فون کی گھنٹی بجتی ہے اور میرے شوہر فون اٹھاتے ہیں۔ ''بمباری ہوئی ہے،'' وہ ٹی وی کھولتے ہوئے بتاتے ہیں۔ سب ٹھیک ہے میں خود کو تسلی دیتی ہوں۔ یہ ایک اور بمباری ہے۔ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ میں خبریں دیکھ رہی ہوں۔ اوہ خدایا۔ میں فلمی کہانیاں لکھتی ہوں۔ میں ایسی ناقابل یقین چیز کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ ابھی تک کسی پر الزام نہیں لگا رہے ہیں۔

۸ بج کر ۲۶ منٹ:

میں گھڑی دیکھتی ہوں۔ اپنی بیٹی کو دروازے سے باہر دھکیلتی ہوں۔ اسے بس پر سوار ہوتے ہوئے دیکھتی ہوں۔ خبروں میں نامہ نگار اسامہ بن لادن کا نام لینا شروع کر دیتا ہے۔ اوکلا ہوما کو مت بھولو۔ اوکلا ہوما کو مت بھولو۔ میں خبر دینے والے سے بار بار کہتی ہوں۔

گیارہ بج کر ۲۰ منٹ دن:

مجھے مقامی سی بی سی ریڈیو ریجینا سے ایک فون آتا ہے کہ مجھے اپنے احساسات کے بارے میں ایک انٹرویو دینا ہے۔ میں رپورٹر سے بات کرنے پر تیار ہو جاتی ہوں۔ میں اُس سے کہتی رہتی ہوں کہ ہمیں نہیں معلوم کہ یہ کس نے کیا ہے۔ وہ مجھے ہمدردانہ انداز میں دیکھتی ہے۔ ''ہاں، لیکن امکان یہی ہے کہ یہ مسلمان دہشت گردوں کے کسی گروہ کا کام ہے'' وہ کہتی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرے ایک بچّے نے قتل کا ارتکاب کیا ہے اور میں اس بات سے انکار کی کیفیت میں ہوں۔

ایک بج کر ۵ منٹ:

میں اپنے بیٹے کو نرسری لے جاتی ہوں۔ دوسرے والدین کی طرح میں بھی انتظار کر رہی ہوں۔ وہ سب بمباری کے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔ کچھ مائیں مجھے دیکھ کر اخلاقاً مسکراتی ہیں، پھر وہ چلی جاتی ہیں۔ کیا مجھے وہم ہے یا لوگ مجھے نظر انداز کر رہے ہیں۔

۴ بج کر پانچ منٹ:

میری بیٹی اسکول سے واپس آتی ہے۔ وہ بمباری کے متعلق جوش وخروش سے باتیں کرتی ہے۔ ''کیا تمھیں کسی نے بتایا کہ یہ کام مسلمانوں نے کیا ہے'' میں نے اس سے پوچھا۔ میری بیٹی مسلمانوں سے اس کے بڑھتے ہوئے تعلق سے ناواقف ہے۔

۸ بجے رات:

میں اپنے شوہر سے بحث کر رہی ہوں۔ یہ ہماری زندگیاں بدل دے گا۔ کوئی بھی چیز دوبارہ پہلے کی طرح نہیں رہے گی۔ ہر شخص ہم سے نفرت کرے گا۔ میرے شوہر کا خیال ہے کہ میں شدید ردِّعمل کا شکار ہوں۔

۱۲ ستمبر۔ ۸ بج کر ۴۶ منٹ صبح۔

میں ٹورنٹو میں اپنی والدہ سے بات کرتی ہوں۔ مسلمان خواتین جو حجاب پہنتی ہیں باہر جانے

سے بہت ڈر رہی ہیں۔

ایک بج کر ۳ منٹ دوپہر

میں ریڈیو پر ایک ''ٹاک شو'' سن رہی ہوں۔ فون کر کے شریکِ گفتگو ہونے والا ایک شخص کہتا ہے ''میں مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی اور تشدد شروع ہونے کا مزید انتظار نہیں کرسکتا۔ کیوں کہ وہ فلسطینیوں کی طرح بمباری کا جشن منائے گا۔ وہ لوگ مسلمان خواتین کو گھر میں رہنے اور جن بچوں کے مسلمان نام ہیں انہیں اسکول نہ بھیجنے کی ہدایت دے رہے ہیں۔ میں خود کو بیمار محسوس کرنے لگتی ہوں۔ میں ان والدین کو تک رہی ہوں جو اپنے بچوں کو اسکول لے جا رہے ہیں۔ میں ریجینا، ساس کا چیوان میں رہتی ہوں۔ یقیناً یہاں لوگ زیادہ سمجھ دار ہیں۔ میں اپنے بیٹے کو اسکول چھوڑ دیتی ہوں۔

اج کر ۳۴ منٹ دوپہر۔

میں سیف وے گروسری اسٹور میں جاتی ہوں۔ میں واقعی اندر جانے سے ڈر رہی ہوں۔ مجھے خود یقین نہیں آرہا ہے کہ میں اتنا گھبرا رہی ہوں۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ اس خوفناک المیے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن میری زندگی بدل گئی ہے۔ میں سامان خرید لیتی ہوں اور مجھے کچھ نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ مجھے گھورتے ہیں کیوں کہ میں حجاب پہنے ہوں لیکن لوگ تو پہلے بھی گھورتے تھے۔

۲ بج کر ۵ منٹ دوپہر

میری دوست نے اپنے بچے کو دو دن سے اسکول نہیں بھیجا۔ وہ باہر نکلنے سے اس قدر خوفزدہ ہے۔ وہ مجھ سے پوچھتی ہے کہ کیا کسی نے مجھ سے کچھ کہا ہے۔ میری ایک اور دوست سوچ رہی ہے کہ کیا اپنی حفاظت کی خاطر حجاب پہننا چھوڑ دے۔

۴ بج کر ۸ منٹ

میں یہ سوچنا شروع کر دیتی ہوں کہ واقعی اس المیے کے ذمے دار مسلمان ہیں۔ یہ بہت تکلیف دہ احساس ہے۔ میں نے ۱۹۹۵ء میں ایک مختصر فلم بی بی کیو مسلمان کے نام سے بنائی تھی جس کا موضوع تھا کہ اوکلاہوما میں بمباری کا الزام کس طرح مسلمانوں پر لگایا گیا تھا۔ اپنے بچوں کے اسکول میں، میں نے اسلام اور رمضان کے بارے میں گفتگو کی تھی۔ میں نے بتایا تھا کہ ہمارا مذہب امن پسند مذہب ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر اب میں یہ باتیں کروں گی تو لوگ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔ وہ الفاظ اب مجھے بالکل سطحی اور بے معنی لگ رہے ہیں۔ میں

چاہتی ہوں کہ میرے بچے خود کو اس ملک کے عام شہری سمجھیں اور لوگ انہیں مشکوک نہ سمجھیں۔ میں جانتی ہوں کہ یہ نہایت غیر منطقی بات ہے لیکن میں بمباری کرنے والوں سے سخت ناراض ہوں کیوں کہ انہوں نے میری پوری زندگی بدل کر رکھ دی ہے اور مجھ میں اپنے خاندان کے لیے حفاظت کی طرف سے پریشانی پیدا ہوگئی ہے۔ میں ناراض ہوں کیوں کہ انہوں نے میرے مذہب کو داغ دار کیا اور میرے طرزِ زندگی کو بدل ڈالا۔ میں پرچون کی دکان جاکر چاکلیٹ اور بسکٹ خریدنا چاہتی ہوں لیکن پھر مجھے باہر نکلنے سے خوف آنے لگتا ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ اس سے بھی بدتر حالات ہونے والے ہیں۔

۱۵ ستمبر صبح ۸ بج کر ۴۰ منٹ

"خبریں اس قدر بور ہیں۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ ہم 'ہیریٹ جاسوس' دیکھ سکیں گے!" میری بیٹیاں یہ وڈیو التجا کرتی ہیں۔ میں نے کل اپنی بیٹوں سے وڈیو دیکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن کل جمعہ تھا اور گھر کے بڑے خبریں سن رہے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ جمعہ کی نماز کو ٹی وی نے کس طرح دکھایا ہے۔ میں نے امام صاحب کو زندگی میں پہلی مرتبہ ٹی وی کو انٹرویو دیتے سنا۔ اس موقعے کو Screw نہ کردینا، میں سوچ رہی تھی کہ وہ بڑی احتیاط سے کہہ رہے ہیں۔ انہوں نے کس طرح کہا ریجنیا میں رہنے والے لوگ ریجنیا میں بسنے والے مسلمانوں کے لیے فکرمند ہیں۔" تمام مسلمان ٹی وی سے مثبت خبریں جاننے کے لیے مرے جارہے ہیں۔

جمعہ کی رات ہمارے لیے اچھی رات تھی لیکن اب میری بیٹوں کے ساتھ بہت زیادتی ہوچکی تھی۔ میں ٹی وی نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ کیوں کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی خبر سننے سے رہ جائے۔ ممکن ہے وہ اصلی دہشت گردوں کو پکڑلیں جو مسلمان نہ ہوں۔

میں بے حد تامّل سے وڈیو لگا دیتی ہوں۔ میں بہت دل چسپی سے دیکھ رہی ہوں۔ یہ ایک گیارہ سالہ بچی کی کہانی ہے جس میں دکھاتے ہیں کہ اس کی ڈائری مل جانے پر اس کے تمام دوست اس کے خلاف ہوجاتے ہیں۔ مجھے اچانک ناقابلِ برداشت غم محسوس ہونے لگتا ہے۔ میں تہہ خانے میں جاتی ہوں اور رونے لگتی ہوں۔ میری اتنی مضحکہ خیز حالت ہے۔ میں پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوں۔ مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔

پچھلے چند دن اس قدر تکلیف، پریشانی اور خوف میں گزرے۔ میری ایک دوست نے وانکوور سے مجھے بتایا کہ اس المیے پر تمام مسلمان دہشت زدہ ہیں۔ مجھے خود کو سنبھالنا چاہیے۔

صبح ۱۰ بج کر ۲۰ منٹ

''ہیریٹ جاسوس'' ختم ہوجاتی ہے۔ وہ کامیاب ہوتی ہے۔ ٹورینٹو سے میری امّی کا فون آتا ہے۔ ''شاید اس المیے میں مسلمان ملوّث نہیں تھے'' وہ کہتی ہیں۔ ''ہم اتنے منظم تو نہیں ہیں۔'' اس بات میں مسلمانوں کے جذبات کی گونج پوشیدہ ہے۔ لیکن میں بدرجہ مجبوری یہ ماننے کے لیے تیار ہوتی ہوں کہ اس واقعے سے مسلمانوں کا کوئی تعلق ہوسکتا ہے۔ یعنی میرے خیال میں وہ لوگ جنہیں مسلمان کہا جاتا ہے۔ میرے والدین ۱۹۷۰ء میں پاکستان سے کینیڈا آئے تھے۔ وہ اکتوبر میں پاکستان جانے کا ارادہ کررہے ہیں۔ لیکن اب معلوم نہیں کہ وہ جا بھی سکیں گے یا نہیں۔ وہ بہت پریشان ہیں کیا کریں کیا نہ کریں۔ اس سارے ہنگامے میں پاکستان بھی پھنس گیا ہے ہماری طرح۔

۲ بج کر ۲۵ منٹ دن

میں اپنی ای میل چیک کرتی ہوں۔ اگلے ہفتے کے آخر میں مجھے اوٹاوا ایک میٹنگ میں شرکت کے لیے جاتا ہے۔ میرا ٹکٹ تیار ہے۔ میرے شوہر کو اگلے ماہ بوسٹن جانا ہے۔ مجھے اپنی آخری فلائیٹ یاد آتی ہے۔ میں اپنے چار بچوں کو سنبھالے دوڑتی ہوئی جہاز میں سوار ہوئی تھی۔ ہم بڑی مشکل سے سوار ہوسکے تھے۔ اب ہم کبھی تاخیر نہیں کرسکیں گے۔ میرے شوہر اور میں بہت گھبرائے ہوئے ہیں۔ ہم ایئرپورٹ یا جہاز میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ جب آپ کا کسی ایسے مذہب سے تعلق ہو جس میں دن میں پانچ مرتبہ عبادت کرنا ہوتی ہے، تو آپ آخر میں ہر جگہ نماز پڑھنے لگتے ہیں۔

اگر میں جہاز میں نماز پڑھتی ہوں تو لوگ سوچیں گے کہ شاید میں آخری نماز ادا کررہی ہوں، اس سے پہلے کہ کوئی حادثہ رونما ہو۔ میرے شوہر سوچتے ہیں کہ اپنے روانہ ہونے سے پہلے وہ داڑھی منڈوالیں تو اچھا ہے۔ میں حجاب نہیں اتار سکتی کیوں کہ یہ میرے عقائد کا حصہ ہے۔ اسے اتار کر مجھے محسوس ہوگا جیسے میں کپڑے اتار کر برہنہ سفر کررہی ہوں۔ میں کینیڈا میں سفر کررہی ہوں، میں خود کو تسلی دیتی ہوں کہ کینیڈا کے لوگ سمجھ دار ہیں۔

۴ بج کر ۲۵ منٹ سہ پہر۔

''ہم نکول کی سالگرہ میں کب جائیں گے۔'' میری سات سال کی بیٹی سوال کرتی ہے۔ میں کیلنڈر پر نظر دوڑاتی ہوں۔ پارٹی ڈیڑھ بجے شروع ہوئی تھی اور آدھا گھنٹہ ہوا ختم ہوچکی۔ میں اس

بچّی کی ماں کو بدحواس ہوکر فون کرتی ہوں۔

یہ دوسری جماعت میں میری بیٹی کی سب سے پکی دوست ہے۔ ''میں شرمندہ ہوں'' میں بڑبڑاتی ہوں۔ ''جب سے بمباری ہوئی ہے میں سخت حواس باختہ ہوں۔''

یہ بات بچّی کی ماں سمجھ سکتی ہے لیکن اس کی بیٹی نہیں۔ میں اسے گاڑی میں بٹھاتی ہوں اور وال مارٹ جاتی ہوں۔

میں بچوں کا اسکریبل خریدتی ہوں اور بیٹی کو اس کی دوست کے گھر لے جاتی ہوں۔ ''اسے یہ نہ بتانا کہ یہ تحفہ میں نے ابھی ابھی خریدا ہے۔'' میں اپنی بیٹی کو ہدایت دیتی ہوں اور اسی دوران اس کی دوست کے گھر کا راستہ یاد کرتی ہوں۔

بچّی کی ماں پوچھتی ہے کہ کیا میری بیٹی کھانے پر رک سکتی ہے۔

''تم میرے پاس پیر کو آنے والی ہو۔'' میں آنے کا وعدہ کرتی ہوں۔ ''میں فون کرکے تمھیں یاد دلا دوں گی۔'' اسے میرے جواب سے تسلی نہیں ہوئی تھی۔ میں فروٹ کیک میں تبدیل ہوئی جارہی ہوں۔

۴بج کر ۴۵منٹ

میں پھر خبریں سن رہی ہوں۔ نیویارک ٹی وی رپورٹرز کو غائب شدہ رشتہ داروں کی تصویریں دکھا رہا ہے۔ ان کو ملبے کے اندر سے کوئی مُردہ مسلمان کیوں نہیں ملتا؟

میری ساس مجھے فون کرتی ہیں۔ ان کی ایک مسلمان دوست کی کزن کا اس بمباری میں انتقال ہوجاتا ہے۔ میری پوری طاقت سلب ہوجاتی ہے۔ مجھے یہ ہمت نہیں رہتی کہ میں اے بی سی نیوز کو فون کرکے اس خاندان کے المیے کے بارے میں خبر دینے کو کہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ شاید ان کے گھر والے میری مداخلت پسند نہ کریں۔ مجھے خود پر قابو پانا ہے۔

۵ بجے۔

میں گروسری اسٹور کے سبزیوں والے شعبے میں سرخ انگوروں کو تھیلی میں رکھ رہی ہوں۔ ایک بوڑھی عورت مجھے گھور رہی ہے۔ وہ قریب آتی ہے اور میرا بازو پکڑلیتی ہے۔ اس کی طاقت سے میرے بازو میں درد ہونے لگتا ہے۔ میں انتظار کررہی ہوں کہ اب وہ مجھے تھپڑ مارے گی۔ ''کیا تم مسلمان ہو؟'' وہ سوال کرتی ہے۔ میں سر ہلاتی ہوں۔ وہ رونے لگتی ہے۔ ''یہ بہت تکلیف دہ بات ہے کہ یہ حادثہ ہوا۔ یہ تمھارا قصور نہیں ہے۔'' اتنے دنوں میں اس وقت مجھے اپنا اعتماد بحال ہوتا ہوا

محسوس ہوا۔ اب شاید میں باہر جانے کے قابل ہو جاؤں اور خوف زدہ ہونا بھی چھوڑ دوں۔

۱۶ ستمبر صبح ۱۰ بج کر ۲۰ منٹ۔

میں روسٹ بنانے کے لیے مرغی گود رہی ہوں۔ میں نے دوستوں کے ساتھ رات کھانے کا پروگرام بنایا ہے۔ ہم سب باہر جائیں گے۔ مجھے ڈر بھی لگ رہا ہے کہ ہمیں کچھ ہو نہ جائے۔ میں پریشان ہوں کہ کہیں میں خوش اور مسکراتی ہوئی نظر نہ آؤں گی۔ کیا مجھے لوگوں کے درمیان خوش رہنے کی اجازت ہوگی۔

کہیں وہ نامناسب تو نہیں۔ یہ پروگرام میں نے خود پر جبر کر کے اپنے بچوں کی خاطر بنایا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنا چاہتے ہیں۔ ان تباہ کاریوں کی وجہ سے میں اپنے بچوں کی زندگی کو جہنم نہیں بنا سکتی۔

صبح ۱۱ بج کر ۲۵ منٹ

میں اسٹور سے ڈبل روٹیاں خرید رہی ہوں۔ وہ مستقل خوف جس نے مجھے گھیرا ہوا تھا، اب ختم ہوتا جا رہا ہے۔ میں ریجینا میں رہنے پر خوش ہوں۔ میری بچی کی ایک دوست کی امی مجھے دیکھ لیتی ہیں۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ باہر آتے ہیں۔ اس نے ایک کینیڈین عرب سے شادی کی ہے۔ حالاں کہ اس کے بیٹیوں کی نیلی آنکھیں اور بھورے بال ہیں لیکن وہ پھر بھی ڈرتی ہے کیوں کہ ان کے ناموں کا آخری حصہ عربی ہے۔ وہ مجھے بتاتی ہے کہ کس طرح اس کا بیٹا رات کو نہیں سو سکا کیوں کہ انہوں نے اسکول میں دیکھا تھا کہ وہ جہاز کس طرح تباہ ہوئے۔ وہ رونے لگتی ہے۔ مجھے دکان سے ٹشو پیپرز بھی خریدنا چاہیے تھے۔ کیوں کہ اس طرح کے واقعات اب میرے لیے روزمرہ کا حصہ بن چکے ہیں۔

۳ بج کر ۶ منٹ سہ پہر۔

میرے مہمان آنا شروع ہوتے ہیں۔ کہانیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف تشدد شروع ہو چکا ہے۔ امریکا میں ایک آدمی مارا گیا۔ ایک مسجد کو آگ لگا دی گئی ہے۔ کسی شخص کا ہاتھ توڑ دیا گیا۔ میری دوست بتاتی ہے کہ وہ تین دن سے مسلسل رو رہی ہے۔ وہ اس بات سے مطمئن ہے کہ اس نے اپنے بچوں کو ایک مسلمان اسکول میں داخل کر رکھا ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ وہ غیر مسلموں کی نظروں کی تاب نہیں لا سکتی۔ وہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ کیا میں ابھی اپنے بچوں کو اس

اسکول میں بھیجوں گی۔ میری اور میرے شوہر دونوں کی شمالی امریکا میں پرورش ہوئی تھی۔ ہم دونوں نے پبلک اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ لہٰذا ہم نے اپنی بیٹیوں کو پبلک امرشن فرنچ اسکول میں داخل کرادیا۔

''نہیں۔'' میں نے اسے بتایا کہ ''ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے اپنی دونوں دنیاؤں میں آرام سے رہیں۔'' میرے بچے صبح پبلک اسکول جاتے ہیں اور شام کو مسجد۔ میں نے اپنی دوست کو بتایا کہ میرے بچے خوش ہیں لہٰذا میں انہیں یہیں رہنے دوں گی۔

میں اسے یہ نہیں بتانا چاہتی تھی کہ ان کے ایسی جگہ نہ جانے سے مجھے اطمینان ہے جہاں وہ کسی ناگہانی نفرت کے جذبات کا شکار ہوجائیں۔

ستمبر ۱۷۔ صبح ۹ بج کر ۳۴ منٹ۔

میں ایک دوست سے ملنے جاتی ہوں۔ ہمارے بچے ایک ہی اسکول میں پڑھتے ہیں۔ اس کا گھر بہت خوب صورت سجا ہوا ہے۔ وہ مجھے اپنا نیا ٹھیک کیا ہوا تہہ خانہ دکھاتی ہے۔ کوئی اور دن ہوتا تو میں سوالوں کے مارے اس کا بھیجا چاٹ لیتی لیکن آج میں بہت پریشان تھی۔ ہم اس کا گھر دیکھ کر آئے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں۔ ''مجھے لگ رہا ہے کہ جنگ شروع ہوجائے گی'' میں ایک دم سے بول اٹھتی ہوں پھر چپ ہوجاتی ہوں۔ مجھے لگا کہ اپنی دوست کو پریشان کر رہی ہوں۔ وہ رنگوں کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی یا یہ کہ ہمارے بچے اسکول میں کیسے چل رہے ہیں۔ وہ نہایت ممونیت سے مجھے بتاتی ہے کہ میرا بیٹا کنڈرگارٹن میں کس طرح رو رہا تھا اور تمہاری بیٹی نے اُسے کس طرح بہلایا تھا۔ وہ اسکول میں ناشتہ کرتے وقت ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے رہتے ہیں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میری بیٹی نے ان کے بیٹے پر کیا اثر ڈالا تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے یہ فکر کرنا چھوڑ دینا چاہیے کہ لوگ ہم سے کتنی نفرت کرتے ہیں۔

۱۱ بجے رات۔

میں خبریں دیکھ رہی ہوں۔ ٹی وی پر ایک مدرسے میں بچوں کو قرآن کا درس دیتے دکھایا جارہا ہے۔ خبریں سنانے والا کہتا ہے کہ اسی قسم کے مدرسوں میں بچے امریکیوں سے نفرت کرنا سیکھتے ہیں اور جہاد کا منصوبہ بناتے ہیں۔ جب میں اس قسم کی رپورٹیں سنتی ہوں تو مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ کیوں کہ میرے بچے بھی اسکول کے بعد مدرسے جاتے ہیں۔ بچپن میں میں نے بھی مدرسے

میں پڑھا تھا۔ بیش تر مسلمان بچوں کے لیے قرآن کی تعلیم حاصل کرنا زندگی کا اہم مرحلہ ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ ہماری مسجد کے بارے میں لوگوں کو غلط فہمی ہو۔ پولیس نے امام صاحب سے مسجد کا نام بدلنے کو کہا۔ کئی پڑوسیوں نے امام صاحب کو مسجد کے دروازے پر کھڑے ہونے سے منع کیا۔ وہ روایتی لمبا سا سفید چغہ اور پگڑی پہنتے ہیں۔ پڑوسی کا خیال تھا کہ کہیں امام صاحب کے دروازے پر کھڑے ہونے سے بچوں کی طرف لوگوں کی توجہ نہ ہوجائے۔ امام صاحب نے بتایا کہ ان کا ''وائس میل'' آس پاس کے لوگوں کے ہم دردانہ پیغامات سے بھر گیا ہے۔

لہٰذا ہم اپنے بچوں کو شام کے وقت مسجد لے جاتے رہے۔

ستمبر ۱۹۔ صبح ۷ بج کر ۵۰ منٹ

میں نے اپنی امی کو فون کیا۔ ''کیا آپ اب بھی پاکستان جارہی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا تم مذاق کررہی ہو؟'' میری امی بولیں۔ میرے والدین دو سال سے یہ پروگرام بنارہے تھے۔ اب یہ بہت خطرناک ہوگیا ہے۔ ''کیا آپ مجھ سے ملنے آرہی ہیں؟'' میں نے پھر امی سے سوال کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اب جہاز پر بکنگ کرانا بہت مشکل ہوگیا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ میری والدہ جہاز میں سفر کرتے ہوئے ڈر رہی تھیں۔ لیکن میں انہیں ہمت دلانے کی کوشش کررہی تھی۔ میرے شوہر کو ایک کانفرنس میں بوسٹن جانا تھا۔ وہ ایک ہفتے کے لیے جارہے ہیں۔ ان کے پیچھے مجھے بچوں کو سنبھالنا بہت مشکل لگتا تھا لیکن اب مجھے محسوس ہوا کہ میں ان کے لیے بھی پریشان رہوں گی اور اپنے لیے بھی۔ اس وقت مجھے امی کی ضرورت تھی۔ مجھے اپنی توجہ مرکوز کرنے کے لیے ان کی مدد چاہیے تھی مثلاً میں اپنے بیٹے کی ٹائیلٹ استعمال کرنے کی تربیت کررہی تھی۔ یہ سب ان حملوں سے پہلے میں بڑی اچھی طرح کررہی تھی۔ میں اپنا پورا وقت اس کے ساتھ صرف کرتی تھی لیکن اب میں ٹی وی، ریڈیو کی خبروں اور دوستوں اور رشتے داروں کے ٹیلی فون سے پریشان رہتی تھی۔ مجھے اپنی بیٹی کے سپرد یہ کام کرنا پڑا کہ وہ چھوٹے بچے کو غسل خانے لے جائے۔ اس نے خود سے کافی اچھی طرح سمجھوتہ کرلیا ہے۔ وہ خود کو یقین دلاتی ہے کہ اپنی مشغول ماں کی مدد کرنے کا اس کو ثانی کی صورت میں اجر ضرور ملے گا۔

صبح ۸ بجے۔

میں ایک یہودی خاتون کو روش ہوسانا کی شروعات کے بارے میں کہتے ہوئے سنتی ہوں۔

وہ کہہ رہی ہے کہ یہ دن اس کے لیے کس قدر اہمیت رکھتا ہے۔ میں ایک دم سے رمضان کے لیے خواہش کرنے لگتی ہوں۔ رمضان اس سال نومبر میں شروع ہوگا۔ یہ مسلمانوں کے لیے امن وسلامتی کا مہینہ ہے۔ مجھے یہ سہولت چاہیے۔ میں ٹی وی پر یہ خبر سن کر رونے لگتی ہوں کہ ایئر لائنز والے اس وقت پولیس کو فون کرتے ہیں جب ایک عرب جہاز پر سوار ہونے لگتا ہے۔ جہازراں کمپنی کے ترجمان سے ایک جواب سنائی دیتا ہے کہ وہ پولیس کو اس وقت بلاتے ہیں جب مخصوص نام رکھنے والے سوار ہونے لگتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ نسلی امتیاز نہیں رکھتے۔ میرے شوہر کے نام کا پہلا حصہ ''محمد'' ہے۔ وہ اکتوبر میں بوسٹن جارہے ہیں۔ میں خود کو تسلی دیتی ہوں کہ اکتوبر تک حالات ٹھیک ہوجائیں گے۔

۲ بج کر ۵ منٹ دوپہر۔

میں اپنی گاڑی ٹھیک کرنے والے مکینک کے یہاں جاتی ہوں۔ مجھے نئی چابی بنوانا ہوگی۔ دو ہفتے پہلے میں نے بے وقوفی میں اپنی گاڑی کی چابی اپنے بچے کو کھیلنے کو دے دی۔ اس دن سے میں نے وہ چابی نہیں دیکھی۔ اس وقت مجھے انتظار گاہ میں بیٹھنے کو کہا گیا جب تک کہ میری چابیاں نہ بن جائیں۔ میں کمرے میں داخل ہونے کو تھی کہ میں نے ٹی وی پر سی این این لگا دیکھا۔ میں رکی۔ میں اندر نہیں جاسکتی۔ مسلمان دہشت گردوں کی خبریں گھر پر اکیلے بیٹھ کر دیکھنا چاہئیں۔ یہ میں لوگوں کے درمیان بیٹھ کر نہیں دیکھ سکتی۔ خاص طور پر جب سب کی نظریں ٹی وی کے ساتھ ساتھ میرے اوپر بھی ہوں۔ میں نے کمرے میں جھانکا۔ اسے بالکل خالی پاکر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میں نے سوچا کہ چینل تبدیل کردوں لیکن اسی وقت ایک شخص آ کر بیٹھتا ہے اور خبریں سننے لگتا ہے۔ میں رسالہ اٹھالیتی ہوں اور یہ ظاہر کرتی ہوں کہ پڑھ رہی ہوں اور جوں ہی وہ میرا نام پکارتے ہیں، میں تقریباً دوڑتی ہوئی باہر جاتی ہوں۔

۹ بجے رات۔

میری دوست مجھے فون کرتی ہے۔ وہ پریشان ہے۔ اس نے ابھی ابھی سی این این دیکھا ہے۔ وہ لوگ دہشت گردوں کے بارے میں تفصیل دینے والے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق دہشت گردوں کا شمالی امریکا میں عرصۂ دراز تک بسنا بہت عام ہے۔ وہاں ان کے خاندان آباد ہیں، وہ دوستی کرسکتے ہیں۔ ''وہ بالکل ہماری طرح ہیں۔'' وہ کہتی ہے وہ بدحواس ہورہی ہے۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھتی ہوں۔ مجھے افسوس ہورہا ہے کہ میں نے پڑوسیوں کی دیوار کے پاس سے

جنگلی پودے نہیں اکھاڑے۔

وہ مجھے بتاتی ہے کہ اس کی کزن مونٹریال میں رہتی ہے۔ اب اس کے برابر میں بس میں کوئی نہیں بیٹھے گا۔ وہ بچپن سے حجاب پہنتی ہے۔ اس کے والد کا اصرار ہے کہ وہ حجاب چھوڑ دے۔ وہ نہیں چاہتے کہ وہ انتقام کا نشانہ بنے۔

میری دوست مجھے اپنے گھر رات کھانے پر بلاتی ہے۔ میں اسے بتاتی ہوں کہ میں نہیں آسکوں گی۔ کیوں کہ میں اوٹاوا میں ہوں گی۔ وہ سوال کرتی ہے ''تم اکیلی سفر کرو گی؟'' ''نہیں جاؤ'' وہ التجا کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ ایک مسلمان عورت اکیلی لفٹ میں تھی جس کو قتل کر دیا گیا۔ ''ہر جگہ سر پھرے ہوتے ہیں۔ تمہیں نہیں معلوم کہ کس وقت کس سے سابقہ پڑ جائے۔''

مجھے اب کانفرنس میں جانے سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ میں ملتوی کرنے کو سوچتی ہوں۔ حالاں کہ میں اس دعوت پر بہت خوش تھی۔

یہ میرے لیے ایک آرام کا موقع تھا اور بچوں کے کام سے چُھٹی۔ لیکن اب ہوٹل پر مجھے اکیلے کمرے میں رہنے سے خوف آ رہا تھا۔ میں منتظمین کو مایوس بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لہٰذا میں جاؤں گی۔ میں اٹاوا میں اپنی ایک مسلمان دوست سے فون کر کے معلوم کروں گی کہ کیا اس نے مسلمانوں کے خلاف کسی تشدد کی کوئی خبر سنی ہے۔ اس کے بعد میں طے کروں گی کہ مجھے اپنی رہائش کے لیے کیا انتظام کرنا ہے۔ مجھے اب بھی کینیڈا پر اعتماد ہے۔

۲۲۔ ستمبر۔ رات ۱۲ بجے۔

میں ہاتھ پاؤں کے ناخن کاٹ رہی ہوں۔ کیوں کہ میں اپنا ناخن تراش گھر پر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ میں اپنے ساتھ کوئی تیز دھار والی چیز نہیں لے جانا چاہتی ہوں۔ میرا جہاز صبح دس بجکر ۲۰ منٹ پر روانہ ہوگا۔ مجھے اس سے دو گھنٹے پہلے ایئرپورٹ پہنچنا ہوگا۔ مجھے تصویر والا شناختی کارڈ چاہیے۔ میرے پاس ڈرائیونگ لائسنس ہے لیکن میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ میں نے کینیڈا کی شہریت کا کارڈ پتہ نہیں کہاں رکھ دیا۔ میں اسے پلنگ کے نیچے رکھے ہوئے بیگ میں تلاش کر لیتی ہوں۔ میں اس تصویر میں ۷ سال کی ہوں لیکن اس سے ثابت ہوتا ہے میں کینیڈا کی شہری ہوں۔

۸ بج کر ۳۰ منٹ صبح

میں ریجنیا ایئرپورٹ پر لائن میں چیک ان کے لیے کھڑی ہوں۔ میں ان سوالوں کو غور

سے سنتی ہوں جو کاؤنٹر پر کیے جارہے ہیں۔ اب میری باری ہے۔ کیا میرے پاس کوئی تیز دھار والی چیز ہے؟ کیا میں نے اپنا بیگ خود تیار کیا ہے؟ کیا میرے پاس کوئی بیٹری والی چیز ہے؟

مجھ سے بھی تمام وہی سوالات پوچھے گئے جو مجھ سے پہلے لوگوں سے پوچھے گئے تھے۔

۹ بج کر ۱۰ منٹ صبح۔

میں ایئرپورٹ کے فوڈ کورٹ میں سلاد اور انڈوں کا سینڈوچ کھا رہی ہوں۔ میری نظر خانساماں پر پڑتی ہے۔ وہ مجھے اس انہماک سے گھور رہا ہے کہ اس کا مُنھ کھلا ہوا ہے۔ میں بمشکل خود کو روکتی ہوں۔ ورنہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں جا کر اس کا منھ بند کردوں۔

لوگ مجھے بہت غور سے دیکھ رہے ہیں۔ میں دھیان رکھتی ہوں کہ کسی کے بہت قریب جا کر نہ بیٹھوں۔ میں کسی کو بے آرام نہیں کرنا چاہتی۔ میں اپنے گیٹ سے گزرتی ہوں اور کچھ نہیں ہوتا۔ میں تقریباً مایوس ہوجاتی ہوں۔ مجھے پکا یقین تھا کہ مجھے جہاز میں چڑھنے سے روک دیا جائے گا۔

۵ بج کر ۶۷ منٹ شام۔

میں بغیر کسی حادثے کے اوٹاوا پہنچ جاتی ہوں۔ میں ہوٹل جانے کے لیے شٹل بس لیتی ہوں۔ ''کیا میں آپ کا کریڈٹ کارڈ دیکھ سکتا ہوں؟''

دربان مجھ سے سوال کرتا ہے۔ مجھے وہ نہیں ملا۔ ''اوہ خدایا۔ میرا بٹوہ کھوگیا۔ شاید ڈیسک پر کام کرنیوالا شخص بہت سرعت سے کام کررہا تھا۔ یہ شٹل بس پر میرے بیگ میں سے گرگیا ہوگا۔'' وہ شٹل بس کو فون کرتے ہیں۔ وہ مل جاتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک گھنٹے میں مجھے میرا بٹوہ مل جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ میں آج رات میکڈونلڈ نہیں جاؤں گی۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔ اوٹاوا میں ایک نوجوان لڑکے کو بہت سے لڑکوں نے گھیرلیا۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ کیا وہ عرب ہے، اس کی پٹائی ہوئی ہے شاید۔ اوٹاوا میں رہنے والی میری دوست نے بتایا کہ وہ گھر جاتے ہوئے لڑکوں کے ایک گروہ کے پاس سے گزری تو ڈرتی رہی۔ جس دوران میں اپنے پرس کا انتظار کررہی تھی میں نے ٹی وی کی خبریں سنیں۔ وزیراعظم ژاں کریتیں ایک مسجد میں نمازیوں کو بتا رہے ہیں کہ وہ اس حادثے پر بے حد شرمندہ ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ایک دن کے اندر میرے احساسات بدل سکتے ہیں۔ میں جب بھی مسلمانوں کے تشدد اور دہشت گردی کے بارے میں سنتی ہوں میں بہت پریشان اور مضطرب ہوسکتی ہوں۔ پھر اس وقت مجھے اس امداد پر یقین نہیں آتا جو مسلمانوں کو دی جارہی ہے۔

۲۳ ستمبر۔شام ۴ بج کر ۴۵ منٹ۔

میری کانفرنس ختم ہو جاتی ہے۔ میں ۷ بج کر ۳۵ منٹ پر روانہ ہونے والے جہاز سے واپس جا رہی ہوں۔ میں اپنے سفر کے پروگرام کو دیکھتی ہوں۔ اچانک مجھے احساس ہوتا ہے کہ میری اوٹاوا سے ٹورنٹو جانے والی فلائٹ کا ٹورنٹو سے ریجنا جانے والی فلائٹ سے کچھ رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ میرا جہاز ۱۵ منٹ میں روانہ ہونے والا ہے۔ میں کس طرح پہنچوں گی۔ میں ٹیکسی سے ایئرپورٹ جاتی ہوں۔ ٹکٹ دینے والا شخص مجھے ۶ بجے کی فلائٹ پکڑنے کے لیے ایک ٹکٹ بنا دیتا ہے۔ خاتون جلدی جلدی مجھ سے سوالات کرتی ہے اور پھر مجھے بتاتی ہے کہ سیکورٹی میں سے بھاگتی ہوئی گزروں، تیزی کے ساتھ قطار میں سے نکل جاؤں اور سب سے کہوں کہ میں جلدی میں ہوں۔

میں بے یقینی سے دیکھتی ہوں۔ اسے پتہ نہیں کہ سیکورٹی گارڈ کا ردعمل کیا ہوگا میں چلتی ہوں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے، میں قطار میں کھڑی ایک خاتون کو بتاتی ہوں۔ وہ مجھے جانے دیتی ہے۔ میں جہاز پر سوار ہو جاتی ہوں۔ دو گھنٹے پہلے پہنچنے کے لیے اتنی مشکل سے گزرنا پڑتا ہے۔

رات ۸ بج کر ۳۶ منٹ۔

میں ٹورنٹو سے ریجنیا جانے والی فلائٹ پر پہنچ جاتی ہوں۔ اس جہاز پر لوگوں کا رویہ بالکل مختلف ہے۔ لگتا ہے جیسے ہمارے درمیان کی خلیج دور ہو گئی ہے۔ اب مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔ دو دنوں میں کس قدر فرق ہو سکتا ہے۔ میں ریجنیا کی رہنے والی، سنہرے بالوں والی ایک خاتون کے پاس بیٹھ جاتی ہوں۔ وہ کہتی ہے، ''میں نے پہلے کبھی مسلمانوں پر غور نہیں کیا۔ لیکن اب مجھے بے حد تجسس ہے۔'' اس المیے کا یہ ایک عجیب و غریب رُخ ہے۔ میری بھاوج نے بتایا کہ کتابوں کی دکان ''چیپٹرز'' پر اسلامی کتابیں فروخت ہو چکی ہیں۔ لوگ مسلمانوں کو شبہ کا فائدہ دینے کو تیار ہیں۔ جہاز پر ہمیں ''بریجٹ جونز کی ڈائری'' دکھائی جاتی ہے۔ فلم کے بعد برابر بیٹھی ہوئی خاتون اپنا بزنس کارڈ دیتی ہیں۔ ''ہمیں کبھی ملنا چاہیے۔'' میں نے جہاز پر ایک دوست بنائی ہے۔ اب سے دو دن پہلے جب میں انتظار گاہ میں بیٹھی تھی اور لوگ مجھے منھ پھاڑے گھور رہے تھے یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کتنے عجیب دن تھے۔

ستمبر ۲۴۔ ا بج کر ۲۹ منٹ دوپہر۔

میں اپنے بچے کو ٹہلانے کے لیے وال مارٹ میں لے جاتی ہوں۔ تین نوجوان میرے

ساتھ داخل ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک کو لفظ افغانستان کہتے سنتی ہوں۔ ''کیا مجھ سے کہا'' میں پوچھتی ہوں۔ وہ گھبرا کر میرے پاس سے ہٹ جاتے ہیں۔ اب میں خفا ہوجاتی ہوں ''میں اس وقت تک تمہارا پیچھا کروں گی جب تک تم مجھے نہیں بتاؤ گے کہ تم نے کیا کہا'' وہ جواب نہیں دیتے اور تیز تیز چلنے لگتے ہیں۔ میں بچہ گاڑی ان کے قریب لے جاتی ہوں اور ان کا پیچھا کرتی ہوں۔ وہ بھاگنے لگتے ہیں اور کھسیانے ہوکر ہنسنے لگتے ہیں۔

میں نے زیر جاموں والے شعبے میں انہیں جا پکڑا۔ وہ سی ڈی کے شعبے کی طرف بھاگے۔ میں نے انہیں کہتے ہوئے سنا۔ ''یہی تو کرتے ہیں یہ لوگ''۔ میں بچوں کے کپڑوں کے حصے میں مُڑ گئی۔

میں ننھے بچّوں کے سویٹ سوٹ والی الماریوں میں گھس جاتی ہوں۔ میں اتنی گھبرائی ہوئی تھی کہ کانپ رہی تھی۔ پتہ نہیں کیا ہوا تھا مجھے۔ میں تقریباً دھاڑتے ہوئے انہیں روک رہی تھی۔

وہ شاید مجھ سے بری طرح ڈر گئے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ میں انگریزی بول سکتی ہوں۔ دوسرے یہ کہ بچے کی گاڑی لیے لیے پوری دکان میں ان کا پیچھا کروں گی۔ جب میں سرخ رنگ کا پاجامہ جس پر پیلے رنگ کا ڈینوسار بنا ہے خریدتی ہوں تو خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ میں نے ۱۹۷۰ء میں پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ ٹورنٹو ہجرت کرنے کے وقت سے آج تک خود کو اس قدر طیش میں نہیں پایا تھا۔ اس وقت یہاں نسلی ہنگامے ہورہے تھے۔ میرے والد نے مجھے اور میرے بھائی کو کراٹے سیکھنے کے لیے بھیجنا شروع کر دیا تاکہ ہم پڑوس کی غنڈہ گردی سے اپنا دفاع کرنے کے قابل ہوجائیں۔ میں ان دنوں کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی ہوں۔ میں اس وقت ایک چھوٹی سی سہمی ہوئی بچّی تھی۔ اور اب شاید میں ان بچوّں کا پیچھا کر کے اپنے ان دنوں کے خوف کا ازالہ کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

۴بج کر ۸ منٹ شام۔

میں اپنے شوہر کو اس واقعے کے بارے میں بتاتی ہوں۔ وہ مجھے نصیحت کرتے ہیں کہ لوگوں کے درمیان مجھے خود پر قابو رکھنا چاہیے۔ ''مجھے معلوم ہے کہ جب تمہیں غصہ آتا ہے تو تم اسی طرح کرتی ہو۔'' میں ان کا پیچھا کرنے پر پچھتانے لگتی ہوں۔ پتہ نہیں وہ مسلمانوں کے بارے میں کیا سوچیں گے۔ لیکن بہرحال اب وہ مسلمان عورتوں کے سامنے کچھ کہنے سے پہلے ایک بار سوچیں گے ضرور۔ مجھے اگلے چند ہفتوں میں تین ہائی اسکولوں میں جا کر اسلام کے بارے میں تقریر کرنا ہے۔

مجھے بہت کوشش کرنا تھے کہ اس دوران میرے جذبات حاوی نہ ہوجائیں۔ وہ لاعلم ہیں۔ مجھے اپنا مضحکہ خیز رویہ بدلنا پڑے گا اور ایک معقول اور پُرزور مسلمان خاتون بننا پڑے گا۔ ممکن ہے وہ بچےّ جن کا میں نے وال مارٹ میں پیچھا کیا تھا، مجھے سنیں۔

ستمبر ۲۶۔ ۲ بج کر ۸ منٹ دوپہر۔

میں اپنی ای میل چیک کر رہی ہوں۔ یہ روز کا معمول ہے۔ میں مسلمانوں کے خلاف تشدّد کے بارے میں رپورٹ دیکھ رہی ہوں۔ میری بھاوج نے مجھے میل پر ''ایل اے ٹائمز'' سے ایک کالم بھیجا ہے۔ ایک گوری جوان لڑکی جو واشنگٹن ڈی سی میں رہتی ہے، حجاب میں رہ کر قومی حجاب کا دن منا رہی ہے۔ مسلمان عورتوں سے تعاون کے طور پر۔ اس نے اس کے بارے میں ایک مسلمان شخص سے دریافت کیا تھا۔ اس نے جب اس لڑکی کے ارادے کے بارے میں سنا تو وہ رونے لگا۔ اس کے رونے کی وجہ سے میں بھی رونے لگی۔

اب میں رو رہی ہوں یہ سوچ کر یہ نوجوان امریکی لڑکی جو مسلمانوں کو نہ جانتے ہوئے بڑی ہوئی مسلمان خواتین کے ساتھ یک جہتی کے لیے اتنا خطرہ مول لے رہی ہے۔ اس رپورٹ میں یہ بھی تھا کہ کئی مسلمان خواتین نے اپنے حجاب جلا دیے۔ ایک اعلان ہوا کہ مسلمان خواتین حجاب ایسی پنوں کے ساتھ پہنیں کہ اگر کوئی انھیں کھینچنے کی کوشش کرے تو ان کا گلا نہ گھٹ جائے۔

لوگ ہم سے نفرت کرتے ہیں، لوگ ہم سے محبت کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے اب لوگوں کو یہ طے کرنا ہے کہ وہ ہم مسلمانوں کو پسند کرتے ہیں یا نہیں؟

۲۷ ستمبر۔ ۹ بج کر ۷ منٹ صبح۔

میں جدید طرز کے کسی لباس کی تلاش میں ہوں۔ شاید جینز۔ اسکرٹ اور دھاری دار ٹی شرٹ۔ مجھے مسلمان ہونے کے بارے میں ۱۰ بج کر ۱۵ منٹ پر ایک اسکول میں گفتگو کرنا ہے۔ میری چھوٹی نند نے میرے لیے جوتے منتخب کر دیے تھے لہٰذا مجھے وہی جوتے پہننا ہیں۔ میں نے بچے کو بستر پر لٹایا اور تیار ہونے لگی۔ اس نے اپنے کھلونے کی فلیش لائٹ نیچے پھینکی جو میرے پاؤں پر گری۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ چوٹ کا نشان ابھرنے لگتا ہے۔ میں بچے کو لے کر لنگڑاتی ہوئی نیچے آتی ہوں تاکہ مزید زخم نہ لگے۔ اب میں اپنے نئے جوتے نہیں پہن سکتی۔ میرے پیر میں سخت

تکلیف ہو رہی ہے۔ میں اپنے نہایت پرانے مادرانہ جوتے پہن لیتی ہوں۔ کوئی بات نہیں۔ میرا خیال ہے وہ میرا سر دیکھنے میں اس قدر مصروف ہوں گے کہ میرے پیروں پر ان کی نظر نہیں جائے گی۔

صبح ۹ بج کر ۴۵ منٹ۔

میں بچے کو بے بی سٹر میں ڈالتی ہوں۔ میری دوست نے جو فیڈ ایکس میں کام کرتی ہے مجھے اسکول کا راستہ سمجھا دیا تھا۔ وہ ایک نجی ہائی اسکول ہے میں چوتھی ایونیو کی طرف مُڑتی ہوں اور کینیڈین بائبل کالج کی پارکنگ میں پہنچ جاتی ہوں۔ شاید میری دوست نے کچھ گڑبڑ کر دی ہے۔ میں قریب کے اسکول جاتی ہوں لیکن وہ اسکول بھی دوسرا ہے۔ میں پریشان ہو جاتی ہوں اور جس طالب علم کو سب سے پہلے دیکھتی ہوں اس سے لوتھر کالج کا پتہ معلوم کرتی ہوں۔ دوسرسری طور پر مجھے راستہ بتاتا ہے۔ مجھے فوراً اسکول مل جاتا ہے اور گاڑی سامان لادنے کی جگہ پارک کرتی ہوں۔ میرے پاس صرف دو منٹ ہیں۔ میرا استقبال کرنے کے لیے وائس پرنسپل موجود ہیں۔ میں معذرت کرتی ہوں۔ وہ تسلی دیتے ہیں۔ انہیں اس قسم کے حالات اور لوگوں کی گھبراہٹ کی عادت ہے۔

آڈیٹوریم طالب علموں سے بھر رہا ہے۔ میں نے تقریر تیار نہیں کی ہے۔ اب مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ وائس پرنسپل نہایت بیزار نظر آنے والے مجمع سے میرا تعارف کراتے ہیں۔ میں مائیک کے پاس آتی ہوں اور بات شروع کرتی ہوں کہ جب ٹریڈ سینٹر سے جہاز ٹکرائے تو میں نے کیا محسوس کیا۔ میں نے مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے برتاؤ کا ذکر کیا۔ اگر کوئی میرے بچوّں سے واپس گھر جانے کو کہے گا تو وہ گلیوں میں چل کر اپنے گھروں میں چلے جائیں گے کیوں کہ اب یہی ان کے گھر ہیں۔ کسی دوسرے ملک میں نہیں بلکہ ریجنیا میں۔ میں نے انہیں اسٹور میں ملنے والی ان خاتون کے بارے میں بتایا جنھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا کہ اس حادثہ کی ذمّے دار میں نہیں ہوں۔

اس کے بعد پورے مجمع کے سامنے رونا شروع کر دیا اور آگے ایک لفظ نہ بول سکی۔ مجھے اپنے اوپر قابو رکھنے پر فخر تھا۔ میں اپنے بھائی کی شادی کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے بھی نہیں روئی تھی۔ میں کوئی فلم دیکھتے ہوئے اپنے شوہر کے سامنے بھی نہیں روتی۔ لیکن اس امریکی لڑکی کے حجاب باندھنے کے بعد کے واقعہ نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے دوبارہ تقریر شروع کی اور نہایت بے تکے اور بے ڈھنگے پن سے اپنے جذبات کا ذکر کیا۔ کہ کس طرح یہاں رہنے میں میں

خود کو شکر گزار محسوس کرتی ہوں۔

۱۰ بج کر ۳۲ منٹ صبح۔

وائس پرنسپل میرے پاس آکر ہاتھ ملاتے ہیں۔ میں رونے پر معذرت کرتی ہوں۔ ''آپ نے ان کی توجہ پورے طور پر اپنی طرف کرلی تھی۔ آپ کے بیان میں سچائی تھی۔ ہم اس کو قابل تعریف سمجھتے ہیں۔''

۱۰ بج کر ۴۶ منٹ صبح۔

میں ایک نہایت لذیذ آئس کریم کیک کھا رہی ہوں جس پر مونگ پھلیاں چھڑکی ہوئی ہیں۔ میں بہت خوش ہوں کیوں کہ میرے دونوں بچوں کو مونگ پھلی سے الرجی ہے اور میں نے ایک زمانے سے نہیں کھائی۔ ٹیچرز نے ان مسلمان بچوں کے متعلق بات شروع کی جو اس اسکول میں پڑھتے ہیں۔

''میں نے بہت دن سے اعلا کو نہیں دیکھا۔ وہ فٹ بال ٹیم میں ہے لیکن ہوائی حادثے کے بعد وہ نظر نہیں آرہا ہے۔'' کھیلوں کے ٹیچر نے کہا۔ میں نے پوچھا کہ اس کی قومیت کیا ہے۔ ''وہ اری ٹیرین ہے۔'' وائس پرنسپل نے بتایا کہ انہوں نے کبھی بچوں سے ان کے متعلق نہیں پوچھا کہ وہ کس کیفیت سے گزر رہے ہیں۔

''شاید وہ بہت مایوس ہیں'' میں کہتی ہوں ''لیکن ہمیں ان حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے پہلے جیسے حالات اب کبھی نہیں ہوں گے۔'' کھیلوں کے ٹیچر مجھے غور سے دیکھتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں، ''کیا آپ کو معلوم ہے کہ حادثے کے چند گھنٹوں کے اندر لوگ واشنگٹن ڈی سی پہنچے جو سلک اسکرینگ والی ٹی شرٹ پہنے تھے جن پر لکھا تھا: "Kill all muslims"

میں نے بتایا کہ اس کے متعلق میں نے نہیں سنا...... وائس پرنسپل نے کہا۔ ۹۰ فی صد امریکی لاجواب لوگ ہیں۔ ''میرا خیال ہے کہ چند لوگ ہیں جو مشکلات پیدا کر رہے ہیں۔'' خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔

۱۲ بج کر ۴۶ منٹ دوپہر۔

میں ہائی وے پر شہر کے شمالی حصے کی طرف سفر کر رہی ہوں۔ مجھے ایک ابتدائی اسکول میں آٹھویں جماعت کے بچوں کے لیے ایک تقریر کرنا ہے۔ اس مرتبہ میرے پاس ایک وڈیو ہے جو میں نے اوکلاہوما پر بمباری کے دوران ۱۹۹۵ء میں بنائی تھی۔ یہ بی بی کیو مسلمان کہلاتی ہے۔ یہ دو

مسلمان بھائیوں کے بارے میں ہے جن پر مشرق وسطیٰ کے دہشت گرد ہونے کا الزام ہے کیوں کہ ان کا بار بی کیو آدھی رات کو پھٹ پڑا تھا۔ میں نے یہ فلم اس لیے بنائی تھی کیوں کہ حملے کے فوراً بعد مسلمانوں پر اس کا الزام لگایا گیا تھا۔ وہ ایک سفید فام امریکی کا کیا دھرا تھا۔ اس مرتبہ بھی ہم یہی اُمید کر رہے تھے۔ میری بعض دوستیں اب بھی یہی امید کر رہی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ خوش دلی کا مظاہرہ کروں، خوب ہنسوں اور رونے کی نوبت نہ آئے۔

اا بج کر ۳ منٹ دوپہر۔

میں اسکول جلدی پہنچ جاتی ہوں۔ سیکریٹری مجھے کلاس میں لے جاتی ہے۔ راستے میں وہ مجھ سے میرے بارے میں سوال کرتی رہتی ہے۔ اس کلاس میں تقریباً ۳۰ طالب علم ہیں۔ دوسری کلاس ابھی نہیں پہنچی ہے۔

میں ان سے سوال کرتی ہوں۔ ''مسلمانوں کی کس بات سے تم لوگ خوفزدہ ہو، کیوں کہ میں اس خبر سے پریشان ہوں کہ اسامہ بن لادن مسلمانوں کو امریکیوں سے جہاد کرنے کے لیے اُکسا رہا ہے۔ میں کلاس کو بتاتی ہوں کہ ''میں بڑی مشکل سے اپنے بچوں کو میز پر ناشتہ دے پاتی ہوں، پڑوسیوں کے خلاف جنگ کا منصوبہ بنانا تو بڑی بات ہے۔''

وہ مجھے دیکھتے ہیں۔ ایک لڑکی مجھ سے سوال کرتی ہے، ''کیا آپ میک اپ کر سکتی ہیں؟''
مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرا ڈر غلط ہے۔ مجھ سے سوال ہوتا ہے ''کیا میں تیر سکتی ہوں؟ میرے بچوں کے نام کیا ہیں؟ کیا میں مکہ گئی ہوں؟ گرم ممالک میں لوگ ہمیشہ کالے کپڑے کیوں پہنے رہتے ہیں؟ سنّی اور شیعہ میں کیا فرق ہے؟ اور سب کا پسندیدہ سوال: آپ یہ اسکارف کب سے پہنتی ہیں؟ مجھ سے تشدّد کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا جاتا۔ یا مسلمانوں نے دہشت گردی کیوں کی۔ وہ اس المیے سے میرا کوئی تعلق نہیں سمجھتے۔ میں سکون کا سانس لیتی ہوں۔ استاد زیادہ مشکل لیکن مہذب سوالات کرتے ہیں۔ مثلاً کیا میں طالبان کو مسلمان سمجھتی ہوں؟ کیا میں اپنے بچوں کو شمالی امریکا میں پرورش کرنا مناسب سمجھتی ہوں؟

بی بی کیو مسلمان دو مرتبہ دکھائی جاتی ہے۔ ہر جماعت کے لیے ایک مرتبہ۔ یہ بڑی کامیاب فلم ہے سوائے اس کے آخری حصے کے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے فلم کے آخر میں دکھایا تھا کہ پولیس اسٹیشن کے سامنے بار بے کیو کی مخالفت کرنے والے لوگ دھرنا دیے بیٹھے ہیں اور اس امر پر افسوس کا اظہار کر رہے کہ انہوں نے دھماکے کے لیے محض اتفاقاً مسلم بار بی کیو کا انتخاب کیا

کیونکہ کوئی اس بات پر مطلق توجہ نہیں دے رہا ہے کہ بی بی کیو سے ان کی مخالفت کا سبب کیا ہے۔ اور وہ سبب یہ ہے کہ باربی کیو آلودگی کو جنم دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ وضاحت کی خاطر میں فلم کا آخری حصہ دوبارہ فلماؤں۔ اگر جارج لوکاس ''اسٹار وارز'' کے ساتھ کچھ نہ کچھ کیے جاتا ہے تو مجھ کو بھی یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ میں اپنی فلم کی بے حرمتی کر رہی ہوں۔

۴ بجے سہ پہر۔

میں گھر پر ہوں اور اپنے فون پر موصول ہونے والے پیغام سُن رہی ہوں۔ لوتھرین فرقے کے ایک گرجے نے میری تقریر کے متعلق سنا ہے۔ میں دورے کر رہی ہوں اور تقریریں کر رہی ہوں۔ میں تھک گئی ہوں۔ میرے بچے کی بے بی سٹر کہتی ہے کہ وہ تھک چکی ہے اور جانا چاہتی ہے اور مجھے بچوں کے لیے کوئی دوسرا بندوبست کر لینا چاہیے۔ عام طور پر بچوں کی دیکھ بھال میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا لیکن امریکہ پر حملے کے بعد سے جو ضرورت سے زیادہ مصروفیت بڑھ گئی ہے اس کی وجہ سے مجھے بچوں کے لیے کسی کا بندوبست کرنا ہوگا۔ کل میں کچھ انتظام کروں گی۔ لیکن اس وقت میں اتنی تھک گئی ہوں کہ بچوں کے ساتھ ساتھ میں بھی سونے جا رہی ہوں۔

۲۸ ستمبر۔ ۹ بج کر ۴ منٹ صبح۔

میں 'لیڈر پوسٹ' (جو ریجنیا کا ایک روزنامہ ہے) کی ایک کاپی اپنے لیٹر بکس میں دیکھ کر حیران رہ جاتی ہوں کیوں کہ میں اس کی خریدار نہیں ہوں۔ اخبار پرانے انداز کے لحاظ سے بالکل مختلف لگ رہا تھا۔ وہ کالے سرورق کی وجہ سے نہایت شان دار لگ رہا تھا۔ اخبار کا نیا ڈیزائن بنایا گیا تھا۔ بیس سال میں پہلی مرتبہ اس میں زبردست تبدیلی آئی تھی۔ اس لیے ریجنیا میں ہر شخص کو مفت بانٹا گیا تھا۔

پہلے صفحے پر ۱۹ دہشت گردوں کی تصویریں چھپی تھیں۔ پورے براعظم میں ہر اخبار نے یہ تصویریں چھاپی ہوں گی۔ میں نے ہر تصویر کو بہ غور دیکھا۔ ان میں سے صرف دو آدمیوں کے داڑھی تھی۔ چھوٹی سی داڑھی باقی بغیر داڑھی مونچھ کے تھے یا صرف مونچھیں تھیں۔ حقیقتاً ان میں سے کئی ایک تو عرب نہیں لگ رہے تھے۔ بعض اطالوی، ہسپانوی، پیورٹو ریکن، گیانا کے رہنے والے ہو سکتے تھے۔ ان میں سے تین مجھے بالکل امریکی لگ رہے تھے۔

اگر کسی شخص پر ذرا سا بھی غیر ملکی ہونے کا گمان ہو اس کے ساتھ کچھ بھی کرنے کی کھلی چھٹی ہوگی۔ وہ اس فہرست کا حصہ بن جائیں گے جن کو تنگ کیا جاتا ہے۔ وہ عورتیں جو اسکارف پہنتی

ہیں، سکھ جو پگڑی باندھتے ہیں۔ حتیٰ کہ عمارتیں تک مثلاً مندر جن کی تعمیر مسجدوں کی تعمیر سے ملتی جلتی ہے۔ ان میں توڑ پھوڑ ہوئی ہے۔

صبح ۱۰ بج کر ۲۹ منٹ۔

میں ساکت سائیکل چلاتے ہوئے ایک ایرانی شخص کے بارے میں پڑھ رہی ہوں جو ایک ہوائی جہاز کے غسل خانے میں سگریٹ پیتا ہوا پکڑا گیا۔ اس کی کینیڈا جانے والی فلائٹ امریکی ہوائی فوج نے دوبارہ لاس اینجلس ...... اس نے امریکہ کو دھمکی دی۔ واہ...... ہمیں اپنا رویہ اچھا رکھنا چاہیے۔ اب میں نہایت دھیان سے ڈرائیو کرتی ہوں۔ گزشتہ کل میرے گھر آنے کے راستے میں رکاوٹ تھیں۔ لمبا راستہ طے کرنے کی کاہلی تھی۔ چناں چہ میں بجلی کے منارے کے پاس سے گھوم کر گھر پہنچی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ سڑک پر کام کرنے والے مزدور مجھے غور سے دیکھ رہے ہیں۔ اوہ...... اس کا مطلب ہے کہ میری اس حرکت نے اس کی نظر میں مسلمانوں کو ذلیل کرا دیا۔ وہ سوچ رہا ہوگا کہ مسلمان قوانین کی پابندی نہیں کرتے۔

ایک عورت کینیڈا کے نابیناؤں کے ایک ادارے کے لیے چندہ مانگنے آئی۔ میں نے پرس میں جو کچھ تھا اُسے دے دیا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ یہ سوچے کہ ہم خیرات نہیں دیتے۔ اس سے پہلے میں نے اپنے مذہب کی شہرت کے بارے میں اتنی ذمہ داری محسوس نہیں کی تھی۔

صبح ۱۱ بج کر ۳۰ منٹ۔

بچوں کی نگہداشت کرنے والی خاتون مجھے فون کرتی ہے۔ آج میرے بچوں کے ساتھ اس کا آخری دن ہے۔ ''میں تمھیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ مسلمان ہونے کی وجہ سے میں تمھاری نوکری نہیں چھوڑ رہی ہوں۔ میں اتنے لمبے عرصے کام کرنے کے بعد کچھ دن آرام کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن میں جب تک کام کروں گی جب تک تمھارے بچوں کے لیے دوسرا انتظام نہیں ہو جاتا۔'' میں نے اسے یقین دلایا کہ یہ بات میرے دماغ میں کبھی نہیں آئی کہ وہ میرے ساتھ ایمان دار نہیں تھی۔ میری بوسنیا میں رہنے والی دوست یہ کام سنبھالنے کو تیار ہے۔ وہ یہاں ۹ سال رہنے کے بعد اب کینیڈا کی قومیت لینے آ رہی ہے۔ اُس نے بتایا کہ اس حملے کے بعد وہ نکالی جانے کے خوف میں ہے کیوں کہ وہ مسلمان ہے۔ بس اسی محرک کی ضرورت تھی کہ قومیت لینے کے امتحان کی تیاری شروع کر دے۔

''فکر نہ کرو تم کو نکالا نہیں جائے گا۔'' اس نے بتایا کہ یوگوسلاویہ میں اسے یہی بتایا گیا تھا۔

۲۹ ستمبر۔ ۵ بج کر ۲ منٹ شام۔

میں چندہ حاصل کرنے کے ڈنر کے لیے باسمتی چاول اُبال رہی ہوں۔ مسلمانوں کے ایک نجی اسکول کو بس خریدنے کے لیے رقم درکار ہے۔ اس سلسلے میں ٹورنٹو سے ایک مقرّر آنے والا ہے۔ پچھلے سال اس مقرّر نے ہمیں بچوں کو نجی اسکول میں داخل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ میں اس شام شاید وہاں نہ جاؤں کیوں کہ میں لوگوں کو یہ بتاتے بتاتے تھک چکی ہوں کہ میرے بچے ایسے اسکول میں کیوں نہیں جاتے۔

میں ٹی وی پر طالبان کے بارے میں ایک اور دستاویزی فلم دیکھ رہی ہوں۔ ان کے متعلق میری رائے روز بدلتی ہے۔ وہ ہر اس چیز کی نمائندگی کرتے ہیں جو میں اپنے مذہب سے نہیں جوڑنا چاہتی۔ خواتین پر بندش۔ قرآن کی آیات کا محض لغوی اور تنگ نظر مفہوم بیان کرنا۔ غصہ اور تشدّد۔ یہ تعلقات عامہ کے لیے ڈراؤنا خواب ہیں۔ لیکن میں کھلا ذہن رکھنا چاہتی ہوں۔ یہ وہ یتیم بچے ہیں جو سویت یونین سے جنگ کے زمانے میں کیمپوں میں پناہ گزین تھے۔ انہیں ہماری طرح سفر کرنے اور اسلام کو صحیح طریقے سے سمجھنے کا موقع نہیں ملا۔ سوائے اس کے کہ وہ کیمپوں میں سخت گیر استادوں سے سبق حاصل کرتے رہے۔ وہ لاعلم ہیں اور آج تک پتھر کے زمانے میں رہتے ہیں۔

میری ساس مجھے فون کرتی ہیں۔ ''تم کہاں ہو؟...... کھانا تو تقریباً ختم ہو چکا ہے۔''

۶ بج کر ۹ منٹ شام۔

میں نے اور میرے شوہر نے بچوں کو منی وین میں بٹھایا۔ مقرّر کا مجمع سے تعارف کروایا جا رہا ہے۔ میں اپنی بوسنیا والی دوست کی طرف دیکھتی ہوں جس نے مجھے بتایا تھا کہ ۷ بجے سے پہلے کھانا نہیں کھائیں گے۔ میری ساس میرے بچے کو کھلانا شروع کرتی ہیں۔ جب کہ میں اپنی بیٹیوں کی پلیٹوں میں تھوڑی میکرونی نکالتی ہوں۔ میں تقریر سنتی ہوں اور یہ محسوس کرتی ہوں کہ وہ اسکول کے متعلق کوئی بات نہیں کر رہا ہے۔ اس کے بجائے وہ مسلمانوں پر تنقید کر رہا ہے کہ کس طرح وہ اسلام کے قوانین کی پابندی نہیں کر رہے ہیں۔ وہ کہہ رہا ہے کہ ''ہم محض ثقافتی اسلام پر عمل کرنے کے جنون میں ہیں۔ بعض مسلمان مسواک سے دانت صاف کرتے ہیں۔ کیوں کہ رسول پاک ۱۴ سو سال پہلے مسواک استعمال کرتے تھے۔ لیکن اب ہمارے پاس ٹوتھ برش ہے اور وہ مسواک سے بہتر ہے اور یہ غیر اسلامی عمل نہیں ہے۔ رسول خدا بھی شاید اب یہی استعمال کرواتے۔''

بھنڈی کا ٹکڑا میرے حلق میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ مجھے لگا جیسے مجھے مات ہوگئی۔ وہ بتا رہا ہے کہ کئی صدیوں سے مسلمانوں کا ذہنی ارتقا رُک گیا ہے اور ہم ساتویں صدی کے بدوؤں کے طرح رہتے ہیں اور اپنے مذہب کی چھوٹی چھوٹی غیر اہم جزئیات میں پڑ گئے ہیں بجائے اس کے کہ مسلم معاشرے کو اکیسویں صدی کے ساتھ چلنے کے قابل بنائیں۔ میں نوجوانی میں کئی سال تک زمین پر یہ سوچ کر کہ سوتی رہی کہ ہمارے پیغمبر کے پاس بستر نہیں تھا۔ بعض مسلمانوں کی طرح میں روحانی ارتقا کے دوران شدّت پسندی کے مرحلے سے گزری اور اس طرح کی تقریریں اُس وقت میرے بہت کام آسکتی تھیں۔

میں نے کمرے پر نظر ڈالی یہ جاننے کے لیے کہ سامعین کا اس کی تقریر پر کیا ردعمل ہے۔ مقرر کو عشاء کی نماز کے بعد مسجد میں مدعو کیا گیا تا کہ وہاں وہ جہاد کے موضوع پر تقریر کرے۔ یہ ایک اچھی نشانی تھا۔

مجھے یاد آیا کہ پچھلی رات میں نے ٹی وی پر مسلمانوں کی ایک گرما گرم بحث ہوتے سنی۔ ایک شخص کہہ رہا تھا کہ شمالی امریکا میں مسجدیں آزاد خیال اور اعتدال پسند مسلمانوں نے تعمیر کی تھیں جن پر بعد میں تنگ نظر اور قدامت پسند مسلمانوں نے قبضہ کرلیا۔ جن کا خیال تھا کہ اسلام کے صحیح معنے وہی جانتے ہیں اور صحیح ترجمانی وہی کر سکتے ہیں۔ یہی وقت ہے کہ مسجدوں کو ان سے واپس لے لیا جائے اور انہیں اسلام کے متعلق تبادلہ خیال اور مباحث کرنے کی جگہ بنائی جائے۔ میں جہاں رہی ہوں وہاں میں نے مسجدوں کے ساتھ یہ ہوتے دیکھا ہے۔ اور اگر یہ گفتگو کسی بات کی نشاندہی کرتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اعتدال پسند مسلمان باہر آرہے ہیں۔

یکم اکتوبر۔ صبح ۹ بج کر ۷ منٹ۔

میری والدہ ابھی ابھی ٹورنٹو سے پہنچی ہیں۔ وہ دو ہفتے کے لیے آئی ہیں۔ میرے شوہر ایک کانفرنس میں بدھ کو بوسٹن جارہے ہیں اور میری والدہ میرے بچوں کو سنبھالنے میں میری مدد کریں گی۔ وہ فوراً مجھے بتاتی ہیں، ”یہ سب مسلمانوں نے نہیں کیا ہے۔ یہ کام سفید فام لوگوں کا ہے تا کہ ہم برے بن جائیں۔“ جیسے ہمیں مدد چاہیے تا کہ سوچ سکیں۔ ”مسلمان پوری دنیا میں عذاب میں ہیں۔ اگر ہم کچھ ایسا انتظام کرسکیں کہ مسلمان اپنی سیاسی مشکلات کا حل ڈھونڈھ لیں۔ یہ مسلمان نہیں ہوسکتے۔“

میری والدہ کو پورا یقین ہے۔ ان کے خیالات پر مجھے ہنسی آرہی تھی۔ وہ بتاتی ہیں کہ وہ

میرے بھائی کے لیے پریشان ہیں۔ وہ اپنے ہی لوگوں کے بے حد خلاف ہوگیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مسلمان نقصان میں ہیں۔ اسے فون کرو اور پوچھو کہ وہ کیا سوچتا ہے۔'' اپنی والدہ کے اصرار پر میں اپنے چھوٹے بھائی کو اونٹاریو فون کرتی ہوں۔ ''امی بالکل فضول باتیں کر رہی ہیں۔ کیا انہوں نے تمہیں بتایا کہ وہ کیا سوچ رہی ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ مسجدیں بنانا چھوڑ کر یونیورسٹیاں بنانا شروع کر دیں۔'' میں اس سے پوچھتی ہوں کہ کیا اسے مسلمان ہونے کی وجہ سے لوگ پریشان کر رہے ہیں؟ ''نہیں۔ لوگ کچھ نہیں کہتے۔ بلکہ وہ ہم سے خوف زدہ ہیں۔ تم تو ایک مسلمان کو پریشان نہیں کرنا چاہتیں ناں۔'' وہ مذاق کرتا ہے۔

۲ بج کر ۸ منٹ دوپہر۔

ریجنیا سے باہر کے اسکول کی لائبریرین مجھے فون کرتی ہے۔ وہ مجھے چھٹی جماعت کے بچوں سے گفتگو کرنے کے لیے مدعو کرتی ہے۔ میں راضی ہوجاتی ہوں۔ ریجنیا میں آج کل اسلام سے دلچسپی بخار کی طرح اپنے عروج پر ہے۔ ممکن ہے پورے شمالی امریکا میں اسی طرح ہو۔ لوگ اپنی شناخت کرنا چاہ رہے ہیں۔ میری نند نے جو ایک اسکول ٹیچر ہے اپنے اسکول میں مسلمانوں سے متعلق ایک نیا نصاب ٹیچروں کے سامنے پیش کیا۔ اس نے بتایا کہ ہر شخص نے اخلاق سے بات سنی لیکن اسے ایک سردمہری کا سا احساس ہوا۔ ایک ٹیچر نے اس سے سوال کیا کہ وہ اس پر اور اسلام کے متعلق اس کے نقطہ نظر پر کس طرح بھروسہ کرسکتے ہیں جب کہ سی این این کی خبروں میں مسلسل بتایا جارہا ہے کہ دہشت گرد تمہارے مہربان پڑوسی ہونے کا ناٹک کرتے رہے۔

انہیں کیسے پتہ چلے گا کہ شمالی امریکا میں رہنے والے مسلمان طالبان کو اوپری دل سے بُرا بھلا کہہ رہے ہیں اور اندر ہی اندر وہ امریکا کی تباہی چاہتے ہیں۔

میری نند نے بتایا کہ ان کو جو کچھ خبریں مل رہی ہیں اس کی تردید کرنا بہت مشکل ہے۔ اس نے انہیں بتایا کہ وہ یہ نہیں جانتی کہ دہشت گرد کون ہیں لیکن آپ کو اس بات پر یقین کرنا چاہیے کہ ۹۰ فیصد مسلمان ایسے نہیں ہیں، وہ سمجھ دار ہیں، ہوش مند ہیں جو کسی کو نقصان یا تکلیف نہیں پہنچانا چاہتے۔ ہم خوف و ہراس میں زندہ نہیں رہنا چاہتے۔ مسلمانوں کو سامنے آنا چاہیے اور مسجدوں کے علاوہ اور جگہ بھی خیرات اور چندہ جمع کرنا چاہیے۔ کیوں کہ ہم نے اپنے بارے میں ایک غیریت پیدا کرلی ہے۔ ہمیں پڑوس میں جاکر لوگوں کا حال پوچھنا چاہیے۔ کیوں کہ ظاہر ہے کوئی دہشت گرد کسی پڑوس کی خیریت نہیں معلوم کرے گا۔

لائبریرین مجھے اپنے اسکول میں مدعو کرنا چاہتی ہے تاکہ میں اپنے عقائد اور خیالات سے آگاہ کروں۔ ''میں چاہتی ہوں کہ تم آ کر طالبان جو کچھ سکھا رہے ہیں اس کو چیلنج کرو اور بتاؤ کہ صحیح اسلام کیا ہے۔''

۹ بج کر ۳۴ منٹ رات۔

میں وال مارٹ جاتی ہوں۔ میرے شوہر کل بوسٹن کے لیے روانہ ہوں گے۔ میں ان کے بھانجے بھانجیوں کے لیے جو بوسٹن میں رہتے ہیں کچھ تحائف خریدنا چاہتی ہوں۔

۱۰ بج کر ۳۸ منٹ رات۔

میرے شوہر میرے لائے ہوئے تحفے دیکھ رہے ہیں۔ وہ ''آرٹ سیٹ'' اور ''پلے ڈو'' کو اپنے بیگ میں رکھتے ہیں۔ ہم دونوں کھلونے والے موبائل کو دیکھتے ہیں۔ ''یہ بیٹری سے چلے گا'' میں بتاتی ہوں۔ ''شاید سفر میں ایسی چیز لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔'' وہ پھر بھی اپنے سوٹ کیس میں رکھ لیتے ہیں۔ ہم دونوں اس کی گھنٹی کی آواز سنتے ہیں۔ ''اس سے لوگ ڈر نہ جائیں'' وہ کہتے ہیں۔ وہ اس کی آواز میں کچھ بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بٹن دباتے ہیں، ''۱، ۲، ۳'' فون کی آواز آتی ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ یہ آواز اور زیادہ خوفناک ہوگئی ہے۔ ''میں اپنے بھائی کو ایئرپورٹ لے جاؤں گا تاکہ اگر یہ کھلونا نہ لے جاسکوں تو اسے واپس کر دوں''۔

میرے شوہر کا بوسٹن میں ایک ہوسٹل میں ٹھیرنے کا ارادہ ہے۔ بوسٹن کے مرکزی شہر میں ہوٹل بہت مہنگے ہیں۔

ہوسٹل میں پرائیویٹ کمرے نہیں ہیں اس لیے میرے شوہر کو پانچ آدمیوں کے ساتھ ایک ہی کمرے میں ٹھہرنا پڑے گا۔ انہیں یہ فکر ہے کہ اس طرح رہنے میں انہیں نماز پڑھنے کی جگہ کیسے ملے گی۔

۳۔ اکتوبر۔ ۱۲ بج کر ۹ منٹ دوپہر۔

مجھے سانس کا زبردست انفیکشن ہوگیا۔ میری طبیعت بہت خراب ہے۔

''آپ کو اس بس ڈرائیور کے متعلق پتہ ہے جس کا آج صبح گلا کاٹ دیا گیا۔ میری گھر کی صفائی والی ملازمہ پوچھتی ہے۔ مجھے غنودگی سی ہونے لگتی ہے۔ ''نہیں۔ کیا وہ مسلمان تھا؟''

''یہ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کس نے کیا۔''

میں ہمت کر کے گولی کھاتی ہوں اور سی این این لگاتی ہوں۔ خبروں میں بتاتے ہیں کہ اس شخص کے پاس سے کروشیا کا ایک جعلی پاسپورٹ ملا ہے۔ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ مسلمان تھا۔ وہ ایک غیر ملکی تھا جس کا مطلب ہے کہ امریکی اب بھی پریشان رہیں گے۔'' میری ملازمہ کہتی ہے۔

۵ بج کر ۹ منٹ شام۔

میں اپنے بچوں کو اپنی ساس کے گھر سے لیتی ہوں۔ وہ بہت اضطراب میں ہیں۔ ''تم نے اسے ہوسٹل میں ٹھیرنے کی اجازت کیوں دی۔''

''اس نے کہا تھا کہ وہ وہاں زیادہ محفوظ رہے گا'' میں نے بے وقوفی سے جواب دیا۔ ''وہ خراٹے لیتا ہے۔ اور اس سے دوسرے پریشان ہوسکتے ہیں۔'' میری ساس نے اور غصہ سے کہا۔ ''کیا چیز زیادہ اہم ہے۔ پیسہ یا اس کی حفاظت؟'' میری والدہ بھی گفتگو میں شریک ہوگئیں۔ ''کیا ہسپتال محفوظ جگہ نہیں ہے؟'' ''نہیں۔ نہیں وہ ہوسٹل میں ٹھہر رہا ہے۔ ان غریب لوگوں اور طالب علموں کے ساتھ جو ہوٹل میں رہنا برداشت نہیں کرسکتے۔ اس کا اپنا کمرہ بھی نہیں ہے۔ کوئی بھی سوتے میں اس کے ساتھ کچھ کرسکتا ہے۔ مجھے پُرسکون رہنا چاہیے۔ مجھے رات میں سو جانا چاہیے یہ سوچے بغیر کہ کوئی میرے بارلیش شوہر پر، اسامہ بن لادن کا دھوکہ کھائے گا۔

''وہ لوگ وہاں چادریں تک نہیں دھوتے۔ اسے کوئی بیماری بھی لگ سکتی ہے۔ تمہارے بچوں کو بیماری لگا دے گا اور تم کبھی ٹھیک نہ ہوسکوگی۔'' میری امّی کہتی ہیں۔

''ان کو چاہیے کہ وہ کار کرائے پر لیں اور اپنی بہن کے گھر چلے جائیں۔'' میرا دیور رائے دیتا ہے۔

جانے سے پہلے میرے شوہر نے یہ کہا تھا کہ وہ مجھے آج فون نہیں کریں گے کیوں کہ وہ رات کو دیر میں پہنچیں گے اور مجھے سوتے میں سے اٹھانا مناسب نہیں سمجھتے۔ میری طبیعت اور زیادہ بگڑ رہی ہے۔ مجھے ایک اور ٹائی لینول کھا لینی چاہیے۔

۶ بج کر ۲۱ منٹ شام

میری امّی میرے فریج سے پلپلے ٹماٹروں کا ایک تھیلا نکالتی ہیں۔ ''دیکھو کتنا پیسہ ضائع کر رہی ہو۔''

وہ پھپھوندی لگے ٹماٹروں کو میرے سامنے نچاتی ہیں۔ ''اگر تم فریج پر ایک نظر ڈال لیتیں تو

ایک مناسب ہوٹل کا خرچہ نکال سکتی تھیں۔"

میں کچھ نہیں بولتی ہوں۔ مجھے بچوں کو مسجد سے لانا تھا اور انھیں سلانا ہے کیوں کہ میری ۷ بجے اسکول ایڈمنسٹریشن کے ساتھ میٹنگ ہے۔

مجھے بہت تھکن محسوس ہورہی ہے، گلا بھی دکھ رہا ہے لیکن میرا جانا ضروری ہے۔ میں چندہ جمع کرنے والے پروگرام کے لیے اسکول کے رسالے کی انچارج ہوں۔ انھیں میری رپورٹ چاہیے۔

۸ بجے رات

خواتین میٹنگ میں اس موضوع پر بات کررہی ہیں کہ کس طرح زیادہ سے زیادہ والدین کو رضا کارانہ طور پر آنے کے لیے تیار کیا جائے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ماہانہ میٹنگ میں والدین شریک کیوں نہیں ہوتے۔ میں انھیں بتاتی ہوں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تم لوگوں سے ڈرتے ہیں۔ "آپ کی پہلی میٹنگ میں کافی تعداد میں والدین شریک ہوئے تھے لیکن پھر وہ کبھی نہیں آئے۔" مجھے پہلی میٹنگ یاد ہے۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ تم لوگ کیا بات کررہے ہو۔ یہ سب بہت ڈرانے دھمکانے والے طریقے سے پیش آنا ہے۔ آپ کو نئے والدین کو شریک کرنے کے لیے انھیں پرسکون اور مطمئن ہونے کا احساس دلانا ہوگا۔" ایک خاتون نے میری ہاں میں ہاں ملائی۔ "میں بھی بالکل یہی محسوس کرتی ہوں" یہ سوچ کر مجھے ایک دم سے جرم کا احساس ہوتا ہے کہ کوئی اور بھی سہا ہوا ہے۔

۴۔اکتوبر

۹ بج کر ۴۳ منٹ صبح

میں فون کی گھنٹی کی آواز پر جاگتی ہوں۔ میری ساس کا فون ہے۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتی ہیں کہ کیا میرے شوہر کی کوئی خبر ملی۔

"ابھی تک نہیں" میرا حلق اس قدر دکھ رہا ہے کہ میں بمشکل بول پاتی ہوں۔

اب میں اٹھ چکی ہوں۔ ایک اور دوست کا فون آتا ہے۔ "کیا تم نے اس جہاز کے بارے میں سنا ہے جو اسرائیل سے چلا تھا اور خود پھٹ کر تباہ ہوگیا۔" خوفناک خواب ختم نہیں ہوتا۔ "کیا وہ مسلمان تھا؟" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ "ان کا خیال ہے کہ وہ دہشت گرد ہے"

میرا دل چاہ رہا ہے کہ میرے شوہر فون کریں۔ ان کے پاس موبائیل نہیں ہے۔ یہ میرا فیصلہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ بہت مہنگا ہے۔

میں نے سوچا کہ آج میں لیٹی رہوں گی جب تک کچھ بہتر نہیں ہوتی۔ میرا تین سال کا بیٹا میرے کمرے میں آتا ہے۔

''میں نے پیشاب کر دیا ہے'' وہ بتاتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ ڈائپر سے اس کا ننھا منا عضوِ تناسل ننگا نظر آ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یونی ورسٹی میں وہ واحد بچہ ہوگا جس کی باتھ روم کی تربیت نہیں ہوئی ہے۔ میں اسے اپنے پاس بلاتی ہوں تاکہ اس کا ڈائپر تبدیل کروں۔

۲ بج کر ۴ منٹ دوپہر

میں ۱۱۔۷ (دکان کا نام) سے ایک فون کارڈ خریدتی ہوں۔ جب میں وہ اپنی والدہ کو دکھاتی ہوں تو وہ چلاّنے لگتی ہیں۔ ''یہ تیس ڈالر کا فون کارڈ ہے۔ مجھے ان سے اتنی لمبی بات نہیں کرنا ہے۔ تم اسی طرح پیسے ضائع کرتی ہو۔ اسے واپس کرو اور ایک مناسب ہوٹل کے لیے پیسے بچاؤ۔''

میں کچھ نہیں کہتی۔ میں واپس ۱۱۔۷ جاتی ہوں وہ کارڈ واپس کرکے ایک دس ڈالر کا فون کارڈ خریدتی ہوں۔ میں اسلام آباد فون کال ملاتی ہوں۔ میری والدہ اپنے بہنوئی سے بات کرکے بہت خوش ہوتی ہیں۔ میں وقت کا غلط حساب لگاتی ہوں اور انھیں آدھی رات کو جگا دیتی ہوں۔ میں فون کا وقت ختم ہونے سے پہلے اپنے کزن کا ای میل نمبر لیتی ہوں۔

۷ بج کر ۳۵ منٹ شام

میرے والد مجھے فون کرتے ہیں۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا میں اب بھی فلموں پر کام کر رہی ہوں۔ ان کی خواہش ہے کہ اب میرے مزید بچے نہ ہوں بلکہ میں اپنے کام کی طرف زیادہ دھیان دوں۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ چونکہ میں آرٹس کی طرف چلی گئی تو اب اکیڈمی ایوارڈ سے ہی ان کا غم غلط ہو سکے گا۔

میں نے انھیں نہیں بتایا کہ پچھلے تین سال سے میں جس فلم پر کام کر رہی ہوں اس میں ایک مسلمان نوجوان کو مجبوراً ایک عرب دہشت گرد کا کردار ادا کرنا ہے۔ جو جہاز کو اغوا کرتا ہے۔ فلم کا اسکرپٹ طنز پر مبنی ہے چونکہ ہالی ووڈ میں عربوں کو ہمیشہ بدمعاش شخص دکھایا جاتا ہے۔ میں فلم ''منتظمین کا فیصلہ'' سے متاثر ہوئی تھی جو چند عربوں کے بارے میں تھی جنھوں نے جہاز اغوا کر لیا۔ میں اس اسکرپٹ کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی جس پر میں نے اتنی محنت صرف کی تھی۔ لیکن

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے آگے کس طرح جاری رکھوں۔ مجھے یہ نئے واقعات شامل کرنا پڑیں گے۔ مجھے اس میں دکھانا ہوگا کہ کس طرح جہازوں کے حادثے شمالی امریکا میں مسلمانوں کی زندگیاں فوراً کے فوراً بدل دیتے ہیں۔

۸ بج کر ۳۵ منٹ رات

میں اپنی سب سے بڑی بیٹی کے لیے باداموں اور مکھن کا سینڈوچ بنا رہی ہوں۔ کیوں کہ اسے بھی میرے بڑے بیٹے کی طرح مونگ پھلی سے الرجی ہے۔

جب میرا بڑا بیٹا دو برس کا تھا تو میں نے اس کے گال پر مونگ پھلی کا مکھن چھوایا، یہ سوچ کر میرے دو بچے اس سے الرجک نہیں ہو سکتے لیکن اس کا چہرہ سوجنا شروع ہو گیا۔

میں چھوٹے بچّے کے دو برس کے ہونے کا انتظار کر رہی ہوں تا کہ اس کا الرجی ٹیسٹ لے سکوں۔ میں اخبار میں شہ سرخی پڑھتی ہوں جو حیاتیاتی دہشت گردی سے متعلق تھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ جب تک وہ آسمان سے مونگ پھلی کی بارش نہیں کرتے میں اس سے محفوظ رہوں گی۔

آخر کار میرے شوہر فون کرتے ہیں۔ ہماری مائیں بہت پریشان ہیں، میں انھیں بتاتی ہوں۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں،'' وہ بتاتے ہیں۔ جس وقت تک وہ کمرے میں پہنچے ہر شخص سو چکا تھا اور ان کے اٹھنے سے پہلے وہ وہاں سے چلے گئے تھے۔

انھوں نے بتایا کہ انھوں نے بستر پر لیٹے لیٹے ہی نماز ادا کر لی تا کہ کسی کو پریشانی نہ ہو''۔

''کیا آپ اپنی بہن کے گھر نہیں ٹھہر سکتے۔'' انھوں نے بتایا کہ جہاں ان کی کانفرنس ہو رہی ہے ان کی بہن اس جگہ سے بہت زیادہ دور رہتی ہے۔ اس لیے یہی ہوسٹل مناسب ہے اور پھر یہاں بے شمار بین الاقوامی طالب علم رہتے ہیں اس لیے کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔

''کیا آپ کھلونے والا موبائل سیکورٹی سے نکال سکے؟'' انھیں کسی نے پریشان نہیں کیا۔ ان کی ملاقات ایک دوست سے ہوگئی جس کا پاکستانی پاسپورٹ تھا۔ اس کا سارا سامان باہر نکال کر ڈال دیا گیا۔ اس نے ایک عرب ٹیکسی ڈرائیور سے دوستی کر لی ہے جو خود کو نکاراگوا کا باشندہ ظاہر کرتا ہے۔ میرے شوہر مجھے تسلی دیتے ہیں۔ وہ کسی بچے سے بات کرنا چاہتے ہیں لیکن کوئی بچہ ان سے بات نہیں کرنا چاہتا۔

۵۔ اکتوبر

۴ بج کر ۲۵ منٹ شام

میری بیٹیاں اسکول بس پر ساتھ گھر آتی ہیں۔ آج جمعہ ہے آج انھیں اسکول سے آ کر ٹی وی دیکھنے کی اجازت ہے۔ دروازے کی گھنٹی بجتی ہے۔ وہ اسکول کی لائبریرین ہے۔ جہاں مجھے اگلے ہفتہ تقریر کرنا ہے۔ وہ مجھے اسکول کا نقشہ دیتی ہے۔ ''پریشان نہ ہوں۔ آپ ہمارے اسکول میں بالکل محفوظ رہیں گی۔ ہمارے اسکول میں صرف ایک مسئلہ ہوا تھا کہ ہماری پارکنگ میں ایک یہودی کو کسی نے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ہم نے اسے بچالیا۔

میں نقشہ اخباروں کے بورڈ میں لگا دیتی ہوں۔ کیلنڈر دیکھتی ہوں۔ وہ بھر چکا ہے۔

اب مجھے کچھ غیر اہم بات سوچنا ہوگی۔ اس ہفتہ مجھے ایک شادی میں شریک ہونا ہے اور میرے پاس میرے کپڑوں سے میچنگ کوئی اسکارف نہیں ہے۔ صرف اس لیے کہ آپ اپنے بال ڈھکتے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ غرور نہیں کر رہے۔ اس ہفتہ کا میرا منصوبہ یہی ہوگا کہ میں ہرے رنگ کا اسکارف خریدوں۔

۷۔ اکتوبر

صبح کے وقت میں ریڈیو اٹھا کر تہہ خانے میں لے جاتی ہوں تا کہ ساکت سائیکل پر ورزش کے ساتھ ساتھ خبریں سن سکوں۔ میں ریڈیو چلاتی ہو اور افغانستان میں ہونے والی بمباری کی خبریں سنتی ہوں۔ میں دو تین منٹ تک سنتی رہتی ہوں تا کہ مجھے یقین آ جائے۔ مجھے بالکل یقین تھا کہ امریکی یہ حرکت کبھی نہیں کریں گے۔

میں ریڈیو بند کرتی ہوں۔ اور واپس اوپر لے کر جاتی ہوں۔ میری والدہ میری سات سالہ بچی کو بُننا سکھا رہی ہیں۔ میری بٹی چیختی ہے، ''امّی۔ وہ لوگ افغانستان پر بمباری کر رہے ہیں۔'' میں ٹی وی کھول لیتی ہوں۔ اسامہ بن لادن مسلمانوں کو امریکیوں کے خلاف اکسا رہا ہے فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ وانکوور سے میری دوست کا فون ہے۔ وہ گھبرائی ہوئی ہے۔ ''گلوب سے رپورٹر میرا انٹرویو لینے آ رہے ہیں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''انھیں بتاؤ کہ اسامہ ہمارا ترجمان نہیں ہے،'' میں اس سے کہتی ہوں۔

دوپہر کو میں اپنے تین سالہ بیٹے کے ساتھ ایئرپورٹ جاتی ہوں۔ میں اپنے شوہر کا انتظار کر رہی ہوں۔ میں انھیں دیکھتی ہوں۔ چار دن میں ان کی داڑھی کس قدر بڑھ گئی تھی۔ وہ ریزر

ساتھ نہیں لے گئے تھے۔ میں انھیں بمباری کے متعلق بتاتی ہوں۔ وہ ششدر رہ جاتے ہیں۔
جوں ہی ہم گھر پہنچتے ہیں ٹی وی لگاتے ہیں۔ میں پوری کوشش کرتی ہوں کہ کارٹون کا چینل نہ لگنے پائے، کیونکہ مختلف چینلز خبریں دکھا رہے ہیں۔ میں اے بی سی پر رک جاتی ہوں جہاں پیٹر جیننگز خبریں سنا رہے ہیں۔ وہ شاید کینیڈین ہونے کی وجہ سے بہت پُرسکون ہیں انھیں سن کر یہ محسوس نہیں ہو رہا ہے جیسے تیسری جنگ عظیم چھڑ گئی ہو۔
انھوں نے مذہب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں وقت صرف کیا ہے۔ وہ لفظ 'جہاد' کی وضاحت کرتے ہیں۔ اور بتاتے ہیں کہ اس کے کئی مختلف معنے ہوتے ہیں۔ میں بہت متاثر ہوتی ہوں۔

ساری دنیا، عالمِ اسلام کے ردعمل کی منتظر ہے۔ اس وقت سب سو رہے ہیں۔ میں پاکستان اپنی کزن کو ای میل بھیجتی ہوں۔ جب تک اسے یہ ملے گی ہنگامے شروع ہو چکے ہوں گے۔ صدر بش برابر کہہ رہے ہیں کہ یہ جنگ مسلمانوں، اسلام یا افغانیوں کے خلاف نہیں ہے۔ میں جنوبی افریقا میں رہنے والی اپنی دوست کو فون کرتی ہوں۔
''میں بش پر بھروسہ نہیں کرتی'' وہ کہتی ہے۔ ''وہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ یہ جنگ صرف دہشت گردوں کے خلاف ہے۔ تقریباً ۵۰۰ آدمی قید ہیں جب کہ ان کے خلاف کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ مجھے مستقبل کی سخت فکر ہے۔ لگتا ہے یہ جنگ برسوں چلے گی۔ مسلمان امریکیوں سے بہت ہمدردی رکھتے ہیں۔ شاید یہ سوچنے لگے ہیں کہ کیا یہ حملہ واقعی ضروری تھا۔''
میں اپنے بیٹوں، اور تین سالہ بچے کو بوسٹن والی دوست کے پاس چھوڑ کر شادی میں جانے کی تیاری کروں گی۔
''میں اپنا فرنیچر فروخت کرنے والی ہوں۔'' وہ کہتی ہے۔
مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔
''اقتصادی بدحالی شروع ہونے والی ہے۔ لوگوں کی ملازمتیں ختم ہو جائیں گی۔ پھر وہ آ کر ہمارا فرنیچر لے لیں گے کیوں کہ ہر شخص ہم سے نفرت کرتا ہے۔''
میں اسے بتاتی ہوں کہ اتنا برا حال نہیں ہوگا۔
''میں نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ ہوتے دیکھا ہے۔ یوگوسلاویہ میں یہی سب کچھ ہوا تھا۔'' میں اس سے پوچھتی ہوں کہ اس کے شوہر کیا سوچتے ہیں۔ اس کے شوہر ایرانی ہیں۔ وہ بتاتی

ہے کہ وہ دونوں ہمیشہ اپنے اپنے جنگی تجربوں کی وجہ سے آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ اس کے شوہر اسے بتاتے ہیں کہ وہ ایران، عراق جنگ سے گزرے ہیں اس لیے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کیا ہوسکتا ہے۔ انہیں یہ پریشانی نہیں ہے کہ یہ سب امریکا میں ہوگا۔

میں اپنی دوست کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں لیکن بے سود۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے بچوں کی دیکھ بھال کا یہ انتظام فائدہ مند نہیں ہوگا۔ مجھے کسی غیر مسلم خاتون کا بندوبست کرنا پڑے گا جو کم از کم خوف و ہراس نہیں پیدا کرے گی اور بھاگ نہیں جائے گی۔

شادی کی تقریب میں ہر شخص بمباری کے متعلق گفتگو کر رہا تھا۔

میری ایک دوست نے بتایا کہ اس نے کل رات سنہرے اور فیروزی رنگ کی ایک ساری آج کے لیے استری کی تھی لیکن آج صبح سے وہ اس قدر افسردہ ہوئی کہ اُسے وہ ساڑھی پہننا اچھا نہیں لگا۔

ہم نئے شادی شدہ جوڑے کے لیے خوش ہونے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن دل کے اندر جو اداسی ہے اُسے چھپانا مشکل ہو رہا ہے۔ ہماری میز کے علاوہ ہر میز پر شیشے کی موم بتی اسٹینڈ جن پر مٹی کے رنگ کا شیڈ تھا چمک دار چاکلیٹوں کے تھیلوں کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ میزبان نے بتایا کہ یہ کم پڑ گئے ہیں۔ میری بیٹیاں ناراض ہو رہی ہیں۔ میں نے ہر میز کا جائزہ لیا۔ ایک میز نظر آئی جس پر اکیلے مرد بیٹھے ہوئے ہیں۔

"کیا آپ کو اس کی ضرورت نہیں ہے" میں نے نہایت شائستگی سے کہا۔

جب میں واپس آئی تو میری میز کے قریب کئی دوستیں موجود تھیں۔

"اگر پائلٹ یا بس ڈرائیور ہماری طرف سے پریشان ہوں تو وہ ہمیں کہیں بھی دھکا دے سکتے ہیں۔ ہماری شہری آزادی ختم ہوتی جا رہی ہے۔" ایک دوست کہہ رہی تھی۔ میری ایک وکیل دوست جو زیادہ عملی نقطۂ نگاہ رکھتی ہے بولی۔

"ہمیں اس بات پر دھیان دینا چاہیے کہ کون سے عوامل ہمیں دوسروں سے الگ کر رہے ہیں اور اسے سب کو بتانا چاہیے تاکہ پتہ چلے کہ ہو کیا رہا ہے۔"

لگتا ہے جیسے کینیڈا میں اتنے سال گزارنے کا وقت ضائع ہوگیا۔ مستقبل میں ہونے والی دہشت گردی اور جنگ سے مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی وبائی بیماری کے ساتھ چلے پھرے جس سے لوگ بچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

۱۰/اکتوبر

ریجنیا کے باہر ایک اسکول میں میرا تعارف ۱۲۰ طالب علموں سے کرایا جاتا ہے۔ میں اسلام کے پانچ ارکان کے متعلق گفتگو کرتی ہوں لیکن لائبریرین مطمئن نہیں لگتی۔ ''انہیں بتائیں کہ آپ کے مذہب سے طالبان کا کوئی تعلق نہیں ہے،'' میں طالبان کا پس منظر سلجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔

لائبریرین اصرار کرتی ہے کہ میں طالب علموں کو بتاؤں کہ اسامہ بن لادن ہمارے مذہب کی نمائندگی نہیں کرتا۔

میں جوش میں آ کر بولتی ہوں۔ ''وہ تو دراصل مسلمان ہی نہیں ہے۔''

ایک دم سے اپنی اس بات پر افسوس ہونے لگتا ہے لیکن اب کچھ اور کہنے کے لیے بہت دیر ہو چکی تھی۔ لائبریرین چاہتی تھی کہ بچے مسلمانوں کے درمیان خود کو غیر محفوظ نہ سمجھیں۔ وہ اس بات سے پریشان تھی کہ بچے ٹی وی پر کیا دیکھ رہے ہیں۔ چناں چہ میں اپنے مذہب اور خود کو لادن سے بہت دور رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے جیسے میں اپنے مستقبل کی خاطر اپنے مذہب کا دفاع کر رہی ہوں۔

۱۱/اکتوبر۔

مجھے اور میرے شوہر کو ریجنیا کے مختلف عقائد کے منعقدہ جلسے کے لیے تاخیر ہوگئی ہے۔ ہر شخص ایک بڑے سے دائرۂ میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس قسم کے جلسے میرے لیے علاج کا کام کرتے ہیں۔ منتظم ہر شخص کو باری باری بولنے کا موقع دیتا ہے۔ بہت سے لوگ کچھ نہیں کہہ سکتے اور دوسرے کو موقع دیتے ہیں۔ میری ایک مسلمان دوست کی باری آتی ہے۔ وہ رونا شروع کر دیتی ہے اور کچھ نہیں کہہ پاتی۔

میں نہیں روؤں گی، میں نہیں روؤں گی۔

میں اپنی باری آنے پر کہنا شروع کرتی ہوں۔ ''آج کل مسلمان ہونا بہت مشکل ہے۔ ان حادثوں کے بعد مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہودی ہونا زیادہ بہتر ہے۔ وہ سب جو کرتے ہیں متحد ہو کر کرتے ہیں۔ لیکن میں مسلمان ہوں اور سمجھتی ہوں کہ دنیا میں ہم میں سے چند لوگوں کے ساتھ نہایت تکلیف دہ واقعات رونما ہوئے ہیں۔ شاید لوگ یہ سوچ رہے ہیں کہ اپنا غصہ دوسروں

کو سمجھانے کا یہی طریقہ ہے میں نہیں جانتی کہ انہوں نے یہ کیوں کیا اور کس نے کیا؟ لیکن میں یہ جانتی ہوں کہ دہشت گردی کا علاج جنگ نہیں ہے۔

مجھے اس رات اپنی گفتگو پر کوئی افسوس نہیں تھا کیوں کہ ایک حد کے بعد بعض مسلمانوں کے عمل پر معافی مانگنا ختم کر دینا ہوگا۔ مجھے خود بھی سمجھنا ہوگا کہ ایسا کیوں ہوا اور لوگوں کو یہ بتانا ہوگا کہ میں کیا محسوس کرتی ہوں۔

افسانہ نگارامر محبوب نے کراچی سے انجینئرنگ کی سند حاصل کرنے کے
بعد کچھ عرصہ نیویورک میں گزارا اور تیز رفتار شہری زندگی کے حوالے
سے کئی افسانے لکھے۔ یہ افسانہ ۱۱/ ستمبر ۲۰۰۱ء سے پہلے لکھا جا چکا
تھا۔ امر محبوب نے کراچی میں دستاویزی فلمیں بنانے کے علاوہ ایک کافی
ہاؤس بھی قائم کیا ہے، جہاں دانش وروں اور ادیبوں کو مل بیٹھنے کا موقع
مل سکے۔

امر محبوب ٹیپو

ایک کیڑا

ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے نیچے زمین کی تہہ میں کئی سوفٹ نیچے ایک ٹرین آ کر رکتی ہے اور اس میں سے ایک کیڑا باہر نکلتا ہے۔ لوگوں کے ہجوم میں گھرا ہوا۔ بازو سے بازو اور کہنیوں سے کہنیاں ٹکراتی ہیں۔ لیکن تمام کہنیوں پر موٹے کوٹوں کی کئی تہیں چڑھی ہوئی ہیں۔ کیڑا اپنے ساتھ چلتی ہوئی کسی گوری عورت کی نرم اور ملائم جلد کو چھوکر محسوس نہیں کرسکتا۔ اس بات کا اسے افسوس ہے۔

مگر اپنے طور پر کیڑا بہت جوش میں ہے۔ اس سے کہیں بڑی بھیڑ اور ہجوم اس نے اپنی زندگی میں کئی بار دیکھے ہیں۔ "یہ تو بچوں کی بات ہے....." کیڑا سوچتا ہے۔ اور وہ دھکے دیتا ہوا اس ہجوم میں آگے بڑھتا ہے...... اس کے ساتھ چلتے ہوئے لوگ ایسے دھکوں کے عادی نہیں۔ اسے جگہ دے دیتے ہیں یوں وہ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ یہ ہی اس کی جیت ہے، یہیں پر اس کی فتح ہے۔ فخر سے اس کا دل اور تیز دھڑکنے لگتا ہے اور کیڑے کو زندگی بھر دھکے کھانے کا پھل ملتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

کچھ دیر میں وہ عمارت سے باہر آجاتا ہے۔ تیز چلتی ہوئی ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی خنجر اس کے چہرے کو چیر رہا ہو۔ کیڑے کو ایک لمحے کے لئے تکلیف کا شدید احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنے دائیں بائیں دیکھتا ہے۔ اسے عمارت سے باہر نکلتی ہوئی کئی خوبصورت عورتیں نظر آتی ہیں۔ وہ سب تیزی سے اپنی اپنی منزلوں کی طرف جارہی ہیں۔ کیڑا کچھ دیر انہیں یوں ہی جاتا ہوا دیکھتا ہے، پھر وہ بھی تکلیف کو بھولتا ہوا اپنی راہ پر ہونے لگتا ہے۔

اب اس کا ذہن تمام خیالات سے خالی ہے سوائے خوش قسمتی کے ایک احساس کے کہ وہ

وہاں، اس جگہ موجود ہے۔ اس کے اطراف کی دنیا میں کتنی روانی ہے، کتنی ہم آہنگی ہے۔

پھر اس کی توجہ اسٹاک مارکیٹ کی طرف مبذول ہو جاتی ہے، اور وہ راتوں رات کروڑ پتی ہونے کے خواب دیکھنے لگتا ہے۔

نیویارک شہر میں رہنے والا یہ ہے صرف ایک کیڑا۔ جس کے ہونے یا نہ ہونے سے شہر کی آب و تاب پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اس کیڑے کو ان باتوں کا احساس نہیں۔

دن کے کوئی گیارہ بجے ہیں۔ کیڑا اپنی کرسی پر بیٹھا کام میں بے انتہا مصروف ہے۔ اس کی میز پر رکھے ہوئے کمپیوٹر کے اسکرین پر متعدد اعداد و شمار نظر آ رہے ہیں جو لمحے لمحے پر تبدیل ہوتے ہیں۔ کیڑے کو ان پر مستقل نظر رکھنی پڑتی ہے۔ اس کے ڈیسک پر رکھا ہوا ٹیلی فون متواتر بجتا رہتا ہے۔ اکثر اوقات بہ یک وقت اُسے کئی کام کرنے پڑتے ہیں۔ آس پاس کام کرنے والوں کا حال بھی یہ ہی ہے۔ کسی کے پاس رکنے کی مہلت نہیں۔ کام کے بے حد دباؤ کی وجہ سے چہروں پر سنجیدگی اور گہرا تناؤ ہے۔ کیڑے کے چہرے سے بھی یہ ہی تاثرات عیاں ہو رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک برابری محسوس کرتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے نظر اٹھا کر اپنے آگے بیٹھی ہوئی لڑکی کو تکتا ہے پھر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو جاتا ہے۔

کیڑا اپنے کام میں ماہر ہے۔ اس کے ساتھ کام کرنے والے یہ بات جانتے ہیں۔ کچھ دیر میں آگے بیٹھی ہوئی لڑکی پاس آتی ہے اور کوئی سوال پوچھتی ہے۔

اب کیڑا اپنا تمام کام چھوڑ دیتا ہے اور اس کے سوال کا جواب دینے میں مگن ہو جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنی قابلیت کو استعمال کرتے ہوئے اس پر ڈورے ڈالے۔ لیکن وہ لڑکی سوال کا جواب پاتے ہی اپنے کام کی طرف لوٹ جاتی ہے اور کیڑے کے ذہن میں پیدا ہونے والے کئی سوالات بن کھلے مرجھا جاتے ہیں۔

کچھ دیر بعد کیڑا اٹھتا ہے، کافی کا کپ ہاتھ میں لئے اس لڑکی کی جانب بڑھتا ہے۔ لیکن وہ لڑکی کام میں بے انتہا مشغول ہے۔ وہ اس کی طرف نہیں پلٹتی۔ کچھ دیر انتظار کر کے کیڑا اپنے دل میں اُسے ایک موٹی سی گالی دیتا ہے، اور یہ سوچتا ہوا کہ وہ اس لڑکی سے زیادہ پیسے کماتا ہے دوبارہ کام میں مشغول ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

اب لنچ کا وقفہ ہے۔

کیڑا عمارت سے باہر نکلتا ہے۔ سورج نکل آیا ہے لیکن سردی اب بھی خاصی ہے۔ ٹھنڈ کے ایک تند تھپیڑے سے اس کی آنکھیں چمکتی ہیں اور جسم سکڑتا ہے۔

سڑک پر کچھ آگے ایک ریستوران نظر آتا ہے۔ اس میں کام کرنے والے اس ہی کے ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہاں کے متعلق خیال آتے ہی کیڑے کے ذہن میں پرانے احساسات جاگ اُٹھتے ہیں۔ ''...... نخش ملک تھا وہ ...... اور نخش ہوتے ہیں وہاں کے رہنے والے......'' وہ غصے میں سوچتا ہے۔ ''...... میں وہاں نہیں جاؤں گا......'' کچھ آگے بڑھ کر وہ ایک سستے سے ٹھیلے سے اپنے واسطے کھانا خریدتا ہے اور تیزی سے اپنی ڈیسک کی طرف پلٹتا ہے۔ ڈیسک پر تنہا بیٹھ کر کھانا کھانے میں اُسے تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔

پھر اپنے وطن کے خیالات اس کے ذہن میں دوبارہ آنے لگتے ہیں۔ وہ ان میں گھر کر کچھ دیر کے لیے بے بس ہو جاتا ہے۔ وہاں کی تنگ اور پتلی گلیاں، چھوٹے چھوٹے کوارٹر، اور ان میں بسنے والے لاتعداد لوگ کچھ دیر تک اس کے تحفظ کے احساس پر تابڑ توڑ حملے کرتے رہتے ہیں۔ اور وہ اپنے آپ کو اس نئی دنیا میں بالکل تنہا اور بے بس محسوس کرتا ہے۔ پھر یکا یک اس کے کمپیوٹر کے اسکرین پر بہت ہی غیر متوقع اعداد و شمار نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں اور ایک بار پھر اس کی تمام توجہ ان اعداد و شمار میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کی لہروں میں تھپیڑے کھانے لگتی ہے۔

یوں وہ دن تمام ہوتا ہے۔ رات آٹھ بجے کیڑا اپنے کام سے فارغ ہو گیا ہے۔ آج کا دن اچھا گزرا۔ اس نے اپنے مالکوں کے واسطے بہت سود مند بیوپار کیا۔ اس بات کی اسے خوشی ہے۔ یہ سال اب تک اچھا گزر رہا ہے۔ کیڑا بہت اطمینان سے ہے۔ شاید اس سال وہ تھوڑے زیادہ پیسے بنا پائے۔ اس خیال نے تمام دن کی تھکن دور کر دی ہے۔ اب وہ اپنے آپ کو عیش و عشرت میں کھونا چاہتا ہے۔ ''...... یہ ہے مزا یہاں کی زندگی کا......'' وہ سوچتا ہے۔

اس رات کلب میں رش خاصا ہے۔ کمر سے کمر اور سینے سے سینہ ٹکراتا ہے۔ کیڑا ڈانس فلور پر رقص کرنے میں مگن ہے۔ کبھی وہ ایک لڑکی کے ساتھ رقص کرتا ہے کبھی دوسری۔ لیکن آج کوئی لڑکی بھی اس کے ساتھ ٹک نہیں رہی۔ ''کیا آج میں کسی کو اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو پاؤں گا؟......'' کیڑا سوچ رہا ہے۔

پھر کوئی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہے۔ کیڑا پلٹ کر دیکھتا ہے کہ ایک مرد ہے۔ کیڑے کو اس کی حرکت بھلی نہیں محسوس ہوتی۔ وہ اس کا ہاتھ ہٹا کر ڈانس فلور پر اس سے دور ہٹ جاتا ہے۔ مگر کچھ دیر میں وہ شخص پھر اس کے قریب موجود ہوتا ہے۔ کیڑے کو اس سے سخت وحشت ہوتی ہے۔ وہ پھر دور ہٹنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ شخص پیچھا نہیں چھوڑتا۔ کیڑے نے آج شراب بہت پی ہوئی ہے نشے اور کوفت سے کیڑا اس شخص کو پیچھے دھکا دیتا ہے۔ وہ شخص بھی اُسے دھکا دیتا ہے۔ چند لمحوں

میں وہ دونوں ڈانس فلور پر گتھم گتھا ہوئے لڑ رہے ہوتے ہیں۔

فلور پر بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ لوگ ادھر اُدھر بھاگتے ہیں۔ کلب کے محافظ ان کو الگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جلد ہی ان پر قابو پالیتے ہیں۔ کیڑے کو دو لحیم شحیم آدمیوں نے جکڑا ہوا ہے۔ وہ اسے کھینچتے ہوئے دروازے کی طرف لے جا رہے ہیں۔ کیڑا چیختا ہے شور مچاتا ہے لیکن وہ اس کی نہیں سنتے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُسے کلب کے دروازے کے باہر دھکا دے دیتے ہیں۔

اب کیڑا باہر سڑک پر اکیلا کھڑا ہے۔ رات کافی گزر چکی ہے۔ جاڑے کی ٹھنڈی ہوا اس کی ہڈیوں کے گودے کو جما رہی ہے۔ لیکن کیڑے کا دماغ ابھی بھی غصے سے گرم ہے۔ ''...... بدمعاش کہیں کے......'' وہ سوچ رہا ہے۔ پر دوسری طرف اسے اب بھی ایک اطمینان ہے کہ آج اس نے اپنے مالکوں کے واسطے بہت پیسے بنائے۔ وہ اپنے بھاری قدم اٹھاتا ہوا ایک ٹرین اسٹیشن کی طرف بڑھ رہا ہے۔

آگے سڑک کے کونے پر ایک عورت کھڑی ہے۔ کیڑا جب اس کے قریب پہنچتا ہے تو وہ عورت اسے دیکھ کر مسکراتی ہے اور ہلکے خرام میں اس کی طرف بڑھتی ہے۔

کیڑا ٹھہر جاتا ہے۔

تھوڑی دیر میں کیڑا اس عورت کے ساتھ ایک کمرے میں موجود ہوتا ہے۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ وقت کا بادشاہ ہے، اور کسی وقت بھی بڑی سے بڑی عیاشی کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ ''اسے کہتے ہیں زندگی...... اور یہ ہے عیاشی......'' وہ سوچ رہا ہے۔

وہاں سے فارغ ہو کر وہ گھر کی طرف نکلتا ہے۔

اس وقت وہ ٹرین میں سفر کر رہا ہے۔ رات کی اندھیری گہرائیوں میں اتر چکنے کے بعد اب نہ جانے کہاں گم ہو چکی ہے۔ ٹرین کے ڈبے میں اس کے علاوہ کوئی شخص موجود نہیں۔

ٹرین ایک اسٹیشن پر رکتی ہے، اور ڈبے میں ایک دیو ہیکل شخص چڑھتا ہے۔ کیڑے کو ڈبے میں اکیلا پا کر اس کی چہرے پر ایک مہیب مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے۔ کیڑا اُسے دیکھ کر سر سے پیر تک کانپ جاتا ہے۔ اس کی نگاہیں راہِ فرار کی تلاش میں ادھر سے ادھر پھڑ پھڑاتی ہیں۔ لیکن کوئی ایسا راستہ اب موجود نہیں۔

نیویارک شہر کی سطح زمین سے کئی سو فٹ نیچے سفر کرنے والی اس ٹرین میں یہ ہے ایک کیڑا۔ صرف ایک کیڑا۔

نیویورک میں نووارد، آسیہ جبّار شمالی افریقا یعنی مغرب کی سربرآوردہ ادیبہ ہیں۔ وہ ۱۹۳۶ء میں الجزائر میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے فرانس میں تعلیم حاصل کی۔ شاعری اور ناول نگاری کے علاوہ وہ لسانیات اور تاریخ پڑھاتی رہی ہیں۔ وہ فرانسیسی میں لکھتی ہیں اور ان کے تین ناولوں کے ترجمے انگریزی میں شائع ہوئے ہیں۔ نقادوں نے ان ناولوں میں مسلم متوسط طبقے کی عورتوں کی زندگی کی حقیقت سے قریب عکاسی اور دروں بینی کو خاص طور پر سراہا ہے۔ تاہم اُردو کی خواتین افسانہ نگاروں کے انگریزی ترجمے کے انتخاب میں عامر حسین نے اُردوا فسانے سے ان کے مزاج کی فطری مناسبت کی نشان دہی کی ہے۔ آسیہ جبار کی یہ تحریر "رسپانسز ٹو نائن الیون" نامی حالیہ مجموعے میں شامل ہے۔ اس میں انگریزی کے مترجم کا نام نہیں دیا گیا۔

آسیہ جبّار

ترجمہ: آصف فرّخی

نیویورک میں ماتم کے مقامات

یہ لکھنا، آج کے دن، ستمبر ۲۰۰۱ء کے گیارہویں دن کے گیارہ دن بعد۔ میں گیارہویں اسٹریٹ پر لکھ رہی ہوں، اپنے سب سے زیادہ پسندیدہ کیفے میں، جو پانچویں اور چھٹی ایونیو کے درمیان لوئر مین ہٹن میں واقع ہے۔

میں نووارد نیویورکر ہوں: میں فرانسیسی ادب پڑھاتی ہوں، انگریزی پڑھتی ہوں، سب سے بڑھ کر یہ کہ ولیج (کے علاقے) میں چلتے پھرتے، بولتے اور خواب دیکھتے ہوئے گھنٹوں تک بلکہ بعض دفعہ پورے پورے دن اپنے ذہن میں لکھتی رہتی ہوں، اس کے بعد کاغذ پر اُتارتی ہوں اور پھر رات کے وقت لکھنے کی میز پر میرا ناول آگے بڑھتا ہے یا میرا اگلا مضمون۔

اپنے نئے پتے میں مجھے گیارہ نمبر نظر آتا ہے اور یہاں سے گیارہ منٹ کے فاصلے پر وہ ہول ناک مقام ہے جس پر آج کے دن ساری دُنیا کی نظریں جمی ہوئی ہیں۔

اس نمبر سے لکھنے کا آغاز کرنا، اسے اس سب کے لیے ایک طرح کا برق کش آلہ (لائٹننگ راڈ) بنالینا جو یہاں سے شروع ہوتا ہے۔

(۲) ادیب نہ تو مستقبل بین پیش گو ہوتا ہے، نہ تباہیوں کا مبصر اور واقعات کے بعد تسلی فراہم کرنے والا تو ذرا بھی نہیں! یہ کام تو ہم تمام مذاہب کے راہبوں کے لیے چھوڑ دیں!

ادیب اکیلا ہے، ادیب بے آواز ہے، دھیرے دھیرے چلتا ہے اور بہت غور کے ساتھ اس مصیبت کی تباہ کاری کا مشاہدہ کرتا ہے جو اس کے ساتھ زندہ بچ رہنے والے باقی لوگوں پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ پھر اس کے بعد ادیب خاموشی پر عمل پیرا ہوتا ہے کہ اندر کی آواز سمٹے اور دوہری ہو جائے، پھر پیچھے ہٹے اور سمجھ میں آنے لگے!

فرانسیسی ادیب موریس بلانچو (Blanchot) نے، میرے خیال میں، اس ناقابلِ برداشت شکست کا خواب دیکھتے ہوئے جو اس کے ملک نے ۳۹ء میں سہہ لی، لکھا تھا:

''ماتم کے کام میں کام غم کا نہیں ہے: غم محض مشاہدہ کرتا ہے۔'' اس نے یہ بھی لکھا تھا:

''تباہی کے کالے بادلوں ہی میں سے روشنی پھوٹتی ہے۔''

(۳) اگر محض اتفاق سے میرے بالکل پہلو میں کوئی بہت بڑی رستاخیز برپا ہو جائے جو بجلی گرنے یا طوفانِ برق و باد سے بھی شدید تر ہو، تو میں محسوس کر رہی ہوں کہ میں اس ہجوم میں محض ایک گواہ ہوں، اتنی ہی بے نام جیسے کہ یہ بھیڑ اور اس میں موجود ہر ایک فرد کی طرح، کلام سے عاری...... جذبات کی وجہ سے، ہول ناکی کے جبلّی احساس سے (جو تباہی کی قُربت کی وجہ سے ہے)...... جو بُری طرح چوٹ اس لیے کھائے ہوئے ہے کہ اب یہ حیوانی جبلّت کا معاملہ نہیں رہا بلکہ اس ارادے کی بات ہے جو بجلی کے ایک کوندے میں مصمّم ہو گیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میرا واحد ہتھیار میری یہ ضرورت ہے کہ میں دیکھوں، نہ تو سائے کو دیکھوں نہ عکس کو، نہ بڑے اسکرین کی امیج کو اور نہ چھوٹے اسکرین کی امیج، بلکہ قدرت کی حقیقت کو دیکھوں اور اس کی شان و شوکت کو اور اسے اپنے اندر تحریر کروں: اس کی جزئیات، چہرے، ایک لفظ یا پکار کے کوندے کی لپک کو تحریر کرلوں۔ نہیں، اس کا نظارہ نہیں، وہ نہیں۔

اپنے اندر تحریر کرلینا، مگر کیوں؟

آہستہ آہستہ سمجھنے کی کوشش کرنے کے لیے، مگر کیا؟ اس اجتماعی المیے کے ان پَروں کے

ساتھ ساتھ پرواز کرنا جو چاروں طرف پرواز میں ہیں اور مجھے تبدیل کر ڈالیں گے؟

(۴) اپنی ذات کے خلا کے اندر لکھنا: چکراتے ہوئے یا، بالکل کنارے پر یا اس کے برخلاف، علم کی کسی آخری اور انتہائی یورش کی جانب جو اپنی فطرت کے عین مطابق سرد اور غیر جانب دار ہے۔ آسان الفاظ میں، یہ چیزیں اندراج پاتی ہیں: پرچھائیوں کا کھیل، تناظر، قربت کی جست اور آخری انجام، خوش بو دار اور آہستہ حرکت کرتے ہوئے، شکستہ اجسام کے اطمینان سامنے ایک خفیف سی جھرجھری ہیں، رلی ملی اس مٹی کے سامنے جواب وہ بن کر رہ گئے ہیں۔

(۵) تحریر کرنا یا نام دینا؟ تحریر میں لانا ان لوگوں کی آوازیں جو زندہ بچ جانے والوں میں پہلے تھے، ڈوبنے والوں میں آخری تھے...... مگر وہ چاہے میں ہوں یا کوئی اور، اپنے آپ کو ساحل کا وہ تنہا سایہ سمجھنے کا فریب کیا جو اُڑتا رہتا ہے دوسرے لوگوں کے بھیانک خوابوں میں شرابور، وہ پانی جو بہت جلد تحلیل ہو جاتا ہے...... میں، آنکھیں کھلی ہوئی، اور جھکی تک نہیں، نبض کی رفتار بہت تیز، میں زندہ ہوں، محض باقی بچ نہیں گئی ہوں، میری توجہ پوری ہے، شکاری جیسی تیز آنکھیں ان کو دیکھ رہی ہیں جو نیچے سے اٹھ کر چلے آرہے ہیں، مخبوط الحواس، بچّوں کی سی حرکتیں کرتے ہوئے، ان کی بے مقصدیت بہت قریب ہے۔

تمام اسٹیڈیم اچانک خالی ہو گئے، ہر طرف خاموشی: گاڑیوں کے بغیر شاہراہوں میں خلا وسیع تر ہو رہا ہے، خوف کی غیر موجودگی: بے مقصد کھڑی ہوئی گاڑیوں کی کھڑکیاں پلٹ کر ہمیں دیکھ رہی ہیں۔

اور اب میں اس بلیو (blue) گلوکار کو نہیں سن سکتی جو ہر دن کے اختتام پر اپنے بے حد شکستہ نوحے کو آسمان کی جانب بھیج دیتا ہے اور آسمان کی طرف جاتے ہوئے میرے فلیٹ کے اندر بھی۔

ایک نئے آہنگ کی تلاش میں، پہلی بھوک کی گرفت میں اور دور دراز کسی بچے کی ہنسی......

افق پر روشن عظیم الاؤ کا دھواں رُخصت ہو جاتا ہے: کیا یہی ہے، ہماری پہنچ سے دور، ہماری سماعت سے باہر، متلاشی نگاہوں کے پیچھے، جھوٹے کوئلے کی سی کالی یاد شروع ہوتی ہے؟

میں دیکھتی ہوں یا تصور کرتی ہوں ایک چمکیلے شیر کی گردن کے بال بہت نزدیک سے جو دھیرے دھیرے جنوب کی طرف گامزن ہے کہ تباہی کے قلب میں سانس لے سکے۔

(اقتباس)

آصف فرخی

روبکاری:

ایک نیویورک، نیویورک کولاژ

کئی دن ہوگئے۔ متواتر یاد آئے چلا جارہا ہے مجھے نیویورک میں اپنی تشویش کا وہ لمحہ......
ڈر گیا تھا، اس جانے پہچانے شہر نیویورک سے بُری طرح ڈر گیا تھا میں......
''ہم سب وے لے لیں گے،'' میں نے ان سے کہا ہی ہوگا۔ شہر کا کم از کم یہ طریقہ، یہ راستہ تو میں نے سمجھ ہی لیا تھا۔ اور ابھی نیویورک میں ہونے کا اکسائٹ منٹ ختم نہیں ہوا تھا کہ دوسروں پر اپنی اس معلومات کا بار بار اظہار نہ کروں۔ ذہن میں یہ گمان تھا، الفاظ اور بیان سے ماورا ایک دھیان کہ زمین کے نیچے بڑی مہارت سے چلنے والی اس ٹرین کے راستے مقرر ہیں، یہ وہیں پہنچا دے گی ہمیں۔ آخر کو یہ نیویورک ہے، یہاں ہر چیز کام کرتی ہے، ہم سے راستے کی کوئی غلطی نہیں ہوسکتی۔ پھر اوپر آنے اور اسٹیشن سے باہر نکلنے کا راستہ بھی معلوم ہے اور یہاں سے نکل کر، اوپر زمین کی سطح پر آ کر، تھوڑا سا چلنے کے بعد وہ عمارت سامنے ہی آجائے گی دو تین گلیوں کے بعد جنھیں امریکی لوگ ''بلاک'' کہتے ہیں۔ مجھے اعتماد تھا۔ ہاں، سب وے میں اعتماد تھا، جس میں دراڑ صرف اترتے وقت پڑتی تھی۔ ہر بار، اسی جگہ سے، اسی طرح کا خوف اور پھر چٹخنا، ٹوٹنا......
گھبراہٹ بھی نہیں کہہ سکتے، یہ عجلت کہ خود بھی اتر جاؤں اور انہیں بھی اُتارلوں ٹرین کا خودکار دروازہ بند ہونے سے پہلے۔ اس لیے کہ میں نے سُن رکھا تھا، ایک آدمی کی ایڑی بند ہوتے دروازے میں آگئی تھی اور ٹرین چل دی تھی (وہ پاکستانی تو نہیں ہوگا!)۔ اس عجلت میں بھی کوئی گڑبڑ نہیں، میں پہلے ہی سیٹ چھوڑ کر دروازے تک آجاتا ہوں۔ وہ تو سب وے اسٹیشن پر اترے اور باہر نکلنے کے لیے مڑتے وقت دروازے کے رُخ اور ٹائلوں کے رنگین ڈیزائن کو فرق پایا، تب احساس ہوا۔ اس ڈیزائن کے اندر بھورے اور سفید حروف سے اسٹیشن کا نام بھی لکھا تھا: ہارلیم۔ نہیں، اس نام پر جاز کی دھن کو ازخود بج اٹھتے ہوئے نہیں سُنا میں نے۔ سہا کر رکھ دینے والی بہت سی کہانیاں ذہن میں دوڑ گئیں، میں نے زیرِلب جو کہا اب یاد نہیں لیکن وہ تاثر ذہن میں محفوظ ہے۔

خوف کی گھنٹیاں سی اب تک دماغ میں بج رہی ہیں، لمبے اوورکوٹ کا دامن میرے پیچھے پیچھے پھٹپھٹا رہا ہے، سیمیں میرا ہاتھ پکڑے ہوئے ساتھ ساتھ دوڑ رہی ہے اور میں نے اپنی بچی کو گود میں اٹھایا ہوا ہے جو سات آٹھ ماہ کی ہے اور ابھی اس نے رونا، مسکرانا اور چند الفاظ منھ سے نکالنا ہی سیکھا ہے جن میں آواز ہے، معنی نہیں...... ایک پوری زندگی ہمارے آگے پڑی ہے...... اردگرد کی زدہ حال عمارتیں، جابجا کوڑے کے ڈھیر، عمارتوں پر آڑی ترچھی بے ہنگم عمارتیں، ٹوٹی ہوئی خالی گاڑیاں، بیئر کے کچلے ہوئے ٹین ڈبے، لڑھکتی ہوئی خالی بوتلیں اور لڑکھڑاتے قدم والے بوڑھے، خوف میں گندھی ہوئی بدبو اور سیاہ چہروں پر غیردوستانہ روکھے پن کو دیکھ دیکھ کر اپنی رفتار بھی تیز کرلیتا ہوں اور ہاتھ کھینچ کر سیمیں سے پرس کو مضبوطی سے پکڑ لینے کے لیے کہتا ہوں۔ کیا ہم صحیح سمت جا رہے ہیں، کسی سے راستہ بھی نہیں پوچھ سکتا، کیا میں کسی سے پوچھ سکتا ہوں؟ ٹیکسی کیا روکی جاسکتی ہے اور دوسری طرف گم ہوتے ہوئے وہ درختوں کی قطار کیا سینٹرل پارک کی نشانی ہے؟ مجھے نہیں یاد کہ ہم تقریباً بھاگتے ہوئے کب ایمسٹرڈم ایونیو پہنچے اور اور کب اپنی میزبان کے فلیٹ کے صدر دروازے کی برقی گھنٹی بجاکر اطمینان کا سانس لیا۔ مگر وہ خوف اس وقت تک یاد ہے جب میں ٹی وی پر سُن رہا ہوں کہ نیویارک میں کیا ہوا۔

مگر مجھے جو نیویارک یاد ہے وہ صرف میرے خوف کا شہر نہیں۔ میں نے اپنی میزبان کو غلط اسٹیشن پر اپنا اُتر جانا بتایا ہوگا اور تھوڑا سا شرمندہ بھی ہوا ہوں گا دل ہی دل میں کہ یوں تو وہ دن کا وقت تھا اور اگر ایک علاقے میں سارے لوگ کالے نظر آرہے ہیں تو اس کا یہ مطلب کیوں ہو کہ میں ڈر کر دوڑ پڑوں۔ میرے خوف میں لاشعوری نسل پرستی کی خلش شامل ہوگئی ہے۔ اب نیویارک میں یہ تو ہونے سے رہا......

پہلی دفعہ جب داخل ہو رہا تھا تو پوری ہدایات سے لیس تھا۔ بوسٹن اس وقت تک مانوس ہوکر اپنا شہر معلوم ہونے لگا تھا کہ ہم یہاں سے آرہے تھے اور نیویارک وسیع وعریض نامعلوم بڑا شہر...... وہ تو رچرڈ نے ساتھ لے جانے کو کہا تھا اور رمیش نے ٹھوکا دیا تھا کہ ہاں، ہو آؤ، بہت آسان ہے۔ رمیش نیویارک ہو آیا تھا اس لیے سیدھے اپنے دیس سے آئے ہوئے منھ پھاڑے ہم احمقوں کے مقابلے میں زیادہ عقل مند تھا...... امریکا میں اسٹریٹ اسمارٹ یہ رمیش تھا۔ اور رچرڈ، لمبا

تڑنگا، سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والا، بچوں کے چہرے والا ہمہ وقت مسکراتا رچی جس پر خواہ مخواہ اعتبار کر لینے کو جی چاہتا تھا، جس کو رمیش اور بزمی مستقل "رچی بلا" کہتے تھے۔ باقی کلاس فیلوز کے مقابلے میں وہ ویسے بھی ہم پاکستانیوں، ہندوستانیوں کے ساتھ گھومتا تھا اور اس نے کہا تھا، مجھے نوکری کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ کسی ویک اینڈ پر کال آجاتی ہے تو میں اس اسپتال میں چلا جاتا ہوں جہاں میں پہلے کام کیا کرتا تھا، میں گاڑی سے جاؤں گا تو تمہیں ساتھ لے جاؤں گا، تم پٹرول کا خرچہ آدھا آدھا دے دینا۔ بوسٹن سے نیویارک کی ڈرائیو کی گپ شپ اور پھر نیویارک کی پہلی جھلکیاں، نیلی سرمئی دھند میں لپٹی عمارتیں، قینچی سے چوکور اور مستطیل کاٹ کر آسمان کے ساتھ چپکائی ہوئی، کٹ آؤٹ جیسی اسکائی لائن، فاصلے سے دھندلائے ہوئے رنگ، ٹریفک کی تیز رفتار قطار، سرنگ پھر آہنی پل، بیچ میں بہتا دریا...... نیویارک، نیویارک...... اس نے مجھے اسٹیشن پر اتارا تو مجھے معلوم تھا کہ یہاں سے مجھے آگے کیسے جانا ہے جہاں میں ٹھہروں گا۔ کندھے پر تھیلا لٹکائے، جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے میں سڑک پر نکلا تو مجھے اعتماد تھا کہ میں پہنچ ہی جاؤں گا کہیں نہ کہیں، نیویارک، نیویارک......

اس بار فارد کے ساتھ ٹھہرا تھا میں جو کولمبیا اسکول آف پبلک ہیلتھ کے "ڈورم" میں رہتا تھا جو باقی کیمپس سے دور ایسے علاقے میں تھا جہاں سب لوگ اسے ہسپانوی سمجھتے تھے۔ بجلی کا چھوٹا چولہا کمرے میں ہی تھا اور چند ڈالر کی عوض ایک اضافی بستر۔ مشکل بس نہانے کی تھی۔ رات کا اندھیرا چھٹنے سے پہلے ہی میں تولیہ صابن لے کر پہنچ گیا تھا۔ جہاں بڑے سے ہال میں آدھے آدھے پٹ لگا کر جگہیں مختص کر دی گئی تھیں۔ پانی بہنے کی آواز سے یہ تو پتہ چل جاتا تھا کہ اس میں کوئی ہے مگر مجھے گھبراہٹ فارد کے اس بیان سے ہوئی تھی کہ اسے پتہ ہی نہیں چلا، صابن ہاتھ سے گر کر فرش پر پھسل گیا اور برابر کی کوٹلی سے بڑھا کر صابن واپس کرنے والا ہاتھ —— صابن کی طرح چکنا اور بالوں سے عاری —— جس بدن سے جڑا ہوا ہوگا اس کے بارے میں اندازہ لگانا فارد کے لیے بھی مشکل نہیں تھا کہ نسوانی ہے —— پھر رمیش کے والد سے ملنے کے لیے گیا تھا ایک اور بار، جب وہ ہندوستان سے آئے ہوئے تھے۔ سوٹڈ بوٹڈ پرانے ہندوستانی بیوروکریٹ جو بہت عمدہ انگریزی میں گفتگو کرتے رہے مگر ایک بار جب رمیش کو ڈانٹا تو تامل میں ڈانٹا اور ہم لہجے کے اتار چڑھاؤ سے بھی اندازہ نہیں لگا سکے کہ برہمی کی وجہ کیا ہے۔ رمیش جواب میں چپ رہا، تامل میں بھی

اور انگریزی میں بھی چپ۔ رمیش کا بڑا بھائی کئی برس سے نیویارک میں رہ رہا تھا۔ ''سریش اب یہاں کی زندگی کا عادی ہوگیا ہے۔ کسی اور شہر میں اس کا دل نہیں لگ سکتا'' رمیش نے ہمیں بتایا تھا۔ میز پر ''نیویارکر'' کا تازہ شمارہ بڑے قرینے سے رکھا ہوا تھا۔ سریش اس میں ٹاک آف دی ٹاؤن ضرور پڑھتا ہوگا، میں نے یوں ہی اندازہ لگایا۔ شاید میں خود تصور کرنا چاہ رہا ہوں گا کہ نیویارک میں کیسے رہا جا سکتا ہے۔

نیویارک ایک شہر نہیں، ذہن کی کیفیت ہے، "The New York State of Mind" باربرا اسٹرائی سنڈ کا نغمہ میں نے اس کے بعد ہی صحیح معنوں میں سُنا ہوگا۔

جب دم میں دم آیا ہوگا تو اپنی میزبان کے گھر میں چائے کی میز پر بیٹھ کر اپنی بدحواسی پر خوب ہنسا ہوں گا میں۔ پہلے بدحواس ہونا اور پھر اپنے آپ پر ہنسنا، میں نیویارک میں بھی میں ہوں۔ نیویارک میں میں، یہاں مجھے کوئی اور کچھ اور ہونے کی ضرورت نہیں۔

ہاں، ایک تصویر بھی ہے۔ چائے کے بعد صوفے پر بیٹھے ہوئے ہیں اور میرے چہرے پر وہ تصویر کھنچواتے وقت کی مخصوص، احمقانہ مسکراہٹ ہے۔ ننھی منی غزل اب صوفے پر میرے پاس بیٹھی ہوئی ہے۔ یہ تصویریں پروفیسر فرانسس پریچٹ نے ڈیولپ کروا کے ڈاک سے بھجوائی تھیں۔ میں ان کے ساتھ شاعری کے ترجموں کی ایک کتاب پر کام کر رہا تھا اور اسی کو آگے بڑھانے کے لیے بوسٹن سے نیویارک آیا تھا۔ اس کے بعد مجھے کراچی واپس جانا تھا، اس وقت تک کا کیا ہوا کام سمیٹ کر۔ ایک اور تصویر ہے غزل صوفے پر اکیلی بیٹھی ہوئی اون کے گولے سے کھیل رہی ہے۔ اس تصویر میں وہ کھیلتے کھیلتے سوگئی ہے۔ سکون کی نیند، نیویارک میں۔

اور پھر تصویروں سی بہت سی یادیں ہیں جن کو وقت نے Paper-over کر دیا ہے...... تمام سیاحوں کی طرح ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ اور مجسمۂ آزادی، کولمبیا یونیورسٹی کے گرد و نواح میں پرانی کتابوں کی دکانیں، پچھلی بار دِلّی میں ملنے کے بعد شمس الرحمٰن فاروقی سے اس شہر میں ملاقات اور یہاں کی چائے پر ان کا اسی انداز کا فقرہ جیسے وہ اپنے تبصروں میں ہم عصر شاعری پر کرتے آئے ہیں، آرٹ میوزیم، ایتھیوپیا کا ریستوران، جگمگاتی سڑکیں، بتیاں...... کیا یہ وہی شہر ہے جس کی تباہی کا ملبہ میں ٹیلی وژن اسکرین پر گرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں؟

نہیں، وہ شہر تو میرے حوصلے اور اعتماد کا شہر تھا۔ خوف زدہ تو میں اب ہوا ہوں۔ یقین نہیں آتا، ٹیلی وژن پر جو کچھ دیکھ رہا ہوں اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں...... نیویورک، نیویورک...... بعد میں جب دوستوں واقف کاروں کی جوابی ای میلز آنا شروع ہوئیں تو کئی لوگوں نے نظمیں، کہانیاں یاد دلائیں...... والٹ وہٹ مین کا آہنگ اور لورکا کی خوف آگیں اور خواب آسا نظم "ایک شاعر نیویورک میں" اور ڈبلیو ایچ آڈن کی وہ کمال نظم جس کا نام ایک تاریخ ہی نہیں، ایک علامت بھی ہے، یکم ستمبر ۱۹۳۹ء۔

"I sit in one of the dives
On fifty- second street
Uncertain and afraid
As the clever hopes expire
Of a low dishonest decade:
Waves of anger and fear
Circulate over the bright
And darkened lands of the earth,
Obsessing our private lives
The unmentionable odour of death
Offends the September night.

نیویورک، نیویورک...... موت کی بو ستمبر کی اس رات میں بسی ہوئی ہے۔ میرے پاس تو آڈن والی آواز بھی نہیں۔ We must love one another or die۔ نیویورک میں یہ جو ہوگیا، اب یہ آواز کون سنے گا؟ نیویورک سے اور ایک دوسرے سے محبت کون کرے گا؟

خوف کی ایک واضح موجودگی تھی نیویورک میں جو پہلے ہی دن سے تعاقب میں تھی۔ اس کی نمایاں شکل تھی جو کاغذ کا وہ ٹکڑا بھی ہوسکتی تھی جس پر ہدایات درج تھیں اور ہمیں اس وقت دیا گیا تھا جب ہارورڈ میں اپنی یونی ورسٹی کے اورینٹیشن کلاس میں گئے تھے۔ یوں بھی مجھے یہ لفظ عجیب سا لگتا ہے کہ اس کی بجائے ہماری ضرورت ری اورینٹیشن ہے، میں نے کسی ہم جماعت سے کہا تھا، ورنہ اس کاغذ پر دوٹوک درج تھا۔ آزادی کے داعی ملک کی یہ پابندیاں مجھے ایک آنکھ نہ بھائیں مگر میں

نے یہ کاغذ پڑھ کر ذہن نشین کرلیا۔ بوسٹن کے لیے ہدایات صاف تھیں...... جاڑے میں دو بجے دن ڈھلنے لگے اور اندھیرا ہوجائے تو کلاس کے بعد اکیلے گھر نہ جانا۔ جیب میں پانچ دس ڈالر ضرور رکھنا کہ کوئی لوٹے تو پیسے لے کر چلا جائے، اسے گولی چلانے کی ضرورت نہ پڑے۔ مگر نیویورک کے لیے ہدایات ہی الگ تھیں۔

جب آپ نیویورک سفر کریں تو یہ سمجھ لیں کہ یہ بوسٹن سے مختلف ہے اور یہاں کے لوگوں کا طرزِ عمل بھی— ہدایات میں بہت تفصیل سے درج تھی۔ لوگوں کے ساتھ eye contact نہ ہونے دیں۔ کسی ان جانے شخص کی طرف دیکھ کر مسکرایئے نہیں، کہ وہ اسے جنسی اشارہ نہ سمجھ لے۔ (کچھ تو سمجھے خدا کرے کوئی! میرا تو یہ جی چاہتا تھا) لوگ گالی دیں گے یا برا بھلا کہیں گے۔ رات کو سب وے سے سفر کرتے ہوئے ایسے ڈبے میں نہ بیٹھیں جو بالکل خالی ہو۔ سب وے اسٹیشن پر اتنے حصّے میں کھڑے رہیں جو روشنی کے دائرے میں ہے۔ میں نے پہلے ہی سفر میں روشنی کی حدود کا اندازہ لگالیا تھا اور آنکھوں کے رابطے سے بچ کر نکلنے کی پاداش میں اب ٹی وی اسکرین پر نیویورک کو دیکھتے دیکھتے میری آنکھیں اسی منظر میں قید ہوگئی ہیں کہ عمارتوں کے قلب میں سے دھواں اٹھ رہا ہے، شہر کی اینٹ سے اینٹ بج رہی ہے......

آنکھیں جھکا کر اور نظریں کترا کر بھی بہت حسین چہرے دیکھے میں نے نیویورک میں۔ کئی ایک پر دل مچلتا تھا کہ عمر اب یہیں بسر کیجیے۔ مگر نیویورک میں مجھے عشق نہیں ہوا تھا۔ عشق اور وہ بھی تکلیف دہ حد تک شدید، مجھے بوسٹن میں لاحق تھا کہ میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنی بے بسی اور بے چارگی پر روتا تھا۔ پہلی نظر میں محبت اور اس کے بعد دوری کے ستم پر بے صبری دل کی گریہ و زاری...... ''اپنے نومولود بچے کو پہلی بار دیکھتے ہی جو کیفیت ہوجاتی ہے تو جسے Love at first sight کہتے ہیں، اس کا مفہوم یہی تو ہے......'' لکھنو سے ڈاکٹر نیّر مسعود صاحب نے مجھے اس بچّی کی پیدائش پر مبارک باد کا خط لکھا تھا جس کی تصویریں دیکھ دیکھ کر میرا دل نہ بھرتا تھا، آنکھیں بھر آتی تھیں...... اس کے ہنسنے، مسکرانے اور ہزاروں معصوم اداؤں سے اتنی دور میں اپنی بچّی کے لمس سے محروم ہوں جو میرے کلیجے کا ٹکڑا ہے...... بستر پر خالی پڑے پڑے میں سوچا کرتا اور اسی سوچ کے درد کے سہارے اتنے دن کاٹ لیے کہ پڑھائی پوری ہوئی، ڈگری ملی اور پھر ملازمت جب میں انہیں اپنے پاس بلوا سکا۔ یہ بچّی مجھے پہچانتی بھی نہیں ہوگی، ایئرپورٹ کے انٹرنیشنل ارائیول لاؤنج پر خدشے نے میرے پاؤں پکڑ لیے تھے۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی تھی اور میں پگھل کر رہ گیا تھا...... چھوٹی سی

چو، چو...... میں اسے نیویورک سے ملاقات کرانے کے لیے لے گیا تھا۔ وہ اپنا نام ادا نہیں کر سکتی تھی تو اس نے اپنے لیے یہ نام تجویز کر لیا تھا...... چوچو...... خودشناسی کا پہلا لمحہ۔ مگر میں نے کئی صفحے ایک ساتھ پلٹ دیے ہیں۔ یہ تو بعد کی بات ہے۔ نیویورک کے اس سفر میں تو وہ مسکرانے تک محدود تھی۔ آٹھ، دس، بارہ سال ہو گئے اس بات کو۔ کتنے فخر کے ساتھ میں نے انہیں نیویورک کو اور ان دونوں کو نیویورک Present کیا تھا۔ جب تک مجھے نیویورک سے عشق ہو چکا تھا۔

پھر اس کے چند سال بعد امریکا کا ایک اور سفر۔ اب کی بار میں نیویورک میں رہا تھا اور نیویورک سے بوسٹن اس طرح گیا تھا جیسے پہلے کبھی بوسٹن سے نیویورک جایا کرتا تھا، گھر سے پوری تیاری کے ساتھ نکل کر۔ دفتر کے وہ دوست جو اس کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے، سب ایک ساتھ ہی ٹھہرے تھے۔ ڈاؤن ٹاؤن کا چھوٹا سا ہوٹل اور جب میرا پیپر ہو گیا تو اس کے بعد شہر کی آوارہ گردی...... تخلیقی قوت پھوٹی پڑتی تھی، پُراعتماد اور امنگوں سے بھرے اس برق رفتار شہر سے...... ایک مسلسل ہیجان تھا جو تھمتا نہ تھا...... تیزی سے گھومتے ہوئے سیر بین میں ہزاروں نقش و نگار کے بننے، جڑنے کے امکانات۔

مگر یہ تخلیقی قوت مجھے چھو کر بھی نہیں گزری۔ میں خرِ عیسیٰ ہی رہا۔ کتابوں سے لدا، تجربوں میں پھندا...... اور لکھنے کے بھی لالے پڑ گئے۔ جو لکھنے کے لیے مختص تھیں وہ Spaces بند کر کے دوسرے مقاصد کے لیے re-appropriate کر دی گئیں، کاغذ اٹھوا دیے گئے اور کتابوں کے پلندے، رسّی سے بندھوا کر ادھر ادھر کیے جا چکے تھے جب میں کینیڈا کے سفر سے اکیلا ہی واپس آیا۔ نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو ابا کندن لعل سہگل کا پرانا ریکارڈ بنے ہوئے تھے: ''ایک بھیدی لوٹ گیا۔'' میرے چاروں طرف کتابیں بکھر جاتی ہیں، صفحے ہوا میں اڑنے لگتے ہیں، دھول کی تہیں جمتی جا رہی ہیں۔ پہلے میں خاک پر اپنا نام انگلی سے لکھ دیا کرتا تھا مگر اب نہیں...... یہ خاک میری رگوں میں اڑ رہی ہے۔ میں مسہری پر گھٹنے پیٹ کی طرف موڑے لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لفظ ہیں کہ سامنے سے گزر جاتے ہیں، صفحہ بن لکھا رہ جاتا ہے۔ کوئی کمرے میں آ کر ٹی وی کھول دیتا ہے۔ میں صفحے ایک طرف رکھ کر لیٹ جاتا ہوں۔ ''کیا طبیعت پھر خراب ہو رہی ہے؟'' کوئی میری جلتی ہوئی پیشانی پر ٹھنڈا یخ ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ ایک شہر ہے جس کے فتیلے کو

آگ کسی نے میرے اندر دکھا دی ہے۔ بارود سے تباہ ہوتے شہر کا ملبہ ڈھیر ہوتا جا رہا ہے اور میں بڑی مشکل سے اس حقیقت کو قبول کر رہا ہوں کہ میں اپنی پہلی موت مر چکا ہوں۔ اب میرے لیے ایک لمبی چپ ہے اور ماتم یک شہر آرزو اور یہ تحریر بھی پس از مرگ۔ جیسے قدیم مصری، اہرام کے اندر چیزیں رکھ دیا کرتے تھے کہ زندگی کے بعد کے سفر میں کام آئیں گی۔ اس نیویورک کا ایک ٹکڑا بھی میں اپنے سامان میں رکھوالوں گا، مرنے کے بعد کے لیے۔

مر چکا ہوں تو کیا ہوا، میں خبریں پھر بھی دیکھے جاتا ہوں۔ مجھے اب باہر نکلنا چاہیے اور لوگوں کے درمیان ہونا چاہیے، ایک اندرونی جبر مجھے اٹھا کر کھینچے لاتا ہے۔ میں اپنے شہر کی سڑکوں پر گھوم رہا ہوں، لوگوں کو دیکھ رہا ہوں، ان کے جذبات پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں...... کیا یہ بھی اس دور دراز شہر کا درد محسوس کر رہے ہیں؟ شہر میں گھومتے گھومتے شام ہوئی۔ تنگ جوتے نے جہاں کاٹا ہے وہاں موزے پاؤں سے چپک گئے ہوں گے۔ میں جوتے کے فیتے کھول کر سڑک کے فٹ پاتھ کی زرد، سیاہ اینٹوں کی گگر پر بیٹھ جاتا ہوں۔ مجھے نیویورک کا نہیں، اپنی اکیلی، چھوٹی سی تکلیف کا خیال بے حال کیے دے رہا ہے۔ میں ہوا میں انگلی گھما کر ایک جملہ لکھتا ہوں۔ پھر آگے بڑھ جاتا ہوں۔ یہ پرانے ٹرک اڈّے کے قریب کراؤن سینما کے علاقے میں کسی پٹھان کا چھوٹا سا چائے خانہ ہے جس میں چینی کی اس مخصوص، نیلے رنگ کی کیتلی میں پیالی بھر چائے ملتی ہے۔ جیب میں کب کے پڑے، مڑے تڑے کاغذ کے ایک کونے پر چند سطریں اسی چائے خانے کی ٹیڑھی میز پر۔ شاہراہِ قائدین کے چوراہے پر گھاس کے تختے کے سامنے وہ عشق اور نیویورک والے جملے ایک کوندے کی طرح مجھ پر سے گزر جاتے ہیں۔ میں جلدی سے ذہن میں لکھ لیتا ہوں۔ اب یہ شہر میرا رائٹنگ ڈیسک بن گیا ہے۔ یہ فقرہ میں نے وہاں لکھا تھا جہاں گرے ہوئے سیمنٹ کے بلاک پر ٹک کر کوئی بھی بیٹھ سکتا ہے۔ اب شام ہوگئی ہے اور وہ جلوس چھٹ گیا ہے جو ہر دوسرے تیسرے دن اس شہر کا مقدر ہو کر رہ گیا ہے۔ گرے ہوئے احتجاجی پلے کارڈز، اعلانات کے اشتہار، بینرز کی دھجیاں، جلوس کے منتشر ہوجانے والے شرکا کا پھینکا ہوا سامان، نعروں کی ادھ مری گونج، اسکوٹروں موٹر سائیکلوں پر پھٹ پھٹ کر کے گارڈن روڈ کی طرف روانہ ہوتے ہوئے مولویوں کا شور اور ایک طرف کھڑی ہوئی پولیس کی گاڑیاں...... رکاوٹیں ہٹائے جانے کے بعد بندر روڈ پر ٹریفک رواں ہے۔ میں اس چوک کے جنگلے پر بیٹھا ہوا اس مانوس منظر کی جزئیات کا جائزہ لے رہا ہوں۔

قائداعظم کے مزار کی طرف سے آنے والی سڑک پر لگے ہوئے بینر پر میری نظر پڑتی ہے۔ انہوں نے اس کا نام "اسامہ بن لادن چوک" رکھ دیا ہے۔ میرے شہر کے نام بدلنے کا اختیار ان کو کس نے دے دیا، میں جھنجھلا کر سوچتا ہوں۔ پرانی نمائش کا نام یہی ٹھیک تھا۔ پھر مجھے وہ زرد رنگ کی چھوٹی سی کتاب یاد آتی ہے جس کا نام یہی ہے۔ شہر کے بارے میں کئی نظمیں تھیں اس میں۔ میں حارث خلیق کو ای میل بھیجوں گا کہ شہر میں ایک نام بدلا گیا، اس لیے تمہاری کتاب کا نام بھی بدل جانا چاہیے۔ طارق رحمٰن اپنی پرنٹنگ پریس چوکس رکھیں۔ یہ نمائش سراب کی سی ہے۔ میں اٹھ کر پیدل ہی دوسری طرف چل پڑتا ہوں۔ کراچی کے برائے نام جاڑے کی پہلی پہلی، ہلکی سی ہوا چل رہی ہے اور میں شام سے رات گئے تک سڑکوں، محلوں میں گھوم گھوم کر کچھ نیویارک کا اور کچھ اپنا احوال رقم کر رہا ہوں۔ نیویارک کہاں ختم ہوا اور میں کہاں شروع، یہ مجھے معلوم نہیں کرنا۔

جب اس کے بعد مجھے پہلی بار نیند آئی ...... ٹیلی وژن دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں...... تو میں نے اس کتاب کو خواب میں دیکھا۔ حیرت ہے کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا اتنی بہت ساری نظموں، کہانیوں میں۔ آلیں روب گرییے کا Project for a Revolution in New York مجھے اس وقت بھی یاد آیا تھا جب میرے اپنے کراچی پر تباہی، بربادی آئی تھی۔ ایک کے اندر سے ایک اور والے چینی ڈبوں کی طرح کراچی کھولو تو اس میں سے نیویارک نکلتا ہے اور اس میں سے پھر کراچی...... نیویورک، نیویورک...... شہر کی تباہی کے منصوبے ہیں اور حساب کی سی باریک بین قطعیت کے ساتھ ایک ناقابلِ بیان جرم کا ارتکاب کیا جا رہا ہے...... نیویورک، نیویورک...... میں اس کتاب کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں مگر بہت سی کتابوں کے ملبے میں دب گئی ہے میں اس کی وہ کیفیت یاد کرتا ہوں جس کو اپنے الفاظ میں دُہرایا تھا۔ یہ "شہر ماجرا" میں ہے نیویورک، نیویورک...... اس خواب میں بھی میں نے شہر دیکھا...... اور پھر اچانک عمل شروع ہو جاتا ہے......

اور پھر اچانک عمل شروع ہو جاتا ہے، کسی اطلاع کے بغیر اور وہی منظر اپنے آپ دُہرانے لگتا ہے دروازے کے دوسری طرف سے اتنی کم روشنی آ رہی ہے کہ کچھ نظر نہیں آتا، اندر کیا ہے اور کیا نہیں۔

کھڑکی کے چوکھٹے کی لکڑی پر بھورا روغن کیا گیا ہے جس میں پتلی پتلی نسبتاً ہلکے رنگ کی

لکیریں، ان خیالی رگوں کی نقل میں جو زیادہ آرائشی سمجھے جانے والے مال میں ہوا کرتی ہیں، اس طرح پڑی ہوئی ہیں کہ لوزاتیں اور جال یا صرف جال کی چھڑیوں کے اُبھار سے تاریک گچھے نمایاں ہو جاتے ہیں، گول یا بیضوی یا تکون، بدلتی ہوئی نشانیوں کا ڈھیر، جس میں ایک عرصے سے انسانی جسم کے خطوط جھلک رہے ہیں: ایک نوجوان عورت بائیں جانب کروٹ لیے ہوئے اور میری طرف منھ کیے ہوئے، ظاہری طور پر ننگی کیوں کہ اس کی چھاتیوں کے ابھار اور ناف کے نیچے کے بال نمایاں ہیں۔ اس کی ٹانگیں مڑی ہوئی ہیں، الٹی والی سیدھی سے زیادہ، اور گھٹنا آگے کی طرف نکلا ہوا، فرش پر نظر آ رہا ہے۔ سیدھا پاؤں لہٰذا الٹے پاؤں کے اوپر رکھا ہوا ہے، ٹخنے یقینی طور پر ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے دونوں کلائیاں اس کی پیٹھ کے پیچھے بندھی ہوئی ہیں معمول کے مطابق، ایسا لگتا ہے، اس لیے کہ دونوں بانہیں جسم کے اوپری حصے کے پیچھے کہیں غائب ہو کر پھر نظر نہیں آتیں: الٹا ہاتھ کہنی کے آگے سے اور سیدھا ہاتھ اس سے تھوڑا اوپر سے۔

چہرہ، ٹھوڑی سے اٹھا کر پیچھے جھکایا گیا ہے، اور اس کے چاروں طرف بے حد گہرے گھنے کھلے بالوں کا حاشیہ ہے جو فرش کے ٹائلز پر بکھرے ہوئے ہیں۔ چہرے کے خدوخال کا اندازہ لگانا مشکل ہے، کچھ تو چہرے کے رخ کی وجہ سے اور کچھ بالوں کی اس موٹی لٹ کی وجہ سے جو ماتھے سے گرتی ہوئی ایک آنکھ اور ایک گال کی سیدھ میں ہے۔ جو واحد خط صاف نظر آ رہا ہے وہ اس کا دہانہ ہے، دونوں ہونٹ ناقابلِ برداشت تکلیف یا دہشت کی طویل چیخ کے لیے کھلے ہوئے چبھنے والی روشنی کا تکون اس فریم کے دائیں جانب پھیلا ہوا ہے جو پیچ دار بازو والی اس بتی سے نکل رہی ہے جس کا پیندا دھات کی میز کے ایک کونے سے چسپاں ہے۔ روشنی کے تکون کا زاویہ احتیاط کے ساتھ متعین کیا گیا ہے، جس طرح تفتیش میں ہوتا ہے، کہ فرش پر ڈھیر پڑے گلابی گوشت کے خطوط کو اجاگر کر سکے۔

مگر یہ تفتیش نہیں ہو سکتی: منھ جو زیادہ دیر سے پورا کھلا ہوا ہے، کسی نہ کسی کپڑے کی مدد سے کھولا گیا ہوگا، مثلاً سیاہ زیر جامے کا کوئی حصہ ٹھونس کر۔ اس کے علاوہ یہ کہ کوئی چیخ، اگر وہ لڑکی چیختی بھی، تو لوہے کی جالی والی اس مستطیل کھڑکی کے موٹے شیشے میں سے ضرور سنائی دے جاتی۔

لیکن اب چاندی کے سے بالوں والا ایک آدمی ڈاکٹروں کا سفید کوٹ پہنے ہوئے دائیں جانب سے سامنے آتا ہے۔ اس کی پشت ہے، اس لیے اس کے چہرے کی جھلک آ کر رہ جاتی ہے اور وہ بھی ایک رخ سے۔ وہ بندھی ہوئی لڑکی کی طرف آتا ہے اور چند لمحوں کے لیے اس کی طرف

دیکھتا ہے، اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے، اس کے جسم سے لڑکی کی ٹانگوں کا ایک حصہ چھپ جاتا ہے۔ قیدی لڑکی بے ہوش ہو گی کیوں کہ وہ اس کی آمد پر کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کرتی۔ علاوہ ازیں، لڑکی کے منہ میں ٹھنسے ہوئے کپڑے کے کلوزاپ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایتھر میں ڈوبا ہوا کپڑا ہے جو لڑکی کی اس مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے ضروری تھا جس کی گواہی اس کے بکھرے ہوئے بال دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر آگے جھک جاتا ہے، ایک گھٹنا فرش پر ٹیک کر اور اس کے ٹخنوں پر بندھی ہوئی رسی کھولنے لگتا ہے۔ لڑکی کا جسم جو اب بالکل ڈھیلا ہے، چت پڑا ہوا ہے جب کہ دو متجسس ہاتھ اس کے گھٹنے چیر کر ہموار، بھوری رانوں کو الگ کرتے ہیں جو بتی کی روشنی میں چمک رہی ہیں۔ لیکن جسم کا اوپری حصہ سیدھا نہیں ہے ان بازوؤں کی وجہ سے جو پیٹھ کے پیچھے ابھی تک بندھے ہوئے ہیں۔ اس رخ سے چھاتیاں آسانی سے دکھائی دے رہی ہیں: فوم ربر کی طرح گدیلی اور شان دار طور پر متناسب، وہ باقی سارے جسم سے ہلکے رنگ کی ہیں اور ان کی دلکش بھوسلی نوکیں (جو دوغلی نسل کی لڑکی کے لحاظ سے زیادہ بڑی نہیں ہیں...... ذرا سی اٹھی ہوئی ہیں۔

ایک لمحے کے لیے اٹھ کر دھات کی میز سے کوئی ایک فٹ لمبا نوکیلا اوزار سنبھالنے کے بعد ڈاکٹر دوبارہ دوزانو ہو گیا ہے، لیکن دائیں جانب تھوڑا سا آگے، جس کی وجہ سے اس کا سفید کوٹ لڑکی کی رانوں کا اوپری حصہ چھپا رہا ہے۔ اس آدمی کے ہاتھ، جو اس وقت دکھائی نہیں دے رہے، لڑکی کے پیٹرو میں جراحی کا کوئی عمل سرانجام دے رہے ہیں، گو کہ اس کی نوعیت کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ مانا کہ مریضہ کو بے ہوشی سنگھائی گئی ہے، پھر بھی یہ سوال تو نہیں اٹھتا کہ وہ کسی طرح کی اذیت رسانی ہے جو ایک جنونی اس قیدی پر کر رہا ہے جس کو اس کے حسن کی وجہ سے چنا گیا ہے۔ پھر مصنوعی تولید کا امکان رہ جاتا ہے جسے باجبر کیا جا رہا ہے (جس صورت میں ڈاکٹر کا ہاتھ کا اوزار کیتھیٹر ہوگا) یا پھر کوئی طبی تجربہ بھیانک قسم کا، جو ظاہر ہے کہ قیدی کی مرضی کے بغیر کیا جا رہا ہے۔

سفید کوٹ والا شخص اپنی قیدی کے ساتھ جو کچھ کرنے والا تھا کبھی بھی معلوم نہیں ہو سکے گا کیوں کہ پچھلا دروازہ تیزی سے کھلتا ہے اور ایک تیسرا شخص نمودار ہوتا ہے: وہ طویل قامت شخص ہے جو دروازے پر ساکت کھڑا ہے۔ وہ اعلیٰ لباس پہنے ہوئے ہے اور اس کا چہرہ اور سر پوری طرح سے چھپے ہوئے ہیں کیوں کہ وہ راکھ کے رنگ کا چمڑے کا نقاب اوڑھے ہوئے ہیں جس میں صرف

پانچ سوراخ ہیں: ایک منہ کے لیے، دو چھوٹے چھوٹے سوراخ نتھنوں کے لیے اور تھوڑے سے بڑے دو بیضوی سوراخ آنکھوں کے لیے۔ یہ آنکھیں ڈاکٹر پر مرکوز رہتی ہیں جو سیدھا کھڑا ہوجاتا ہے اور الٹے قدموں چلتا ہوا دوسرے دروازے کی جانب ہٹنے لگتا ہے، جب کہ نقاب دار شخص کے پیچھے ایک اور آدمی نظر آتا ہے: ٹھگنے قد کا گنجا جو مزدوروں کے کپڑے پہنے ہوئے کندھے پر اوزاروں کی پیٹی لٹکائے ہوئے ہے، غالباً نل والا یا بجلی والا یا تالے والا ہے۔ پورا منظر تیزی سے گزر جاتا ہے اور کسی تفصیل میں بال برابر تبدیلی نہیں ہوتی۔

اور پھر اچانک وہ اندھیرا جس پر ذرہ برابر تعجب نہیں ہوتا۔

میرے سامنے بس وہی گرد آلود کھڑکی کا شیشہ باقی رہ گیا ہے جس میں میرے چہرے کا دھندلا عکس جھلک رہا ہے اور اس کے پیچھے عمارت کے سامنے والا رخ جس میں لکڑی پر بھورا روغن پھیرا گیا ہے جس میں پتلی لکیریں بلوط کی نقل میں بنائی گئی ہیں......

•

کس کتاب میں ہے یہ منظر؟ میں یاد کرنا چاہتا ہوں۔ یہ یقیناً Topology of a phantom city میں سے ہوگا۔ ''اس سے پہلے کہ میں سوجاؤں، شہر، دوبارہ...... ''نہیں، نہیں، یہ اس میں سے نہیں ہے بلکہ Project for a Revolution in New York اس طرح شروع ہوتا ہے۔ مجھے یاد آ گیا، وہی منظر کسی تبدیلی کے بغیر۔ سفید رنگ کی اور کاغذی پشتے والی کتاب تھی جس کے سرورق پر سرخ رنگ سے کتاب کا نام لکھا تھا اور مجھے یاد ہے کہ سیاہ ٹائپ کے حروف سے شہر کی فلک شگاف عمارتوں کا خاکہ بنایا گیا تھا...... منفی ناول کی ایک مثال، آلیں روب گریئے کے بارے میں ممتاز شیریں کے مضمون کا نام اچٹتا ہوا یاد آتا ہے...... منفی ناول؟ منفی زندگی؟ غیر حقیقی شہر...... اس طرح کی باتوں سے لوگوں کا مطلب کیا ہے؟ نام یاد آتا ہے۔ پھر ذہن بالکل خالی ہوجاتا ہے، یکسر خالی...... اس سے آگے کا خلا سفید ہے...... چٹا سفید جو کچھ نہ ہونے کا رنگ ہے۔

جب میرے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تو میں ''دیوانِ غالب'' یوں ہی کھول کر ورق الٹنے لگتا ہوں۔ ٹیلی وژن اسکرین، اخباروں کے اوراق، ای میل سے ڈاؤن لوڈ کیے ہوئے تجزیاتی مضامین کا روز بہ بروز، لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہوا انبار...... نوم چومسکی، ایڈورڈ سعید، رابرٹ فسک...... میں اس سوال سے نبٹنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ کیا ہوگیا، اس کا ذمہ دار کون ہے اور اس نے یہ کیوں

کیا؟ اتنے لوگوں کی موت، زخم خوردگی اور گمشدگی کے تجربے کے معنی کیا ہیں، یہ کیسے اندر ہی اندر ہمیں بدل کر رکھ دیتا ہے؟ اس تجربے کو بھلا کس طور پر گرفت میں لایا جاسکتا ہے؟ اس کے بعد کیا ہوگا؟ یہ دُنیا کو کس طرح تلپٹ کر کے رکھ دے گا...... سوال بہت ہیں اور ان سب کے جواب ناکافی ہیں نیویورک، نیویورک...... I am in the New York state of mind مجھے لگتا ہے یہ حروف فرار ہو جائیں گے۔ کاغذ پر سے اٹھ اٹھ کر بھاگنے لگتے ہیں۔ میں پکڑ پکڑ کر واپس لانے کی کوشش کرتا ہوں مگر پھر اٹھے اٹھ کر بھاگنے لگتے ہیں۔ سارے تجزیے ایک طرف رکھ کر میں ''دیوانِ غالب'' اٹھالیتا ہوں کہ کسی بہانے تو ٹیلی وژن کے نیوز کاسٹر کا چہرہ ڈزالو ہوجائے۔ اور پھر اپنے خیال کی گمان بھر دہشت پر چپ ہوجاتا ہوں۔ نہیں، نہیں، اس کا چہرہ سلامت رہے۔ نہ تحلیل ہو نہ تقسیم کہ دنیا کی خبروں میں آج زخم بہت ہیں۔ میں ہی اپنی آنکھیں کہیں اور لے جاؤں گا۔ میرے سرہانے وہ پاکٹ ایڈیشن رکھا رہتا ہے جسے میں اس کے ناشر اور اپنے عزیز دوست کے نام پر ''نسخۂ طارق رحمان فضلیہ'' کہتا ہوں۔ میں نے کہیں ذکر سنا تھا کہ روسی پروفیسر لڈمیلا روزانہ صبح اٹھ کر ''دیوانِ غالب'' سے فال نکالتی ہیں کہ آج کا دن کیسا گزرے گا۔ بلا کسی نیت یا مقصد کے، میں ''دیوانِ غالب'' کو کھولتا ہوں۔ اس نسخے کا صفحہ ۱۶۱ ہے جس کے الفاظ اب میرے سامنے صفحے پر واپس آکر اپنی جگہ سنبھالنے لگتے ہیں:

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز — گرم بازارِ فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہاں میں پھر اندھیر — زُلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال — ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب — اشک باری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا — آج پھر اس کی روبکاری ہے

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

دِلّی کے دِلّی میں بیٹھے بیٹھے کیا مرزا غالب نیویورک ہو آئے تھے؟ دفعتاً مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب مجھے وہ بتا رہے ہیں...... بے سبب نہیں، کچھ تو ہے...... جو تجزیہ نگاروں کے حروف میں نہیں سما سکتا۔ میں ٹی وی بند کر کے اسکرین کے سامنے ''دیوانِ غالب'' رکھ دیتا ہوں۔ اب کی بار جب مجھے کچھ نہیں کرنا ہوگا تو ''کلیاتِ اقبال'' کھولوں گا۔ مگر مجھے آنکھیں بند کر کے اس میں سے

فال نہیں نکالنی۔ مجھے معلوم ہے میں کتاب کس صفحے سے کھولوں گا۔ اس پر محراب گل افغان کا نام لکھا ہے اور ایک مصرعہ بار بار کہتا ہے "اپنی خودی پہچان، او غافل افغان......"

لیکن یہ پھر بھی گردش میں ہے۔ عدالت میں سورج کے زمیں کے گرد گھومنے کے بارے میں حلفیہ بیان دے کر آنے کے بعد گلیلیو نے زیر لب کہا تھا۔ کہانی کا ایک دورانیہ ختم بھی ہوتا ہے تو شاید اس لیے کہ اس کے کردار کسی اور کیفیت میں، کسی اور صورت میں بیان کیے جا سکیں۔ دنیا بقول محبوب خزاں، رگوں میں چلتی رہتی ہے۔ کہانی بڑھتی رہتی ہے۔ یہاں سے آگے جو کہانی میں لکھوں گا، اس کا نام رکھوں گا: فوج داری...

دنیا بھر کے ممالک کی طرح ایران میں بھی دہشت گردی کی اس کارروائی پر تبصرہ کیا گیا جو ۱۱ ستمبر کو پیش آئی۔ سیاسی تجزیے اور بیانات اپنی جگہ، لیکن ایرانی دانش وروں کی طرف سے فن کارانہ رد عمل کی کئی صورتیں سامنے آئیں، جن کی حسّاس سنجیدگی ہمیں فوری طور پر حیرت زدہ کردیتی ہے۔ افشین تاجیان فارسی کی شاعرہ ہیں مگر ان کے بارے میں مزید معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔ صدف کیانی عباسیان مصّورہ ہیں اور تہران میں مقیم ہیں۔

یہ دونوں تحریریں ''دی ایرانین'' نامی ویب سائٹ پر جاری کی گئیں جس میں ایرانی اخبارات سے منتخب تحریریں شامل ہوتی ہیں۔ فارسی سے ان کا ترجمہ، جدید لہجے کے شاعر معین نظامی نے کیا ہے۔ معین نظامی دانش گاہ پنجاب میں فارسی زبان و ادب پڑھاتے ہیں۔ جدید فارسی شاعری کے تراجم کے ایک مجموعے کے علاوہ ان کی طبع زاد نظموں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوچکا ہے۔

افشین تاجیان
فارسی سے ترجمہ: معین نظامی

کبوتر اور درخت

اُس کے آنسوؤں کے شفاف قطرے
درخت کے پتوں پہ شبنم بن گئے......
سفید کبوتر کی بے یقین نظریں
اُن سر بہ فلک عمارتوں کی تباہی پہ جمی ہوئی تھیں
جو اپنی عظمت میں شکست و ریخت کا شکار ہوگئیں......
تب اُس کی لرزتی ہوئی آواز نے
چیری کے پودے سے کہا:

"لگتا ہے لوہے کے پرندے
درخت پر بیٹھنے کا سلیقہ نہیں جانتے
افسوس پرندوں پر!"
پودے نے حسرت بھری آہ کی اور جواب دیا:
"نہیں! سنگ وخشت کے درختوں پر
کسی پرندے کے بیٹھنے کے لیے کوئی شاخ نہیں ہوتی......"

عمل: پادی خورسندی

بزرگترین مجازات برای اسامه

اگر امریکا اسامه را گیر بیاورد، چکارش میکند؟

• میکشدش که از او قهرمان بسازد؟......
• یا زندانی اش میکند که یارانش هر روز برای آزادی او، عملیات تروریستی انجام دهند؟...

• بهترین مجازات این است که او را بسپارد به جراحان خبره که حسابی وضعیت جنسی او را تغییر دهند و به سکس مقابل تبدیلش کند.
وقتی اسامه به صورت یک زن کامل درامد، بفرستندش در افغانستان زندگی کند!

صدف کیانی عباسیان/معین نظامی

آٹھ دن بعد......

میں کل شام کو پہنچی۔

میں یہاں لوٹ آئی کہ شاید پُرسکون ہو سکوں۔

میرا پورا بدن لرز اٹھا۔ رنگ اُڑ گیا۔ زبان خشک ہو گئی اور بات چیت کے قابل نہ رہی۔ کنپٹیوں میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ باطن میں کچھ گرا اور ٹوٹ گیا۔ سب کچھ پل بھر میں جل بجھا۔ تباہ و برباد ہو گیا......

اور سمجھ میں نہ آ سکنے والی آوازوں سے میرے کان بھر گئے۔

اُس دن کے بعد میں ہر روز دَم بہ خود ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہوتے لوگوں کی تصویریں دیکھتی رہی اور بلند آواز میں پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ہزاروں دھڑکتے دل، اکٹھے، ایک ہی جگہ پر، ایک ہی وقت میں پھٹ گئے اور اُس ہولناک آگ کے شعلوں میں کوئلہ ہو گئے۔

میرے لیے مزید ممکن نہ تھا...... اُس کمرے کی چھوٹی سی تنہائی میں رہنا میرے لیے ممکن نہ تھا جو دن رات بکھر جانے کی باتیں کرتی رہتی تھی......

آنسو رُک نہیں رہے تھے اور آہیں اب میرے زخم کا مرہم نہیں بن رہی تھیں...... میں نے اپنے سُوٹ کیس تیار کر لیے۔

ایئرپورٹ کے خالی پن پر ایک الاؤ کی حکمرانی تھی کیوں کہ میرا تعلق ایک ایسے ملک سے تھا، جس کی حکومت، امریکا کی مخالف ہے۔ میں پریشان تھی۔

ایک عورت نے میرے سوٹ کیسوں کی تلاشی لی اور مجھے ایک مسکراہٹ دی۔ ایک افسردہ مسکراہٹ میرے ہونٹوں پہ جم گئی۔

انتظار گاہ میں ایک نوجوان بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ اُس نے کتاب پر سے سر اٹھایا۔ میری

بے چین آنکھوں کو دیکھا۔ بھنویں اوپر کیں اور مسکرا کر سلام کیا۔
میں نے آہستہ سے کہا: سلام!

ہوائی جہاز میں ایک لڑکی میرے پاس آ کے بیٹھی۔ اُن کی مہربان نیلی آنکھیں میرے ہاتھوں پر گڑی ہوئی تھیں۔ کہنے لگی: ''کتنا خوب صورت کنگن ہے!'' میں نے کہا: شکریہ! میں کنگن اُسے دے دینا چاہتی تھیں لیکن اُس نے قبول نہ کیا۔

میں کل شام کو پہنچی۔
میں یہاں لوٹ آئی کہ شاید پُرسکون ہوسکوں۔
مجھے اُس کمرے کی مانوس خوش بو نے مدہوش کر دیا جس نے گزشتہ سفر میں میری میزبانی کی تھی۔
بیدار ہوئی تو میں نے پردے ہٹا دیے۔ صبح میرے کمرے میں چلی آئی۔ میں نے جیکٹ پہنی اور صحن میں چلی گئی۔ گلِ حنا کے گلدانوں کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے خود کو بہی کے درخت تک پہنچایا۔
خزاں اپنی خنک ہوا باغ میں پھیلا رہی تھی۔ میں گرم دھوپ میں، ڈیلیا کے پھولوں کے پاس، کُرسی پر بیٹھ گئی۔
کچھ خشک اور زرد پتے تالاب میں گرے ہوئے تھے اور پانی کے ہلکوروں سے ہل رہے تھے۔
ایک ننھی منّی کالی گلہری میرے قریب آئی اور دھوپ میں لیٹ گئی۔
میں نے اپنے تنکوں کے ہیٹ کا کونا پکڑا اور آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک ہوائی جہاز اڑ رہا تھا۔

۱۹۔ ستمبر ۲۰۰۱ء

دنیا کے کئی ممالک کے لکھنے والوں نے نیویورک میں تباہ کاری اور اجتماعی دہشت کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا اور اس کے بعد اپنے تاثرات قلم بند کیے۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے مینار جس وقت ٹوٹ رہے تھے، اردو کی معروف افسانہ نگار نیلم احمد بشیر وہاں سے دور نہیں تھیں۔ اس حادثے اور اس کے بعد شہر کی بدلتی ہوئی کیفیات کو انھوں نے ایک رپورتاژ میں قلم بند کیا ہے۔ ''گلابوں والی گلی'' کی مصنفہ ان دنوں امریکا میں ہیں اور ایک ناول پر کام کررہی ہیں۔ ان کی یہ تازہ تحریر ہم تک محترمہ پروین عاطف اور جناب زاہد حسن کے توسط سے پہنچی ہے اور ان کے شکریے کے ساتھ یہاں شامل کی جارہی ہے۔

نیلم احمد بشیر

ستم گر ستمبر

ستمبر ۲۰۰۱ء میں، مَیں نیویورک کے نواحی شہر اسٹیٹن آئی لینڈ (Staten Island) میں اپنے بیٹے کاشف کے ساتھ تھی۔ ہڈسن دریا کے اُس پار بسنے والا یہ خوب صورت شہر بہت تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اس جزیرے اور نیویورک کے بیچوں بیچ دریا میں چھ سوفٹ نیچے ایک ایسا مقام ہے جسے کیمرون لائن (Cameron's Line) کہا جاتا ہے۔ سائنس دان کیمرون نے ٹھوس ثبوت سے بتایا کہ یہی وہ لکیر ہے جہاں تین سو بیس ملین سال قبل افریقہ اور شمالی امریکا کی Continental Plates کا آپس میں ٹکراؤ ہوا تھا۔ یعنی گھر میں برتن ٹوٹے اور علیحدگی ہوگئی۔ آج دنیا کی موجودہ جغرافیائی صورت حال دیکھ کر یہ باور کرنا مشکل لگتا ہے کہ امریکا، افریقہ یا کسی اور ملک سے کبھی اتنا قریب بھی تھا، لیکن ماہرین ارضیات کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ اٹھارویں صدی کے آغاز میں جزیرے کے جنگل صاف کرکے رہائشی مکانات تعمیر کیے گئے اور ۱۹۴۷ء میں Fresh Kills کے نام سے اسٹیٹن آئی لینڈ کا مشہور کوڑا قبرستان یعنی dump شروع ہوا جہاں نیویورک سے لاکر ہر قسم کا کوڑا کرکٹ (جس میں کیمیائی فضلہ بھی شامل تھا) پھینکا جانے لگا۔ اس نیم دیہات، نیم شہر

میں زیادہ تر وہ لوگ رہتے ہیں جو لوئر مین ہٹن میں کام کرتے ہیں۔ لوئر مین ہٹن ڈاؤن ٹاؤن نیویارک کا وہی علاقہ ہے جہاں فنانشل ڈسٹرکٹ، وال اسٹریٹ اور ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے جڑواں ٹاورز ایستادہ ہوا کرتے تھے۔ یہ لوگ صبح جاتے اور شام کو گھر لوٹ آتے ہیں۔ دریا پار لے جانے کے لیے نیویارک شہر کی ٹرانزٹ اتھارٹی نے بڑی بڑی پیلے رنگ کی Ferries یعنی کشتیاں چلانے کا بندوبست کر رکھا ہے، جو ہر آدھ گھنٹے کے وقفے سے چلتی رہتی ہے۔ یہ فیریز پریوں کی سی برق رفتاری کے ساتھ تقریباً ستر ہزار لوگوں کو روزانہ اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر منزل تک پہنچانے میں مصروف رہتی ہیں۔ نیویارک تو ہے ہی سیاحوں کا محبوب شہر، لہٰذا فیری میں کافی تعداد میں ٹورسٹ نظر آتے ہیں۔ کیمرے تھامے، بیگ کندھوں سے لٹکائے جوگرز پہنے، یہ سیاح نیویارک شہر کی موتیوں کی لڑی جیسی اسکائی لائن کی خوب صورتیوں کو اپنے کیمرے میں محفوظ کرنے کو اکثر چہرے اونچے کیے بلڈنگوں کی طرف تکتے دکھائی دیتے ہیں۔

فیری پانی میں سے گزر رہی ہو تو بروکلین برج، ویرازانو برج، مجسمہ آزادی اور ایلس آئی لینڈ قریب سے اور بالکل صاف دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ایلس آئی لینڈ وہ تاریخی جزیرہ ہے جہاں یورپ اور دیگر ممالک کے تارکین وطن طالع آزمائی کے لیے بحری جہازوں سے آ کر اترنا شروع ہوئے اور امریکا Immigrants کا ملک کہلانا شروع ہوا۔

نیویارک کی جگمگاتی خوب صورتیوں کے بارے میں کون نہیں جانتا۔ یہ الف لیلوی شہر اپنی روشنیوں اور بلند قامت عمارات کی وجہ سے دنیا بھر کے لوگوں کا مَن پسند شہر ہے جہاں مختلف قومیتوں، مذاہب اور کلچرز کے لوگ مل جل کر رہتے ہیں، اپنی اپنی ایکٹی وٹیز کی وجہ سے ہمیشہ ہنگامہ بپا رکھتے ہیں اور یہ شہر The city that never sleeps کہلاتا ہے۔

تمام موسم گرما میں اور میرے بچے تقریباً روزانہ ہی فیری سے سفر کرتے نیویارک آتے جاتے رہے۔ ستمبر کے پہلے ہفتے کی ایک شام اسی طرح ہم لوگ واپس اسٹیٹن آئی لینڈ آ رہے تھے کہ میری بہن سنبل اور میں خلاف معمول فیری کے ڈیک سے تا دیر پیچھے ہٹتی نیویارک کی جگمگاتی اسکائی لائن کو کھڑے تعریفی نظروں سے دیکھتے رہے۔ نیچے گہرا دریا اور تیز رفتار فیری سے اٹھنے والے جھاگ کی جھالریں اور دور ہوتی، خوبصورت، اونچی متوازن، ہائی رائز کوہ قامت عمارتیں، جن میں پرشکوہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے ٹاورز بھی شامل تھے، سب کچھ بڑا دل فریب دکھائی دے رہا تھا۔

اس وقت ہمیں کہاں معلوم تھا کہ ہم وہ نظارہ اس طرح سے دوبارہ کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے گا اور باقی رہ جائیں گی کہانیاں، قیاس آرائیاں اور گرم لہو کی افسردہ مہک۔

میرے بیٹے کاشف نے اپنی رہائش بھی اسٹیٹن آئی لینڈ میں اسی لیے رکھی ہوئی تھی کیونکہ وہ لوئر مین ہٹن میں واقع ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے اندر ایک پبلشنگ کمپنی میں اکاؤنٹ مینجمنٹ کی جاب کرتا تھا۔ عجیب بات یہ ہوئی تھی کہ اگست ۲۰۰۱ء میں اس کی کمپنی کو گھاٹا پڑ گیا اور ملازمین کی چھانٹی شروع ہو گئی۔ کاشف کو بھی جاب سے فارغ کر دیا گیا جس کی وجہ سے وہ کافی فکر مند اور افسردہ تھا اور اب شہر چھوڑ کر دوسری جگہ جانے کی سوچ رہا تھا۔ میں اسے تسلیاں دے رہی تھی کہ اس میں اللہ کی کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوگی، انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا، تم فکر نہ کرو وغیرہ وغیرہ۔ میں اور وہ تب کہاں جانتے تھے کہ کاشف کی جاب چھوٹ جانے کے پیچھے تقدیر کی کون پلاننگ شامل تھی؟

کاشف پچھلے دو سال سے ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں جاب کرتا رہا تھا اس لیے وہ اکثر مجھے اس کے بارے میں بتاتا، اور قصے کہانیاں سناتا رہتا۔ کئی بار صبح کا ناشتہ وہ ٹاور کی سب سے اونچی منزل پر واقع ریستوراں Windows of the World میں کیا کرتا تھا۔ ایک بار وہ مجھے بھی وہاں لنچ کے لیے لے گیا تو میں اُس خوب صورت چوکور رستوراں کو دیکھ کر حیرت زدہ سی رہ گئی۔ دنیا کے سب سے اونچے رستوراں کی دیواریں زمین سے لے کر چھت تک تمام کی تمام شیشے کی بنی ہوئی تھیں۔ ایک سو آٹھ منزلوں والے ٹاور کی اونچائیاں بادلوں میں گم ہوتی جاتی تھیں۔ شیشے کے اس محل میں دنیا بھر کے معززین، بزنس مین، مہذب اقوام سے تعلق رکھنے والے خوش پوش لوگ، جنھیں کم تر اقوام اور پیچھے رہ جانے والے لوگوں سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی، بڑی بڑی deals طے کرتے، ہنستے مسکراتے نظر آ رہے تھے۔ شیشے کی دیواریں آسمان کو لپکتے ہوئے سفید سفید بادلوں کے راستے میں سینہ تانے کھڑی تھیں اور بادل اُن سے لپٹ لپٹ کر اندر بیٹھے لوگوں کی ایک جھلک دیکھنے کو ادھر ادھر سے تاک جھانک کر رہے تھے۔

اگست ۲۰۰۱ء کے تقریباً آخری ہفتے کی بات ہے۔ میں اور میری بیٹی عنبر جو کوئینز کے Devry Institite میں ایڈمنسٹریٹر کی جاب کرتی ہے، فون پر باتیں کر رہے تھے۔ یک دم عنبر

کہنے لگی، ''امّی، رات میں نے بڑا عجیب خواب دیکھا ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے دیکھا ہے کہ نیویورک کے سارے برج بند ہوگئے اور ان پر کوئی ٹریفک نہیں۔ مگر لوگ انہیں پیدل چل کر کراس کر رہے ہیں۔''

''لو، بھلا یہ کیا خواب ہوا؟ ایسا کیسا ہوسکتا ہے کہ برج بند ہوجائیں اور چھ میل لمبے برج پر لوگ پیدل چل سکیں۔'' میں نے اسے جواب دیا۔ کیوں کہ امریکا میں کسی بھی برج پر لوگوں کا چلنا غیر قانونی ہے اور قانون کی تو وہاں ہر صورت پابندی کی جاتی ہے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

دس ستمبر کو میں عنبر کے ہاں کوئینز آ گئی کیوں کہ وہاں سے مجھے اپنی دوست معروف پاکستانی شاعرہ فرحت زاہد کے ہاں لانگ آئی لینڈ جانا تھا۔ فرحت کے ساتھ ایک محبت بھرا دن گزار کے میں شام کو دوبارہ عنبر کے ہاں کوئینز آ گئی، اس ارادے کے ساتھ کہ صبح جب وہ کام پر چلی جائے گی تو میں بیٹے کے پاس واپس اسٹیٹن آئی لینڈ چلی جاؤں گی۔ کیونکہ وہی میرا مستقل ٹھکانا تھا۔

گیارہ ستمبر کی صبح آٹھ بجے عنبر آفس کے لیے نکل رہی تھی تو میں نے اُسے خدا حافظ کہا اور بتا دیا کہ اس کے جانے کے بعد میں بھی روانہ ہوجاؤں گی۔ نہ جانے کیوں خلافِ معمول عنبر نے کہا، ''امّی آج آپ نہ جائیں۔ یہیں رک جائیں۔''

''کیوں بھئی؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔ کیونکہ وہ مجھے کبھی میرے پروگرام میں ردّ و بدل کرنے کو نہیں کہتی تھی۔

''بس آپ نہ جائیں، شام کو میں آپ کو خود چھوڑ آؤں گی۔'' اس نے اصرار کیا۔

''لو تم آٹھ بجے آؤ گی، پھر دو گھنٹے ڈرائیو کرو گی۔ میں اتنا انتظار کس لیے کروں؟ اور سارا دن یہاں اکیلی رہ کر کروں گی بھی کیا؟'' میں نے جواب دیا۔

''آپ یہاں سے پیدل چل کر بس اسٹاپ تک جائیں گی، پھر بس لے کر ٹرین لیں گی، دو ٹرینیں بدلنے کے بعد مین ہٹن اتریں گی، پھر فیری لے کر آگے سے پھر بس لے کر گھر جائیں گی!......'' اس نے میرے سفر کی روداد اور صعوبتیں سنا کر مجھے قائل کرنا چاہا۔

''تو کیا ہوا؟ میں کرلوں گی۔ تم فکر کیوں کرتی ہو؟ کیا کبھی پہلے نہیں گئی؟''

پتہ نہیں کیوں روک رہی ہے مجھے میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ وہ خاموش ہو کر آفس چلی گئی اور مجھے اس پر پیار آنے لگا۔ خواہ مخواہ میرے لیے پریشان ہو رہی تھی۔ سوچا ناشتہ کرتے ہی نکل کھڑی ہوں گی۔ فیری ٹرمینل ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے چند قدموں کے فاصلے پر تھا، وہاں تھوڑی ہی دیر میں قیامت آنے والی تھی مگر میں کب جانتی تھی۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ وہاں کیا ہونے والا ہے۔ پوری دنیا کیسی صورت حال سے دوچار ہونے والی ہے۔

میں پیدل چل کر کیو ۳۵ بس اسٹاپ پر جا کر کھڑی ہوئی۔ کچھ ہی دیر میں بس آ گئی اور اس نے مجھے کانٹی نینٹل ایونیو کے ٹرین سٹیشن پر اتار دیا۔ پلک جھپکتے میں ٹرین آ گئی اور صبح سویرے کے رش آور میں دیگر لوگوں کے ساتھ میں بھی ہچکولے کھانے لگی۔ ایکسپریس ٹرین تھی اس لیے جلدی جلدی کئی اسٹیشن پھلانگتی ہوتی Lexington ایونیو پر پہنچ گئی جہاں سے ٹرین بدل کر میں ساؤتھ فیری ٹرمینل کی طرف روانہ ہو گئی۔

ساؤتھ فیری ٹرمینل سے ابھی ہم دو اسٹاپ پرے کنال سٹریٹ اسٹاپ پر ہی پہنچے تھے کہ ٹرین میں یک دم جیسے زلزلہ سا آ گیا، اور ٹرین ایک جھٹکے سے رک گئی۔ مسافر ایک دوسرے پر جا گرے اور فضا میں چیخیں بلند ہونے لگیں۔ یہ وہی وقت تھا جب پہلا طیارہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے ایک ٹاور سے ٹکرا چکا تھا اور ہم اس بلڈنگ کے تقریباً نیچے سے گزر رہے تھے۔ کوہ قامت عمارت میں آگ اور خون کا خوف ناک کھیل شروع ہو چکا تھا۔ ہم کہاں جانتے تھے کہ چند دیوانوں نے ٹاورز کو ان کی مضبوط بنیادوں سے اس طاقت سے ہلا کر رکھ دیا ہے کہ اس کی دھمک دور دراز دیسوں کے رہنے والوں کی زندگیوں اور معیشتوں میں ایک عرصے تک سنی جاتی رہے گی، تباہی کا بادل اس زور سے گرجے گا کہ دھرتی کانپ اٹھے گی۔ ٹرین کی تمام بتیاں بجھ گئیں اور سب لوگ اندھیرے میں ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ کیا ہوا ہے! ماؤں نے اپنے بچے سینوں سے چمٹائے اور میں دل ہی دل میں اللہ کو یاد کرنے لگی۔ سب لوگ اندھیرے میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ ہوا کیا ہے؟ چند ہی لمحوں بعد نیویورک میٹرو ٹرانزٹ کمیٹی کے ایک گارڈ نے لوگوں کو باہر آنے کو کہا۔ مسافر نظم و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے تحمل سے باہر نکلنے لگے۔ دل ایک ان جانے خوف سے دھک دھک کرنے لگا۔ پتہ نہیں کیا ہونے والا تھا؟ اندھیرے میں ٹٹولتے ٹٹولتے، میں بھی دیگر مسافروں کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر ادھر پلیٹ فارم تک جا پہنچی۔ گارڈ نے ہمیں بتایا کہ ہم لوگ اسٹیشن

سے باہر سٹریٹ میں نہ جائیں کیونکہ وہاں کچھ ہوگیا ہے۔ کیا؟ یہ اُسے خود بھی پتہ نہیں تھا۔ فیری ٹرمینل تک دو اسٹاپ کا فاصلہ ہم نے پیدل اندر ہی اندر زمین دوز پلیٹ فارموں پر چل چل کر طے کیا۔ خدا خدا کرکے ہم باہر نکل کر کھلے آسمان تلے آئے تو سامنے کھڑی ورلڈ ٹریڈ سینٹرز میں جو کچھ ہوتے دیکھا، اس پر آنکھ نے یقین کرنے سے انکار کردیا۔ ایک اونچے پربت میں الاؤ دہک رہا تھا۔ حشر کا ساسماں بپا تھا۔ بلڈنگ میں آگ یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے ایک بہت بڑے چوکور لمبوترے کیگر میں آگ کی فلنگ کی تہہ بچھا دی گئی ہو۔ گرمی سے شیشے چیخ رہے تھے اور لوگ کھڑکیوں سے باہر یوں گر رہے تھے جیسے گرم ریت بھری کڑاہی میں مکئی کے دانے پھول بن بن کر باہر جا گرتے ہیں۔ ایک مرد اور عورت ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اکھٹے باہر کودے تو میرا اس بات پر ایمان ایک بار پھر پختہ ہوگیا کہ محبت ایک لافانی جذبہ ہے اور وفا کا وجود دنیا سے کبھی ختم نہیں ہوگا۔

''یا الٰہی! تیرا شکر ہے میرا بچہّ اس وقت وہاں نہیں تھا۔'' میرے دل نے ایک خود غرض ماں کی طرح سوچا اور اللہ کے اس کرم پر آب دیدہ ہوگئی کہ اس نے کس طرح کاشف کو کچھ عرصے پہلے وہاں سے دور کردیا تھا۔ سب اللہ کے کام ہیں۔ ہم سب اللہ کا مال ہیں اور ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ مگر افسوس ...... کئی دوسری ماؤں کے اتنے ہی اہم بچےّ اس وقت آگ کے شعلوں میں گھرے ہوئے تھے۔ اُن کا دُکھ میں اپنے دل میں محسوس کر رہی تھی۔ اللہ کی منطق، اس کی مصلحتیں، مہربانیاں، ہم عام سے بندے بھلا کہاں سمجھ سکتے ہیں۔ ہماری سمجھ سے تو بالاتر ہیں۔

بہت برس گزرے ایک ہوائی جہاز پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں گر کر لاپتہ ہوگیا تھا۔ جہاز کے جواں سال پائلٹ اپنی تین ماہ کی بیاہتا منتظر بیوی کی آنکھوں میں آنے والے دنوں کے حسین سپنے سجا کر پیچھے چھوڑ تو آئے تھے مگر خود دوبارہ اُسے ملنے واپس نہ جاسکے۔ جوان بیوہ کی زندگی میں چپکے سے بہار جب آئی جب اس کے آنگن میں ایک پھول کھلا اور وہ اپنے شوہر کی نشانی کو پالنے میں مصروف ہوکر زندگی کی دوڑ میں پھر سے شامل ہوگئی۔ یہ بچہّ جوان ہوکر امریکا چلا گیا اور پھر ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں جاب کرنے لگا۔ گیارہ ستمبر کو صبح پونے نو بجے وہ اپنی امی سے، پاکستان میں بات کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ مارننگ کافی کی چسکیاں بھی لے رہا تھا کہ یک دم اس نے ماں سے کہا، ''امّی، کوئی دھماکہ ہوا ہے'' اور پھر لائن کٹ گئی۔

گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ہمیشہ کے لیے۔

چند قدم دور کھڑکی میں ایک ناقابل یقین منظر دیکھ رہی تھی۔ تیل سے لبالب بھرے جہازوں کا عمارتوں سے ٹکرانا کسی ہالی وڈ فلم کے منظر سے بڑھ کر تھا۔ میرا دل پتے کی طرح زور زور سے کانپ رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو پھنس کر پھانس کی طرح چبھنے لگ گئے تھے۔ کیا یہ کوئی بھیانک خواب تھا؟ اگر خواب تھا تو آنکھ کھل کیوں نہیں گئی تھی۔ ٹاورز زمین بوس ہو کر بھُس کے ڈھیر میں تبدیل ہوتے نظر آرہے تھے۔ غالباً صور پھونکا جا چکا تھا۔ ایمولینس، پولیس مین، فائر مین، افراتفری، خوف، اور نفسانفسی کے عالم میں بھی ایک دوسرے کی مدد کرتے نظر آتے لوگ۔ عجیب سماں تھا۔ موت ایک چڑیل کی طرح وحشت سے چاروں طرف ننگا ناچ ناچ رہی تھی۔

امریکا ہمیشہ سے ہی پر سکون اور انڈر کنٹرول قسم کا ملک رہا ہے۔ وہاں اس طرح کا کبھی کچھ نہیں ہوتا، نہ ہوا ہے۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے، دوسروں کے ملک میں، اُن کے گھروں میں ہوتا ہے۔ بربادی کی گرد ان کے آنگن تک اڑ کر کبھی نہیں آتی۔ لیکن آج یہ کیسا دن تھا؟ سورج شاید کسی اور سمت سے طلوع ہوا تھا کیونکہ امریکا تباہ ہو رہا تھا۔ امریکا رو رہا تھا، بلبلا رہا تھا...... امریکا پر حملہ...... ناقابل یقین تھا۔

دونوں ٹاورز میں پھنسے ہزاروں لوگوں کو بچانے کے لیے بہت سے فائر مین اندر داخل ہو گئے لیکن باہر نہ آسکے اور یوں سبھی لوگ ایک بہت بڑی اجتماعی قبر میں اکٹھے سو گئے۔ اُنیس نوجوان ہائی جیکرز، دلوں میں حسرت ویاس کے سوراخ لیے کوئے یار سے نکلے اور سوئے دار چلے گئے۔

امریکا کے لوگ یہی پوچھتے رہ گئے کہ ہم اتنے امن پسند، مدد کرنے والے لوگ ہیں، لوگ ہم سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟ ہم تو دنیا بھر کے Immigrants کو سمیٹے بیٹھے ہیں پھر ہمارے ہی ملک میں یہ زیادتی، ہم ہی سے کیوں؟ حالانکہ انہیں پتہ ہونا چاہیے کہ امریکا کی اسرائیل نواز اور اینٹی مسلم پالیسیاں ہی اس انتقام کی ذمہ دار ہیں لیکن پھر بھی وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ کمزور تو ویسے بھی طاقت ور سے نفسیاتی طور پر نفرت کرتا ہے، احساس کمتری کا شکار رہتا ہے۔ اور امریکا کی بدقسمتی یہ ہے کہ تمام تر فکری، سائنسی، فوجی، تکنیکی طاقت کے باوجود یہ دنیا کی محبت سے محروم ہے۔

رمز فیلڈ نے کہا They caught us with our pants down، کیونکہ امریکا واقعی اس قسم کے کسی بڑے حادثہ کی کبھی توقع نہیں کرسکتا تھا۔ بے خبر اور مزے میں زندگی گزار رہا تھا کہ ایسی ان ہونی ہوگئی۔

بہت دیر کھڑے رہنے کے بعد جب فیری ہم مسافروں کو لیے، دھیرے دھیرے نیویورک ہاربر چھوڑ کر اسٹیٹن آئی لینڈ کی طرف چلی تو اس میں ہوش وحواس سے عاری، دم بخود لوگ تھے جنہیں دیکھ کر لگتا تھا جیسے یہ کسی پاگل خانے سے چھٹے ہوئے مریض ہوں۔ دریا پر بندھا طویل ویرازانو برج ٹریفک کے لیے بند تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ نیویورک کے تمام خوبصورت خوابوں کے جھولوں جیسے طویل برج اسی وقت تباہی کی دھمکیاں ملنے کے باعث بند کردیے گئے تھے۔ ٹی وی پر بعد میں یہ عجیب منظر بھی دیکھا کہ لوگ خاموش بت بنے، ننگے سر، کپڑوں پر سفید دھول، چہروں پر خوف کے رنگ سجائے پیدل ہی برج کراس کر کے گھروں کو جارہے تھے۔ مجھے اپنی بیٹی عنبر کا خواب یاد آ گیا۔ یہی تو دیکھا تھا اُس نے اور مجھے سنایا بھی تھا۔ میں حیرت زدہ ہوگئی۔ کئی بار کیسی عجیب عجیب باتیں ہوجاتی ہیں جن کا بظاہر کوئی مقصد یا تک نہیں ہوتی اور نہ ہی ہم ان کا ادراک کرسکتے ہیں، مگر وہ ہوجاتی ہیں۔ نہ جانے عنبر نے یہ منظر پہلے سے کیسے دیکھ لیا تھا۔

اس روز نیویورک مکمل طور پر کلوز ڈاؤن ہوگیا تھا۔ فلائیٹس، بسیں، ٹرینیں سب کچھ بند کردیا گیا۔ ایک ہنستا، مسکراتا، چہکتا، مہکتا شہر، جس کے لیے کبھی اکیلا نیویورک کا لفظ استعمال نہیں ہوتا بلکہ اسے ہمیشہ نیویورک سٹی کہہ کر پکارا جاتا ہے، شہر وحشت اور افسردہ نگر بن کر رہ گیا۔

کاشف کے گھر پہنچی تو اس نے مجھے صحیح سلامت دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ موبائل پر چھوٹی بیٹی کا گھبرایا ہوا فون آیا، ''امّی یہ کیا ہورہا ہے؟ قیامت تو نہیں آرہی؟'' وہ Buffalo میں اکیلی اپنے کالج ہاسٹل میں بیٹھی پریشان ہورہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی اور پھر نیویورک میں رہنے والے اپنے رشتے داروں اور دوستوں کی خیریت معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگی مگر فون سسٹم خراب ہوجانے کی وجہ سے بہت مشکل پیش آرہی تھی۔ میرے پھوپھی زاد بھائی شکوہ نے، جو مین ہٹن میں ہی رہتا ہے، بعد میں بتایا کہ وہ چھٹی ہوجانے کے بعد جب آفس سے نکلا تو اسے ظاہر ہے کوئی سواری نہیں ملی اسے پانچ گھنٹے مسلسل چلنا

پڑا تب کہیں جا کر وہ گھر پہنچا۔ اس کی ٹانگیں اس قدر شل ہو چکی تھیں کہ اس سے بات بھی نہیں کی جا رہی تھی۔

اسٹیٹن آئی لینڈ فیری ٹرمینل پر کئی روز گزرنے کے بعد بھی وہ پارک شدہ کاریں کھڑی رہیں جن کے مالکان گیارہ ستمبر کی صبح کو فیری میں سوار ہو کر شام کو حسبِ معمول واپس آنے کی اُمید میں کام پر گئے تھے مگر لوٹ کے نہ آ سکے تھے۔ ان کی کاروں پر رکھے پھولوں کے گلدستے، کارڈز اور ربن، جمی ہوئی گرد میں سے بھی صاف چمکتے نظر آ رہے تھے۔ آنے والی راتوں میں پولیس کی کئی کشتیاں دریائے ہڈسن میں نیلی نیلی روشنیاں بکھیرتی، چکر لگاتی نظر آنے لگی۔

شام کے وقت اکثر اسٹیٹن آئی لینڈ کے رہنے والے دریا کنارے جنگلے کو پھولوں، کارڈز، اور ربن سے سجاتے رہتے۔ پھر دور نیویورک ہاربر سے دکھائی دینے والی مین ہٹن اسکائی لائن، ملبے سے اٹھتے ہوئے دھوئیں، بلڈوزر، لائٹوں سے پھوٹتی روشنی میں کلین اپ کا کام، ان سب مناظر کو اپنے کیمرے میں محفوظ کرتے نظر آتے کہ ایسا عجیب و غریب نظارہ انہوں نے پہلے کبھی کہاں دیکھا تھا اور دیکھنے کی امید نہ کر سکتے تھے۔

ورلڈ ٹریڈ سینٹر کا جلا ہوا ملبہ کئی دنوں تک بڑے بڑے ٹرکوں سے بڑے بڑے بحری جہازوں میں لاد کر اسٹیٹن آئی لینڈ کے فریش کلز ڈمپ'' میں بکھیرا جانے لگا۔ وہاں اس کے ذرّے ذرّے کے چھان پھٹک کی گئی، اجزاء کے لیبارٹری میں تجزیے کیے گئے اور ان کے نتائج محفوظ کر لیے گئے۔

حادثہ کے دوسرے تیسرے دن میری بہن سنبل نے، جو میرے کزن فگار کے ہاں فلاڈلفیا میں ٹھہری ہوئی تھی، اصرار کرنا شروع کر دیا کہ تم فلاڈلفیا آ جاؤ، میرا دل گھبرا رہا ہے۔ وہ پہلی بار پاکستان سے نکلی تھی اور اب اتنا بڑا حادثہ ہو گیا تھا اس لیے وہ پریشان ہو گئی کہ میں پتہ نہیں پاکستان اپنے بچوں کے پاس کب جا سکوں گی۔ میں نے ہامی بھر لی اور بیٹے سے کہا کہ مجھے ٹرین میں سوار کرا دے۔

میں نے سفر سے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ اپنا لباس شلوار قمیض نہیں پہنوں گی بلکہ امریکن طرز کے کپڑے پہن کر سفر کروں گی کیوں کہ اس وقت امریکا میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور تعصب کی آگ بری طرح بھڑک اٹھی تھی۔ امریکی میڈیا، سامعین اور

ناظرین کو جو کچھ بتا رہا تھا اس پر سب کو یقین تھا اور اس پر ہی ان کا ایمان تھا۔ میڈیا سرکس اپنے رنگ برنگے کرتب دکھا رہا تھا۔ اکھاڑے میں کھڑے، معلومات کے بھوکے عوام کو خبروں کا جو بھی ٹکڑا پھینکا جاتا وہ اس پر جھپٹ پڑتے اور اُسے غنیمت جانتے۔ ساری دنیا کی توجہ اُس وقت میڈیا کی گرفت مضبوط تھی اور سچ جھوٹ، ظلم و عدل کا فیصلہ ٹی وی اسکرین پر ہی کیا جا رہا تھا۔

ٹکٹ بوتھ مشین میں پیسے ڈال کر بیٹے نے مجھے ٹکٹ خرید دیا اور اس پر سے پڑھ کر یہ ٹرین سیدھی Trenton جائے گی، جو نیوجرسی کا آخری اسٹاپ ہے، میں سوار ہوگئی۔ ٹرین سے فلاڈلفیا کے لیے ٹرین تبدیل کرنا تھی لہٰذا میں نے سکون سے بیٹھ کر ٹرین میں بیٹھے دیگر مسافروں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ہر جگہ کی طرح یہاں بھی ہر قوم و ملک سے تعلق رکھنے والے لوگ بیٹھے ہوئے تھے جن میں بیشتر تعداد 'دیسی لوگوں' یعنی انڈین پاکستانی لوگوں کی تھی، کیونکہ نیو جرسی ایریا میں ان کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ اور وہ کام کے لیے نیویورک آتے جاتے رہتے ہیں۔ خلاف معمول کوئی بھی دیسی لباس میں نہ تھا (میری طرح)۔ سبھی نے امریکی طرز کے کپڑے پہن رکھے تھے اور ورلڈ ٹریڈ سینٹر کا حادثہ بھی مسافروں کے زیر بحث تھا۔ دیسی لوگ البتہ کچھ خائف اور خاموش سے بیٹھے موضوع کو نظر انداز کرنے کی کوشش میں کھڑکیوں سے باہر جھانک رہے تھے۔ ایک پندرہ سولہ سالہ بچہ بڑے مزے سے اپنے موبائل فون پر اپنے کراچی اسٹائل لہجے میں اردو میں زور زور سے گھر بات کرکے بتا رہا تھا کہ وہ بس آدھ گھنٹے میں پہنچنے ہی والا ہے۔ میں نے بچّے کو ایک طرف اشارہ کرکے بلایا اور سمجھایا کہ اس وقت ذرا احتیاط کرے، انگلش میں بات کرے اور وہ بھی دھیمے انداز میں۔ اس کے بعد اس بچّے نے ایسی زبردست امریکی انگلش بولی کہ میں اس تضاد پر حیران سی ہوگئی، بالکل لگتا تھا جیسے وہ امریکا میں ہی پیدا ہوا ہے حالانکہ وہ مجھے بتا چکا تھا کہ وہ ابھی دو سال پہلے ہی کراچی سے آیا تھا۔ ایک شرابی جوڑا اخلاق سے گری ہوئی زبان استعمال کر رہا تھا اور بیہودگیوں میں مصروف تھا۔ مجھے انہیں دیکھ دیکھ کر کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔ مگر میں چپ بیٹھی رہی۔ لوگ دھیرے دھیرے اترتے چلے گئے مگر میرا اسٹیشن آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اناؤنسمنٹ ہوتی جا رہی تھی مگر میرے پلّے کچھ نہیں پڑھ رہا تھا۔ نہ جانے ہر سفری اناؤنسمنٹ، خواہ وہ ٹرین اسٹیشن کی ہو یا ایئرپورٹ کی، امریکا میں ہو یا پاکستان میں، سمجھنی اتنی

مشکل کیوں ہوتی ہے؟ ایک دو بار لوگوں نے میری طرف غور سے دیکھا میں بے نیازی سے اخبار بینی میں مصروف ہوگئی۔ شام ہوتے ہوتے ٹرین تقریباً خالی ہوگئی اور ایک غیر آباد جنگل میں جا کر رک گئی جہاں وہ شرابی بدتمیز جوڑا بھی اتر گیا اور میں ٹرین میں بالکل اکیلی رہ گئی۔ دل میں یہ سوچ کر حیران ہونے لگی کہ کیا صرف مجھے ہی ٹرینٹن جانا تھا؟ تھوڑی دیر بعد دیکھا کہ ٹرین کے بالکل سامنے والے ڈبے میں ٹرین آپریٹرز، کنڈیکٹرز وغیرہ اکٹھے ہوگئے اور آپس میں ہنسی مذاق کرنے لگے۔ ٹرین کے بیچ والے سارے دروازے آٹو میٹک طریقے سے کھل چکے تھے اور میں اپنی سیٹ پر بیٹھی ہوئی پوری ٹرین کے آخر تک یہ دیکھ سکتی تھی کہ میرے سوا پوری ٹرین میں کوئی بھی مسافر موجود نہیں تھا۔ پانچ چھ لمبے تڑنگے ہٹے کٹے گورے کالے امریکی مردوں کے درمیان خود کو اکیلا پا کر میں کچھ نروس سی ہوگئی۔ ابھی ورلڈ ٹریڈ سینٹر ایک کچا، تازہ زخم تھا اور میں دشمن قبیلے کی ایک تنہا عورت، کچھ دیر بعد ٹرین اسٹاف نے میری جانب دیکھا اور آپس میں کچھ بات کی۔ مجھے جتنی دعائیں یاد تھیں میں نے پڑھنا شروع کر دیں اور اللہ کو مدد کے لیے پکارا، یا اللہ میری حفاظت کرنا۔ ہندو پاک بٹوارے کے وقت کے واقعات میرے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ ٹرین میں اور ویسے بھی عورتوں کے ساتھ ایسے وقتوں میں ہمیشہ ہی ظلم وزیادتی ہوتی ہے۔ میں اُس وقت حقیقی طور پر خوف زدہ ہوگئی حالانکہ میں نے زندگی کے بہت سے طوفانوں کا تنِ تنہا مقابلہ کیا ہے اور اپنے تئیں خود کو ہمیشہ بہت بہادر سمجھتی ہوں مگر ...... یہ وقت بڑا عجیب تھا۔ میرا خون خشک ہونے لگا۔ اس وقت امریکیوں کو ہر مسلمان زہر لگتا تھا، نفرت اور تعصب کی بپھری ہوئی بلا، ہر لاجک کو بلا سوچے سمجھے ہڑپ کیے جا رہی تھی۔ ایک لمبا چوڑا کنڈیکٹر میرے قریب آ کر کھڑا ہوگیا۔

''ویل لیڈی، آپ ٹرین سے کیوں نہیں اتریں؟'' اس نے خلاف توقع مجھ سے بڑے ادب سے پوچھا۔

''میں آخری اسٹیشن ٹرینٹن پر اتروں گی۔'' میں نے نظر جھکا کے جواب دیا۔

''ڈونٹ یو نو کہ اس ٹرین کا آخری اسٹیشن Rahway ہے جو پیچھے رہ گیا ہے۔ اس پر تو ٹرین خالی ہوگئی تھی شاید آپ نے غور نہیں کیا۔''

''اوہ مائی گاڈ'' میرا دل بیٹھ سا گیا۔ ''لیکن مجھے تو فلاڈلفیا جانا ہے، ٹرینٹن سے مجھے دوسری ٹرین لینی ہے۔'' میں پریشان ہوگئی۔

اُس نے میرے ہاتھ سے میری ٹکٹ لے لی اور دیکھ کے کہنے لگا، ''آپ تو شروع سے ہی غلط ٹرین پر سوار ہیں۔''

''تو اب؟''

وہ میری ٹکٹ لے کر دوسرے کنڈیکٹروں کے پاس چلا گیا، سب نے آپس میں سر جوڑ کر کچھ ڈسکس کیا اور پھر وہ دوبارہ میرے پاس آ گیا۔

''دیکھیے لیڈی، یہ ٹرین اب دوبارہ واپس اسی ٹریک پر چلائی جائے گی اور جب ہم دوبارہ Rahway پہنچیں گے تو آپ اتر جایئے گا۔ پلیٹ فارم سے نیچے اُترنے کے بعد داہنے ہاتھ سڑک پار کر کے اسٹیشن کے دوسری جانب جا کر ٹرینٹن کی ٹرین کا انتظار کیجیے گا جو ہر گھنٹے پر آتی ہے۔''

''اور میری ٹکٹ؟'' مجھے پندرہ ڈالر کے ضیاع کا افسوس ہونے لگا۔ اُس نے پل بھر کو میری طرف دیکھا اور پھر اسے ایک دوسری جگہ سے پنچ کر کے بولا:

''اصولاً تو آپ کو نئی ٹکٹ درکار ہے لیکن چونکہ ایسا غلط فہمی کی بنا پر ہوا ہے لہٰذا میں آپ کو اسی ٹکٹ پر رعایت دے دیتا ہوں۔ اس پر لکھ دیتا ہوں کہ آپ اسی غلط ٹکٹ پر دوبارہ سفر کر سکتی ہیں۔ And yes enjoy your jonrney.''

وہ مسکراتا ہوا اپنے ساتھیوں کے پاس جا کھڑا ہوا اور میں نے دل ہی دل میں رب کا شکر ادا کیا۔ امریکن قوم کی فرض شناسی، باقاعدہ پن اور سسٹم کی بالا دستی دیکھ کر انسان کو سمجھ میں آ جاتا ہے کہ آخر یہ قوم اتنی کامیاب و سرفراز کیوں ہے۔ سپر پاور کیسے بنی ہے۔ سیاسی طور پر یہ قوم دنیا کے نقشے پر موجود جس ملک میں چاہے دندناتی پھرتی ہے مگر انفرادی سطح پر یہ عام امریکن بہت فراخ دل، کافی حد تک لاعلم، لاتعلق اور محبت بھرا، دوستانہ رویہ رکھتا ہے۔

ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے واقعے کے بعد سے افغانستان میں شروع ہونے والی بمباری اور اس کے نتیجے میں بدلتے حالات و واقعات کی وجہ سے میرا امریکا میں قیام لمبے سے لمبا ہوتا چلا گیا۔ کچھ بے یقینی کی کیفیت تھی، کچھ بچوں کو امریکا میں چھوڑ کر جانے کی فکرمندی، کچھ پاکستان کے حالات کہ میں پاکستان روانہ ہوئی تو نومبر آ چکا تھا فلائٹ چونکہ نیویارک سٹی سے ہی لینا تھی، اس لیے میں بالٹی مور میں بھائی کے پاس وقت گزارنے کے بعد تین ماہ بعد پھر ایک بار نیویارک آ گئی تھی۔ پاکستان روانہ ہونے سے پہلے میں نے بچوں سے ورلڈ ٹریڈ

سینٹر کا علاقہ، جواب گراؤنڈ زیرو کہلاتا ہے، دیکھنے کی خواہش کی تو وہ رضا مند ہو گئے اور یوں ہم لوگ ایک شام وہاں جا پہنچے۔ اتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی وہ علاقہ پولیس نے کافی حد تک سیل کر رکھا تھا مگر پھر بھی سیاحوں کے لیے ایک آدھ اسٹریٹ کا راستہ کھول دیا گیا۔

اُسی علاقے میں میں کتنی بار گھوم پھر چکی تھی لیکن اب سب کچھ اجنبی اجنبی اور ان دیکھا سا لگ رہا تھا۔ سارے ایریا میں واضح تبدیلیاں آچکی تھیں۔ نہ وہ چہل پہل، نہ رونق میلے، نہ وہ خوش باش چہرے، نہ ٹورسٹوں کے شہد کی مکھیوں جیسے بھنبھناتے چھتے۔ ایک پُراسرار ہیبت میں ڈوبی وال اسٹریٹ چپ چاپ کھڑی آنے جانے والوں کو تکے جا رہی تھی۔ دونوں ٹاورز کی جگہ ایک بہت بڑا کھیا پڑ گیا تھا جو کہ دیکھنے میں بہت عجیب لگتا تھا۔ اسکائی سکر پیرز کے جنگل کے سب سے لانبے اور اہم درخت جڑ سے اُکھیڑے جا چکے تھے اور اب آس پاس کی دیگر بلڈنگیں چھوٹی اور ننگی ننگی سی لگ رہی تھیں۔ حیرت کی بات ہے کہ انسان کس قدر زبردست تخلیقی قوت کا مالک ہے، چاہے تو بلڈنگوں کے خوبصورت جنگل اُگا لے چاہے تو انہیں جڑ سے ہی اکھاڑ پھینکے، نیست ونابود کر کے رکھ دے۔ مجھے یاد آ گیا شکاگو کے سب سے بڑے ٹاور Seers کو ایک پاکستانی مسلمان آرکی ٹیکٹ نے ڈیزائن کیا تھا، اور بلڈنگ میں گھستے ہی اس کے نام کی تختی لگی دیکھ کر ہم پاکستانیوں کا دل جذبۂ فخر سے بھر جاتا تھا۔

NASDAQ نیویورک اسٹاک ایکسچینج بلڈنگ کے سامنے نصب بڑا سا دھات کا بنا ہوا کالا بھینسا رات کی تاریکی میں بھی چمک رہا تھا۔ سڑک کی مدھم روشنیوں میں اکا دکا چلتے ہوئے لوگ یوں قدم اٹھا رہے تھے جیسے مرے ہوئے ہوں یا ہوا میں تیر رہے ہوں۔ گنگ زبان، سراسیمہ، گمشدہ، ہر کوئی گراؤنڈ زیرو کا View دیکھنے کو بے تاب تھا کیونکہ کافی راستے پولیس نے بلاک کر رکھے تھے اور ہر آنے جانے والے کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

ورلڈ ٹریڈ سینٹر کا بچا کھچا نچلا تقسیم شدہ حصہ ابھی تک کھڑا تھا۔ اس کی درزوں اور دیواروں میں نہ جانے کس کس کی لاش کے ٹکڑے اور ذرّے پھنسے ہوئے بے نام ہوتے جاتے تھے۔ اُن دفاتر میں نہ جانے کون کون تلاشِ معاش میں صبح نو سے شام پانچ بجے تک کام کر کے روٹی گھر لاتا ہوگا۔ اور اپنے بچّوں کے ساتھ گھر جا کر کھیلتا ہوگا۔ اب تو وہاں زندگی کی کوئی پرچھائیں تک موجود نہیں تھی۔ بس ایک منحوس سی اداسی تھی جو اس بھسم شدہ عمارت پر بال کھولے سو رہی تھی۔ نیویورک شہرِ خموشاں بن چکا تھا۔

اس وقت تک نیویورک کے میئر جولیانی کی طرف سے اعلان کیا جا چکا تھا کہ جن لوگوں کے عزیز و اقارب کی لاشیں یا جسم کے ٹکڑے نہیں ملے یا شناخت نہیں کیے جاسکے وہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے ملبے سے کچھ راکھ یا مٹی اٹھالیں اور ان ہی کو اپنے پیاروں کی باقیات سمجھ کر لے جائیں۔ چاہے تو ان کا DNA Test کروالیں کیونکہ ان پیاروں کے وجود اور ہستی کے ٹکڑوں کی آمیزش سے اب وہی مٹی متبرک تھی اور سبھی کچھ تھی۔ یہ سچ ہے کہ جب کسی کا پیارا رخصت ہوتا ہے تو جب تک وہ اسے اس کے منطقی انجام تک پہنچتا نہ دیکھ لے، اُسے چین نصیب نہیں ہوتا لہٰذا مٹھی بھر نشانی بھی کسی بے چین دل کو قدرے راحت پہنچا سکتی ہے۔

سڑک کے کھمبوں، جنگلوں، حتیٰ کہ زمین پر بھی گلدستے اور پھول، ٹیڈی بیئرز، ربن، کارڈز، کھوئے ہوئے لوگوں کی تصاویر، ان کی محبت میں لکھی گئی نظمیں، جا بجا سجائی نظر آتی تھیں۔ اور ان کے ساتھ ہی مسلمانوں کے لیے نفرت آمیز جملے، اسامہ بن لادن کی تصاویر والے پوسٹرز جن میں اس کے سر میں راکٹ، میزائل گھستے ہوئے دکھائی دے رہے تھے، ان سے بھی نظریں چرانا ممکن نہ تھا۔ ملبہ اٹھانے والے بڑے بڑے لوہے، شیشہ، جہاز کے ٹکڑوں سے بھرے ہوئے ٹرک اور کام کر کر کے تھکے ہوئے ہارڈ hat پہنے، ستے ہوئے چہروں والے جینز میں ملبوس مزدور۔ ٹریلرز میں عارضی طور پر قائم شدہ ٹی وی اسٹیشن اور بڑی بڑی تیز روشنیاں۔ چینی لڑکے لڑکیاں جو کمائی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے امریکی قومی رنگوں سرخ، سفید اور نیلے میں بنی ہوئی نگوں کی جیولری فروخت کر رہے تھے اور لوگ جذبہ حب الوطنی سے مغلوب ہو کر ننھے ننھے جھنڈے اور Pins خرید کر اپنے ملک سے محبت کا اظہار کر رہے تھے۔ گلی کی بند دکانوں میں تڑخے ہوئے شیشے کے شوکیس، الٹا پلٹا سامان، سفید ملبے کی گرد، اوندھے پڑے ہوئے manequins دیکھ کر ذہن الجھا جاتا تھا۔ گراؤنڈ زیرو کے باہر سڑک پر کسی کانونٹ اسکول کے بچے اپنی nuns کے ہمراہ کھڑے Choir کی شکل میں مقدس گیت گا رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں بھی مسکرا کر اپنا چرچ لٹریچر اور پھول پکڑائے جو ہم نے تھینکس کہہ کر لے لیے اور میری نظر بغل ہی میں موجود ایک ننھے منّے ویران سے چرچ پر جا پڑی جو اُجڑا اور حیران حیران سا لگ رہا تھا جیسے پوچھ رہا ہو، یہ انسانوں کو کیا ہو گیا ہے؟ گاڈ اور اللہ کو پیار کرنے والے آپس میں ایک دوسرے سے پیار کیوں نہیں کرتے؟ خدا تو محبت کا پیغام ہے تو پھر یہ ایک دوسرے کے جانی دشمن کیوں ہیں؟

مشہور پاکستانی پاپ سنگر گروپ جنون کو ٹی وی نے اپنے ایک بڑے ہی مقبول پروگرام Politically Incorrect میں شمولیت کی دعوت دی تو سلمان احمد کو امریکیوں کے تیز کٹیلے، طنزیہ سوالات کا سامنا کرنا پڑا۔ سلمان نے بڑی ہی خوبصورتی اور تحمل سے اُن کا جواب دیا اور بتایا کہ پاکستان جنونی قاتل ملک نہیں، جیسا کہ میڈیا پراپیگنڈہ میں دکھایا جاتا ہے مگر اس کے میزبان نے یہ کہہ کر بحث ختم کردی کہ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ مسلمان تیل سے لبالب بھرے جہاز بلڈنگوں میں دے مارتے ہیں اور بس۔

سلمان احمد کے والد اعجاز صاحب نیویورک کی بہت جانی پہچانی شخصیات میں سے ایک ہیں۔ ان کی ایک دوست فیملی کا بیٹا ۲۸ سالہ نوجوان تیمور بھی ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے حادثے میں کئی ماہ لاپتہ رہا۔ مگر اس کی والدہ تیمور کے بارے میں پُرامید تھیں کہ وہ ضرور زندہ مل جائے گا۔ انہوں نے اپنے گھر کئی بار ختم قرآن اور دعائیں کروائیں۔ ایک ماں ہونے کے ناطے میں سمجھ سکتی ہوں کہ انہیں اس حقیقت کا سامنا کرنے میں کتنی دشواری پیش آرہی ہوگی۔ ان کے دوست، رشتہ دار سب پریشان تھے کہ انہیں کیسے سمجھائیں، پھر بالآخر ایک روز تیمور کا سراغ مل گیا اور اس ماں کو ماننا ہی پڑا کہ اس کا لاڈلا اب اسے کبھی دکھائی نہیں دے گا۔

جان ایف کینڈی ائیرپورٹ پر سکیورٹی اس بار بہت زیادہ تھی۔ پہلے تو رخصت کرنے والے تقریباً جہاز کے دروازے تک مسافروں کو الوداع کہتے نظر آتے تھے مگر اب ایسا ممکن نہ تھا۔ ہرے ہرے کمانڈو سوٹ میں ملبوس، رائفل بردار امریکن جابجا دکھائی دے رہے تھے۔ ایئرپورٹ پر چونکہ ہر ملک وقوم کے لوگ نظر آتے ہیں اس لیے طالبان کی سی وضع قطع والے بھی کافی لوگ دکھائی دیے جنہیں آتے جاتے کوئی بھی خاص توجہ سے نہیں دیکھ رہا تھا۔

ستمبر ۲۰۰۱ء کبھی نہ بھول سکنے والا مہینہ بن کر تاریخ میں ہمیشہ کے لیے نمایاں ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق جب اکانومی تباہ ہوئی تو پوری دنیا کو ۳۰۰ بلین ڈالرز کا نقصان ہوا۔ دیارِ غیر میں محنت کشوں کو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا اور ملک بدری کے احکامات نازل ہوئے تو کئی خاندانوں میں فاقے آ گئے۔ امیگریشن قوانین کی سختیاں تعصب اور نسلی منافرت کے بڑھتے ہوئے واقعات سے امریکا میں رہنے والے ہمارے بھائی بندوں پر زمین تنگ ہوگئی۔ اسامہ اور ملاّ عمر نے لاکھوں افغانی مروا کر بھائی کو بھائی کا دشمن بنا دیا۔ آج

امریکا وسطِ ایشیا میں اپنا قدم پہلے سے زیادہ مضبوطی سے جما چکا ہے اور ساری دنیا کا چوہدری بن چکا ہے مگر یہ ایک سپر پاور کی طاقت کے مظاہرے ہیں۔ وہ جہاں جو چاہے کرے اسے پوچھنے والا کوئی نہیں۔ امریکا نرم دل اتنا ہے کہ ایک مچھلی یا چیونٹی، بلی یا کتے کو بچانا ہو تو ملین ڈالر کے فنڈ جمع کرلے گا، افغانی بچوں کو بم مارتے ہوئے خوراک کے پیکٹ بھی ساتھ میں دے گا لیکن اگر اسے غصہ آجائے تو پھر وہ اپنے سامنے آنے والی ہر چیز کو برباد کرسکتا ہے۔ ایک جرثومے کے ذریعے پوری پوری قوموں کو نیست و نابود کرسکتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک کامیاب ملک ہے اور Success create its' own morality یعنی کامیابی اپنی اقدار خود تخلیق کرتی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اگر دوسری قومیں خود کو اس کی سطح پر نہیں رکھتیں تو پھر اپنے آپ کو اتنا مضبوط اور خود کفیل کرلیں کہ انہیں ہر پل کاسہ لیے امریکا کی طرف نہ دیکھنا پڑے۔ ورنہ پھر امریکا بہادر تو وہ کرے گا جو مزاجِ یار میں آئے گا۔

تباہی کے چند دن بعد ایسا لگا کہ اب جنگ چھڑا ہی چاہتی ہے، ایک نئی عالمگیر جنگ۔ دنیا زاد نے فرمائش کی کہ پچھلی جنگ کا کچھ احوال سنایا جائے، جس قدر یاد آئے وہ دہرایا جائے۔ اگلی دو تحریریں اسی حوالے سے ہیں۔ دو مختلف ادیب مگر یادوں کا محور ایک ہی شہر۔

ڈاکٹر اسلم فرخی

زمانہ کتنا لڑائی کو رہ گیا ہوگا

مجھے وہ دن یاد آ رہے ہیں جب ہمارے گھر میں لڑائی کا بڑا چرچا تھا۔ ایک تو یہ کہ سارے یورپ میں ہٹلر کی جنگی تیاریوں اور دھونس نے تہلکہ برپا کر رکھا تھا۔ برطانوی وزیر اعظم چیمبرلین اپنی چھتری لیے دوڑے دوڑے برلن جاتے اور لندن واپس آ کر اعلان کر دیتے کہ لڑائی کا خطرہ ٹل گیا ہے۔ یہ تو بیرونی مسئلہ تھا۔ ہمارے گھر کا لڑائی سے یہ تعلق تھا کہ والد صاحب نے جرمنی کے ایک کارخانے سے ایک مشین منگوائی تھی۔ جرمن کارخانے کے برطانوی ایجنٹ کو لندن میں آرڈر دیا گیا تھا۔ رقم بھی ادا کر دی گئی تھی۔ برطانوی ایجنٹ نے وعدہ کیا تھا کہ مشین مارچ ۳۹ء میں پہنچ جائے گی۔ مگر مارچ گزرا، اپریل گزرا، مئی اور جون گزرے، جولائی گزر گیا۔ مشین نہیں آئی۔ ہر ہفتے برطانوی ایجنٹ کے یہاں سے ایک خط آتا۔ لمبے لفافے پر بڑے نفیس انداز میں ہاتھ سے پتہ لکھا ہوتا تھا۔ خط کا مضمون یہ کہ کارخانہ بہت مصروف ہے۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ مشین بہت جلد بھیجے گا۔ عموماً یہ ہوتا کہ جب اس قسم کا خط آتا تو والد صاحب سب بچوں کو جمع کرتے اور بتاتے کہ جرمن کارخانے لڑائی کا کام بنانے میں مصروف ہیں۔ عنقریب لڑائی ہونے والی ہے۔ جرمن بڑی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ہٹلر نے ہاری ہوئی جرمن قوم میں ایک نئی روح پھونک دی ہے اور وہ برطانیہ پر حملہ کرنے کے لیے بالکل تیار ہے۔

خدا خدا کر کے اگست کے شروع میں یہ مشین آ گئی۔ والد صاحب بڑے خوش ہوئے۔ کہنے لگے ''میں اس کے آنے سے بالکل مایوس ہو گیا تھا'' پھر انہوں نے مجھے مخاطب کر کے کہا ''۱۴ء کی بڑی لڑائی میں مَیں تمہاری عمر کا تھا۔ چار پانچ برس بڑے عذاب میں گزرے تھے۔ لڑکپن کی ساری چونچالی

جاتی رہی تھی اور پھر اُس کے بعد جو کچھ ہوا وہ لڑائی سے زیادہ ہولناک تھا۔ لڑائی عنقریب پھر چھڑنے والی ہے۔ نجانے تم لوگوں پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو لڑائی کے شر سے محفوظ رکھے۔"

میرے ذہن میں لڑائی کا جو نقشہ تھا وہ ہندو مسلم فسادات سے ملتا جلتا تھا جو اُن دنوں عام تھے۔ میرے علم کے مطابق سب سے بڑا فساد کانپور میں ہوا تھا جس کی روداد میرے ایک دادا نے مجھے بڑی تفصیل سے سنائی تھی۔ اُن کا کہنا تھا کہ تعداد میں کم ہونے کے باوجود مسلمانوں نے ایسا مقابلہ کیا کہ حریف کے دانت کھٹے کر دیے۔ قلی بازار ایک محلّہ تھا۔ چاروں طرف سے اغیار کے محلّوں سے گھرا ہوا مگر وہاں کے مسلمان ایسے جی دار تھے کہ انہوں نے حملہ کرنے والوں کی ایک نہ چلنے دی اور ہر حملہ پسپا کر دیا۔ فساد لکھنؤ اور فتح گڑھ میں بھی ہوا تھا۔ میں نے اس کی بھی روداد سنی تھی۔ میرے دادا سارے بچوں کو ان فسادات کا حال گاہے گاہے اس انداز سے سناتے رہتے تھے کہ فتح گڑھ کے فساد کو روکنے والے ہیرو وہی ثابت ہوتے تھے۔

شہر اور ہمارے اسکول میں بھی لڑائی کا ایک خوف چھایا ہوا تھا۔ بوڑھے بڑی لڑائی کا حال اکثر سناتے رہتے تھے۔ ہمارے یہاں ایک بڑے میاں آیا کرتے تھے۔ نصیر باز خاں نام تھا مگر سب انہیں تسن کہتے تھے۔ بڑے مختصر سے آدمی تھے۔ ناٹا قد۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں۔ نجانے وہ کس طرح لڑائی میں عراق چلے گئے۔ آدمیوں کی کمی تھی۔ وہ بھی فوج میں بھرتی ہوگئے اور عراق پہنچ گئے۔ وہ عراق کو میسوپوٹامیہ کہا کرتے تھے اور لڑائی کے بڑے دلچسپ قصّے سناتے تھے۔ اپنی بہادری کے قصّے بڑے زور شور سے سناتے اور انگریزوں کو برملا برا بھلا کہتے تھے مگر ان سب باتوں کے باوجود میرے ذہن میں لڑائی کا تاثر ہندو مسلم فساد سے آگے نہیں بڑھا۔ چودہ پندرہ برس کی عمر میں نویں جماعت کا طالب علم اس سے آگے کی نہیں سوچ سکتا تھا۔ اسکول کے دوسرے لڑکوں کا خیال بھی یہی تھا۔ بعض مسلمان لڑکے کہتے تھے کہ اس جنگ میں امام مہدی کا ظہور ہوگا اور وہ کفر کی ساری طاقتوں کو پارہ پارہ کر دیں گے۔ ساری دُنیا میں مسلمانوں کی حکومت ہو جائے گی۔ یورپ کے سارے دجّال ختم ہو جائیں گے، یہ بات لڑکوں سے زیادہ بعض بڑے بوڑھوں میں مقبول تھی۔

ستمبر کے پہلے ہفتے کی کوئی ابتدائی تاریخ تھی۔ ہم لوگ کوٹھی کے صحن میں بیڈمنٹن کھیل رہے تھے۔ اتنے میں پھاٹک سے ہانپتے کانپتے عنایت گزٹ نمودار ہوئے۔ عنایت گزٹ "شہر خبرو" تھے۔ شہروں اور قصبوں میں ایک آدھ آدمی ایسا ضرور ہوتا تھا جو فی سبیل اللہ سارے شہریوں کو خبریں سناتا رہتا تھا۔ عنایت کا درجہ ذرا بلند تھا۔ کچہری میں ملازم تھے، صبح کچہری جاتے تو مختلف لوگوں اور

گھروں میں بڑی ترتیب سے خبریں سناتے اور یہی عمل واپسی میں بھی دہراتے۔ خبریں سنانے کے معاملے میں ان کا انداز ریڈیو پاکستان کے شکیل احمد جیسا تھا۔ آواز کا زیر و بم، لہجے کا اتار چڑھاؤ، صحیح ترتیب، انگریزی اخباروں کے حوالے۔ میں نے ایک آدھ دفعہ انہیں ٹوکا کہ یہ خبر تو ''پانیر'' میں نہیں ہے تو انہوں نے ڈانٹ کر کہا، ''میاں صاحب زادے یہ خبر ہندی کے ورتمان اور دیر بھارت میں چھپی ہوئی ہے۔'' عنایت گزٹ نے ہم لوگوں کو کھیل میں محو دیکھ کر اپنی آمد کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے کہا، ''تم لوگ یہاں کھیل کود میں مصروف ہو۔ وہاں یورپ میں جنگ چھڑ گئی ہے۔ ہٹلر نے پولینڈ پر حملہ کر دیا ہے۔ مسٹر چیمبرلین ہٹلر کو جنگ سے باز رکھنے کے لیے جرمنی گئے ہیں۔'' ہم میں سے کسی نے جھنجھلا کر کہا، ''گئے سر ہوں گے۔ ہم کیا کریں۔'' عنایت گزٹ یہ سن کر بڑے ناراض ہوئے۔ بولے ''نئی تانتی تو بالکل ہی ہاتھوں سے نکل گئی ہے۔ احسن میاں موجود ہوتے تو وہ غور کرتے۔ تم لوگ کیا سمجھو گے۔'' میں نے کہا، ''میں احسن میاں کو یہ خبر سنا دوں گا۔'' عنایت گزٹ مطمئن نہیں ہوئے۔ کچھ بڑبڑاتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ کھیل ختم ہوا تو میں نے اندر جا کر والد صاحب کو بتایا کہ عنایت گزٹ آئے تھے۔ یہ خبر سنا گئے ہیں کہ جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا ہے۔ والد صاحب یہ خبر سن کر سوچ میں پڑ گئے۔ کہنے لگے، ''آزمائش کے لیے تیار ہو جاؤ...... خدانخواستہ کوئی اونچ نیچ ہو تو گھر کی ذمہ داری تمہارے سر ہو گی۔'' میں نے اُن کی بات پر کوئی توجہ نہیں کی۔ وہ مجھے اکثر میرے فرائض سے آگاہ کرتے رہے تھے۔

دوسرے دن عنایت گزٹ کی خبر کی تصدیق ہو گئی۔ جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا تھا۔ تین چار دن کے بعد لکھنؤ کے ایک اردو اخبار غالباً ''حق'' میں شہ سرخی شائع ہوئی۔ ''یورپ کے قزاقوں میں پولینڈ کی تقسیم۔'' یہ شہ سرخی مجھے اب تک یاد ہے اور اس لیے یاد ہے کہ میری چھوٹی بہن خورشید نے یہ سرخی پڑھ کر مجھ سے پوچھا تھا کہ ''بھیا کیا ہٹلر قزاق ہے؟'' اور میں نے اپنی پوری دانائی کو بروئے کار لاتے ہوئے جواب دیا تھا کہ یہ سب انگریزوں کی شرارت ہے۔

چند دن کے بعد برطانیہ نے باقاعدہ اعلانِ جنگ کر دیا۔ یورپ اور برطانیہ میں دنادن ہونے لگی۔ ''لفٹ وافے'' اور ''بلٹز کریگ'' کے الفاظ عام ہو گئے۔ اسکول کے بعض اچھے گھرانوں کے ہندو لڑکے اور ماسٹر قمیصوں کے کفوں میں سواستیکا کے نشان والے بٹن لگائے نظر آنے لگے۔ شہر میں بھی بعض ہندو معززین یہ بٹن لگا رہے تھے۔ کچھ ہندو لڑکوں نے مجھے بتایا کہ انگریز عنقریب ہٹلر کے ہاتھوں مارے جائیں گے۔ ان کی ساری اکڑ نکل جائے گی۔ حکومت ختم ہو جائے گی اور ہندوستان

آزاد ہوجائے گا۔ "سوتنترا" حاصل ہوجائے گی۔ بھارت ورش کا بول بالا ہوگا۔ میں نے اور بعض دوسرے مسلمان لڑکوں نے اس لاف وگزاف پر کوئی توجہ نہیں کی۔ والد صاحب سے تذکرہ کیا تو وہ بڑی دیر تک سمجھاتے رہے کہ انگریز بڑے چالاک ہیں۔ ہندوستان کو آزادی تو کیا دیں گے، کوئی نیا فتنہ کھڑا کر دیں گے۔ ۱۴ء کی بڑی لڑائی میں انہوں نے مسلمانوں کی عظیم الشان سلطنت کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ سارے اسلامی ملکوں کو اپنا باج گزار بنالیا۔ ان سے کسی فلاح کی امید رکھنا فضول ہے اور یہ اپنی چالاکی اور عیاری سے ہٹلر کو بھی زیر کرلیں گے۔ ان کے کاٹے کا تو منتر ہی نہیں ہے۔ برباد کر دیا ہندوستان کو...... تم اپنی پڑھائی سے کام رکھو۔ فضول چکروں میں نہ پڑو۔"

آہستہ آہستہ فتح گڑھ جیسی خاموش اور پرسکون بستی میں بھی جنگ کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔ اخباروں اور ان سے بڑھ کر عنایت گزٹ نے آفت مچا دی۔ جرمنی نے ہالینڈ پر قبضہ کرلیا ہے بلجیئم ہٹلر کے قبضے میں آ گیا ہے۔ ڈنمارک پر بھی ہٹلر کا قبضہ ہوگیا ہے۔ فرانس نے بھی ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ جنرل ڈیگال نے جلا وطن حکومت قائم کرلی ہے۔ لندن پر زور وشور سے بمباری ہو رہی ہے۔ روزانہ ایک نئی خبر سننے کو ملتی ہے بہت سے گھروں میں ہٹلر کی تصویریں بھی نظر آنے لگی تھیں۔ چہرے مہرے سے کوئی خاص خوفناک آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ بعض لوگوں نے اس کی طرح کی بٹر فلائی مونچھیں بھی رکھ لی تھیں۔ ادھر ہٹلر کے ایک حلیف مسولینی نے جو لڑائی شروع ہونے سے پہلے حبش پر قبضہ کرچکا تھا، شمالی افریقا میں محاذ کھولا۔ امریکا بھی جنگ میں کود چکا تھا۔ ایک دن خبر ملی کہ جاپان نے بھی برطانیہ اور امریکا کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ہے۔ اعلانِ جنگ کرتے ہی جاپان نے برطانوی بحریہ کے دو بڑے جہاز پرنس آف ویلز اور ری پلس ڈبو دیے۔ برطانیہ کا دعویٰ تھا کہ کارک ڈوب سکتا ہے مگر پرنس آف ویلز نہیں ڈوب سکتا۔ لیکن ایک جاپانی محبّ وطن بم لے کر اس کے بوائلر میں کود گیا اور جہاز کو ڈبو دیا۔ عنایت گزٹ نے اس خبر کو ایسے اہتمام سے سنایا تھا جیسے وہ خود جہاز ڈوبنے کے وقت وہاں موجود تھے اور رواں تبصرہ کر رہے تھے۔ اُس دن عنایت گزٹ کی بڑی واہ واہ ہوئی تھی۔

فتح گڑھ میں نمایاں تبدیلی تو یہ ہوئی کہ یہاں فوج کی ایک چھوٹی سی چھاؤنی تھی۔ یہ سیونتھ راجپوت رجمنٹ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ یک لخت یہ ہوا کہ سیونتھ راجپوت غائب ہوگئی اور اس کی جگہ راجپوت رجمنٹل سینٹر وجود میں آ گیا۔ بے شمار فوجی جوان یہاں آ گئے۔ اتوار کی شام کو اکثر فوجی فتح گڑھ کے بازاروں میں آتے تھے اس وقت تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ

میلہ لگا ہوا ہے۔ آدمی پر آدمی گر رہا ہے۔ آنے والے خریدار دکانیں خالی کر دیتے تھے۔ پہلے تو دکان دار اس چہل پہل اور گرم بازاری سے بہت خوش ہوئے۔ اچھا منافع کمایا مگر بعد میں جب دکانوں کے لیے مال ملنا بند ہوگیا تو خریداروں کی جھڑکیاں سننے کو ملیں اور ہر اتوار کو جھگڑے فساد ہونے لگے۔

شہر میں اشیا کی قلت ہونے لگی۔ راشن ہوگیا۔ آدھ پاؤ آٹا فی کس۔ شکر کا راشن۔ پٹرول اور مٹی کے تیل کا راشن۔ شیروانی کے لیے لال املی کی ڈیڑھ گز سرج کا پرمٹ سپلائی آفس سے ملنے لگا۔ لٹھے، ململ، سب کے لیے پرچی ضروری ہوگئی۔ بڑے بوڑھے کہتے تھے ہر چیز میں آگ لگی ہے۔ نوجوان فوج میں بھرتی ہونے لگے۔ دیہات کے دیہات خالی ہوگئے۔ ہوائی حملوں سے بچاؤ کا ایک محکمہ قائم ہوا۔ راتوں کو اندھیرا ہونے لگا۔ رات کے وقت ریلوں میں بھی اندھیرا رہتا تھا۔ ہر چیز مہنگی، ہر چیز نایاب، حد یہ ہے کہ ریزگاری نایاب ہوگئی۔ فتح گڑھ سے فرخ آباد جانے کے لیے ایک صاحب اکے پر سوار ہوئے۔ اکے والے نے پوچھا، میاں اُترتے وقت جیب سے روپیہ تو نہیں نکالو گے؟ اکنی ہے تمہارے پاس؟ ماچس عنقا ہوگئی۔ پان سگریٹ والوں نے اپنی دکانوں پر ناریل کی رسّی جلا کر لٹکانا شروع کر دی۔ اس سے راہ چلتوں کا بھی بھلا ہوتا تھا۔ ولایتی سامان آنا بند ہوگیا۔ ہٹلر کامیابیاں حاصل کر رہا تھا۔ بے شمار لوگوں کی زبان پر ایک نظم تھی جسے عام طور پر جوش صاحب سے منسوب کیا جاتا تھا مگر ان کا کہنا تھا کہ یہ نظم ان کی نہیں ہے۔ وہ کسی فاشسٹ کی مدح نہیں کر سکتے۔ نظم کا پہلا مصرع یہ تھا۔

سلام اے تاجدار جرمنی اے ہٹلر اعظم

اور آخری مصرع یوں تھا۔

ہمارے نام کا بھی ایک گولہ پھینکتے آنا

پہلے مصرعے میں قصر بکنگھم کا ذکر تھا۔ جوش صاحب کی نظم ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام'' کا یہ شعر زبان زد خاص و عام تھا:

جس کو ہر ہٹلر ہیں کہتے بھیڑیا ہے بھیڑیا
بھیڑیے کو مار دو گولی پئے امن و بقا

فتح گڑھ میں پڑھے لکھے گھرانے کم تھے مگر اس کے باوجود ان میں سے اکثر گھرانوں میں ہٹلر کی خودنوشت مین کیمف اور مسولینی کی خودنوشت پڑھی جا رہی تھی۔ کوشش میں نے بھی کی لیکن میری انگریزی واجبی اور معمولی تھی اس لیے کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ دونوں کتابیں میں نے بہت بعد میں

پڑھیں۔ ایک چکر آریا نسل کا بھی چلا تھا۔ ہندو طالب علم کہتے تھے ہم بھی آریا ہیں، ہٹلر بھی آریا ہے اور میاں تم اصل نسل کے سامی ہو، تمہارا تعلق یہودیوں کی نسل سے ہے۔ ہٹلر نے سارے یہودیوں اور یہودی نسل والوں کو ختم کرنے کی تیاریاں کرلی ہیں۔ ہٹلر جب بھارت ورش کو آزادی دے گا تو تم سب لوگ مارے جاؤ گے۔ ہم لوگوں کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ہنسی میں ٹال دیتے تھے۔

ان دنوں ریڈیو ایک نادر و نایاب چیز تھی۔ گراموفون کی ایک دکان پر ریڈیو لگا ہوا تھا۔ ہم لوگ شام کو جب پریڈ کے میدان سے ہاکی کھیل کر لوٹتے تو اس دکان پر کھڑے ہوکر دلّی سے نشر ہونے والا پروگرام تھوڑی دیر تک سنتے۔ بڑا عجیب معلوم ہوتا تھا۔ پھر یہ دیکھا کہ والد صاحب آٹھ بجے کے قریب اُٹھ کر ایک وکیل صاحب کے یہاں پابندی سے جانے لگے ہیں۔ میں نے اپنی والدہ سے پوچھا کہ بھائی جان پہلے تو ان وکیل صاحب کے یہاں کبھی کبھی جاتے تھے اب روزانہ جانے لگے ہیں کیا بات ہے؟ والدہ نے بتایا کسی سے کہنا نہیں، جرمن ریڈیو سننے جاتے ہیں۔ خبریں سنائی جاتی ہیں۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ان وکیل صاحب کے یہاں ریڈیو تھا۔ رات کو شہر کے بعض آدمی خاموشی سے جرمن ریڈیو سے خبریں سنتے تھے۔ اردو کی خبریں غالباً اشفاق نامی کوئی شخص پڑھتا تھا۔ انگریزی میں جو شخص خبریں پڑھتا تو وہ لارڈ ہاہا کے نام سے مشہور تھا۔ یہ خبریں بڑی رازداری سے سُنی جاتی تھیں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو مگر عنایت گزٹ جو خبریں صبح صبح آکر سناتے تھے ان میں جرمن ریڈیو کا حوالہ ضرور ہوتا تھا۔ رات جرمن ریڈیو نے یہ کہا، یہ کہا۔ اور بھائی انگریز تو بالکل جھوٹ بولتے ہیں۔ انگریزی فوج کا قتل عام ہو رہا ہے اور وہ یہی کہے جارہے ہیں کہ ہمیں کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ سفید جھوٹ۔

صحیح یا غلط، میں نے نوعمری کے باوجود یہ محسوس کیا کہ عام ملکی باشندے نفسیاتی طور پر جرمنی کی فتح کے خواہاں ہیں۔ غالباً یہ انگریز دشمنی کا نتیجہ تھا۔ اوپری سطح پر برطانوی حکومت کی حمایت کے نعرے تھے اور اندرونی سطح پر جرمن کامیابی کی دعائیں۔ عام آدمی کے لیے جمہوریت اور فاشزم کا ٹکراؤ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے لیے ہٹلر وہ ہیرو تھا جسے قدرت نے انگریزوں کو سزا دینے کے لیے مامور کیا تھا۔ سیاسی رہنماؤں نے لڑائی کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا تھا، کیا ردِ عمل تھا، یہ میرے لیے دور کا جلوہ تھا کیوں کہ یہ سب کچھ میری فہم سے بالاتر تھا۔ میں جو کچھ دیکھ رہا تھا وہی میرے لیے بہت کافی تھا۔ شہر کے بہت سے نوجوان فوج میں بھرتی ہوکر محاذ پر چلے گئے تھے۔ ان کی کوئی خبر نہیں تھی۔ انگریز اور ہندوستانی افسروں کے رویے میں غیر معمولی سختی اور رعونت آگئی تھی۔

ان دنوں فتح گڑھ میں ایک ہندوستانی کلکٹر تھا۔ اس کا نام ''گنڈیویا'' تھا۔ نہایت بدزبان، بدکلام اور بدتمیز۔ ایک دن قائم گنج کے ایک ویدجی اجلاس میں پیش ہوئے۔ بڑی لجاجت سے کہنے لگے، ''سرکار، شکر نہ ملنے سے ہمارے سارے شربت خراب ہو گئے ہیں مریضوں کو ان شربتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آپ کرپا کر کے تھوڑی سی شکر کا پرمٹ دے دیں تو بہت اچھا ہو۔'' فرعونِ بے سامان گنڈیویا نے برسرِ عدالت کہا، ''ویدجی، شربتوں میں گوبر ڈالا کیجیے۔ اس سے رنگ بھی اچھا آئے گا اور ذائقہ بھی چوکھا ہو جائے گا۔'' ویدجی آنسو پونچھتے ہوئے جب عدالت سے باہر نکلے تو سب سے کہنے لگے ''یہ سور کے بچے دیسی انگریز اپنے باپ سے بھی بڑھ گئے ہیں۔'' فتح گڑھ میں اس واقعے کا بہت دن تک چرچا رہا تھا۔

لڑائی جاری رہی میں نویں جماعت سے دسویں میں آ گیا۔ اس زمانے میں ایک نئی شرارت سوجھی۔ فرخ آباد کا ضلع گنے کی کاشت کے لیے مشہور تھا۔ گنا پلنے کا موسم شروع ہوتا تو فتح گڑھ، کمال گنج اور قائم گنج سے گنے مال گاڑیوں کے کھلے ڈبوں میں لاد کر ملوں میں بھیجے جاتے تھے۔ ہم لوگ یہ کرتے کہ دس پندرہ لڑکوں کا ایک گروہ بنا کر اسٹیشن جاتے اور چار چار پانچ پانچ لڑکے موقعے موقعے سے ڈبوں سے گنے پار کرتے۔ اُس زمانے میں گنے بہت سستے تھے۔ معمولی گنے ایک پیسے کے دو تک مل جاتے تھے اور پونڈے ایک پیسے سے دو پیسے میں آتے تھے مگر چوری کے گنوں میں لذت ہی کچھ اور ہوتی تھی۔

ایک شام ہمارا گروہ اسٹیشن پہنچا تو پلیٹ فارم پر بہت سے فوجی ٹہلتے نظر آئے۔ معلوم ہوا کوئی فوجی گاڑی آنے والی ہے۔ ہم نے چوکی پھیرا دیکھ کر اس دن کی واردات ملتوی کر دی اور ایک ایک کر کے گھر واپس ہونے لگے۔ گاڑی کا سگنل ہو چکا تھا۔ میں پلیٹ فارم پر یہ سوچ کر ٹھہر گیا تھا کہ گاڑی گزر جائے تو سامنے ریلوے انسٹیٹیوٹ جا کر تیرتھ رام فیروز پوری کا ایک ناول لیتا چلوں۔ ریلوے کے اس انسٹیٹیوٹ کا کتب خانہ بہت اچھا تھا۔ کوئی ریلوے والا کہہ دیتا تھا، ہمیں کتاب مل جاتی تھی۔ میں اسی ادھیڑ بن میں پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا کہ گاڑی آ گئی اور ٹھہر گئی، فتح گڑھ کے اسٹیشن پر انجن کی تبدیلی ہوتی تھی۔ یہ عام گاڑیوں سے مختلف فوجی گاڑی تھی۔ زخمی فوجیوں کی گاڑی۔ میں اسے دیکھتا ہوا آگے بڑھا تو کانوں میں بڑی دردناک اللہ، ہائے اللہ کی آواز سنائی دی۔ دل دہل گیا۔ قریب جا کر جھانکا تو ایک عورت سیٹ پر لیٹی ہوئی تھی۔ سارے جسم پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ صرف چہرا کھلا تھا یہ ایک بے ہوش نوجوان عورت کا درد میں ڈوبا چہرا تھا۔ اردگرد اور ماحول سے بے خبر یہ عورت تقریباً بے ہوش تھی، دردناک آواز میں کراہ رہی تھی اور اللہ، ہائے اللہ کہتی

جا رہی تھی۔ میں بڑی دیر تک وہاں کھڑا یہ درد بھری آواز سنتا رہا۔ کسی فوجی نے ٹوکا نہیں۔ انجن بدل گیا، سیٹی ہوئی اور گاڑی چل دی۔ ذرا دیر میں نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ مگر میں اس طرح کھڑا رہا جیسے زمین میں گڑ گیا ہوں۔ پلیٹ فارم نے پیر پکڑ لیے ہوں۔ وہ کرب میں ڈوبا ہوا چہرا، پٹیوں میں لپٹا ہوا جسم دل دوز کراہ، اُس دن میں نے لڑائی میں شریک ہوئے بغیر لڑائی کی ہولنا کی کو پوری طرح محسوس کر لیا۔ مدتوں وہ چہرا، وہ، جسم وہ کراہ، میرے دل و دماغ پر چھائی رہی۔ بعد میں میں نے ڈنکرک سے ہزیمت خوردہ برطانوی سپاہیوں کے الم انگیز انخلا کی داستانیں پڑھیں۔ فرانس کے محاذ پر ہندوستانی فوجیوں کی پسپائی کا حال سنا۔ برما سے بھاگ کر آنے والے بعض لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ بمباری سے لندن کی تباہی کی تصویریں دیکھیں۔ وامق جونپوری کی زبانی ''بھوکا ہے بنگال'' کا نغمہ سنا۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرنے اور ہزاروں انسانوں کی ہلاکت کے دل ہلا دینے والے واقعات سُنے لیکن اس زخمی عورت کا تصوّر میں آج تک اپنے ذہن سے محو نہیں کر سکا۔ لڑائی کا ذکر چھڑتا ہے تو میرے ذہن میں اُس کی کراہ گونجتی ہے۔ کیسی دردناک کراہ تھی۔ لڑائی کے ہولناک اثرات کو نمایاں کرنے والی دل دوز کراہ جس میں پوری انسانی زندگی، انسانی معاشرے اور عالم گیر اضطراب کا سارا کرب پنہاں تھا۔ میں اُس عورت کو نہیں جانتا۔ مطلق نہیں پہچانتا۔ نجانے کون تھی۔ کس محاذ سے آئی تھی۔ بم دھماکے میں زخمی ہوئی تھی، گولہ پھٹنے سے یہ کیفیت ہوئی تھی کچھ، نہیں معلوم۔ بس ایک دردناک کراہ، گہری بے ہوشی میں ڈوبا ہوا چہرا اور پٹیوں میں لپٹا ہوا جسم یاد ہے۔ اور اس کے علاوہ لڑائی ہو بھی کیا سکتی ہے۔ میں اسی سوچ میں غرق تھا کہ میرا چھ برس کا پوتا دانیال مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر میرے پاس آیا اور میرے برابر بیٹھ گیا۔ ان دنوں میرے گھر میں اس نئی لڑائی کا بہت چرچا ہے۔ دانیال یہ چرچا دن رات سنتا رہتا ہے۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگا، ''دادا! لڑائی کب ختم ہوگی۔'' میں نے اس کی طرف بڑے غور سے دیکھا۔ دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ فراق صاحب کی ایک مشہور نظم کے دو مصرعے ذہن میں گونج اٹھے۔ دلّی کے رسالے 'آج کل' میں یہ نظم غالباً لڑائی کے دوران یا اس کے فوراً بعد شائع ہوئی تھی...... ''زمانہ کتنا لڑائی کو رہ گیا ہوگا''...... ''سیاہ روس ہے اب کتنی دور برلن سے۔'' سیاہ روس کب کی برلن میں داخل ہو چکی۔ دیوار برلن کھنچی اور ٹوٹ گئی۔ دیواریں ٹوٹنے ہی کے لیے کھینچی جاتی ہیں۔ فتح شکست اور شکست فتح میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ لڑائی جاری ہے۔ شاید ہمیشہ جاری رہے گی۔ مگر میں چھوٹے دانیال کو کیسے سمجھاؤں...... کیا سمجھاؤں کہ لڑائی زبردست کی دھونس، دھاندلی اور ظلم کی وجہ سے ہوتی ہے۔ زیردست محض اپنا دفاع کرتا ہے اور مار کھاتا ہے۔ اگر عنایت گزٹ زندہ ہوتے تو شاید دانیال کو یہ بات وہ بھی نہ سمجھا پاتے۔

انور احسن صدیقی

چھبّا لال "انجینئر"

گیارہ ستمبر کو امریکا کے شہروں میں پیش آنے والے دہشت گردی کے واقعات کے حوالے سے ایک بہت پرانا، بھولا بسرا، لیکن بہت ہی دل چسپ واقعہ یاد آ گیا جسے میں قارئین کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ میں کچھ باتیں اپنے والد مرحوم محمد احسن کے بارے میں عرض کر دوں جو اس قصّے کے راوی تھے اور جن کی زبان سے میں نے یہ قصہ مختلف لوگوں کے ساتھ متعدد بار سنا۔ والد مرحوم محمد احسن غیر معمولی یادداشت کے حامل تھے اور میں نے اپنی زندگی میں ایسے لوگ شاذ و نادر ہی دیکھے جن کا حافظہ اس قدر تیز ہو۔ مرحوم پیشے کے اعتبار سے تو انجینئر تھے لیکن دنیا کا شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس سے انہیں دلچسپی نہ رہی ہو اور جس کے بارے میں وہ کچھ نہ کچھ معلومات نہ رکھتے ہوں۔ اچار، چٹنیاں اور مرّبے بنانے سے لے کر گھڑی سازی تک اور سائنسی موضوعات پر انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنے سے لے کر سبزیاں اور پھل اگانے تک ہر میدان سے ان کا کچھ نہ کچھ تعلق ضرور تھا۔ علم و ادب کے اور خاص طور سے شاعری کے شیدائی تھے۔ خود بھی شعر کہتے تھے لیکن انہوں نے شاعری کو کبھی "ذریعہ عزت" نہیں بنایا۔ اردو اور فارسی کے بلا مبالغہ ہزاروں اشعار انہیں یاد تھے اور اس کے ساتھ ہزار ہا قصے اور واقعات بھی جنہیں وہ مختلف محفلوں اور مجلسوں میں بڑی دل جمعی اور ذوق و شوق کے ساتھ سنایا کرتے تھے اور ان کے بیان کی خوبی یہ تھی کہ اگر ایک قصے کو دس مختلف اوقات میں دس بار سناتے تھے تو بھی کیا مجال کہ اس کے مقررہ الفاظ کی نشست برخاست اور دروبست میں ذرا سی بھی تبدیلی ہو جائے۔ جو لفظ ایک بار جہاں بھی اور جس طرح بھی استعمال ہوتا تھا وہ ہر بار اسی انداز سے ان کی زبان سے ادا ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کے دماغ میں ایک کتاب لکھی ہوئی موجود ہے جس کے صفحات کو وہ پڑھتے چلے جاتے ہوں۔ اندازِ بیان اس قدر شگفتہ اور دل نشین ہوتا تھا کہ سننے والے مسحور ہو جاتے تھے۔ جس محفل میں وہ موجود ہوتے تھے جانِ محفل بن جاتے تھے۔

میرے خاندان کا تعلق ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ضلع فرخ آباد کے ایک قصبے فتح گڑھ

سے ہے۔ فتح گڑھ فوجی چھاؤنی بھی تھا اور ضلعی ہیڈ کوارٹر بھی۔ کچہری فتح گڑھ میں تھی۔ ٹریژری (خزانہ) کا دفتر فتح گڑھ میں تھا۔ کلکٹر فتح گڑھ میں رہتا تھا۔ سول اسپتال فتح گڑھ میں تھا۔

اس پس منظر کے ساتھ اب وہ قصہ قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا جو میں نے ایک سے زائد بار اپنے والد مرحوم کی زبانی سنا۔ میری کوشش ہوگی کہ میں اس قصے کو انہیں کی زبان، انداز اور لب و لہجے میں نذرِ قارئین کروں۔ اس قصے کا تعلق انگریزی دورِ اقتدار سے ہے۔

ٹریژری کا دفتر فتح گڑھ میں ہوا کرتا تھا اور کلکٹر اس کا نگراں ہوتا تھا۔ ٹریژی کے دفتر کو بند کرنے کے بعد چابیاں کلکٹر کی تحویل میں دے دی جاتی تھیں اور اس کے پاس رہتی تھیں۔ قاعدہ یہ تھا کہ اگر کبھی اتفاق سے چابیاں گر جائیں تو خزانچی کے لیے لازم تھا کہ وہ فوراً کلکٹر کو اس کی اطلاع دے۔ دریں اثنا اگر چابیاں مل بھی جاتیں تو بھی سارے تالے تبدیل کر دیے جاتے تھے۔ چابیاں نہ ملنے کی صورت میں تالے توڑ دیے جاتے تھے۔

ٹریژری کے دفاتر میں مشہور عالم برطانوی کمپنی چب (Chibb) کے تالے استعمال کیے جاتے تھے۔ چب کمپنی کا دعویٰ تھا کہ اس کے بنائے ہوئے تالوں کو کسی نقلی چابی سے نہیں کھولا جاسکتا اور انہیں صرف توڑا ہی جاسکتا ہے۔

ایک بار فتح گڑھ میں ٹریژری کی چابیاں گم ہوگئیں۔ ٹریژری کے دفاتر کو بند کیا جاچکا تھا۔ اس واقعے کی اطلاع فوری طور پر ضلع کلکٹر کو دی گئی۔ جو ضروری عملے کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ اعلا پولیس افسران کو بھی بلوایا گیا۔ چابیاں نہیں ملیں اور تالوں کو توڑنے کا فیصلہ کیا گیا۔

انگریز کلکٹر نے کوتوال سے پوچھا کہ شہر میں کون شخص ایسا ہے جو چب کے تالوں کو توڑ سکے۔ کوتوال نے کہا، ”حضور ایک لوہار ہے چھبا لال...... جو بڑا ہوشیار آدمی ہے۔ وہ تالے توڑ سکتا ہے۔“

کلکٹر نے کوتوال کو حکم دیا کہ چھبا لال کو بلوا لے۔ کوتوال نے فوراً ہی ایک سپاہی کو چھبا لال کی دکان کی طرف روانہ کر دیا۔

چھبا لال کی ایک چھوٹی سی لوہار کی دکان تھی جہاں وہ دن بھر بیٹھے ہوئے دھونکنی چلایا کرتے تھے اور چھوٹے موٹے کام کیا کرتے تھے۔ چھبا لال کے دو شوق تھے، ٹھرّا پینا اور جوا کھیلنا۔ اپنے کام سے فارغ ہوجانے کے بعد وہ اپنے ان مشاغل میں مصروف ہوجایا کرتے تھے اور ان کی پاداش میں اکثر کوتوالی میں بند بھی کیے جاتے تھے جہاں ان کی جوتے کاری بھی ہوتی تھی۔ اس روز

جب چھبا لال نے پولیس کے ایک سپاہی کو اپنی دکان کی طرف آتے دیکھا تو وہ ڈر گئے اور انہیں تعجب بھی ہوا کیوں کہ وہ نہ تو جوا کھیلتے پائے گئے تھے اور نہ انہوں نے شراب پی کر غل غپاڑہ کیا تھا۔ تو پھر پولیس کیوں ان کو پکڑنے آرہی تھی؟ اور جب سپاہی نے ان کو یہ بتایا کہ انہیں کلکٹر نے بلایا ہے تو وہ بالکل ہی حواس باختہ ہوگئے۔ آخر ان سے ایسا کون سنگین جرم سرزد ہوگیا تھا جو انہیں کلکٹر نے طلب کیا تھا؟ تاہم جب سپاہی نے ان کو اصل بات بتائی تو ان کی جان میں جان آئی۔ وہ اپنے ساتھ ضروری اوزار لے کر سپاہی کے ساتھ روانہ ہوگئے۔

چھبا لال ہانپتے کانپتے، لرزتے سپاہی کے ساتھ ٹریژری کے دفتر پہنچے جہاں انہوں نے انگریز کلکٹر اور انگریز ایس پی کے علاوہ کئی ہندوستانی افراد کو بھی موجود پایا۔

''چھبالال، ان تالوں کی چابیاں گم ہوگئی ہیں'' کلکٹر نے ان سے کہا۔ ''کیا تم ان کو توڑ سکتے ہو؟''

''توڑ بھی سکتا ہوں اور اگر آپ حکم دیں تو توڑے بغیر کھول بھی سکتا ہوں۔'' چھبالال نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

انگریز کلکٹر سخت حیران ہوا۔ ایک معمولی، مکمل طور سے اَن پڑھ ہندوستانی لوہار چب جیسی شہرۂ آفاق کمپنی کے تالوں کو توڑے بغیر کھولنے کا دعویٰ کر رہا تھا!

''لیکن جس کمپنی نے یہ تالے بنائے ہیں اس کا دعویٰ ہے کہ ان کو اصلی چابی کے بغیر نہیں کھولا جاسکتا۔'' انگریز کلکٹر نے ان سے کہا۔ ''انہیں صرف توڑا جاسکتا ہے۔''

''مجھے معلوم ہے سرکار......'' چھبالال نے بدستور ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اگر آپ حکم دیں تو میں انہیں توڑے بغیر کھول سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے کھولو......'' کلکٹر نے انہیں حکم دیا۔

چھبالال نے فوراً ہی اپنا کام شروع کر دیا اور کلکٹر، ایس پی اور دوسرے افسران کی موجودگی میں چب کے تالوں کو توڑے بغیر کھول دیا۔ کلکٹر حیران و ششدرہ گیا اور اس نے چھبالال کو اچھا خاصہ انعام دیا۔

اس کے بعد انگریز کلکٹر نے چب کمپنی کو لندن ایک خط بھیجا جس میں یہ لکھا کہ چب کمپنی کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ اس کے بنائے ہوئے تالوں کو توڑے بغیر کھولا نہیں جاسکتا۔ ''یہاں ہندوستان کے ایک شہر فتح گڑھ میں چھبالال نامی ایک شخص موجود ہے جس نے میری اور دوسرے بہت سے

لوگوں کی موجودگی میں چپ کے تالوں کو توڑے بغیر کھول دیا۔ چناں چہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم آئندہ اپنے ٹریژری کے دفاتر میں چپ کے تالے استعمال نہیں کریں گے۔''

بات آئی گئی ہوگئی۔ ٹریژری کے تالے تبدیل کر دیے گئے۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد کلکٹر کو چپ کمپنی کی طرف سے ایک خط موصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ ''ہم اپنی کمپنی کے چیف انجینئر کو فتح گڑھ بھیج رہے ہیں۔ وہ وہاں آ کر ہندوستانی انجینئر چھبا لال سے ملاقات کرے گا اور ان سے دریافت کرے گا کہ آخر ہمارے تالوں میں ایسی کون سی خامی تھی جس کی بناء پر انجینئر چھبالال نے ان کو توڑے بغیر کھول لیا۔'' چھبا لال کو اس بارے میں کسی نے کچھ نہیں بتایا۔

کچھ دنوں کے بعد چپ کمپنی کا چیف انجینئر ہندوستان کے ایک دور افتادہ، چھوٹے سے قصبے فتح گڑھ میں وارد ہوا اور ضلع کلکٹر کا مہمان ہوا۔ کلکٹر نے اس کو ایک بار پھر اس واقعے کی تفصیلات بتائیں۔ چیف انجینئر نے یہ کہا کہ وہ ''انجینئر'' چھبالال سے فوراً ملاقات کرنا چاہتا ہے۔

''میں اسے ابھی بلوائے دیتا ہوں۔'' کلکٹر نے کہا۔ لیکن چیف انجینئر نے اس کو ایسا کرنے سے منع کر دیا۔

''میں خود اس کے پاس جاؤں گا۔'' چیف انجینئر نے کہا ''غرض مند تو میں ہوں۔ مجھے اس سے کچھ پوچھنا ہے۔

انگریز کلکٹر چپ کے چیف انجینئر کو اپنے ساتھ دو گھوڑوں والی بگھی میں بٹھا کر چھبا لال ''انجینئر'' کی ''ورکشاپ'' کی طرف روانہ ہوا۔ چھبا لال نے جب دور سے دیکھا کہ لال منہ کے دو بندر بگھی میں بیٹھے ہوئے ان کی دکان پر آئے ہیں تو ان کے اوسان خطا ہوگئے۔ رام جانے، ان سے اب کون سی غلطی ہوگئی تھی۔

وہاں پہنچ کر چپ کا چیف انجینئر حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ لوہار کی اس چھوٹی سی دکان میں اسے کہیں کوئی ''انجینئر'' نہیں نظر آ رہا تھا۔

''یہ ہیں انجینئر چھبالال'' کلکٹر نے اس کالے کلوٹے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جو سارے بدن سے ننگا، صرف ایک لنگوٹا باندھے ہوئے دھونکنی چلا رہا تھا، انگریزوں کو وہاں دیکھ کر سخت خوف زدہ اور سہما ہوا نظر آ رہا تھا۔ چپ کا چیف انجینئر وہیں زمین پر چھبا لال کے پاس بیٹھ گیا۔ مجبوراً کلکٹر کو بھی وہیں بیٹھنا پڑا۔

''دیکھو چھبا لال'' کلکٹر نے ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ ''جس کمپنی کے تالے تم نے توڑے

بغیر کھولے تھے، یہ اس کمپنی کے سب سے بڑے انجینئر صاحب ہیں اور ولایت سے خاص طور پر تم سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آخر ان کے تالوں میں ایسی کون سی کمی تھی جس کی وجہ سے تم نے انہیں توڑے بغیر کھول دیا۔''

چھبا لال ایک دم خوش ہوگئے اور انہوں نے خوشی خوشی چیف انجینئر کو تفصیل کے ساتھ بتایا کہ ان تالوں میں کیا خامی تھی۔ کلکٹر نے ترجمانی کے فرائض انجام دیے۔ چیف انجینئر پوری طرح ان کی بات سمجھ گیا اور مطمئن ہوگیا۔

کلکٹر نے چیف انجینئر کو چھبالال کے پسندیدہ مشاغل کے بارے میں بھی پہلے ہی سے بتا دیا تھا۔ چیف انجینئر نے چھبا لال کو پیشکش کی کہ وہ ان کے ساتھ لندن چلیں، جہاں انہیں چب کے کارخانے میں نوکری دی جائے گی۔ ''وہاں تمہیں بہترین شراب پینے کو ملے گی اور کوئی پولیس والا تم کو نہیں پکڑے گا۔'' چیف انجینئر نے ان کو یقین دلایا۔

چھبا لال دم نقد تھے، نہ جورو نہ جاتا، اللہ میاں سے ناتہ، فوراً ہی تیار ہوگئے اور چب کا چیف انجینئر انہیں اپنے ساتھ لندن لے گیا۔

میرے والد مرحوم کا متعدد بار کا بیان کردہ چھبالال ''انجینئر'' کا یہ قصہ یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ چھبالال تو ایک اَن پڑھ، معصوم اور بے ضرر لیکن بہت ہوشیار لوہار تھا جس نے اپنے دور کے شہرۂ آفاق سیکورٹی سسٹم چب کو آن کی آن میں ناکام بنا کر رکھ دیا تھا۔ لیکن ہمارے عہد کے ''چھبالال'' نہ تو اَن پڑھ ہیں نہ معصوم ہیں، نہ بے ضرر ہیں۔ ان کے اندر مضبوط سے مضبوط سیکورٹی سسٹم کو ناکارہ بنانے کی اور اس کے نتیجے میں ہزاروں، بلکہ لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کو ہلاک کر دینے کی تخریبی صلاحیت موجود ہے۔ ساری اقوام عالم کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی سلامتی کو یقینی بنانے کی غرض سے اس تخریبی ''چھبالال'' کی بیخ کنی کریں۔

پاش جدید پنجابی ادب کا اہم نام ہے۔ وہ نکسلائٹ تحریک سے ہم دردی رکھتے تھے اور سماجی بے اطمینانی، غم وغصہ اور بندوق اٹھالینے کی آرزو نے ان کی شاعری کو اس کا مخصوص لہجہ عطا کیا، جس نے ان کو جدید ہندوستان کے منفرد شاعروں میں سے ایک بنا دیا۔ مگر وہ خود دہشت گردی کا شکار ہوگئے جب خالصتان تحریک کے حامیوں نے ۱۹۸۸ء میں انہیں ان کے گاؤں میں ہلاک کر ڈالا۔ فارسی رسم الخط (شاہ مکھی) میں پاش کی نظموں کا ایک مجموعہ لاہور سے بھی شائع ہوا۔ اس نظم کے مترجم انعام ندیم شاعر ہیں۔ انہوں نے سرحد کے دونوں طرف کے جدید پنجابی ادب سے تراجم کیے ہیں جو ''دنیا زاد'' میں شائع ہوں گے۔

پاش

پنجابی سے ترجمہ: انعام ندیم

تیسری جنگِ عظیم

عدالتوں کے باہر کھڑے
بوڑھے کسان کی آنکھوں میں موتیا اتر آئے گا
شام تک ہوجائے گی سفید
دفترِ روزگار کے صحن میں کانپتی ہوئی سنہری لَو
بہت جلد بھول جائے گا پرانے ڈھابے کا نیا نوکر
اپنی ماں کے ہمیشہ ہی میلے چیکٹ رہنے والے
کندورے کی میٹھی مہک
ڈھونڈتا رہے گا سڑک کے کنارے وہ اداس جوتشی
اپنے ہی ہاتھ سے مٹی ہوئی قسمت کی لکیر
اور پنشن لینے آئے ہوئے، کار کے نیچے کچلے گئے

پرانے فوجی کی ٹوٹی ہوئی سائیکل
تیسری جنگِ عظیم لڑنے کا سوچے گی

تیسری جنگِ عظیم
جو نہیں لڑی جائے گی اب
جرمنی اور کرائے کے فوجیوں کے مابین
تیسری جنگِ عظیم سینوں میں گھُلتی
جینے کی بادشاہت لڑے گی
تیسری جنگِ عظیم گوبر سے لپی
کوٹھڑیوں کی سادگی لڑے گی
تیسری جنگِ عظیم
قمیص سے دُھل نہ سکنے والے
گندی چربی کے چھینٹے لڑیں گے

تیسری جنگِ عظیم
موت کے پھندے میں لپٹی، کٹی ہوئی انگلی لڑے گی
بنے سنورے ظلم کے چہرے پر چمکتی
نزاکت کے خلاف
دھرتی کو قید کرنا چاہتے چابی کے چھلّے کے خلاف
تیسری جنگِ عظیم
کبھی بھی نہ کھُل سکنے والی مُٹھی کے
خلاف لڑی جائے گی
تیسری جنگِ عظیم نرم شاموں کے بدن پر
رینگنے والے موٹے تازے
کیڑے کے خلاف لڑی جائے گی

تیسری جنگِ عظیم
اس سہم کے خلاف لڑی جائے گی
جس کا عکس دودھ کے دانت نکالتی ہوئی
میری بیٹی کی آنکھوں میں ہے
تیسری جنگِ عظیم
کسی خستہ سی جیب میں تڑے مڑے
چھوٹے سے سنسار کے لیے لڑی جائے گی۔

سعید الدین نظم کہتے ہیں اور کبھی کبھار غزل بھی۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "رات" شائع ہوچکا ہے۔ یہ نظم انہوں نے گیارہ ستمبر کے واقعات سے بہت پہلے لکھی تھی۔ دہشت گردی کے حالیہ واقعات کے پس منظر میں دیکھیے تو اس کے طنز کی دھار اور تیز ہوگئی ہے۔

سعید الدین

امریکا کو کیسا ہونا چاہیے

سب سے پہلے ہمیں
امریکا کے نقشے کو تبدیل کرنا چاہیے۔
اس کے کناروں کو اس طرح کاٹا جائے
کہ امریکا ایک دل کی شکل کا ملک بن جائے،
اور پھر ان کٹے ہوئے ٹکڑوں کو
ضائع کرنے کے بجائے
انہیں امریکا کے قلب میں جگہ دی جائے۔
امریکا کے دریاؤں کو
ایک موسم میں شمال سے جنوب
اور دوسرے موسم میں
جنوب سے شمال کی جانب چلنا ہوگا۔
ہمیں امریکا کے لیے ایک ترانہ لکھنا ہوگا
جس کی ترتیب میں
کرۂ ارض کا ہر شہری حصہ لے سکے۔
ہمیں امریکا کے ورلڈ آرڈر سے خائف نہیں ہونا چاہیے۔
ہمیں امریکیوں سے محبت کرنی چاہیے

اور امریکا کے ورلڈ آرڈر کو
رڈی کی ٹوکری میں ڈال دینا چاہیے۔
امریکی شہرت حاصل کرنے کے لیے
ایک آوارہ دل رکھنے کی پابندی ہونی چاہیے
لیکن سال میں دو ایک ماہ کے لیے
اس پابندی کو بھی ختم کر دینا چاہیے۔
امریکا کے خلاف کی جانے والی سازشوں میں بھرپور حصّہ لینا چاہیے
اس سے آپ کی امریکی شہریت مضبوط ہوگی۔
اگر امریکا آپ کو
اپنے دل کی شکل کا محسوس نہ ہو
تو اس کے ٹکڑے کر دینے چاہییں
دل کی شکل کے
لاتعداد ٹکڑے۔

بشکریہ: زیڈ میگزین

شہرزاد
SCHEHERZADE

انور احسن صدیقی

امریکا دہشت گردی کی زد میں

گیارہ ستمبر کو نیویارک اور واشنگٹن میں ہونے والی دہشت گردی کی زبردست اور تباہ کن، خودکش کارروائیوں سے امریکا اور ساری دنیا پر لرزہ طاری ہوگیا ہے اور امریکا سمیت ساری دنیا میں مکمل عدم تحفظ کا احساس عام ہوگیا ہے۔ اپنی اندرونی سیکورٹی پر اربوں کھربوں ڈالر صرف کرنے والے امریکا کو اس کا ''سامان سو برس کا'' ایک پل کی بھی خبر نہیں دے سکا اور کام کرنے والے دہشت گرد پلک جھپکتے میں اپنا کام کر گئے۔ کئی ہزار افراد ہلاک ہوگئے۔ اداروں کو کھربوں ڈالر کی مالیت کا نقصان ہوگیا اور واحد عالمی سپر پاور کی حیثیت سے امریکا کے ناقابلِ شکست ہونے کا بھرم ٹوٹ گیا۔

جہاں تک انسانی جانوں کے اتلاف کا تعلق ہے، تو اس کا تو کوئی ازالہ ہی نہیں ہوسکتا۔ مرنے والے اپنی جان سے گزر گئے اور اپنے پیچھے سوگواروں اور غم گزاروں کے لشکر چھوڑ گئے۔ اب وہ دنیا میں کبھی دوبارہ واپس نہیں آسکتے اور جہاں تک مالی نقصان کا تعلق ہے، تو یہ محض ایک عارضی جھٹکا ہے۔ مالی طور پر امریکا نے جو کچھ گنوایا ہے وہ بہت جلد اسے مع سود کے واپس حاصل کرلے گا اور یہ سارا نقصان تیل کی دولت سے مالا مال عرب ممالک اور تیسری دنیا کے غریب اور پس ماندہ ممالک سے وصول کرے گا۔ افریقا، ایشیا اور لاطینی امریکا کے وسائل سے بھرپور لیکن نیم فاقہ کش اور سامراجی معاشی محکومی اور جبر کے تلے دبے ہوئے ممالک، نوآبادیاتی گلوبلائزیشن کی خون آشام پالیسی کے تحت اس تمام معاشی اور مالی نقصان کو پورا کرنے کے لیے مجبور اور بے بس ہوں گے جو امریکی کو دہشت گردی کی حالیہ کارروائیوں کے دوران پہنچا ہے۔ ملٹی نیشنل مالیاتی اور کاروباری ادارے جن کے چنگل میں آج ساری دنیا جکڑی ہوئی ہے۔ اپنے ہونے والے اس نقصان کی ایک ایک پائی تیسری دنیا کے ممالک سے ہی وصولیں گے اور تیسری دنیا کے عوام میں اس نئے معاشی اور مالیاتی دباؤ کا سب سے آسان اور طے شدہ شکار ہے۔

امریکی حکمراں اپنا مالی نقصان تو ضرور پورا کرلیں گے، لیکن اس نقصان کا کیا ہوگا جو دنیا بھر

میں طاقت ور ترین ملک کی حیثیت سے امریکا کی ساکھ کو پہنچا؟ یہی وہ اصل سوال ہے جس پر امریکا کے اربابِ حل وعقد کو سنجیدگی اور تدبیر کے ساتھ، معروضی طور پر اور غیر جذباتی انداز میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ عصرِ حاضر کی تاریخ میں کوئی بھی دوسرا موقع ایسا نہیں تھا جب امریکا کو اس سوال پر غور کرنے کی اتنی زیادہ ضرورت ہو۔

سوویت یونین اور عالمی سوشلسٹ نظام کے زوال کے بعد امریکا بلاشرکت غیرے، دنیا کی واحد سپر پاور بنا ہوا تھا، سوویت یونین کے حصے بخرے ہوجانے سے اور مشرقی یورپ کی سوشلسٹ جمہوریاؤں کے ختم ہوجانے کے بعد امریکا کو عالمی سیاست اور دہشت میں کھلا میدان ملا ہوا تھا اور اسے کسی بھی سمت میں کوئی بھی قدم اٹھانے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس مطلق العنان اور بے لگام طاقت کا مالک بن جانے کے بعد امریکی پالیسی ساز دنیا کے مختلف خطوں میں اپنی پالیسیوں میں توازن اور احتیاط کا مظاہرہ کرتے، جو خود ان کو اپنی بقا اور استحکام کے لیے بھی یکساں طور پر ضروری تھا، لیکن انہوں نے طاقت کے نشے میں سب کچھ بھلا دیا اور ان معروضی حقائق کو سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کی جو امریکا کو دنیا کے ایک بہت بڑے حصے میں سیاسی علیحدگی کی طرف لے جارہے تھے اور اس کے لیے ناپسندیدگی اور استرداد کے جذبات کو ہوا دے رہے تھے۔

عالمی سامراجی طاقت کی حیثیت سے امریکا کے سیاسی اور معاشی اثر ونفوذ میں اصل اضافے کا آغاز دوسری عالمی جنگ کے بعد سے ہوا۔ یہ امریکا ہی تھا جس نے تاریخ انسانی کی سب سے بڑی دہشت گردی کا ارتکاب کیا اور اس وقت جبکہ نازی اور ان کے ایشیائی اتحادی جنگ ہار رہے تھے اور ان کی فتح کے سارے راستے مسدود ہو چکے تھے، ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹم بم مار کر لاکھوں بے گناہ جاپانی شہریوں کو جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ساری دنیا اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ جاپان کی سرزمین پر امریکی حکام کی یہ کارروائی صرف ظالمانہ ہی نہیں، بلکہ قطعاً غیر ضروری بھی تھی، کیوں کہ نازی اور ان کے اتحادی میدان چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔

دوسری عالمی جنگ کے خاتمے کے بعد یورپی سامراجی قوتیں کم زور پڑنے لگیں اور ان کے افریشیائی مقبوضات ایک ایک کر کے ان کے قبضے سے نکلنے شروع ہوگئے۔ نوآبادیاتی اور سامراجی غلامی کے شکار محکوم ومظلوم افریشیائی ممالک کی ابھرتی ہوئی اور طاقت پکڑتی ہوئی قومی آزادی کی تحریکات کی مادّی، سیاسی اور اخلاقی حمایت کے لیے اس وقت ایک مضبوط قوت موجود تھی اور یہ تھی

سوویت یونین اور عالمی سوشلسٹ نظام کی قوت جس کی امداد سے حوصلہ پاکر ساری محکوم افریشائی دنیا میں سامراجی اور نوآبادیاتی غلامی کے خلاف بیداری کی زبردست لہر دوڑ رہی تھی اور یہ ممالک یکے بعد دیگرے مغربی علاقے کے بندھنوں سے آزاد ہوتے جارہے تھے۔

اور تب امریکا نے دنیا کے سب سے بڑے اور مضبوط ترین سامراجی ملک کی حیثیت سے ساری محکوم اور مصروف جدوجہد دنیا میں قومی آزادی، روشن خیالی اور جمہوریت کی قوتوں کا قلع قمع کرنے کی غرض سے بے لگام دہشت گردی کا بازار گرم کرنا شروع کردیا اور مغربی سامراجی اور نوآبادیاتی قوتوں کے سربراہ کی حیثیت سے بے دریغ وہ تمام اقدامات کیے جنھیں سامراجی مفادات کے تحفظ کے لیے ضروری خیال کیا اور اس مقصد کے لیے تشدد، دہشت گردی، سازش، قتل و غارت گری کے تمام ناجائز اور ممنوعہ حربے استعمال کیے۔ تیسری دنیا کے ممالک میں قومی اور معاشی آزادی کا راستہ روکنے کی غرض سے اور انہیں سامراجی غلامی میں جکڑے رکھنے کی خاطر جگہ جگہ سینکڑوں، ہزاروں اور لاکھوں بے گناہ انسانوں کو تہ تیغ کردیا گیا اور پوری کی پوری قوموں اور ملکوں کو یرغمال بنایا گیا۔

سی آئی اے وہ امریکی ادارہ ہے جو ملک کے اندر بہت کم اور ملک کے باہر بہت زیادہ کام کرتا ہے اور اس ادارے کا بنیادی کام یہ رہا ہے کہ سامراجی مفادات کے تحفظ اور حصول کی غرض سے دنیا بھر میں بالعموم اور تیسری دنیا کے ممالک میں بالخصوص، ہر طرح کی سازشوں کے جال بچھائے جائیں، اگر ضروری ہو تو ناپسندیدہ حکمرانوں اور سیاسی لیڈروں کو قتل کیا جائے، ان کے خلاف مقامی تنخواہ دار ایجنسیوں کے ذریعے تحریکات چلائی جائیں انہیں کسی نہ کسی طور پر اقتدار سے محروم کیا جائے اور ان کی جگہ اپنے پسندیدہ اور تنخواہ دار حکمرانوں کو بدنصیب قوموں کے سروں پر مسلّط کردیا جائے۔ سوویت یونین اور عالمی سوشلسٹ نظام کے زوال کے وقت تک کی امریکی سی آئی اے کی تاریخ ایسے خوفناک اور روح فرسا واقعات سے بھری پڑی ہے۔ امریکا نے دنیا کے ہر ملک کی قومی آزادی کی تحریک کی بھرپور مخالفت کی اور اسے ناکام بنانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ امریکی پالیسی سازوں کا سیاہ نامۂ اعمال ایسے ہی واقعات سے بھرا پڑا ہے۔ سی آئی اے نے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکا کے ممالک کو ہمیشہ اپنی شکارگاہ سمجھا۔ تیسری دنیا کا کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں ہے جس کے بے گناہ عوام کے خون کے چھینٹے امریکی حکمرانوں کے دامن پر موجود نہ ہوں۔

قوم پرست ایرانی وزیراعظم ڈاکٹر مصدق کی حکومت کا تختہ الٹنے اور ہزارہا ایرانی عوام کے قتل عام کو سازش میں ملوث ڈاکٹر ڈونالڈو نے امریکی اخبار نیویارک ٹائمز میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ میں خود اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ امریکی سی آئی اے اور برطانوی انٹیلی جنس نے ۱۹۵۳ء میں ایران میں فوجی انقلاب کی سازش کی تھی جس کا اصل مقصد ایران کے تیل اور اس کی دولت پر قبضہ کرنا تھا اور امریکا اور برطانیہ ایرانی قوم پرستوں کو اپنی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے جب کہ رضا شاہ پہلوی امریکی اور مغربی طاقتوں کے وفادار تھے۔

۱۹۵۶ء میں جب اسرائیل کو آگے بڑھا کر برطانیہ اور فرانس نے مصر کی قوم پرست حکومت کا خاتمہ کرنے اور نہر سوئز پر اپنے غاصبانہ قبضے کو برقرار رکھنے کی غرض سے مصر پر حملہ کیا، تو امریکا اس کارروائی میں حملہ آوروں کے ساتھ تھا۔

کوریا اور ویت نام میں امریکا برسہابرس تک مقامی باشندوں کے خون کی ہولی کھیلتا رہا اور ان دونوں چھوٹے اور کم زور ممالک کی جدوجہد آزادی کے بدترین دشمن کا کردار ادا کرتا رہا۔

۱۹۶۰ء کے عشرے کے اواخر میں امریکی سی آئی اے کی سازش سے انڈونیشیا میں ہزارہا سوشلسٹوں اور جمہوریت پسندوں کو قتل کر دیا گیا۔ انڈونیشیا کی زمین بے گناہوں کے خون سے سرخ ہوگئی۔ ہند چینی کے دوردراز علاقے سے لے کر لاطینی امریکی ممالک تک پھیلے ہوئے ان واقعات کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ اس کے ذکر کے لیے ایک پورا علیحدہ دفتر درکار ہوگا۔ امریکی پالیسی سازوں نے سب سے زیادہ خطرناک اور احمقانہ کھیل مشرق وسطیٰ میں کھیلا، جہاں انہوں نے اپنے مفادات کی برآری کی غرض سے اسرائیل کو بے جا طور پر نوازنے اور اس کی پشت پناہی کرنے کی انتہا کر دی جس کے نتیجے میں پوری دنیائے عرب میں امریکی ساکھ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا اور بہت ساری عرب حکومتوں کی حمایت حاصل کرنے کے باوجود امریکا عرب عوام کی اکثریت کے دلوں میں اپنے لیے کبھی بھی کوئی نرم گوشہ پیدا نہیں کر سکا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ سوویت یونین کے خاتمے کے بعد امریکی پالیسی ساز کم از کم مشرق وسطیٰ میں اپنی پالیسی پر ضرور نظرثانی کرتے اور اسرائیل اور عربوں کی جانب اپنے رویے میں کچھ توازن پیدا کرتے، کیوں کہ سامراجی مفادات کو حق خطرات میں تو اب بہت کمی واقع ہوئی تھی۔ لیکن طاقت کے نشے میں چور امریکا نے اس کڑی تاریخی حقیقت کو فراموش کر دیا کہ کوئی بہت چھوٹی سی طاقت بھی کسی بہت بڑی طاقت سے ٹکرانے کا حوصلہ پیدا کر سکتی ہے۔ سوویت یونین اور عالمی سوشلسٹ نظام کے خاتمے کے بعد فلسطینی قیادت

کے رویے میں معروضی تقاضوں کے مطابق، اس قدر زیادہ لچک پیدا ہوئی کہ فلسطینی قیادت نے بہت زیادہ دب کر اسرائیل کو غیر معمولی رعایتیں دیں۔ امریکا نے اس صورت حال کا بہت غلط فائدہ اٹھایا اور اسرائیل کو فلسطینیوں پر ایک مرکھنے بیل کی طرح بے لگام چھوڑ دیا۔ اسرائیل نے مار مار کر فلسطینیوں کا جینا عذاب کر دیا اس ردِعمل کے طور پر عرب عوام میں بالخصوص اور مسلمان عوام میں بالعموم، امریکا کے خلاف جذبات شدت اختیار کرتے گئے۔

جس چیز کو امریکی انتظامیہ آج مذہبی دہشت گردی کا نام دے رہی ہے، وہ بھی خالصتاً امریکا کی ہی پیداوار ہے۔ امریکی سی آئی اے تیسری دنیا کے مالک میں ہمیشہ مذہبی انتہاپسندی کو فروغ دیتی رہی اور انتہاپسند مذہبی گروپوں کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت قوم پرست، جمہوریت پسند اور روشن خیال قوتوں کے خلاف استعمال کرتی رہی اور بے دریغ خون کی ندیاں بہاتی رہی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جنگِ افغانستان سے پہلے کسی بھی مسلم ملک کی جانب سے جہاد کا نعرہ بلند نہیں ہوتا تھا۔ فلسطینیوں نے اسرائیل کے خلاف اپنی جدوجہد کو ہمیشہ قومی آزادی کو جدوجہد قرار دیا اور انہیں اس جدوجہد میں بلاتخصیص مذہب، دنیا بھر کی آزادی دوست اور جمہوریت پسند قوتوں کی حمایت حاصل تھی۔ امریکا نے افغانستان کی سرزمین پر سوویت یونین کے ساتھ ہونے والی اپنے مفادات کی جنگ کو مذہبی رنگ دیا، جب کہ متحارب افغان عوام کے دونوں ہی فریق مسلمان تھے۔ سعودی منحرف اسامہ بن لادن، جنہیں اب کوئی بھی عرب ملک قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، امریکا ہی کی دریافت ہیں سوویت یونین اور عالمی سوشلسٹ نظام کے خاتمے کے ساتھ ہی امریکی پالیسی سازوں کی یہ ضرورت بڑی حد تک ختم ہوگئی کہ انتہاپسند گروہوں کو اپنے سامراجی مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ تاریخی عوامل نے کچھ ایسی کروٹیں لیں (جن کے تجزیے کے لیے ایک علیحدہ باب کی ضرورت ہے) کہ مذہبی انتہاپسندی اور دہشت گردی کا رُخ خود امریکا کی طرف ہوگیا اور اب وہ امریکا کے حلق کی ہڈی بن گئی ہے۔

صرف حفاظتی اقدامات سے امریکا کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ وقت ہے کہ امریکی پالیسی ساز دنیا کے ہر خطے کی جانب اپنے روّیے پر اور اپنی عمومی خارجہ پالیسی پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور ان اسباب و عوامل کو دور کرنے کی کوشش کریں جو دنیا کے ایک بڑے حصے میں ان کے لیے ناپسندیدگی اور استرداد کے جذبات کو ابھارتے ہیں۔

انور احسن صدیقی

عالمی دہشت گردی: چند اہم نتائج

گیارہ ستمبر، منگل کی صبح، امریکا میں ہونے والی انسانی تاریخ میں دہشت گردی کی سب سے بڑی وارداتوں کے بعد ساری دنیا لرزہ براندام ہے۔ روز بلکہ ہر لمحے صورت حال کے متعدد نئے اور مخفی پہلو منظر عام پر آ رہے ہیں اور جس وقت یہ سطور شائع ہوکر قارئین تک پہنچیں گی، اس وقت حالات میں شاید بہت کچھ تبدیلی رونما ہوچکی ہو۔ اس وقت تک کی صورت حال یہ ہے کہ متعدد امریکی خفیہ اور غیر خفیہ ایجنسیوں کے ہزارہا کارندے امریکا کے طول وعرض میں ان لوگوں کی تلاش میں مصروف ہیں جو اس واردات کے ذمہ دار ہیں، جس میں ہزارہا بے گناہ افراد جن میں مرد، عورتیں اور بچے سب ہی شامل تھے، آن واحد میں لقمۂ اجل بن گئے، جو سب کے سب امریکی عیسائی اور یہودی نہیں تھے بلکہ ان میں دنیا کے بہت سارے مختلف مذاہب کے ماننے والے اور مختلف ملکوں، قوموں اور نسلوں سے تعلق رکھنے والے افراد بھی شامل تھے جو نامعلوم دہشت گردوں کی اس کارروائی کا شکار ہوکر آگ اور خون کے سمندر میں ڈوب گئے۔ مرنے والوں میں خاصی تعداد میں مسلمان بھی شامل تھے جن کا تعلق امریکا سے اور دوسرے بہت سارے ممالک سے تھا۔

ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی ان عمارتوں میں تقریباً ایک لاکھ افراد کام کرتے تھے، جن میں بھارتی باشندوں کی تعداد ۱۵ فیصدی تک تھی۔ ان عمارتوں میں سیکڑوں امریکی اور غیر امریکی تجارتی کمپنیوں کے دفاتر تھے جن سے لاکھوں انسانوں کا روزگار وابستہ تھا۔ ان لوگوں کا بھی جو امریکا کی سرزمین پر موجود تھے، ان لوگوں کا بھی جو امریکا سے ہزاروں میل کے فاصلے پر، سمندر پار کے ملکوں میں تھے۔ ان میں عرب بھی تھے، ایرانی بھی، پاکستانی بھی، بھارتی بھی، جاپانی بھی اور دنیا کے بہت سے دوسرے ممالک سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی تھے۔

یہ وہ لوگ تھے جو نہ تو امریکی حکومت کے چھوٹے یا بڑے عہدے دار تھے، نہ ان کا امریکی حکومت کی پالیسیوں سے کوئی تعلق تھا، نہ ان کا امریکا کے نظم حکمرانی کو چلانے میں اور داخلی و خارجہ حکمت عملی کی تشکیل میں کوئی حصہ تھا۔ یہ تو سیدھے سادے، کام کرنے والے، محنت کرنے والے،

کاروبار کرنے والے، ملازمتیں کرنے والے عام لوگ تھے جو ملکی اور غیر ملکی سیاست کے داؤ پیچ سے بہت دور اپنی اپنی معاشی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔

تازہ ترین، محتاط اندازوں کے مطابق اس المیے میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد تقریباً ہزار وں میں ہے، مگر ابھی اس بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کم و بیش ایک لاکھ آدمی تو ان عمارتوں میں کام کرتے تھے، علاوہ ازیں یہاں روزانہ بہت بڑی تعداد میں لوگ مختلف دفتروں میں کاروباری سلسلے میں آیا کرتے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق روزانہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ افراد ان عمارتوں میں آتے جاتے تھے اس لیے یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ اس کارروائی کے وقت ان عمارتوں میں کتنے بدنصیب انسان موجود تھے۔ مرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہو سکتی ہے۔ تاہم امریکا نے اب تک صرف ۵ ہزار افراد کے لاپتہ ہونے کا اعلان کیا ہے۔

عصرِ حاضر میں دہشت گردی کی اس سب سے بڑی کارروائی میں جو نقصان ہونا تھا، وہ ہو چکا اور اب اس کی تلافی تو نہیں کی جا سکتی۔ مجرموں کی تلاش و جستجو کا کام جاری ہے جن کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ وہ ابھی امریکا میں ہی موجود ہیں۔ وہ جنہوں نے اس کارروائی کو کامیاب بنانے کے لیے اپنے آپ کو خود بھی ہلاک کر لیا، وہ تو اپنے اس عمل کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے لیکن اس ہولناک منصوبے میں ان کے دوسرے شریک، ابھی کہیں کسی گوشے میں دنیا والوں کی نظروں سے چھپے ہوئے، محفوظ و مامون بیٹھے ہوئے ہیں اور شاید ابھی ہی کسی اگلی کارروائی کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ اتنی بڑی کامیابی سے دہشت گردوں کے حوصلے بلند بھی ہو سکتے ہیں۔

اس ساری صورت حال کے اسباب و علل اور عواقب و نتائج کا ساری دنیا میں بڑی شدومد کے ساتھ جائزہ لیا جا رہا ہے۔ ہر ملک کے ماہرین اپنے اپنے انداز میں ان پر خیال آرائی کرتے ہوئے اپنے اپنے انداز کے تجزیے پیش کر رہے ہیں اور یہ عمل طویل عرصے تک جاری رہے گا۔ صورت حال ابھی پوری طرح واضح نہیں ہے اور کسی بھی باقاعدہ عملی کارروائی کا آغاز اسی وقت ممکن ہوگا جب امریکی انتظامیہ اصل مجرم کا تعین کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اس وقت جو صورت حال پیدا ہوگی اس کے بہت سارے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں۔

تاہم بعض بے حد اہم اور بنیادی نکات اس تاریخی المیے کے نتیجے میں واضح ہو کر ساری دنیا کے سامنے آ چکے ہیں۔ عقل و دانش کا تقاضا یہ ہے کہ ان سے سبق سیکھا جائے اور ان کو نظر انداز نہ

کیا جائے۔ سب سے پہلا اور بنیادی سوال دہشت گردی کے اسباب و محرکات کا، اس کے منبع اور مخرج کا ہے۔ یہ ایک وسیع سوال ہے اور اس کے جواب کے لیے بہت ساری تاریخی تفصیلات میں جانا ہوگا۔ ہم اس سوال کو اگلے کسی وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

دوسرا اہم نکتہ جو واضح ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی ملک کو خواہ وہ کتنا ہی طاقت ور کیوں نہ ہو، خواہ اس کے پاس ایٹمی، ہائیڈروجن اور روایتی ہتھیاروں کے پہاڑ کے پہاڑ کیوں نہ موجود ہوں، خواہ وہ سُپر، سُپر، سُپر پاور ہی کیوں نہ ہو اور خواہ دنیا بھر میں اس کا کوئی بھی مدِ مقابل موجود نہ ہو پھر بھی اسے اپنے آپ کو ناقابلِ تسخیر، ناقابلِ شکست اور لازوال ہونے کے خبط سے آزاد کرالینا چاہیے۔ کوئی چھوٹی سے چھوٹی قوت بھی جب بے لگام اور بے قابو ہو جاتی ہے تو وہ بڑی سے بڑی قوت کو بھی اپنا نشانہ بنانے کی اہلیت پیدا کر لیتی ہے اور اس کا عملی مظاہرہ بھی کرتی ہے۔

تیسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ سیکورٹی کا کوئی بھی نظام ایسا نہیں ہے جسے ناکام نہ بنایا جا سکے۔ جدید ترین ٹیکنالوجی نے جہاں انسان کو عظیم ترین تحفظ فراہم کیا ہے وہیں اس عظیم ترین تحفظ کا توڑ بھی فراہم کیا ہے کیوں کہ ٹیکنالوجی تو انسانی ذہن کی پیداوار اور دریافت ہے اور انسان کو اپنی تخلیق، اپنی پیداوار اور اپنی دریافت پر مکمل عبور اور غلبہ حاصل ہے۔ وہ اسے جس طرح سے چاہے استعمال کر سکتا ہے، جس طرح دنیا میں آج تک ایسی کوئی تجوری نہیں بن سکی جسے چور اور ڈاکو کھول یا توڑ نہ سکیں، کیوں کہ اگر تجوریاں بنانے والا انسانی دماغ ہوتا ہے تو وہی انسانی دماغ تجوریاں کھولنے اور توڑنے کی تکنیک بھی تلاش کر لیتا ہے، اسی طرح آج تک سیکورٹی کا کوئی ایسا نظام نہیں بن سکا جو صد فی صد کامیاب ہو، کیوں کہ سیکورٹی کا نظام بنانے والا بھی انسان ہوتا ہے اور اس میں نقب لگا کر اس کو توڑ دینے والا بھی انسان ہی ہوتا ہے۔ امریکی حکومت ملک کی اندرونی سیکورٹی پر کتنی رقم خرچ کرتی ہے؟ کتنے لوگ موجود ہیں جو رات دن اس کام میں مصروف رہتے ہیں اور ان کو ریاست کے سارے وسائل پر دسترس حاصل ہوتی ہے لیکن نتیجہ؟ تمام تر احتیاطی تدابیر کے باوجود چار چار طیارے ایک ساتھ اغوا کر لیے جاتے ہیں، اغوا کنندگان بڑے اطمینان اور بے خوفی کے ساتھ طیاروں میں داخل ہو جاتے ہیں، وہ اپنے ساتھ تیز دھار والے ہتھیار لانے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں اور پھر ان اغوا شدہ طیاروں کو، پچاس پچاس ٹن پیٹرول سے بھرے ہوئے بموں کی طرح دنیا کی مضبوط ترین عمارتوں سے ٹکرا کر ہزاروں انسانوں کو مار ڈالتے ہیں۔

اگلا بے حد اہم اور قابلِ غور نکتہ روایتی اور ایٹمی ہتھیاروں کی موجودگی سے تعلق رکھتا ہے۔

امریکا کے پاس طرح طرح کے جدید ترین ہتھیاروں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں جن میں متعدد اقسام کے دور مار میزائل وغیرہ کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں ایٹمی ہتھیار بھی شامل ہیں۔ کیا ایٹمی ہتھیاروں سمیت یہ تمام ہتھیار امریکا کو اس بڑی تباہی سے بچا سکے؟ کیا واقعی ہتھیاروں کی کوئی جنگی اہمیت ہے یا یہ ایٹمی ہتھیار پورس کے ہاتھی بن کر خود اپنی ہی فوج کو نیست و نابود کر دیں گے؟ وہ سنگ دل دہشت گرد جو کسی ردعمل یا انتقام جوئی کا شکار ہو کر بیس پچیس ہزار انسانوں کو بآسانی موت کے گھاٹ اتار سکتے ہیں، وہ بیس پچیس کروڑ انسانوں کو بھی بے دریغ ہلاک کر سکتے ہیں۔ اس بات کی ضمانت کون دے سکتا ہے کہ امریکا میں ایٹمی ہتھیاروں کے ذخائر دہشت گردوں کی دسترس سے دور ہیں؟ امریکی ایٹمی ہتھیار کسی دوسرے ملک کو تباہ کرنے کے بجائے سب سے پہلے تو خود امریکا کو تباہ کر سکتے ہیں!

آخری لیکن اہم ترین بات انسانی عزم و حوصلے کی اور وحشت و جنوں کی ہے، جس کے آگے دنیا کی ہر قوت ہیچ ہے۔ انسانی عزم و حوصلہ جب مثبت اور انسان دوست شکل میں ظہور پاتا ہے تو یہ ناقابلِ یقین اور محیر العقول کارنامے سرانجام دیتا ہے اور جب یہی وحشت و جنوں منفی شکل اختیار کرتا ہے تو بھی یہ نامعلوم یقین ہولناک اور تباہ کن کارنامے انجام دیتا ہے جو نوع انسانی پر لرزہ طاری کر دیتے ہیں۔ امریکا میں جو کچھ ہوا وہ انسانی عزم و حوصلے کی منفی، مسخ شدہ، گمراہ کن اور انسان دشمن شکل کا مظہر ہے۔

دہشت گردی کی اس منفرد نوعیت کی کارروائی کے بعد دنیا بھر میں انسانوں کی سلامتی کو یقینی بنانے کے لیے نئے سرے سے طریقوں پر غور کرنا ہوگا اور نئی حکمت عملی وضع کرنی ہوگی۔ دہشت گردی کی روک تھام کے روایتی طریقے ناکام ثابت ہو چکے ہیں۔ مٹھی بھر دہشت گرد، نہایت ٹھوس اور جامع منصوبہ بندی کے ساتھ، بالکل خاموشی کے ساتھ بے گناہ انسانوں پر اچانک شب خون مارتے ہیں اور آن کی آن میں لاشوں کے پہاڑ کھڑے کر دیتے ہیں۔ ان کے اس طریقہ واردات سے نمٹنے کے لیے اور باتوں کے علاوہ جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ دہشت گردی کے اسباب و علل کا تجزیہ اور خاتمہ کیا جائے اور دہشت گردی کی بنیادوں پر کلہاڑی چلائی جائے۔

جان جیریسی کوئنز کالج اور گریجویٹ سنٹر کولمبیا یونیورسٹی نیویارک میں سیاسیات کے پروفیسر ہیں۔ وہ اس مضمون کو شائع نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن یہ مضمون امریکا کے علاوہ دنیا بھر کے کئی اخبارات میں شائع ہوا۔

جان جیریسی
ترجمہ: مسعود اشعر

یہ آنسو کب تھمیں گے؟

میں اپنے آنسو نہیں روک سکتا۔ جب بھی ٹیلی وژن پر کسی شخص کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے سانحے میں اپنے کسی پیارے کی موت پر گریہ کرتے دیکھتا ہوں اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکتا، میرے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔

لیکن میں سوچتا ہوں کہ نوریگا کی تلاش کے بہانے جب ہماری فوجوں نے پاناما کے ایل کوریلو علاقے میں پانچ ہزار غریبوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اس وقت میں کیوں نہیں رویا تھا؟ ہمارے لیڈر جانتے تھے کہ وہ (نوریگا) کہیں اور چھپا ہوا ہے مگر ہم نے ایل کوریلو کو اس لیے تباہ کردیا کہ وہاں کے رہنے والے لوگ قوم پرست تھے جو پاناما سے امریکیوں کو نکال باہر کرنا چاہتے تھے۔

اس سے بھی زیادہ صدمے کی بات یہ ہے کہ میں اس وقت کیوں نہیں رویا جب ہم نے بیس لاکھ ویت نامیوں کو قتل کیا تھا؟ ان میں سے اکثر بے گناہ تھے۔ اور وہ جنگ بھی ایسی تھی جس کے بارے میں اس جنگ کے شروع کرنے والے وزیر دفاع میک نمارا خود جانتے تھے کہ وہ جیت نہیں سکتے۔ ابھی چند دن پہلے میں خون کا عطیہ دینے گیا تو میں نے کمبوڈیا کے ایک شخص کو دیکھا۔ وہ بھی خون کا عطیہ دے رہا تھا۔ وہ قطار میں مجھ سے تین آدمی آگے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ میرے آنسو اس وقت کیوں نہیں نکلے تھے جب ہم انسانی خون کے پیاسے پوٹ پال کی مال و دولت اور ہتھیاروں سے مدد کر رہے تھے کہ وہ لاکھوں انسانوں کو کھیت کردے۔ کیوں؟ محض اس

لیے کہ وہ ہمارے دشمن کا دشمن تھا (وہ دشمن جس نے بالآخر وہ قتلِ عام بند کرایا۔)

اس شام اپنے بھڑکتے جذبات ٹھنڈے کرنے کے لیے میں فلم دیکھنے چلا گیا۔ سوچا فلم فورم میں لومبا فلم دیکھی جائے۔ وہاں پہنچ کر بھی مجھے شدّت کے ساتھ احساس ہوا کہ جب کانگو کے واحد شریف النفس لیڈر (پیٹرس لومبا) کو قتل کرانے اور اس کی جگہ لالچی، دغا باز اور سفاک آمر مبوتو کو اقتدار دلانے میں ہماری حکومت نے مدد کی تھی تو اس وقت بھی میرے آنسو نہیں نکلے تھے۔ میرے آنسو تو اس وقت بھی نہیں نکلے جب سی آئی اے نے انڈونیشیا میں سوکارنو کی حکومت کا تختہ الٹنے کا اہتمام کیا تھا۔ سوکارنو وہ شخص تھا جس نے دوسری جنگ عظیم میں جاپانی حملہ آوروں کا مقابلہ کیا تھا اور اپنے ملک کو آزادی دلائی تھی۔ اس کی جگہ ہم نے سوہارتو کو تخت پر بٹھایا۔ وہ شخص تھا جس نے جاپانیوں کا ساتھ دیا تھا۔ اس نے کم سے کم پانچ لاکھ مارکسسٹوں کا خون پانی کی طرح بہایا۔ (ستم ظریفی یہ ہے کہ اس ملک کا عام آدمی مارکس نامی کسی شخص سے اگر واقف بھی ہوگا تو وہ زیادہ سے زیادہ فلمی اداکار گروچو مارکس ہی ہوسکتا ہے۔)

کل رات میں نے پھر ٹی وی دیکھا اور پھر رویا اس گم شدہ آدمی کی تصویر دیکھ کر جو (تصویر میں) اپنے دو مہینے کے بچّے کے ساتھ کھیل رہا تھا، مجھے پھر ایل سیلواڈور کے وہ ہزاروں باشندے یاد آئے جن کے قتلِ عام کی سچی تصویر کھینچی ہے رے بونر نے نیویارک ٹائمز میں۔ اور مجھے یاد آئی ان امریکی رہباؤں اور ان کی معاون خواتین کی عصمت دری اور ان کا قتل جو وہاں بے کس عوام کی مدد کررہی تھیں۔ یہ کارنامہ بھی سی آئی اے کے تربیت یافتہ اور تنخواہ دار ایجنٹوں نے ہی انجام دیا تھا۔ میں نے اس درندگی پر ایک بھی آنسو نہیں بہایا تھا۔

میں نے آنسو بہائے سولیسٹر جنرل کی بیوی باربرا اولسن کی بہادری پر حالانکہ ان کے سیاسی خیالات سے مجھے نفرت ہے۔ مگر میں نے آنسو نہیں بہائے جب امریکا نے چھوٹے سے خوبصورت کیریبین ملک گرینیڈا پر حملہ کیا۔ وہاں کے غریب لوگ سیاحوں کو راغب کرنے کے لیے وہاں ایک ہوائی اڈّہ بنانا چاہتے تھے۔ ہماری حکومت اسے روس کا فوجی اڈہ کہنے پر مصر تھی۔ اس حملے میں ہزاروں آدمی ہلاک ہوگئے۔ لیکن اس کے بعد اسی ہوائی اڈے کی تعمیر ہم نے مکمل کی۔

میں اس وقت کیوں نہیں رویا جب ایریل شیرون نے، جو آج اسرائیل کا وزیراعظم ہے، صبرہ اور شتیلا کے پناہ گزین کیمپوں میں ہزاروں بے گناہ فلسطینیوں کا قتل عام کرنے کا منصوبہ بنایا اور ان معصوموں کا خون بہایا۔ یہی شیرون ہے جو بیگن اور شمیر کے ارگن اور اسٹرن نامی دہشت گرد

گروہوں کا رکن رہا ہے۔ ان گروہوں نے کنگ ڈیوڈ ہوٹل میں پناہ لینے والے برطانوی فوجی افسروں اور ان کے بیوی بچوں کو دھماکے سے اڑا دیا تھا۔ دونوں دہشت گرد بھی اسرائیل کے وزیر اعظم بن گئے تھے۔

میں جانتا ہوں انسان اپنوں کو ہی روتا ہے۔ لیکن کیا یہ وجہ کافی ہے کہ ہم ہر اس شخص سے بدلہ لینے کا مطالبہ کریں جو ہمارے ساتھ اتفاق نہیں کرتا؟ مگر لگتا ہے امریکی یہی چاہتے ہیں۔ کم سے کم ہماری حکومت تو یہی چاہتی ہے اور ہمارا میڈیا بھی۔ کیا واقعی ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا کے غریب لوگوں کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنا ہمارا حق ہے؟ محض اس لیے کہ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم آزاد ہیں اور وہ آزاد نہیں ہیں؟

یقیناً ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ ہم ان لوگوں کا پیچھا کریں جنہوں نے ہمارے اتنے بے گناہ بہن بھائیوں کو ہلاک کیا ہے۔ اور ہمیں یقین ہے ہم کامیاب ہوں گے۔ اسامہ بن لادن کے خلاف، طالبان کے خلاف، عراق کے خلاف، خواہ وہ کوئی بھی ہو اور کیسا بھی ہو۔ اس کارروائی میں ہم پھر کچھ اور معصوم بچے قتل کر دیں گے۔ وہ بچے جن کے پاس سردیوں کے لیے کپڑے نہیں ہیں، جن کے سر پر چھت نہیں ہے اور جن کے لیے ایسا کوئی اسکول نہیں ہے جہاں وہ پڑھ سکیں کہ دو، یا چار یا چھ برس کی عمر میں ان سے کون سا جرم سرزد ہو گیا ہے۔ صرف ایونجلسٹ پادری فیلویل اور رابرٹسن ہی یہ فتویٰ دے سکتے ہیں کہ ان کی موت درست ہے کیونکہ وہ عیسائی نہیں ہیں۔ یا شاید امریکی وزارت خارجہ کا کوئی ترجمان دنیا کو بتائے کہ یہ لوگ اتنے غریب اور بے کس تھے کہ ان کا مر جانا ہی اچھا تھا۔ انہیں بے کسی کی زندگی سے نجات مل گئی۔

پھر کیا ہوگا؟ کیا اس کے بعد ہم دنیا کو ایسے چلائیں گے جیسے ہم چاہتے ہیں؟ میری تمہاری نگرانی کے لیے بنائے جانے والے قاعدے قانون کے بعد ہمارے (ملٹی نیشنل کمپنیوں کے) چیف ایگزیکٹیو افسر یقیناً خوش ہوں گے کہ گلوبلائزیشن کے خلاف مظاہرے کرنے والے لوگ ہمیشہ کے لیے دبک کر بیٹھ جائیں گے۔ سیاٹل، کیوبیک اور جینوا کے ہنگامے ختم۔ اب تو چین ہی چین ہے۔

ہاں، اگلی باری تک۔ تو اب کس کی باری ہے؟ کیا اس بچّے کی جس کے بے گناہ ماں باپ ایل کوریلو کے قتل عام میں بچ گئے تھے؟

یا نکاراگوا کی اس لڑکی کی جسے معلوم ہے کہ اس کی ڈاکٹر ماں کو ان کونٹرا غنڈوں نے محض اس وجہ سے قتل کر دیا تھا کہ سی آئی اے نے انہیں پڑھایا تھا کہ ملک کے غریب اور بے سہارا عوام کو بہتر

حالات زندگی فراہم کرنے کی کوشش کرنے والی حکومت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے حامی استادوں، ڈاکٹروں اور کھیت مزدوروں کو قتل کردیا جائے۔ اور یہ کونٹرا اپنے آپ کو جمہوریت پسند کہتے تھے۔ یا پھر چلی کے اس ناراض شخص کی باری ہے جسے یقین ہے کہ نکسن کے وزیر خارجہ ہنری کسنجر کے حکم پر اس کے پورے خاندان کا صفایا کردیا گیا تھا۔ اور یہ وہ کسنجر ہیں جو کمیونسٹوں، ڈیموکریٹک سوشلسٹوں حتیٰ کہ قوم پرستوں میں بھی فرق نہیں کرتے۔

یہ بات ہم امریکیوں کی سمجھ میں کب آئے گی کہ جب تک ہم دنیا کو اپنے ہی مفاد کی غرض سے چلاتے رہیں گے ہمیں کسی نہ کسی کے انتقام کا نشانہ ضرور بننا پڑے گا۔ جب تک ہم اپنے انداز کی دہشت گردی چلاتے رہیں گے اس وقت تک کوئی جنگ بھی دہشت گردی ختم نہیں کرسکتی۔ چنانچہ میں نے آنسو بہانا بند کردیے کیونکہ میں نے ٹی وی دیکھنا بند کردیا۔ اور پھر میں چہل قدمی کو نکلا۔ میں اپنے گھر سے صرف چار گھر آگے تک گیا۔ وہاں کچھ لوگ جمع تھے جو مقامی فائر بریگیڈ اسٹیشن کے باہر پھول چڑھا رہے تھے۔ اسٹیشن بند تھا۔ وہ کئی دن سے بند تھا استقبال کرتے تھے، (ٹریڈ سینٹر کے) پہلے ٹاور کی آگ بجھانے اس تیزی سے بھاگے تھے کہ جب دونوں ٹاور گرے تو وہ بھی ان کے ساتھ ہی بھسم ہوگئے۔ ایک بار میں پھر رویا۔

یہ مضمون لکھ لیا تو میں نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ اسے چھپنے کے لیے نہ بھیجو۔ تمہارے کچھ طلبہ اور کچھ پڑوسی تم سے نفرت کرنے لگیں گے اور ہوسکتا ہے وہ تمہیں نقصان بھی پہنچائیں۔ لیکن میں نے پھر ٹی وی کھولا۔ وہاں وزیر خارجہ کولن پاویل مجھے بتا رہے تھے کہ ان بچوں، ان غریب لوگوں، امریکا سے ان نفرت کرنے والوں کے خلاف جنگ کرنا بالکل ٹھیک ہے کیونکہ ہم مہذب ہیں اور وہ تہذیب یافتہ نہیں ہیں۔ چنانچہ میں نے مضمون چھپنے کا خطرہ مول لینے کی ٹھان لی۔ ہوسکتا ہے یہ (مضمون) پڑھنے کے بعد ایک اور آدمی یہ سوال کرے کہ:

دنیا میں اتنے بہت سے لوگ ہمیں وہی مزہ چکھانے کے لیے اپنی جانیں قربان کرنے کو کیوں تیار ہیں جو مزہ ہم انہیں چکھا رہے ہیں؟

عزمی بشارہ اسرائیل کے پارلیمنٹ (کنیسیٹ) کے منتخب رکن ہیں اور وہ اپنی تحریر و تقریر میں اس سلوک پر توجہ دلاتے رہتے ہیں جو اسرائیل میں عرب شہریوں سے روا رکھا جاتا ہے۔ عزمی بشارہ کا یہ مضمون ''الاہرام'' کی ۲۰/ ستمبر ۲۰۰۱ء کی ہفتہ وار انگریزی اشاعت میں شامل ہے۔ دہشت گردی کے حوالے سے عزمی بشارہ نے حال ہی میں کئی مضامین لکھے ہیں۔

عزمی بشارہ
ترجمہ: شجاعت علی

بیان کا تصادم

جاپان نے دوسری جنگِ عظیم میں اتحادی افواج کے خلاف کامیکازے (Kamikaze) پائلٹوں کو استعمال کیا۔ کامیکازے کا مطلب ''آسمانی ہوا'' ہے۔ جاپانیوں نے یہ نام اس آندھی کو دیا تھا جس نے جاپان پر حملہ آور منگولین فوج کو تباہ کرکے رکھ دیا تھا۔

کامیکازے طیاروں کو خودکشی حملوں کے لیے خاص طور پر تیار کیا جاتا تھا۔ فضا میں پرواز کرنے کے بعد یہ طیارے دوبارہ لینڈنگ کی صلاحیت سے محروم کردیے جاتے تھے۔ ان پر ایک ٹن گولہ بارود لدا ہوتا جو طیارے کے کل وزن کے نصف سے بھی زائد تھا۔ ان کے فیول ٹینک بھی عام سائز سے بڑے ہوتے تھے اور جب وہ ۹۷۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے جاکر مقررہ اہداف سے ٹکراتے تو زبردست تباہی ہوتی۔ کامیکازے طیاروں کے خودکش حملوں نے اتحادی افواج کے ۴۰ بحری جنگی جہاز تباہ کیے تھے۔ جاپان کے شہر اوکیناوا میں اسی نوعیت کی خودکش کارروائیوں میں امریکا کے ۵۰۰۰ فوجی ہلاک ہوئے تھے جو امریکا کی تاریخ میں کسی بھی جنگ کے دوران ہلاک

ہونے والے فوجیوں کی سب سے بڑی تعداد ہے۔

دنیا کے مظلوم اور سامراجی طاقتوں کے جبر کا شکار عوام کو آج بھی جاپان کے ان خودکش پائلٹوں کے کارنامے یاد ہیں، اگر چہ جاپان خود ایک سامراجی ملک تھا اور اس کا رویہ اپنی پڑوسی ممالک سے کبھی اچھا نہیں رہا مگر پھر بھی لوگ جاپان کو حق بہ جانب قرار دیتے ہیں۔

جاپان کے خودکش حملے فتح کے لیے اس کی فوجی حکمت عملی کا حصہ نہیں تھے۔ جاپان نے صرف بری شکست سے بچنے کے لیے انہیں ڈھال بنایا۔ جاپان کی فوجی اور مذہبی روایات میں دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کو اولین ترجیح حاصل ہے اور اس فرض کے سامنے ایک فوجی کی زندگی کوئی معنی نہیں رکھتی۔

امریکی طیاروں یا امریکی ساختہ طیاروں نے بغداد، بلغراد، ہنوئی، کمبوڈیا، ڈریسڈن، بیروت، رفاہ اور خان یونس کے شہروں پر بمباری سے وسیع پیمانے پر تباہی پھیلائی ہے۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء طیاروں کے خودکش ہائی جیکروں نے امریکی طاقت اور عظمت کے دو میناروں، ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پینٹا گون کی عمارتوں کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی امریکی شہر پر حملہ ہوا اور شہریوں کو نشانہ بنایا گیا۔ کیا ان خودکش حملوں سے امریکا کے خلاف دنیا بھر کے مظلوم لوگوں کے غصّے میں کوئی کمی آئی ہے؟ کیا ستم زدہ عوام کو کچھ تسلی مل گئی ہے؟

ان حملوں سے کسی کو کچھ نہیں ملا۔ امریکی عوام کے مصائب میں اضافے سے دنیا بھر کے مصیبت زدہ لوگوں کی مشکلات پہلے سے بھی بڑھ گئی ہیں کیوں کہ یہ مظلوم لوگ انسان ہیں، یہ خودکشی کرنا نہیں بلکہ عزت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ کوئی بھی شخص انسانیت کے ناطے دوسروں کو زندہ جلتے ہوئے دیکھ کر خوشیاں نہیں منا سکتا۔ لیکن جب انسانیت کے اس غم کی کوئی تلافی نہیں ہوتی تو دل ٹوٹ جاتے ہیں اور زندہ لوگوں کے پاس خود کو اسی آگ میں جھونکنے کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔

اعداد و شمار میں ظاہر کی جانے ہلاکتیں، وہ اموات جن کا کہیں ذکر نہیں ہوتا اور کیمرہ کی آنکھوں کے سامنے ہونے والی ہلاکتوں میں واضح فرق ہوتا ہے۔ یہ حقیقت جان کر ہماری مایوسی آخری حدوں کو چھونے لگتی ہے۔ ہم عالمگیریت کی مخالفت کرتے ہیں مگر ہم خود عالمی میڈیا کے صارفین ہیں۔ ٹریڈ سینٹر کے جڑواں ٹاورز میں ہلاک ہونے والے افراد پر ہمیں شدید افسوس ہے لیکن روانڈا اور برونڈی کے قتل عام ہمارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اگر ہم اپنے رنج والم اور غصّے کا بہ غور

جائزہ لیں تو ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ برونڈی اور روانڈا میں لاکھوں افراد کی ہلاکت کی نسبت ہم صرف چند ہزار امریکیوں کی ہلاکت پر آنسو بہا رہے ہیں۔ دنیا کو منصفانہ بنانے کی کوشش کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ اس دہری پالیسی پر احتجاج کریں اور اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

عالمگیریت میں ہالی وڈ کی طلسماتی دنیا کے ساتھ ساتھ امریکا کے خلاف ردِعمل اور اس کی تلافی کو بھی جگہ ملنی چاہیے۔ دنیا بھر میں ٹیلیوژن کے سامنے بیٹھے ہوئے ناظرین ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پینٹا گون کی تباہی کو حیرت زدہ ہو کر دیکھتے ہوئے کہتے ہیں "مجھے اپنی آنکھوں پر بالکل یقین نہیں آ رہا، یہ منظر تو بالکل فلم جیسا ہے۔" امریکا کی شاید ہی کوئی فلم پروڈکشن کمپنی ایسی ہو جس نے "عرب دہشت گردوں" پر فلم نہ بنائی ہو۔ ان فلموں میں عرب، مذہبی بنیاد پرستی اور لالچ میں اپنے دوستوں کو قتل کر دیتے ہیں، ہائی جیکنگ اور نیو یارک کو تباہ کرنے یا کسی کثیر المنزلہ عمارت کو بم سے اڑانے کی منصوبہ بندی کر رہے ہوتے ہیں۔ ہالی ووڈ کی فلموں کے نکتہ نظر سے دیکھیں تو یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کیوں کہ جب بھی امریکا کا کوئی دشمن حملے کی کوشش کرتا ہے تو اسی وقت آرنلڈ شوارزینگر یا جان ریمبو کسی طیارے سے اونچی عمارت کی اوپری منزل پر کود کر ہر قسم کے حملوں کو ناکام بنا دیتے ہیں۔

امریکی ایئر لائنز کے طیاروں کے اغواء کو بزدلانہ اقدام قرار دیا جا رہا ہے۔ یہ خیال بھی ہالی وڈ کے اختراع کردہ تصورات پر مبنی ہے جن میں بہادر ہیرو اور بزدل دشمن کے درمیان فرق واضح کر کے یہ بتایا جاتا ہے کہ امریکی قوم کا ہر فرد ہیرو ہے۔ مگر دنیا میں صرف بہادر ہیرو اور بزدل دشمن ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ نہ تو سب اچھے صرف اچھے ہیں اور نہ سب برے بہت برے۔

انسان فطرت میں اب بھی قبائلی جبلت ہے۔ ہمیں خوف ہے کہ امریکا بھی قبائلی جبلت سے مجبور ہو کر حملہ آور ہوگا اس لیے ہم امید کرتے ہیں کہ حملہ آور عرب نہیں تھے۔

ہماری دعا ہے کہ وہ جاپانی ہوں جنہوں نے ہیروشیما کا بدلہ لینے کے لیے امریکا پر حملہ کیا۔ ہوسکتا ہے سربیائی باشندوں نے بلغراد کی تباہی کا بدلہ لیا ہو۔ وہ امریکی بھی ہوسکتے ہیں جو واکو (WACO) اور ٹموتھی میک وے کا انتقام لینا چاہتے ہوں اور کچھ ایسے لوگ بھی ملوث ہوسکتے ہیں جو امریکا کی غلامی کے طوق سے آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور ہمیں یہ تسلیم کرتے ہوئے خوف آتا ہے کہ کسی عرب نے یہ سب کیا ہوگا۔ بلاشبہ عرب بھی کئی افراد کے تعاون سے ایسا منظم منصوبہ

تیار کر سکتے ہیں اور طویل عرصہ تک اس کی تیاری کر کے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں۔

فلسطینی کیمپوں میں رہنے والا ایک بچہ جس کی تمام امیدیں خاک میں مل گئی ہوں اور مایوسی کے کسی لمحے میں اگر وہ اسرائیلی فوجیوں سے لڑتے ہوئے اپنی جان قربان کر دیتا ہے تو اس کی خودکشی کی منطق سب کو سمجھ آ سکتی ہے۔ اس کے برعکس یہ تصور کرنا بھی مشکل ہے کہ کئی افراد ایک سال سے اپنی جانیں ضائع کرنے کی تیاری کر رہے ہوں، پائلٹ کی ٹریننگ حاصل کریں، پروازوں کے روٹس اور سیکورٹی کے انتظامات کا جائزہ لیں اور اس کے علاوہ اسی نوعیت کے دیگر کئی پیچیدہ کام انجام دے رہے ہوں۔ کوئی بھی مایوس شخص ایسا انتہا پسندانہ طرزِ عمل اختیار نہیں کر سکتا کیوں کہ بوسٹن اور برسلز کی زندگی مہاجر کیمپوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ امریکا پر حملہ کرنے والے افراد بلند حوصلہ، مثالیت پسند اور باصلاحیت تھے اور اگر وہ اپنی قابلیت کو کسی اور میدان میں ذاتی ترقی کے لیے بروئے کار لاتے تو یقیناً آرام دہ زندگی بسر کر سکتے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ذاتی نفرت کی بنیاد پر نہیں بلکہ کسی ارفع مقصد سے پختہ وابستگی کے باعث ایسا کیا۔

ان معنوں میں صدر جارج بش بالکل درست تھے جب انہوں نے یہ کہا کہ ہمیں نئے قسم کے دشمن کا سامنا ہے۔ ہم بیس قسم کے دشمنوں کی فہرست پہلے گنوا چکے ہیں جنھوں نے امریکا پر ایٹم بم کی قوت کے مساوی حملہ کیا۔ ہیروشیما پر ایٹم بم گرنے سے ۱۴۰۰۰۰ افراد لقمۂ اجل بن گئے تھے اور تابکاری سے زخمی اور متاثر ہونے والوں کا کوئی شمار نہیں۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر گرنے والے بم سے ۵۰۰۰ افراد ہلاک ہوئے اور ٹی وی پر تباہی کے مناظر دیکھ کر لاتعداد افراد کئی امراض میں مبتلا ہو جائیں گے۔

حملہ آوروں کو امید ہوگی کہ مغرب کی فوجی طاقت ان سے دہشت زدہ ہو جائے گی اور اس طرح ان کا پلہ بھاری ہو جائے گا۔ سرد جنگ کے زمانے میں نیٹو اور وارسا معاہدے کی طاقت کے توازن کی وجہ ایٹمی صلاحیت تھی جس نے بڑی طاقتوں میں کشیدگی کو بڑھنے سے روکے رکھا لیکن اس کے باوجود بھی دنیا پر ایک تباہ کن جنگ کے خطرات منڈلاتے رہے۔ وارسا معاہدے کے خاتمے کے بعد نیٹو کو ایک نئے دشمن کا سامنا ہے۔ اس دشمن کے پاس ایٹمی ڈھال نہیں اور نہ ہی یہ کسی خاص ملک تک محدود ہے۔ ایک یا دو جگہ پر بم دھماکے اسے محفوظ بنانے کے لیے ناکافی ہیں۔ یہ دشمن ساری دنیا میں سرگرم ہے اور اس کی رسائی سرمایہ دارانہ نظام کے کمزور ترین گوشوں اور مغربی ممالک کے اہم ترین شہروں تک ہے۔ یہ مغرب کی عظیم الشان ٹیکنالوجی کو اس کے خلاف ہتھیار کے

طور پر استعمال کرسکتا ہے۔ ان کی بلند وبالا عمارتوں کو قاتل مشین، تیل کے ٹینکوں کو آگ کے بم اور کسی بھی جدید فوجی تربیت کے بغیر طیاروں کو میزائل بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

مظلوم اور بیکس لوگ اس کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں مگر کم زوری کو کسی بھی طرح طاقت نہیں کہا جاسکتا نہ ہی جنگ کے بغیر طاقت ور کے گھٹنے ٹیکنا ممکن ہے۔ اقتصادیات اور سیاست کے متوازی نظام ہر جگہ کارفرما نظر آتے ہیں یعنی مضبوط لوگ کم زوروں سے زیادہ طاقت ور ہوتے ہیں۔

صدر بش کی جانب سے نئے دشمن کی شناخت کے بعد اسرائیل نے روس، ترکی اور دیگر ممالک کے ساتھ مہذب دنیا میں اپنا خیر مقدم ہونے پر خوشی کا اظہار کیا ہے کیوں کہ اسے ایک مدت سے اسی موقع کا انتظار تھا۔ اسرائیل سے تو اپنی خوشی چھپائے نہیں چھپتی کہ اب امریکا پر یہ حقیقت منکشف ہوئی ہے کہ دہشت گردی دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور اسے جنم دینے والے حالات کی کوئی وقعت نہیں۔ جب امریکا کو پتہ چلا کہ ترکی اور روس کے ساتھ یورپ بھی دہشت گرد مخالف کیمپ میں شامل ہوگیا ہے تو اس نے اسے تاریخی اتحاد قرار دیا۔ امریکا کو یقین ہے کہ عرب بھی اس کے وفا دار اتحادی ثابت ہوں گے جیسا کہ عراق کے خلاف انھوں نے امریکا کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔

ہمیں امریکا کی حمایت کا دم بھرنے والے عرب ملکوں کے طرزِ عمل پر افسوس ہوتا ہے کیوں کہ جب ان کے خلاف دہشت گردی ہوتی ہے تو وہ مغرب کو نظر نہیں آتی۔ عرب ممالک طویل عرصہ سے امریکا اور برطانیہ سے کہہ رہے ہیں کہ دہشت گردوں کو سیاسی پناہ نہیں دیں مگر مغربی جمہوریتوں نے ان کی کوئی بات نہیں مانی۔ اسامہ ان کے ملکوں میں گھومتا پھرتا رہا ہے مگر اس وقت وہ ان کا آدمی تھا۔ اس کے برعکس جب دہشت گرد مغربی ملکوں پر حملے کرتے ہیں تو عرب ملکوں کو دہشت گردی کے خلاف بین الاقوامی اتحاد میں شامل ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ وہ مجبوری کے تحت اتحاد میں شامل ہوجاتے ہیں جس کا اعلان ان کا ترجمان شکایت کے لہجے میں کرتے ہوئے کہتا ہے ”لیکن افغانستان میں حکومت سے کون تعاون کرتا ہے؟“

آج کے دور میں دہشت گردی کے خلاف بین الاقوامی اتحاد میں اسرائیل ایک بڑی طاقت کے طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔ اب فلسطینی اتھارٹی کے پاس دو کیمپوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا راستہ باقی رہ جائے گا جیسا شمعون پیریز نے ۱۹۹۶ء میں شرم الشیخ کے معاہدے سے

حاصل کیا تھا۔ اس میں غیر وابستہ ممالک شامل نہیں ہوں گے۔ اس پر بھی اسرائیلی کی خوشی دگنی ہوگئی ہے۔ جسے وہ کیمروں کی چکا چوند روشنی میں بھی مگر مچھ کے آنسو بہا کر نہیں چھپا سکتا۔ امریکا میں تمام مذاہب اور نسلوں کے افراد نے حملوں کے فوراً بعد خون کے عطیات دیئے جس کا مقصد نہ صرف اس سانحے میں امداد دینا تھا بلکہ وہ اس بات کی بھی یقین دہانی کرانا چاہتے تھے کہ وہ بلا تفریق رنگ ونسل خون دے کر ایک قوم کے شہری ہونے کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔ اسرائیل میں دیئے گئے خون کے عطیات سے اس بات کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ امریکا اور اسرائیل ایک ہی دشمن کی زد میں ہیں۔

۱۱ ستمبر کو رونما ہونے والے واقعات کے بعد دہشت گردی کے خلاف بین الاقوامی اتحاد کی تشکیل ایک اور سانحے کو جنم دینے کا باعث بنے گی۔ امریکی اقدام سے اسرائیل کے موقف کو بین الاقوامی حمایت حاصل ہوگئی۔ جس سے اسے فلسطینیوں کو بھرپور قوت سے کچلنے کی کھلی چھوٹ مل جائے گی۔ جنین میں ہونے والے واقعات امریکا پر حملے کا ردعمل تھے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ مستقبل میں امریکا جن خطوط پر بین الاقوامی تعلقات استوار کرنا چاہتا ہے ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' اس کا بنیادی اصول ہوگا۔

اگر امریکا نے اپنی طویل حکمت عملی میں اسرائیل کی پالیسی کو اپنا لیا تو اس سے مغربی ملکوں پر دہشت گردوں کے مزید حملوں کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ دہشت گردی کے خلاف اندھا دھند اور تباہ کن انداز میں لڑنے سے اس کا دائرہ وسیع ہونے کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ دہشت گردی غربت، ناانصافی، بیرونی مداخلت اور نا مساعد حالات کے جبر کے ردِعمل کے طور پر پیدا ہوتی ہے۔ یہ عالمگیریت کے خلاف ایک بین الاقوامی بغاوت ہے جس نے ساری دنیا کے نادار لوگوں کی طرف پیٹھ پھیر رکھی ہے۔ یہ جدیدیت سے دور کم زور لوگوں کا ایک ہتھیار ہے جو قوت اور طاقت کے عالمگیری اصول کے خلاف ہیں۔ یہ لوگ برابری کی سطح پر عالمگیریت کے مراکز سے اپنی شرائط نہیں منوا سکتے کیوں کہ ان کے پاس اتنا سیاسی وثقافتی اثر ورسوخ نہیں ہے جو عالمی طاقتوں کو ان کے حق میں درست فیصلے کرنے پر مجبور کر سکے۔ تجربہ بھی ہمیں یہ بتاتا ہے کہ مغربی عقلیت پسندی کی بنیاد معاشی مفادات اور ان کے معاون مضبوط انتظامی صلاحیتوں کی حامل ادارہ جاتی تنظیموں پر مستحکم ہے اور وہ سب سے پہلے اپنے مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں ہے کہ امریکی اور مغربی مفادات پر حملوں سے

پس ماندہ لوگوں کو خوشی ہوئی ہے۔ تاہم ان حملوں کی گرد بیٹھنے کے بعد کم زوروں کو اس حقیقت کا پتہ چلے گا کہ ان میں تو ہزاروں بے گناہ لوگوں کی جانیں ضائع ہوگئی ہیں۔ مغربی طاقت اور مفادات صرف ایک یا دو عمارتوں تک محدود نہیں ہیں۔ امریکا جیسا مضبوط اور پیچیدہ سیاسی اور اقتصادی نظام طے شدہ تخمینوں میں پھل پھول رہا ہے اور اس نظام کا تسلسل برقرار رکھنے اور اسے از سرِ نو تخلیق کرنے کے ضروری عناصر مقامی اور بین الاقوامی ہر دو سطح پر اسے کنٹرول کررہے ہیں۔ اس نظام پر حملہ کرنے کا واحد مقصد اس کے فیصلہ سازوں کو قائل کرنا ہے کہ وہ اپنی سوچ کے معیارات تبدیل کریں اور ایسا نہ تو امریکا کے منطقی مذاکرات سے ممکن ہے نہ ہی خودکش حملوں سے، البتہ ان قوتوں اور امریکی نظام کو چلانے والوں کے خیالات کو تبدیل کر کے ہی کسی سمجھوتے پر پہنچا جاسکتا ہے۔ اثر انداز ہونے کے لیے قوت کی ضرورت ہوتی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ طاقت کا قابلِ فہم سیاسی زبان میں ترجمہ بھی ضروری ہے۔

امریکا کے عربوں اور مسلمانوں کو جلد ہی یہ پتہ چل جائے گا کہ مذہبی یا نسلی بنیاد پر بدلہ لینے سے ان کے ترقی پذیر ملکوں کی حفاظت ممکن نہیں ہے۔ لیکن اسرائیل، یورپ اور امریکا کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ امریکی عربوں کو نسل پرستی کے خلاف جنگ میں اتحادیوں کی ضرورت ہوگی۔ انہیں امریکی معاشرے کے مختلف طبقات سے مذاکرات کرنے پڑیں گے تاکہ وہ حملہ آور ہجوم کے خلاف انفرادی آزادی اور جمہوریت کا دفاع کرسکیں۔ امریکا میں اسلامی تنظیموں کو رواداری، آزادی اظہارِ رائے اور آزادی کے اصولوں سے اپنی گہری وابستگی کی دوبارہ تصدیق کرانا ہوگی۔ بہ الفاظ دیگر امریکی عربوں اور مسلمانوں کو انتقامی کارروائی کا نشانہ بننے سے بچنے کے لیے امریکی جمہوریت کے اصولوں پر حرف بہ حرف عمل کر کے دکھانا ہوگا۔ ان پر حملے کیے گئے تو وہ احتجاج کرتے ہوئے کہیں گے کہ ہم امریکی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں امریکی جاپانیوں نے بھی یہی کہا تھا مگر انہیں الگ کیمپوں تک محدود کردیا گیا۔ اگرچہ اس طرح کا سانحہ دوبارہ رونما نہیں ہوسکتا مگر اس کی نوعیت بھی کم وبیش ایسی ہی ہوگی۔ امریکی جمہوریت کے طرزِ زندگی کو اپنانے کے خواہش مند مسلمانوں کو امریکیوں کی نفرت بھری نظروں کو برداشت کرتے ہوئے خوف زدہ ہوکر رہنا پڑے گا۔

اس عمل میں امریکی مسلمانوں کے نئے تشخص کی دوبارہ تصدیق ہوگی۔ ایسی صورت حال میں ہم مقامی، جمہوری اور بین الاقوامی قدروں کو درست قرار نہیں دے سکتے۔

ماضی قریب جو آج بہت پرانی بات معلوم ہوتا ہے، اس میں عربوں کو کبھی بھی امریکا سے

نفرت نہیں تھی۔ یہ خطہ امریکا کے نو آبادیاتی تسلط میں کبھی نہیں رہا۔ عرب سیاست دان اور دانش ور امریکا کے اصولوں کو پسند کرتے تھے۔ مصر کے بعض عسکری انتہا پسندوں کو یقین تھا کہ وہ برطانیہ اور فرانس کے خلاف امریکا سے اتحاد کر کے دونوں ملکوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے اب ایسا نہیں رہا، اب عربوں کو امریکا سے نفرت ہوگئی ہے۔ امریکا کا کردار سامراجی ملکوں جیسا ہوگیا ہے جس میں تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے پسندیدہ حکمرانوں کو مسلط کرنا، مفادات کے تحت وفا داریاں بدلنا، عربوں کے ساتھ تنازعہ میں اسرائیل سے بھر پور تعاون اور اسرائیلیوں کو فلسطینیوں کو کچلنے کے لیے کھلی چھوٹ دینا شامل ہیں۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ نفرت کی آگ کو مزید بھڑکائے گی کیوں کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں عراق، فلسطینی عوام اور دنیا بھر میں ظلم وتشدد اور جبر و استحصال کا شکار لوگ امریکا کی نظروں سے اوجھل ہیں۔

جب تک دنیا محفوظ نہیں ہوگی اس وقت تک امریکا بھی غیر محفوظ رہے گا۔ امریکیوں کو علم ہے کہ کامیکازے حملوں کو کسی ملک پر بم باری کر کے یا اس کا محاصرہ کر کے روکنا ممکن نہیں ہے۔ عالمی نفرت کا کوئی علاج نہیں نہ ہی جغرافیائی حدود کے ایک ایک انچ کی حفاظت کی جا سکتی ہے۔ اس کا واحد راستہ اس کے بنیادی اسباب کو حل کرنا ہے۔ اگر ہم امریکا اور یورپ کے عوام کو یہ یقین دلا سکیں تو پھر ہی مفاہمت کی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے پاس مکمل علم ہو ہم ان کی ثقافتی اقدار کو سمجھتے ہوں۔ یکسر مسترد کر دینے اور جذباتی نعروں سے ہمیں اپنے لیے مصیبت کے انبار جمع کرنے کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔

فلسطینی عوام کو امریکا پر ٹوٹنے والی آفت سے خوشی نہیں ہوئی۔ لیکن چند فلسطینی جو امریکا کے حملوں پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے انہیں کیمرہ میں محفوظ کر کے بار بار مغربی چینلز پر دکھایا گیا۔ ایسا کیوں کیا گیا؟ اس لیے کہ بعض لوگ نہیں چاہتے کہ ہمارے اور مغربی و امریکی عوام کے درمیان مکالمہ ہو۔ اس کے بجائے مغربی ملکوں کے عوام کو اوزار دیئے گئے کہ وہ مسلمانوں پر حملے کریں۔ مغربی معاشرے میں کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں کہ وہ ان واقعات کی مذمت کریں جو انتقام کے جذبات پر مبنی ہیں کیوں کہ انہیں خوف ہے کہ دیگر سیاسی رہنما ان پر تنقید کریں گے اور ان کی مقبولیت کم ہو جائے گی۔

ہمارے معاشرے کو ابھی اس ممکنہ تباہی کے سیاسی اور اخلاقی زیاں کا بہ غور جائزہ لینا ہے۔

اگر انتقام کے کلچر اور خودکش (کامیکازے) حملوں کو بہترین نظریہ قرار دے دیا جائے تو ہم اس کی مدد سے نہ تو روشن خیالی سے کوئی حکمت عملی ترتیب دے سکتے ہیں اور نہ ہی اصلاح پسند یا انتہا پسندانہ مخالفت سے عوام کے حالاتِ زندگی میں کوئی بہتری لائی جا سکتی ہے۔

مقبوضہ حالت میں رہتے ہوئے وسائل اور جانوں کی قربانیاں مقامی و عالمی سطح پر ایسا نظریہ پیش کرتی ہیں جن کا کوئی متبادل نہیں ہو سکتا، ان میں بہت بڑا فرق ہے اور ان نظریات کا تقابل قبضے کے خلاف قانونی مزاحمت سے نہیں کیا جا سکتا۔

خودکش حملوں نے امریکی معاشرے کو اس کے اسباب پر غور کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا ہے۔ تاہم امریکی معاشرہ اندرون ملک اپنی خارجہ پالیسیوں پر بحث کرے گا مگر جو ماہرین ہمارے متعلق ان کے روبرو گفتگو کریں گے وہ امریکی ہوں گے جو اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کریں گے لیکن ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا کیوں کہ وہ ہمارا موقف سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

دہشت گردی کے خلاف بین الاقوامی اتحاد ہم سے چاہتا ہے کہ ہم فوراً بلا تاخیر امریکا پر حملوں کی مذمت کریں۔ اگر ہم سیاسی یا اخلاقی بنیادوں پر اس مؤقف سے انحراف کریں تو وہ اسے غلط قرار دے کر اپنا بیانیہ سنائے گا۔ ہماری رائے سننا اس لیے ضروری ہے کہ اس سے ہمارے دلائل اور نقطہ نظر ان پر واضح ہوگا۔ جب عالمی رہنماؤں سے حملوں کی فوری مذمت کے لیے کہا جاتا ہے تو ان پر یہ بھی واضح کر دیا جاتا ہے کہ وہ دو میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں۔ دنیا کو محفوظ تر کرنے اور مربوط حکمت عملی بنانے کے لیے ان کے خیالات کو سننا ضروری ہے۔ اس کے برعکس امریکا اپنی مرضی سے دنیا کو دہشت گرد مخالف اتحاد میں دھکیل رہا ہے۔ وہ لوگ جو اس میں شامل ہونے سے خوف زدہ ہیں اور اس کی مخالفت کرتے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ اس کے خلاف تعمیری طرزِ عمل اپنائیں اور اس خوفناک حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے اثرات کو کم کرنے کی کوشش کریں۔

جین برکمونٹ
ترجمہ: آصف فرخی

"تاریخ کے انجام" کا انجام

سب کچھ ٹھیک ہو رہا تھا۔ سربیا اب گھٹنے ٹیک چکا تھا اور میلوسیوچ کو بین الاقوامی جرائم کی عدالت کے ہاتھوں مٹھی بھر ڈالر کے عوض بیچ ڈالا تھا (جن میں سے بیش تر کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ پہلے ہی سے نشان زدہ تھے کہ ان قرضوں کو اتارنے میں کام آئیں جو ٹیٹو کے زمانے میں لیے گئے تھے)۔ نیٹو مشرق کی سمت بڑھ رہا تھا جدھر بے کار اور طاقت سے عاری روس موجود ہے۔ صدام حسین پر جب بھی جی چاہے بڑی حفاظت کے ساتھ بم برسائے جا سکتے تھے۔ یو سی کے کی فوج کشی کا شکار مقدونیہ کو مجبور ہونا پڑا کہ اسی یو سی کے کے غیر مسلح کیے جانے کا سوانگ قبول کرے جو ان ہی لوگوں کے ہاتھوں سرانجام پا رہا تھا جنھوں نے پہلے ہی اس گروہ کو مسلح کیا تھا۔ فلسطینی علاقے سخت انتظام کے تحت بند تھے جب کہ ان کے رہنماؤں کو "اسمارٹ" بموں کے ذریعے ہلاک کیا جا رہا تھا۔ گزشتہ کئی برس سے، اسٹاک ہولڈر، ریکارڈ توڑ منافع کما رہے تھے۔ سیاسی "دائیں بازو" اپنی موت آپ مر چکا تھا اور اس کے ساتھ تمام سیاسی جماعتوں "نولبرل ازم" اور "انسانی بنیادوں پر" دخل اندازی کا علم اٹھا چکی تھی۔ قصہ مختصر، جیسے کہ بعض مبصرین کہتے ہیں، ہم امن کے دور دورے میں تھے۔

پھر اچانک صدمے، تعجب، خوف: ہر عہد کی سب سے بڑی طاقت، حقیقی معنوں میں واحد آفاقی سلطنت کے عین قلب میں وار ہوا، اس کی دولت اور طاقت کے مرکز کو نشانہ بنایا گیا۔ فقید المثال اور تمام و کمال قوت کا حاصل برقیاتی جاسوسی نظام، حفاظت کے ایسے طریقے جن کی کوئی نظیر نہیں، دفاع کے لیے ڈھیروں ڈھیر اخراجات...... ان میں سے کچھ بھی اس تباہی کی روک تھام میں کام نہ آیا۔

ہم مکمل طور پر واضح رہیں۔ ہم (امریکا کی سابق وزیر داخلہ) میڈلین البرائٹ کے روّیے میں شریک نہیں ہیں کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ عراق کی خلاف بندشیں جاری رکھنے کی قیمت وہ

نصف ملین عراقی بچے ہیں جو اس دوران ہلاک ہوگئے۔ ''یہ بہت مشکل فیصلہ ہے، مگر ہمارے خیال میں اس کی جو قیمت دینی پڑی وہ حق بجانب ہے'' انہوں نے جواب دیا۔ بے گناہ شہریوں کا قتل عام کبھی بھی قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس حملے کی تہ میں موجود معنی کو سمجھنے کی کوشش بھی نہ کریں۔

امریکی امن پسند اے جے مسٹے (A.J.Muste) نے ایک مرتبہ یہ کہا تھا کہ ہر جنگ میں یہ ہوتا ہے کہ جیتنے والا فریق ہی مسئلے کو نمایاں کرتا ہے: فاتح کو یہ سبق مل جاتا ہے کہ تشدد کامیاب ہوگیا۔ دوسری عالم گیر جنگ کے بعد کی تمام تر تاریخ اس مشاہدے کے برمحل ہونے کی گواہی دیتی ہے۔ امریکا میں، ''جنگ کے محکمے'' کا نام بدل کر محکمہ دفاع رکھ دیا گیا، عین اس وقت جب اس ملک کو کوئی براہ راست خطرہ لاحق نہیں تھا اور ایک کے بعد دوسری حکومت نے یہ طریقہ اپنایا کہ کمیونزم کے پھیلاؤ کو روکنے کے بہانے فوجی مداخلت اور سیاسی عدم استحکام کے سلسلے جاری رکھے..... ایسی حکومتوں کے خلاف جو میانہ روی کے ساتھ قوم پرست تھیں، جیسے برازیل میں گولارت، ایران میں مصدق اور گواٹے مالا میں آربنز کی حکومت، اپنے آپ کو زمانہ حال تک محدود رکھتے ہوئے ہم چند سوالوں کا جائزہ لیں جو مغربی اور خاص طور پر امریکی پالیسی کے بارے میں شاذ و نادر ہی اٹھائے جاتے ہیں:

کیوٹو کا پروٹوکول: اس پر امریکا کا مرکزی اعتراض سائنسی بنیادوں پر نہیں ہے بلکہ محض یہ ہے کہ ''یہ ہماری معیشت کے لیے برا ہے۔'' وہ لوگ جو غلاموں کی سی اُجرت پر بارہ گھنٹے روزانہ کام کرتے ہیں، اس طرح کے ردعمل سے کیا سمجھیں؟

ڈربن کانفرنس: مغرب کی طرف سے غلامی اور نوآبادیاتی قبضے کے جرمانے کا ہلکا سا خیال بھی مسترد کر دیا جاتا ہے۔ لیکن کیا یہ بات واضح نہیں ہے کہ اسرائیل کی ریاست، یہودی دشمن اعمال کے معاوضے کی ایک صورت کے طور پر کام کر رہی ہے؟ بس اس معاملے میں فرق صرف اتنا ہے کہ یورپین اقوام کے جرائم کی قیمت فلسطینی عرب ادا کر رہے ہیں اور کیا یہ بات صاف نہیں ہے کہ نوآبادیاتی نظام کے شکار ہونے والے لوگ ذمہ داری کی اس منتقلی کو ایک طرح کی نسل پرستی سمجھیں گے؟

مقدونیہ: یہ وہ ملک ہے جسے مغرب نے آزادی کی طرف دھکیلا تاکہ سربیا کو کم زور کیا جاسکے اور جس کی حکومت بڑی وفاداری کے ساتھ مغربی احکام کی تابع دار رہی ہے۔ اس کے نتیجے

میں اسے ان دہشت گردوں کے حملوں کا سامنا کرنا پڑا جنہیں خود نیٹو نے مسلح کیا تھا اور جو نیٹو کے زیرِ انتظام علاقے سے آ رہے تھے۔ یہ سب کچھ سلاو آرتھوڈاکس لوگوں کو کیسا لگتا ہے، خاص طور پر اس واقعے کے بعد کہ نیٹو دیکھتا رہا اور کوسوو سے سرب باشندے بے دخل کر دیے گئے اور ان کے ثقافتی ورثے کا بڑا حصہ تباہ کر دیا گیا۔

افغانستان: یہ بات بہت جلدی بھلا دی جاتی ہے کہ اسامہ بن لادن کو تربیت دینے والے اور ہتھیار فراہم کرنے والے امریکی ہی تھے جو اب اس بات کا کھلے بندوں اعتراف کرتے ہیں کہ وہ افغانستان کو استعمال کر رہے تھے تاکہ سوویت روس کے استحکام کو نقصان پہنچا سکیں اور وہ یہ کام، افغانستان پر روسی حملے سے بھی پہلے سے کر رہے تھے۔ کتنے لوگ اس کھیل میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ جسے سابق صدر کارٹر کے مشیر زبگنیو برزینسکی نے ''شطرنج کی بساطِ عظیم'' قرار دیا تھا؟ اور کتنے ہی دہشت گرد ہیں ایشیا میں، براعظم وسطی امریکا میں، بلقان ریاستوں میں اور مشرقِ وسطیٰ میں جو ''آزاد دُنیا'' کے استعمال کے بعد کھلے چھٹے پھر رہے ہیں۔

عراق: دس برس سے یہاں کی آبادی کا گلا وہ پابندیاں گھونٹ رہی ہیں جس کی وجہ سے ہزاروں، لاکھوں اموات واقع ہو چکی ہیں...... یہ سب شہریوں کی اموات تھیں۔ یہ سب اس لیے کہ عراق نے تیل کے وہ کنویں واپس حاصل کرنے کی کوشش کی تھی جو اس سے برطانیہ نے de facto ہتھیا لیے تھے۔ اس کا موازنہ اس رویے سے کریں جو ۱۹۶۷ء میں عرب علاقوں پر غیر قانونی قبضہ جمانے کے بعد اسرائیل کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ کیا اس بات کا کوئی امکان ہے کہ اس تصور میں، جس کو مغرب میں عام طور پر قبول کیا جاتا ہے، کہ صدام حسین ہی پر تمام الزام ہے، عربوں اور مسلمانوں کو اس میں کوئی معقولیت نظر آئے؟

یہ محض اتفاق ہے کہ ۱۱ ستمبر کا حملہ چلی میں آئندے حکومت کا تختہ الٹنے کی ''سالگرہ'' کے دن ہوا جو پہلی نیولبرل حکومت کے قیام کی، اور وہ بھی جنرل پنوشے کی حکومت، نشان دہی کرتا ہے (اور یہ حقیقت بڑی آسانی کے ساتھ بھلا دی جاتی ہے) بلکہ تیسری دُنیا میں قومی و آزاد تحریکوں کے خلاف ایک وسیع تر تحریک کا آغاز بھی ہے جس نے ان ملکوں کو بین الاقوامی مالیاتی ادارے (آئی ایم ایف) کی ہدایات پر عمل پیرا ہونے پر مجبور کر دیا۔

اسی لیے ہمیں شک ہے کہ لاطینی امریکا میں، انڈونیشیا میں، ایران میں، برباد شدہ اور ذلت کے مارے ہوئے روس میں اور چین میں جہاں میں کوئی بھی اس ابھرتے ہوئے دیو کے استحکام کو ختم

کرنے کی کوششوں سے دھوکا نہیں کھاتا، اور اس کے ساتھ پوری اسلامی دنیا میں ۱۱ ستمبر کا المیہ لوگوں کو محض مگرمچھ کے آنسو بہانے پر مائل کرے گا۔

ظاہر ہے کہ غم و غصّہ کے نعرے اور ہمدردی کے پیغامات بھی ہوں گے۔ ''سخت گیر جوابی کارروائیوں'' پر تالیاں بھی بجائی جائیں گی، جب بھی ایسی کارروائی کی جائے گی (اب کی بار کیا وہ سوڈان میں کسی دوا ساز کارخانے کو تباہ کریں گے یا کسی عرب ملک کے شہریوں کو بمباری کا نشانہ بنائیں گے؟) دانش وروں کی ایک بڑی جماعت اکٹھا کرلی جائے گی کہ غلط مماثلت سے بھرے ہوئے چالاک تجزیے کرتے رہیں جو ان حملوں کے تانے بانے کسی سے بھی جوڑ دیں جس کے وہ خلاف ہیں: صدام حسین، قذافی، مغرب کے امن پسند اور سامراج دشمن، فلسطین کی تحریک آزادی بلکہ چین، روس اور شمالی کوریا بھی۔ یہ بار بار دہرایا جائے گا کہ ایسا وحشیانہ عمل ہمارے مزاج سے بہت دور ہے، ہم تو اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ اونچائی سے بم ماردیں اور پابندیوں کے ذریعے آہستہ آہستہ ہلاک کریں۔ لیکن ان میں سے کسی بات سے بھی بنیادی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ بجائے خود اس انقلاب پر حملے کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ جس چیز پر حملہ کرنے کی ضرورت ہے، وہ دُکھ اور مصائب ہیں جو بغاوت اور انقلاب کا پیش خیمہ بنتے ہیں۔ ان حملوں کے دو منفی سیاسی نتائج ہوں گے، پہلی چیز تو یہ کہ امریکی قوم، جو بڑی تشویشناک حد تک قوم پرست ہے، بقول خود، ''جھنڈے تلے جمع'' ہونے لگے گی، اور اپنی حکومت کی پالیسی کی توثیق کرے گی، یہ پالیسی چاہے کتنی ہی وحشیانہ کیوں نہ ہو۔ امریکی پہلے سے بھی زیادہ مصمّم ارادہ کرلیں گے کہ اپنے ''طرزِ زندگی'' کی حفاظت کریں اور یہ نہیں سوچیں گے کہ کرۂ ارض کی باقی ماندہ اقوام کو اس کی کیا قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ سیئٹل کے بعد سے جو دبی دبی تحریکیں سر ابھارنے لگی تھیں، انہیں ایک طرف ہٹا دیا جائے گا یا مجرم قرار دے دیا جائے گا۔

دوسری طرف وہ لاکھوں افراد جنھوں نے امریکا اور اس کے حلیفوں کے ہاتھوں ہزیمت، شکست، ذلّت و خواری اٹھائی ہے، ان کو یہ ترغیب ملے گی کہ وہ ایسا سمجھنے لگیں کہ دہشت گردی ہی وہ واحد ہتھیار ہے جو اس سلطنت پر وار کرنے کا اہل ہے۔ اسی لیے پوری دُنیا کی اکثریت پر ایک چھوٹی سی اقلیت کے ثقافتی، معاشی اور سب سے بڑھ کر فوجی غلبے کے خلاف سیاسی جدوجہد...... تشدد نہیں...... پہلے سے بھی زیادہ ضروری ہوگیا ہے۔

موجودہ بحران کے دوران جہاں بعض میڈیا چینلز نے کسی مخصوص نقطہ نظر کی اطاعت اور فرماں برداری کا شعار اختیار کیا وہاں بعض جرائد نے آزاد فکر اور ''مترادف نقطہ نظر'' کی ترویج کا بیڑا اٹھائے رکھا۔ ان جرائد میں ''زیڈ میگزین'' نمایاں ہے اور اس پر جاری ہونے والے تجزیے اور مضامین انٹرنیٹ کے ذریعے ساری دنیا میں پڑھے گئے۔ جین برکمونٹ اور ایدواردو گلیانو کے مضامین یہیں سے لیے گئے ہیں۔ برکمونٹ فرانس کے معروف فلسفی اور سماجی امور کے تجزیہ نگار ہیں اور گلیانو ناول نویس۔ لاطینی امریکا کے ممتاز ناول نگار ایدواردو گلیانو کا یہ مضمون ہسپانوی جریدے ''لاجورنا ڈا'' میں ۲۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو شائع ہوا۔ اس کا انگریزی ترجمہ جسٹن پوڈور نے کیا ہے۔ گلیانو کے ناولوں میں ''آتشی سہ شاخہ'' اہم ہے اور اس کی تازہ ترین کتاب Up side Down دُنیا کے نقشے کو آئینے کے آرپار دیکھنے کی ایک فن کارانہ کوشش۔

ایدواردو گلیانو
ترجمہ: آصف فرخی

خیر اور شر کی تماشا گاہ

خیر اور شر کی کشمکش میں مارے جانے والے ہمیشہ عام آدمی ہوتے ہیں۔ نیویارک اور واشنگٹن میں، شر کے خلاف خیر کے نام پر دہشت گردوں نے تقریباً پچاس ملکوں کے کارکنوں کو ہلاک کر ڈالا ہے اور شر کے خلاف خیر کے نام پر بش انتقام کی قسم کھا رہا ہے: ''ہم اس دُنیا کے شر کو جڑ سے ختم کر ڈالیں گے'' وہ اعلان کرتے ہیں۔ شر کو ختم کر ڈالیں گے؟ شر کے بغیر خیر کا کیا بنے گا؟ صرف مذہبی شدت پسندوں ہی کو دشمن کی ضرورت نہیں ہوتی کہ اپنے جنون کا جواز فراہم کر سکیں۔ دشمنوں کی ضرورت اس لیے بھی پڑتی ہے کہ اسلحہ سازی کی صنعت اور امریکا کے دیوقامت فوجی ساز وسامان کے وجود کا بھی جواز فراہم کیا جا سکے۔ خیر اور شر، شر اور خیر: اداکار اپنے اپنے مکھوٹے بدل لیتے ہیں، ہیرو راکھشس بن جاتے ہیں اور راکھشس دیوتا، اور یہ سب ان لوگوں کی ضروریات

کے تحت جو ڈراما تحریر کر رہے ہیں۔

یہ کوئی نئی بات نہیں۔ جرمن سائنس داں ورنر وان براؤن شر تھا جب اس نے وی ٹو راکٹ ایجاد کیے جو ہٹلر نے لندن پر برسا دیے، مگر اس دن مجسم خیر میں تبدیل ہو گیا جب اس نے اپنی مہارت امریکا کی خدمت میں پیش کر دیں۔ اسٹالن دوسری عالم گیر جنگ کے دوران اچھا تھا مگر بعد میں برا ہو گیا جب وہ شر کی سلطنت کا قائد بن کر ابھرا۔ سرد جنگ کے دوران جان اسٹائن بیک نے لکھا: ''شاید ہر ایک کو روسیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ روس میں بھی روسیوں کی ضرورت ہے۔ شاید وہ انہیں امریکی کہتے ہیں۔'' پھر روسی اچھے ہو گئے۔ آج پیوٹن بھی فرما رہے ہیں: ''شر کو سزا ملنی چاہیے۔''

صدام حسین خیر تھے اور ان کے کیمیائی ہتھیار بھی اچھے جو وہ ایرانیوں اور کردوں کے خلاف استعمال کر رہے تھے۔ پھر وہ شر بن گئے۔ ان کو ''شیطان'' بھی کہا گیا جب امریکا نے، جس نے ابھی پانامہ پر حملہ کیا ہی تھا، عراق پر دھاوا بول دیا اس لیے کہ عراق نے کویت پر حملہ کیا تھا۔ والد بزرگوار بش شر کے خلاف اس جنگ کے ذمہ دار تھے۔ جو انسانی اور ہم دردانہ جذبہ ان کے اس خاندان سے مخصوص ہے، اس سے کام لیتے ہوئے انہوں نے ایک لاکھ سے زیادہ عراقیوں کو ہلاک کر ڈالا، جن کی غالب اکثریت شہریوں کی تھی۔

''شیطان'' جہاں تھا اب بھی وہیں ہے مگر انسانیت کا یہ اوّل نمبر کا دشمن اب پیچھے چلا گیا ہے اور دشمن نمبر دو کے درجے پر پہنچ گیا ہے۔ دُنیا کے آزار کا نام اب اسامہ بن لادن ہے۔ وہ دہشت گردی کے بارے میں جو کچھ جانتا ہے، اسے سی آئی اے نے سکھایا ہے۔ بن لادن جس سے امریکا نے محبت کی اور مسلح کیا، افغانستان میں کمیونزم کے خلاف ''آزادی کے مجاہدین'' میں سے تھا۔ والد بزرگوار بش اس وقت نائب صدر تھے جب صدر ریگن نے کہا تھا کہ یہ ہیرو ''امریکا کے بنیاد گزار آباؤ اجداد کا اخلاقی نعم البدل ہیں۔'' وہائٹ ہاؤس کی اس رائے سے ہالی وڈ کو بھی اتفاق تھا: ان دنوں ''ریمبو ۳'' کی فلم بندی ہو رہی تھی: افغان مسلمان خیر تھے۔ پسر بش کے عہد میں، محض تیرہ سال بعد۔ اب وہ بدترین شر بن گئے ہیں۔

ہنری کسنجر ان پہلے لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اس المیے پر ردِعمل ظاہر کیا۔ ''دہشت

گردوں جتنے ہی مجرم وہ لوگ بھی ہیں جو انہیں تعاون، معاشی امداد اور محرک فراہم کرتے ہیں'' انہوں نے ان الفاظ میں اعلان کیا جو صدر بش نے چند گھنٹوں کے بعد دہرا دیے۔ اگر یہ بات دُرست ہے تو سب سے پہلے جس پر بم پڑنا چاہیے وہ کسنجر خود ہیں۔ وہ جتنے جرائم کے گناہ گار ہیں ان کی تعداد بن لادن اور باقی دنیا بھر کے دہشت گردوں سے کہیں زیادہ ہے اور بہت زیادہ ملکوں میں: کئی امریکی حکومتوں کے لیے کام کرتے ہوئے انہوں نے ''تعاون، معاشی امداد اور محرک'' فراہم کیا اس ریاستی دہشت گردی کے لیے جو انڈونیشیا، کمبوڈیا، قبرص، ایران، جنوبی افریقا، بنگلہ دیش میں برپا ہوئی اور جنوبی امریکی براعظم کے ان ملکوں میں بھی جو ''پلان کونڈور'' کی غلیظ جنگ کا نشانہ بنے۔

۱۱ ستمبر ۱۹۷۳ء کے دن، آج کی بھڑکتی ہوئی آگ سے ٹھیک ۲۸ برس پہلے، چلی میں صدارتی محل جل اٹھا تھا۔ کسنجر نے سلوادور آئندے (Allende) اور چلی کی جمہوریت کے لیے قبر کے کتبے کی پیش بینی کر دی تھی جب انہوں نے عام انتخابات کے نتیجے پر تبصرہ کیا تھا: ''کوئی وجہ نہیں کہ ہم یہ بات تسلیم کرلیں کہ ایک ملک مارکسی بن جائے، محض اپنے عوام کی غیر ذمہ داری کی وجہ سے۔'' لوگوں کی خواہشات کے لیے حقارت، ان بہت سی اتفاقی مماثلتوں میں سے ایک ہے جو ریاستی دہشت گردی اور انفرادی دہشت گردی کے درمیان موجود ہیں۔ مثال کے طور پر: ای ٹی اے، جو (ہسپانیہ کے) باسک علاقے کی آزادی کے نام پر لوگوں کو قتل کرتی ہے، اپنے ایک ترجمان کے ذریعے سے کہتی ہے:

''حقوق کا اقلیت اور اکثریت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔''

دہشت گردی کی مختلف صورتوں کے درمیان بہت مماثلت ہے..... دست کاری والی دہشت گردی اور اعلیٰ ترین ٹیکنولوجیکل سطح کی دہشت گردی، مذہبی کٹر پنتھیوں کی دہشت گردی اور مارکیٹ کے کٹر پنتھی، بے یارومددگار لوگوں کی دہشت گردی اور طاقت ور لوگوں کی دہشت گردی، پاگل جنونیوں کی دہشت گردی اور وردی پوش پیشہ وروں کی دہشت گردی۔ ان سب میں قدرِ مشترک انسانی زندگی کے لیے حقارت ہے: ہزاروں شہریوں کا قتل، جو ٹریڈ سینٹر کے ٹوئن ٹاورز کے ملبے تلے دب کر مارے گئے جب وہ ریت کے محل کی طرح ڈھیر ہو گئے اور گواٹے مالا کے دو لاکھ باشندوں کا قتل، جس کی اکثریت ''دیسی'' تھی، جو جل کر بجھ گئے اور دُنیا کے کسی ٹی وی یا اخبار نے ان کی طرف توجہ نہ کی۔ گواٹے مالا کے ان لوگوں کو کسی انتہا پسند مسلمان نے موت کے گھاٹ نہیں اتارا تھا بلکہ ان دہشت گرد سپاہیوں کے ہاتھوں جن کو امریکا کی ایک حکومت کے بعد دوسری حکومت سے

''تعاون، معاشی امداد اور محرک'' حاصل ہوا۔

موت کا جشن منانے والوں میں یہ ضبط بھی مشترک ہے کہ تمام سماجی، ثقافتی اور قومی تضادات کو فوجی اصطلاح تک محدود کرلیا جائے۔ شر کے مقابلے میں خیر کے نام پر، بے شرکت اور واحد حقیقت کے نام پر وہ ہر بات کا ارادہ کرلیں گے، پہلے ہلاک کریں گے اور پھر اس کے بعد ہی پوچھیں گے اور اس طرح وہ اسی دشمن کو نشوونما پہنچاتے ہیں، جس سے وہ نبرد آزما ہیں۔

(پیرو میں) سیندورولومینوسو (''روشن راستہ'') کے ظلم وستم نے صدر فیوجی موری کو پروان چڑھایا جنہوں نے قابلِ ذکر عوامی مقبولیت کے ساتھ، ظلم و دہشت کی حکمرانی کو رائج کیا اور پیرو کو ایک محض کیلے کی قیمت پر بیچ ڈالا۔

مشروقِ وسطیٰ میں امریکا کے ظلم وستم نے بڑی حد تک، ''اللہ کے نام پر'' دہشت گردی کی مقدس جنگ کو رائج کیا۔

آج ''مہذب ملک'' کے سربراہِ اعلیٰ ایک نئی صلیبی جنگ کے لیے للکار رہے ہیں مگر اپنے نام پر کیے جانے والے جرائم سے اللہ بے گناہ ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا (God) نے نازی ہولوکاسٹ کے احکامات جاری نہیں کیے تھے کہ یہووا کے بندگان کے خلاف ہو اور نہ یہووا نے سابرہ اور شتیلا کے قتل عام کا حکم دیا اور یہووا نے فلسطینیوں کو ان کی سرزمین سے محروم کردینے کا حکم بھی نہیں دیا۔ کیا اللہ، خدا اور یہووا ایک ہی معبود کے تین نام نہیں ہیں؟ غلط کاروں کا المیہ یہ ہے کہ یہ فرق نہیں کیا جاسکتا کہ ان میں سے کون کیا ہے۔ ان دھماکوں کا دھواں ایک وسیع تر دھوئیں کی چادر کا حصہ ہے جو ہمیں دیکھنے سے روک دیتی ہے۔ ایک انتقام سے دوسرے انتقام تک، دہشت گرد ہمیں قبرستان کی راہ چلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ حال ہی میں شائع ہونے والی ایک تصویر میں نے دیکھی: نیویارک کی دیوار پر کسی نے لکھ دیا تھا: ''آنکھ کے بدلے آنکھ، دُنیا کو اندھا کردیتی ہے۔''

تشدد کا گھیرا مزید تشدد اور انتشار کو نمایاں کرتا ہے: درد، خوف، عدم رواداری، نفرت، جنون۔ اس سال کے آغاز میں الجزائر کے احمد بن باللہ نے خبردار کیا تھا: ''جس نظام نے گائے کو پاگل کیا تھا وہ انسانوں کو بھی پاگل کرے گا۔'' اور پاگل، نفرت کے مارے پاگل ہوجانے والے، اسی طرح چلتے ہیں جیسے فوج کے جرنیل۔

تین سال کا ایک بچہ جس کا نام لوچا ہے، تبصرہ کرنے لگا کہ ان دنوں ''دنیا کو یہ نہیں پتہ کہ اس کا گھر کہاں ہے''۔ اس وقت وہ نقشے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خبریں بھی دیکھ سکتا تھا۔

ماہر لسانیات نوم چومسکی امریکا کی خارجہ پالیسی کے سخت ترین مبصرین میں سے ایک ہیں جنھوں نے متعدد کتابوں میں بین الاقوامی تعلقات کے بدلتے ہوئے تناظر میں امریکی روّیوں پر نکتہ چینی کی ہے۔ وہ امریکا کی معروف یونی ورسٹی ''ایم آئی ٹی'' (میسا چوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی) میں پروفیسر ہیں۔ چومسکی نے حال ہی میں پاکستان کا دورہ کیا اور اقبال احمد یادگاری خطبہ دیا۔

نوم چومسکی
ترجمہ: سیّد کاشف رضا

بم باری کے بارے میں

دہشت گردی پر بنی یہ حملے بہت بڑا ظالمانہ فعل تھے۔ ہوسکتا ہے یہ حملے ایسے دیگر واقعات کے پیمانے کو نہ پہنچتے ہوں مثلاً کلنٹن کی طرف سے سوڈان پر بغیر کسی قابلِ اعتبار بہانے کے بمباری، جس کے نتیجے میں سوڈان کی ادویات کی سپلائی کا نصف حصہ تباہ ہوگیا اور نامعلوم کتنے افراد ہلاک ہوگئے (نہیں معلوم کتنے، کیوں کہ امریکا نے اس سلسلے میں اقوام متحدہ کی تحقیقات میں کھنڈت ڈال دی اور اب ان تحقیقات کو آگے بڑھانے میں کسی کو دلچسپی نہیں) اس سے کہیں زیادہ بھیانک واقعات کو تو خیر چھوڑیے، جو بڑی آسانی سے یاد آجاتے ہیں لیکن اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ حملے نہایت ہی ہولناک تھے۔

حملوں کی زد پر ہمیشہ کی طرح، عام افراد آئے: نگراں، ماتحت، آگ بجھانے والے وغیرہ وغیرہ۔ امکان یہی ہے کہ یہ حملے فلسطینیوں اور ایسی ہی دیگر بے یار و مددگار اور بچھڑی ہوئی قوموں کے لیے ایک زبردست وار ثابت ہوں گے۔ یہ بھی امکان ہے کہ ان کے نتیجے میں ظالمانہ سیکورٹی کنٹرول کو راہ ملے گی نیز شہری آزادیوں کو دبائے جانے پر مبنی کئی ممکنہ اثرات بھی سامنے آسکتے ہیں۔
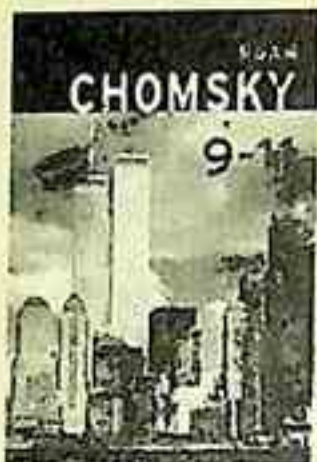
یہ واقعات ڈرامائی طور پر میزائل دفاع کے منصوبے کی بدمعاشی کو ظاہر کرتے ہیں جیسا کہ پہلے ہی واضح تھا اور جس کی اسٹریٹجک (Strategic) تجزیہ کار مسلسل نشان دہی بھی کرتے رہے ہیں، اگر کوئی امریکا میں، انسانی تباہی کے ہتھیاروں کے استعمال کے بشمول، کوئی بڑی کارروائی کرنا چاہے تو اس بات کا امکان نہیں کہ وہ میزائلوں سے حملہ آور ہوگا اور یوں اپنے میزائلوں کی فوری تباہی کا مقدر دیکھے گا۔ اس کے لیے ایسے بے شمار آسان تر راستے ہیں جنھیں بنیادی طور پر منتخب کرنے سے روکا ہی نہیں جاسکتا۔ مگر آج کے واقعات کو ممکنہ طور پر انہی (میزائل) نظاموں کو آگے بڑھانے اور انہیں نافذ کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔ خلا کو "فوجیانے" (Militarisation) کے منصوبوں کے لیے "دفاع" کا بہانہ کافی نہیں اور اچھے تعلقات عامہ (پی آر) سے اب بودے دلائل خوف زدہ عوام کے ذہنوں میں کچھ نہ کچھ بار پاجائیں گے۔

مختصر یہ کہ یہ جرم جنگ پسند دائیں بازو کے لیے ایک تحفہ ہے، ان لوگوں کے لیے جو اپنے علاقوں کو کنٹرول کرنے کے لیے طاقت کے استعمال کی اُمید کرتے ہیں۔ ممکنہ امریکی اقدامات اور ان کے نتیجے میں ہونے والے واقعات کا تو ذکر ہی کیا..... ہوسکتا ہے مزید ایسے واقعات ان اقدامات کے نتیجے میں ہوں یا اس سے بھی سنگین واقعات۔ آگے کے امکانات ان تازہ ترین مظالم سے پہلے دکھائی دینے والے امکانات سے بھی زیادہ منحوس نظر آرہے ہیں۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ہمیں کس ردعمل کا اظہار کرنا چاہیے تو ہمارے پاس منتخب کرنے کے لیے ان راستوں میں سے کوئی ایک راستہ ہے۔ ہم خوف کا اظہار کرسکتے ہیں جس میں ہم حق بجانب ہوں گے، ہم یہ جاننے کی کوشش کرسکتے ہیں کہ کون سے عوامل ان جرائم کا باعث بنے، مطلب یہ کہ ہم ممکنہ مجرموں کے دماغوں کو کھوجنے کی ایک کوشش کریں۔ اگر ہم یہ آخری راستہ منتخب کریں تو اس سے اچھی اور کوئی بات نہیں ہوگی۔ سوائے اس کے کہ ہم رابرٹ فسک کی بات پر دھیان دیں جس کا اس علاقے کے بارے میں علم اور تفہیم کئی برس کی زبردست رپورٹنگ کے بعد بے مثل ہوچکا ہے۔ "کچلے ہوئے اور ذلت کے مارے لوگوں کی شرانگیزی اور حیرت ناک سنگ دلی" کو بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ "آئندہ دنوں میں دنیا کو جس جنگ پر یقین کرنے کے لیے کہا جائے گا وہ جمہوریت اور دہشت کے درمیان نہیں ہوگی۔ یہ متعلق ہوگی ان امریکی میزائلوں سے جنھوں نے فلسطینیوں کے گھر توڑ پھوڑ ڈالے، ان امریکی ہیلی کاپٹروں کے جنھوں

نے ۱۹۹۶ء میں ایک لبنانی ایمبولینس پر میزائل داغے، ان امریکی بموں سے جو قنعا نامی گاؤں پر گرے اور اس لبنانی ملیشیا سے...... جسے امریکا کے اسرائیلی اتحادی نے یونیفارم پہنائے اور پیسے دیے تھے جس نے پناہ گزین بستیوں میں زناکاری اور قتل و غارت گری کرتے ہوئے راستہ بنایا تھا۔'' وغیرہ وغیرہ میں پھر کہوں گا، ہمیں انتخاب کرنا ہے۔ ہم سمجھنے کی کوشش بھی کر سکتے ہیں اور اس سے انکار بھی اور انکار کی صورت میں موجودہ واقعات سے بدتر واقعات میں اپنا حصہ ڈال سکتے ہیں جن کے سامنے آنے کا امکان موجود ہے۔
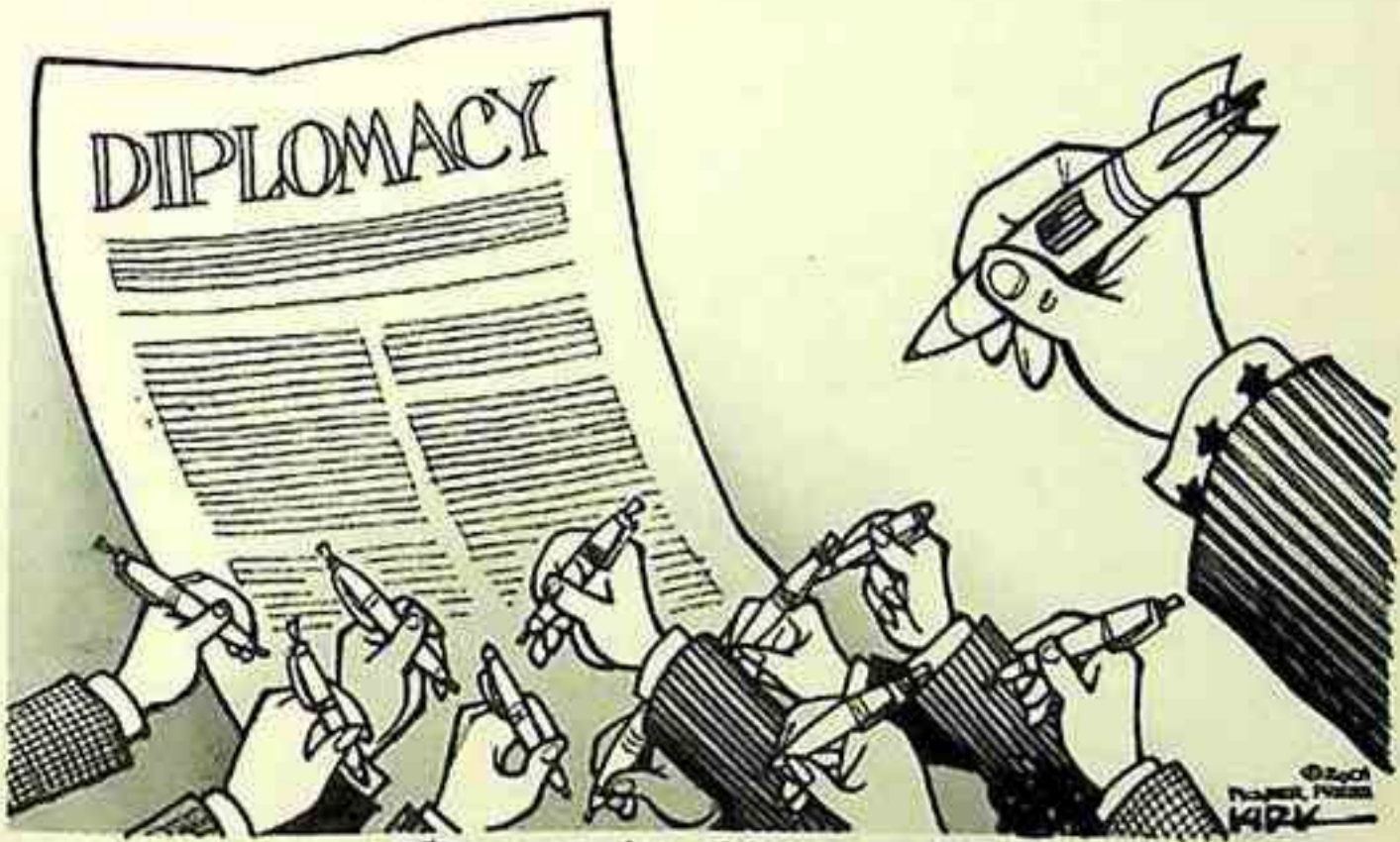
ADDRESSING NUCLEAR WAR

مائیکل البرٹ نے نوم چومسکی سے ای میل کے ذریعے سوالات کیے۔ یہ سوال اور چومسکی کے جواب ''زیڈ میگزین'' میں شائع ہوئے۔

نوم چومسکی
ترجمہ: سیّد کاشف رضا

البرٹ کے سوالوں کے جوابات

سوال: ان دنوں فوجوں کی بڑی پیمانے پر نقل و حرکت دیکھنے میں آرہی ہے اور جنگی زبان بولی جارہی ہے حتیٰ کہ حکومتوں کو ختم کرنے کی باتیں کی جارہی ہیں۔ تاہم بہت سے لوگوں کے خیال میں ابھی کافی حد تک احتیاط کا مظاہرہ کیا جارہا ہے تو جناب اصل میں ہو کیا رہا ہے؟

نوم چومسکی: حملوں کے ابتدائی دنوں سے اب تک بش انتظامیہ کو نیٹو رہنماؤں، خطے کے ماہرین اور لگتا ہے کہ خود خفیہ ایجنسیوں (ہمارے اور آپ کی طرح کے لوگوں کے علاوہ) نے متنبہ کیا ہے کہ اگر انہوں نے ایک بڑے حملے کی صورت میں ردِعمل کا اظہار کیا، جس سے کئی بے گناہ لوگوں کی جانیں چلی گئیں، تو ایسا کرنا بن لادن کی دل کی گہرائیوں سے مانگی ہوئی دعاؤں کا ثمر ہوگا۔ جیسا کہ فرانس کے وزیر خارجہ نے کہا کہ ایسا کرنا ''شیطانی پھندے'' میں گرفتار ہونے کے مترادف ہوگا۔ یہ بات حقیقت ہوگی، بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ، اگر یہ لوگ بن لادن کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں اور وہ بھی گیارہ ستمبر کے جرائم میں اس کے ملوث ہونے کی قابل اعتبار شہادت فراہم کیے بغیر۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو پھر وہ مسلمانوں کی اس عظیم اکثریت میں بھی شہید کا رتبہ پاجائے گا جو ان جرائم کی مذمت کررہی ہے۔ اور مذمت تو خود بن لادن نے بھی کی ہے یہ کہہ کر کہ ان (حملوں) کا فائدہ کیا ہے، اس نے ان جرائم میں کسی بھی حوالے سے ملوّث ہونے بلکہ اس کا علم رکھنے تک کی تردید کی ہے اور یہ تبصرہ کیا ہے کہ ''معصوم عورتوں، بچوں اور دیگر انسانوں کا قتل'' ایک ایسا کام ہے جسے اسلام سختی سے منع کرتا ہے، حتیٰ کہ دورانِ جنگ بھی۔'' (بی بی سی، ۲۹ ستمبر) اُس کی آواز اُن دسیوں ہزار کیسٹوں میں سنائی دیتی رہے گی جو مسلم دنیا میں پہلے ہی سے تقسیم ہورہے

ہیں۔ اس کے بہت سے انٹرویو بھی زندہ رہیں گے جن میں سے کچھ اس نے گزشتہ چند دنوں میں دیے۔ ایسا حملہ جس میں معصوم افغان— طالبان نہیں بلکہ ان کے دہشت زدہ شکار— مارے جائیں، درحقیقت بن لادن کے نیٹ ورک اور دوسرے دہشت گرد گروپوں کے زیرِ تعلیم افراد کے ہولناک مقصد کے لیے نئے رنگروٹ بھرتی کرنے کی ایک اپیل کے مترادف ہوگا۔ وہ دہشت گرد نیٹ ورک جو سی آئی اے اور اس کے حواریوں نے ۲۰ سال قبل روسیوں کے خلاف ''جہاد'' کے لیے تیار کیے تھے، اس عرصے میں ان گروہوں نے اپنے ایجنڈے پر کام شروع کر دیا اور ۱۹۸۱ء میں مصر کے صدر سادات کو قتل کر کے ''افغانیوں'' کے سب سے زیادہ پُرجوش تخلیق کاروں میں سے ایک کو ختم کر دیا۔ یہ ''افغانی'' دنیا بھر کے انقلابی انتہاپسند مسلمان عناصر پر مبنی رنگروٹ ہیں جنہیں افغانستان میں لڑائی کے لیے بھرتی کیا گیا تھا۔ تو ہوا یوں کہ کچھ وقت کے بعد یہ پیغام بش انتظامیہ کی سمجھ میں آ گیا اور اس نے اپنے نقطۂ نظر سے بھی کافی عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک مختلف راستہ اپنانے کا انتخاب کیا۔ تاہم آپ کی جانب سے ''احتیاط'' کا لفظ مجھے قابل بحث لگتا ہے۔ ۱۶ ستمبر کو نیویارک ٹائمز نے خبر دی کہ ''واشنگٹن نے (پاکستان سے) یہ مطالبہ بھی کیا ہے کہ افغانستان کی شہری آبادی کو بھیجی جانے والی ایندھن کی رسد منقطع کر دی جائے اور ٹرکوں کے کاروانوں کو بھی وہاں جانے سے روک دیا جائے جو وہاں خوراک اور دیگر سامانِ رسد مہیا کرتے ہیں''۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس رپورٹ کا مغرب میں کوئی قابل مشاہدہ ردعمل سامنے نہیں آیا۔ یوں ایک مرتبہ پھر ہماری یاددہانی ہوجاتی ہے کہ اس مغربی تہذیب کی فطرت کیا ہے جس کا علَم بلند کرنے کے دعوے ہمارے رہنما اور طبقہ امراء کے مبصرین کیا کرتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کے لیے ایک اور سبق ہے جو بندوق کے دوسرے کنارے پر رہے اور صدیوں سے مار کھا رہے ہیں۔ اگلے دنوں میں مذکورہ مطالبات پورے کر دیئے گئے۔ ۲۷ ستمبر کو نیویارک ٹائمز کے اسی مکتوب نگار نے خبر دی کہ پاکستان میں حکام نے ''آج کہا ہے کہ وہ ملک کی افغانستان سے ملحق ۱۴۰۰ میل کی سرحد بند کرنے کے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ اس اقدام کی درخواست بش انتظامیہ نے کی تھی کیوں کہ، بقول حکام کے، وہ چاہتے تھے کہ بن لادن کا کوئی آدمی مہاجرین کے عظیم انبوہ میں چھپ کر نہ آ جائے'' (جان برنس، اسلام آباد)

تو دنیا کے سب سے بڑے اخبار کے مطابق واشنگٹن نے پاکستان سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ بڑی تعداد میں افغانوں کو قتل کر ڈالے جن میں سے لاکھوں پہلے ہی بھوک کے مارے موت کے

کنارے پر ہیں۔ تقریباً تمام
امدادی مشن افغانستان سے واپس
آچکے یا بمباری کے خدشے کے
پیشِ نظر ملک سے نکالے جاچکے
ہیں۔ قابلِ ترس افراد کی ایک عظیم
تعداد اس وقت سے خوف و دہشت
کے مارے سرحدوں کی طرف
بھاگ رہی ہے جب سے واشنگٹن
نے افغانستان میں بقا کے باقی
ماندہ امکانات کو بھی بموں سے تباہ
کرنے اور شمالی اتحاد کو اسلحے سے
لدی پھندی مسلح قوت میں تبدیل
کرنے کی دھمکی دی ہے۔ شمالی
اتحاد کو غالباً ان مظالم کا اعادہ
کرنے کی کھلی چھوٹ دی جانے
والی ہے جن کے باعث ملک
ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا تھا اور افغان
آبادی کے ایک بڑے حصے نے
طالبان کو خوش آمدید کہا تھا جب
ان متحارب قاتل گروہوں کو نکال
باہر کیا گیا جنہیں اب واشنگٹن اور
ماسکو اپنے مقاصد کے لیے استعمال
کرنے کی امیدیں لگائے بیٹھے
ہیں۔ مہاجرین جب سیل شدہ
سرحدوں پر پہنچیں گے تو وہاں وہ

عمل: گوپی گجوانی
بشکریہ: دی لٹل میگزین، نئی دہلی

خاموشی سے موت کا انتظار کریں گے۔ ان میں سے چند ہی دور دراز پہاڑی درّوں سے فرار ہو کر پاکستان آنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ ان میں سے کتنے لوگ پہلے ہی جان جانِ آفریں کے سپرد کر چکے ہیں، ہمیں نہیں معلوم اور چند ہی لوگ ہوں گے جنہیں اس سے کوئی دلچسپی ہو۔ امدادی ایجنسیوں کے علاوہ میں نے کسی کو اس سلسلے میں اندازہ لگاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ چند ہی ہفتوں میں شدید سردیاں شروع ہونے والی ہیں۔ سرحدوں کے اس پار کچھ رپورٹر اور امدادی کارکن مہاجر کیمپوں میں موجود ہیں۔ انہوں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ کافی ہولناک ہے مگر وہ جانتے ہیں اور ہم بھی، کہ وہ تو صرف ان لوگوں کو دیکھ پا رہے ہیں جو خوش قسمت ہیں، وہ چند لوگ جو فرار ہو سکے، اور جو اپنی اس امید کا اظہار کرتے ہیں کہ ''حتیٰ کہ ظالم امریکیوں کو بھی ہمارے تباہ شدہ ملک پر کچھ ترس آنا چاہیے'' اور اس خاموش اور وحشیانہ قتلِ عام سے باز رہنا چاہیے (بوسٹن گلوب، ۲۷ ستمبر۔ صفحہ اوّل) اس معاملے کو غالباً سب سے زیادہ مناسب انداز میں حیرت انگیز اور حوصلہ مند بھارتی ادیب اور سماجی کارکن اروندھتی رائے نے بیان کیا ہے۔ بش انتظامیہ کی جانب سے ''آپریشن لامتناہی انصاف'' کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں ''نئی صدی کا لامتناہی انصاف ملاحظہ فرمایئے۔ عام شہری بھوکوں مر رہے ہیں اور اس دوران اپنے قتل کر دیے جانے کا انتظار بھی کر رہے ہیں'' (گارجین۔ ۲۹ ستمبر)

سوال ۲: اقوامِ متحدہ نے نشان دہی کی ہے کہ افغانستان میں قحط سالی کا خطرہ بہت مہیب ہے۔ اس معاملے میں بین الاقوامی تنقید بڑھی ہے اور اب امریکا اور برطانیہ بھوک کے خاتمے کے لیے خوراک کی امداد فراہم کرنے کی باتیں کر رہے ہیں۔ کیا وہ دراصل اختلافی نقطہ ہائے نظر کے سامنے سر جھکا رہے ہیں یا یہ محض دکھاوا ہے؟ ان کا مقصد کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی مساعی کا اثر اور پیمانہ کیا ہوگا؟

نوم چومسکی: اقوامِ متحدہ نے اندازہ لگایا ہے کہ تقریباً ۷۰ سے ۸۰ لاکھ افراد کو بھوک سے دوچار ہونے کے لازمی خطرے کا سامنا ہے۔ نیویارک ٹائمز نے ایک مختصر سی خبر (۲۵ ستمبر) میں یہ بتایا ہے کہ تقریباً ۶۰ لاکھ افغانوں کا گزارا اقوامِ متحدہ کے امدادی خوراک کے پروگرام پر ہے۔ اسی طرح وہ ۳۵ لاکھ افراد ہیں جو بیرونِ ملک مہاجر کیمپوں میں مقیم ہیں اور جن میں سے بہت سے سرحدیں بند کیے جانے سے قبل فرار ہوئے تھے۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ سرحد پار چند کیمپوں میں خوراک پہنچائی جا رہی ہے۔ اگر واشنگٹن کے حکام اور ادارے کے دفاتر میں بیٹھے لوگوں کی کھوپڑیوں میں ذرا سی بھی عقل ہے تو انہیں یہ اندازہ کر لینا چاہیے کہ انہیں خود کو انسانوں کے ہمدرد کے طور پر

پیش کرنا ہوگا جو اُس ہولناک المیہ کو ٹالنے کی کوشش کر رہے ہوں جو بمباری اور فوجی حملے کی دھمکی نیز ان کے اپنے مطالبے پر سرحدوں کی بندش سے پیدا ہوگا۔'' ماہرین نے بھی امریکا سے کہا ہے کہ وہ افغان مہاجرین کے لیے امداد میں اضافہ کرکے اور ان کی معیشت کی تعمیرِ نو میں مدد کرکے اپنے امیج کو بہتر بنائے'' (کرسچن سائنس مانیٹر، ۲۸ ستمبر) یہ بات تو انتظامیہ کے حکام، تعلقات عامہ کے ماہرین کے سکھائے بغیر بھی جان لیتے کہ انہیں سرحد پار پہنچ جانے والے مہاجرین کے لیے کم از کم کچھ نہ کچھ خوراک ضرور فراہم کرنی چاہیے اور کم از کم افغانستان کے اندر بھوکوں مرنے والے افراد کے لیے فضا سے خوراک پھینکنے کی بات تو کرنی چاہیے۔ نہ صرف اس لیے تاکہ ''زندگیاں بچائی جاسکیں'' بلکہ اس لیے بھی تاکہ ''افغانستان کے اندر دہشت گرد گروہوں کو تلاش کرنے کی کوششوں میں مدد حاصل کی جاسکے۔'' (بوسٹن گلوب، ۲۷ ستمبر، نے پینٹاگون کے ایک افسر کا بیان نقل کیا جس نے اس بات کو ''لوگوں کے دل اور دماغ فتح کرنا'' کہہ کر بیان کیا) نیویارک ٹائمز کے مدیران نے اگلے روز اسی خیال پر خامہ فرسائی کی، یہ خبر شائع کرنے کے ۱۲ روز بعد کہ ایک قاتلانہ آپریشن کو روبہ عمل لایا جارہا ہے۔

امداد کا پیمانہ کیا ہوگا؟ بس امید ہی کی جاسکتی ہے کہ امداد بڑے پیمانے پر ہوگی۔ ورنہ چند ہفتوں میں انسانی المیے کا پیمانہ بڑا ہوگا مگر ہمیں یہ بات دماغ میں رکھنی چاہیے کہ بڑے پیمانے پر امدادی خوراک فضا سے پھینکے جانے میں تو شروع ہی سے کوئی رکاوٹ نہیں تھی اور ہم اس کا تو اندازہ ہی نہیں کرسکتے کہ کتنے لوگ پہلے ہی ہلاک ہوچکے ہیں یا جلد ہی ہونے والے ہیں۔ اگر حکومت میں ذرا بھی عقل ہے تو کم از کم ''بڑے پیمانے پر فضا سے خوراک پھینکے جانے'' کا تماشا تو ضرور ہوگا جس کی حکام نے نشان دہی بھی کی ہے۔

سوال ۳: لگتا ہے کہ بین الاقوامی قانونی ادارے بن لادن اور دیگر پر مقدمہ چلانے کی کوششوں کی توثیق کردیں گے۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ اُن کا جرم، بشمول ان کی جانب سے طاقت کے استعمال کے، ثابت کیا جاسکے گا۔ تو امریکا اس راستے سے اجتناب کیوں کر رہا ہے؟ کیا اس کا باعث یہ ہے کہ وہ اس راستے کو قانونی شکل نہیں دینا چاہتا جو بعد میں خود اس کے دہشت گردانہ اقدامات کے خلاف استعمال کیا جاسکے یا پھر اس کا باعث دیگر عوامل ہیں؟

نوم چومسکی: زیادہ تر دنیا امریکا سے کہہ رہی ہے کہ بن لادن کو جرم سے متعلق ثابت کرنے کے سلسلے میں کوئی ثبوت فراہم کرے اور اگر ایسا کوئی ثبوت فراہم کیا جاسکے تو کسی بین الاقوامی کوشش

کے لیے بڑی تعداد میں حمایت جمع کرلینا چنداں مشکل نہ ہوگا۔ ایسی کوشش جو اقوام متحدہ کے نام پر ہو اور جو بن لادن کو گرفتار کرنے اور اس پر اور جرم میں شریک اس کے ساتھیوں پر مقدمہ چلانے کے لیے ہو۔ تاہم یہ کوئی سادہ سا معاملہ نہیں۔ اگر بن لادن اور اس کا نیٹ ورک ۱۱ ستمبر کے جرائم میں ملوث تھا تو بھی ان کے خلاف کوئی قابلِ اعتبار گواہی سامنے لانا شاید بڑا مشکل ہو۔ جیسا کہ سی آئی اے، جس نے ان تنظیموں کو پالا پوسا ہے اور جو ۲۰ برس سے ان کا بڑے قریب سے مشاہدہ کرتی رہی ہے، بڑی اچھی طرح جانتی ہے کہ یہ تنظیمیں منتشر، لامرکز اور ایسی ساخت کی حامل ہیں جن میں اعلیٰ سے ادنیٰ درجوں تک عہدے دار وغیرہ نہیں ہوتے اور غالباً ان کا آپس میں رابطہ اور براہ راست ان کی رہنمائی بھی بہت کم ہوتی ہے اور جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں ہوسکتا ہے زیادہ تر مجرمان نے خود کو اپنے ہولناک مشن کے دوران ہلاک کر ڈالا ہو۔ پس منظر میں کچھ اور مسائل بھی موجود ہیں۔ پھر سے ارون دھتی رائے کا حوالہ دوں گا، ''بن لادن کی ملک بدری سے متعلق امریکی مطالبات پر طالبان کا ردعمل اتنا معقول رہا ہے کہ وہ خود طالبان کے کردار اور روّیے سے لگا نہیں کھاتا: انہوں نے کہا ہے کہ ثبوت لائیں تب ہم اسے آپ کے حوالے کردیں گے۔'' وہ ان کئی وجوہات میں سے ایک کا تذکرہ بھی کرتی ہیں جن کے باعث متذکرہ فریم ورک واشنگٹن کے لیے قابلِ قبول نہیں: ''اب جب کہ چیف ایگزیکٹو افسران کی ملک بدری کی بات ہو رہی ہے کیا بھارت امریکا کے وارن اینڈرسن کی ملک بدری کی ایک ضمنی سی درخواست کرسکتا ہے؟ اینڈرسن یونین کاربائیڈ کا چیئرمین تھا جو ۱۹۸۴ء میں بھوپال میں گیس کے اخراج کی ذمے دار تھی جس سے ۱۶ ہزار افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ ہم مختلف شواہد کا ایک دوسرے سے موازنہ کرکے انہیں فائلوں میں اکٹھا کرچکے ہیں۔ کیا ہم اسے حاصل کرسکتے ہیں، پلیز؟''

ایسے موازنے مغربی رائے عامہ کے انتہا پسند حلقوں میں جنونی پن کو ابھارتے ہیں۔ ان حلقوں میں سے کچھ کو ''بایاں بازو'' کہا جاتا ہے۔ لیکن وہ اہلِ مغرب جنہوں نے اپنی سلامت طبع اور اخلاقی دیانت برقرار رکھی ہوئی ہے انہیں یہ موازنے بامعنی دکھائی دیتے ہیں۔ حکومتی قائدین غالباً اس بات کو سمجھتے ہوں گے اور ارون دھتی رائے نے جو مثال پیش کی یہ تو ظاہر ہے کہ صرف شروعات ہے اور ایک چھوٹے درجے کی مثال ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ ۱۱ ستمبر کے جرم کا درجہ اس قدر بلند تھا اور پھر یہ کہ یہ جرم واضح طور پر کسی ریاست نے نہیں کیا تھا۔ فرض کریں ایران کارٹر اور ریگن انتظامیہ کے اعلیٰ سطح کے افسران کی ملک بدری کا مطالبہ کرتا اور ان جرائم کے ثبوت پیش کرنے سے انکار کردیتا

جن کا الزام وہ ان پر دھرنے جارہا تھا، اور ان کے جرائم چاہے واقعی ایک حقیقت ہوتے، یا فرض کریں نکاراگوا اقوامِ متحدہ میں امریکا کے سفیر کی ملک بدری کا مطالبہ کرتا، جسے اب ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کی قیادت کرنے کے لیے تعینات کر دیا گیا ہے، ایک ایسا شخص جس کا ریکارڈ یہ ہے کہ اس نے ہنڈوراس کی صحیح معنوں میں ایک جاگیر کے مشیر اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں اور جہاں وہ ان ریاستی دہشت گردوں کے مظالم سے یقیناً آگاہ تھا جن کی وہ پشت پناہی کر رہا تھا اور جو اس دہشت گردانہ جنگ کے امور کی بھی دیکھ بھال کر رہا تھا جس کے لیے عالمی عدالت اور سلامتی کونسل نے امریکا کی مذمت کی (ایک ایسی قرارداد میں جسے امریکا نے ویٹو کر دیا) اور اس طرح کی کئی دوسری مثالیں ہیں۔ کیا امریکا خواب میں بھی ان مطالبات کا جواب دینے کا سوچ سکتا ہے جب کہ کوئی ثبوت بھی پیش نہ کیا گیا ہو یا اگر کافی ثبوت پیش کر بھی دیے گئے ہوں۔

یہ دروازے بند ہی رہیں تو بہتر ہے جیسا کہ اس شخص کی ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کی قیادت کے لیے تعیناتی پر خاموش رہنا بہتر ہے جس نے اس آپریشن کی قیادت کی ہو جسے دنیا میں موجود اعلیٰ ترین اداروں نے دہشت گردی قرار دے کر ان کی مذمت کی ہو۔ جوناتھن سونفٹ بھی یہ چیز دیکھتا تو صم بکم ہو جاتا۔

شاید یہی وجہ رہی ہو کہ انتظامیہ کے پبلسٹی ماہرین نے ''جنگ'' کی مفید حد تک مبہم اصطلاح کو ''جرم'' جیسی زیادہ واضح اصطلاح پر ترجیح دی۔ ''انسانیت کے خلاف جرم'' جیسا کہ اسے رابرٹ فسک، میری رابنسن اور دوسروں نے قرار دیا اور بالکل درست قرار دیا ہے۔ جرائم کتنے ہی ہولناک کیوں نہ ہو ان سے نمٹنے کا ایک جانا مانا اور پائیدار طریقہ کار ہوتا ہے۔ ان کے لیے ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے، اس اصول کی پاسداری کی ضرورت ہوتی ہے کہ ''وہ لوگ جو ان اقدامات کے مجرم ہیں'' جب ثبوت مل جائے تو انہیں ہی ذمہ دار ٹھہرایا جائے نہ کہ دوسروں کو (پوپ جان پال دوئم۔ نیویارک ٹائمز، ۲۴ ستمبر)۔ اُس قابلِ رحم قوم کی نامعلوم تعداد کو نہیں جو سیل شدہ سرحدوں پر خوف کے عالم میں بھوکوں مر رہی ہے، اگرچہ اس معاملے میں بھی ہم بات ''انسانیت کے خلاف جرائم'' ہی کی کر رہے ہیں۔

سوال ۴: دہشت گردی کے خلاف جنگ کی ذمہ داری سب سے پہلے ریگن نے سرد جنگ کے متبادل کے طور پر اٹھائی تھی تاکہ عوام کو ڈرایا دھمکایا جاسکے اور یوں ایسے پروگرام آگے بڑھائے جائیں جو عوامی مفاد کے برخلاف تھے۔ مثلاً غیر ملکی مہمات، عمومی حربی اخراجات، دیکھ بھال کے

اخراجات وغیرہ وغیرہ۔ اب ہم اسی سمت ایک بڑی اور زیادہ شدید مسائل ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ کیا یہ مشکل کہ ہم دنیا بھر میں عام شہریوں پر حملوں کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں اس مسائل کو آگے بڑھانے میں پیچیدگیاں پیدا کر رہی ہے؟ کیا یہ سعی واقعتاً کوئی ''گولی چلائے بغیر جنگ'' کے ذریعے کامیاب نہیں ہوسکتی؟

نوم چومسکی: ریگن انتظامیہ ۲۰ برس قبل اقتدار میں آئی اور اعلان کیا کہ اس کی سب سے بڑی دلچسپی بین الاقوامی دہشت گردی کا طاعون جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں ہے، اس نے اسے ایک ایسا سرطان قرار دیا جو تہذیب کو تباہ کر رہا تھا۔ تو انہوں نے اس طاعون کا علاج نہایت غیر معمولی پیمانے پر ایک بین الاقوامی دہشت گرد نیٹ ورک تشکیل دے کر کیا۔ نتیجہ کے طور پر وسطی امریکا، مشرقِ وسطیٰ، افریقا، جنوب مشرقی ایشیا اور دیگر مقامات پر کیا کچھ ہوا— سب کو معلوم ہے یا ہونا چاہیے۔ جیسا کہ آپ نے فرمایا، مختلف بہانوں سے ایسے پروگرام شروع کیے گئے جو نہ صرف مقامی آبادی کے لیے بے انتہا خطرے کا باعث تھے بلکہ انسانی بقا کو بھی ان سے خطرہ تھا۔ کیا انہوں نے کوئی ''گولی والی جنگ'' شروع کی تھی؟ اس پروگرام پر عمل درآمد سے انہوں نے دنیا بھر میں لاشوں کا جو انبار چھوڑا وہ بہت بڑا تھا مگر درحقیقت انہوں نے عام طور پر بندوقیں خود نہیں چلائی تھیں، سوائے لیبیا پر بمباری جیسی تعلقات عامہ پر مبنی شفاف مشق کے جو تاریخ میں جنگ کا پہلا جرم تھا جس کا وقت پرائم ٹائم ٹی وی کو نظر میں رکھتے ہوئے طے کیا گیا اور جو اس آپریشن کی پیچیدگی اور براعظم یورپ کے ممالک کی جانب سے ساتھ دینے سے انکار کے باعث کوئی چھوٹی سی مسائی نہیں تھی — تشدد، قطعِ اعضا، زنا کاری اور قتلِ عام تو وسیلوں کے ذریعے عمل میں لائے گئے۔

اگر ہم دہشت گردی کے اس بڑے مگر ناقابلِ ذکر حصے کو ایک طرف بھی رکھ دیں جس کی جڑیں دہشت گرد ریاستوں سے ملتی ہیں، جس میں ہماری اپنی ریاست یقیناً شامل ہے، تو بھی دہشت گردی کا طاعون واقعتاً ایک حقیقت ہے۔ بہت خوفناک بلکہ صحیح معنوں میں دہشت ناک حقیقت۔ ردِعمل کے لیے ایسے راستے بھی ہیں جن سے نہ صرف ہمیں بلکہ دوسروں کو لاحق خطرات میں بھی اضافہ ہونے کا خطرہ ہے۔ اس سے زیادہ ہوش مندانہ اور باعزت طریقے اختیار کیے جانے کی مثالیں کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ایسے طریقے ہیں جن کو ہم اس سے قبل زیرِ بحث لا چکے ہیں اور جو مبہم بھی بالکل نہیں، لیکن انہیں کم ہی زیرِ بحث لایا گیا ہے اور وہی بنیادی راستے ہیں۔

سوال ۵: اگر طالبان کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور بن لادن یا کوئی اور جس کو وہ ذمہ دار سمجھتے ہیں

گرفتار کرلیا یا مارا جاتا ہے اس کے بعد کیا ہوگا؟ افغانستان کے ساتھ کیا ہوگا؟ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ دیگر خطوں میں کیا ہوگا؟

نوم چومسکی: انتظامیہ کا تو یہی منصوبہ ذہن میں آتا ہے کہ خاموش قتل عام کے پہلے سے جاری پروگرام میں پیش رفت کی جائے اور اسے انسانیت پر مبنی اقدامات کے ساتھ ملا دیا جائے تاکہ پہلے کی طرح اس کورس کی مدح وستائش کو ابھارا جائے جس کو ''اصولوں اور اقدار'' سے مخلص اور ''ختم ہوتی ہوئی انسانیت'' کے ''نئے دور'' کی جانب دنیا کو لے جاتے ہوئے رہنماؤں کی تعریف وتوصیف کے لیے پکارا جاتا ہے۔ انتظامیہ یہ کوشش بھی کرسکتی ہے کہ شمالی اتحاد کو ایک قابلِ استعمال قوت میں تبدیل کردے نیز غالباً اس کے مخالف دیگر جنگی رہنماؤں کو بھی اس کے ساتھ متحد کردے جیسے کہ گلبدین حکمت یار ہے جو ان دنوں ایران میں ہے۔ خیال اغلب ہے کہ افغانستان کے اندر کارروائیوں کے لیے وہ لوگ برطانوی اور امریکی کمانڈوز کو استعمال کریں گے اور شاید منتخب مقامات پر بمباری کریں گے جس کا پیمانہ زیادہ بڑا نہیں ہوگا تاکہ بن لادن کی دعائیں مقبول نہ ہوجائیں۔ امریکی حملے کا موازنہ سن اسی کی دہائی میں روس کی ناکام جارحیت سے نہیں کرنا چاہیے۔ روسیوں کو ایک بڑی فوج کا سامنا تھا جو تقریباً ایک لاکھ یا اس سے زیادہ مردوں پر مشتمل تھی اور جسے سی آئی اے اور اس کے ساتھیوں نے منظم کیا تھا، تربیت دی تھی اور بھاری تعداد میں اسلحہ فراہم کیا تھا۔ امریکا کو سامنا ہے ایک پھٹی پرانی قوت کا، ایک ایسے ملک میں جو ۲۰ سال کی دہشت کے نتیجے میں پہلے ہی تقریباً تباہ ہوچکا ہے اور جس کے لیے تھوڑے بہت ذمے دار ہم بھی ہیں۔ طالبان فوجیں جس حال میں ہیں تو شاید وہ اپنے مضبوط مرکزے کے سوا جلد ہی ٹوٹ پھوٹ جائیں اور ہم یہ اُمید ہی کرسکتے ہیں کہ باقی بچ جانے والی آبادی جارح قوت کو خوش آمدید کہے گی بشرطے کہ وہ واضح طور پر ان قاتل گروہوں کے ساتھ ساتھ نہ ہو جنہوں نے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے تھے تاوقتے کہ طالبان نے اقتدار سنبھال لیا تھا۔

فی الوقت تو زیادہ تر لوگ چنگیز خان کو بھی خوش آمدید کہنے پر آمادہ ہوجاتے۔ آگے کیا ہوگا؟ بیرونِ ملک افغان اور بہ ظاہر کچھ اندرون ملک موجود عناصر، جو طالبان کے اندرونی حلقے کا حصہ نہیں ہیں، اقوام متحدہ سے مطالبہ کرتے رہے ہیں کہ کسی قسم کی عبوری حکومت قائم کردی جائے، یہ ایک ایسا راستہ ہے جس سے ہوسکتا ہے کہ اس کاٹھ کباڑ سے کسی کام کی چیز کی تشکیلِ نو میں کامیابی ہوجائے۔ لیکن یہ تب ہی ہوگا جب تشکیلِ نو کے لیے بڑی مقدار میں امداد دی جائے جسے اقوام متحدہ

یا قابل اعتبار این جی اوز کے ذریعے لوگوں تک پہنچایا جائے۔ کم از کم اتنی تو ذمہ داری ہے ان کی جنھوں نے اس غربت کے مارے ملک کو دہشت، مایوسی، لاشوں اور کٹے پھٹے اعضا والوں کی سرزمین میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ ہو تو سکتا ہے مگر امیر اور طاقت ور معاشروں کی جانب سے بڑے پیمانے پر اور عوامی حمایت کے بل بوتے پر ملنے والی امداد ہی کے سہارے۔ فی الوقت تو بش انتظامیہ ایسے کسی راستے کا امکان ہی مسترد کر چکی ہے جس نے اعلان کیا ہے کہ وہ ''قوم کو تعمیر کرنے'' میں ملوث نہیں ہوگی یا پھر یہ تعمیرِ نو ایسی مساعی سے ممکن ہے جو زیادہ قابلِ عزت اور انسانیت پسندی پر مبنی ہو، میرا مطلب ہے دیگر ملکوں کی جانب سے ''قوم کی تعمیر کرنے'' کے لیے بلا مداخلت کافی بڑی امداد، جو واقعتاً اپنے مقصد میں کسی نہ کسی سطح کی کامیابی حاصل کر لیں لیکن فی الوقت جو اس اچھے راستے پر غور کرنے سے انکار کیا گیا ہے یہ بھی کوئی پتھر پر لکیر نہیں۔ دوسرے خطوں میں کیا ہوگا — اس کا انحصار ان کے اندرونی عوامل پر ہے، یا پھر غیر ملکی ایکٹرز کی پالیسیوں پر (جن میں امریکا پیش پیش ہوگا، واضح وجوہات کے سبب) اور اس پر کہ افغانستان میں معاملات کیسے آگے بڑھتے ہیں۔ اعتماد سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر بہت سے ممکنہ راستوں کے نتیجے سے متعلق معقول تجزیہ کیا جا سکتا ہے، اور ممکنات تو بہت سے ہیں، اتنے زیادہ کہ اس مختصر سے تبصرے میں ان کا جائزہ لینے کی گنجائش نہیں۔

سوال ٦: آپ کے خیال میں اس وقت ان سماجی متحرکین (Activists) کا کردار کیا ہونا چاہیے اور انھیں کس چیز کو اوّلیت دینی چاہیے جو انصاف کے لیے پریشان ہیں؟ کیا ہمیں اپنی تنقید کم کر دینی چاہیے جیسے کہ کچھ لوگوں نے کہا بھی ہے یا اس کے بجائے یہ نئے سرے سے اور مزید بڑے پیمانے پر کوششیں کرنے کا وقت ہے نہ صرف اس لیے کہ یہ ایک ایسا بحران ہے جس میں ہم کوشش کر سکتے ہیں کہ اس کا بہت ہی اہم مثبت نتیجہ نکلے بلکہ اس لیے بھی کہ عوام کا ایک بڑا طبقہ عام حالات کی بہ نسبت اس وقت بحث اور جستجو کرنے کی جانب زیادہ مائل ہے، اگرچہ ایک اور طبقہ متعصبانہ حد تک مخالف بھی ہے؟

نوم چومسکی: یہ اس پر منحصر ہے کہ یہ سماجی متحرکین کس چیز کے حصول کے لیے کوشاں ہیں۔ اگر ان کا مقصد یہ ہے کہ تشدد کے دائرے کو پھیلایا جائے اور ۱۱ ستمبر جیسے مزید مظالم کے امکانات وسیع کیے جائیں — بلکہ بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے، اس سے کہیں زیادہ بڑے مظالم جن سے یہ دنیا اچھی طرح آگاہ ہے — تو پھر یقیناً انھیں چاہیے کہ اپنے تجزیوں اور تنقید کی دکان بڑھا دیں،

سوچنے سے انکار کر دیں اور ان بہت سنجیدہ امور میں اپنی دلچسپی کم کر دیں جن میں وہ ملوث رہے ہیں۔ میں ان لوگوں کو وہی مشورہ دوں گا اگر وہ سیاسی و معاشی طاقت کے نظام میں موجود جوابی ردعمل کے شائق اور رجعت پسند عناصر کی مدد کرنا چاہتے ہیں جو ان منصوبوں پر عملدرآمد میں مدد کرنا چاہتے ہیں جو یہاں بھی عام آبادی کے لیے بڑے نقصان دہ ہوں گے اور دنیا بھر میں بھی، بلکہ ہوسکتا ہے کہ ان سے انسانی بقا ہی کو خطرہ لاحق ہو جائے۔

اگر اس کے برخلاف سماجی متحرکین کا مقصد مزید خون خرابے کے امکانات کو کم کرنا اور آزادی، انسانی حقوق اور جمہوریت کی امیدوں کو فروغ دینا ہو تو پھر انہیں ایک اور راستہ منتخب کرنا ہوگا۔ انہیں ان اور دیگر جرائم کے پس پشت موجود عوامل کی تحقیق کرنے کے لیے اپنی کوششوں کو بڑھانا ہوگا، ان منصفانہ مقاصد کے لیے اور بھی شدت سے کام کرنا ہوگا جن سے وہ پہلے ہی مخلص ہیں۔ مواقع یقیناً موجود ہیں ان ہولناک جرائم کے صدمے نے اعلا طبقوں کو بھی اس قسم کے غور و خوض پر مجبور کر دیا ہے جس کا کچھ عرصے قبل تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور عام آدمی کے بارے میں تو یہ امر اور بھی حقیقی ہے۔ ظاہر ہے ایسے لوگ بھی ہوں گے جو ہم سے خاموش اطاعت چاہیں گے۔ ہمیں اس کی توقع انتہا پسند دائیں بازو سے ہے اور جو لوگ تاریخ سے تھوڑا بہت بھی واقف ہیں وہ بائیں بازو کے دانش وروں سے بھی اس کی توقع کریں گے اور وہ بھی کہیں زیادہ زہر آلود شکل میں۔ لیکن اہمیت اس بات کی ہے کہ ہم ہسٹیریائی وعظ اور جھوٹ کے رعب میں نہ آئیں اور سچائی اور دیانت داری کے راستے پر سختی سے کاربند رہیں۔ انسان کیا کرتا ہے اور کیا کرنے میں ناکام رہتا ہے اس کے انسانی نتائج کیا ہوتے ہیں، اس بارے میں فکر مند رہیں۔ یہ سب باتیں پیش پا افتادہ ہی سہی لیکن اس قابل ہیں کہ انہیں یاد رکھا جائے۔

پیش پا افتادہ باتوں کے علاوہ ہمیں خاص سوالوں کی طرف رُخ موڑنا چاہیے، اُن کی تحقیق و جستجو کے لیے اور پھر کارگزاری کے لیے۔

نوم چومسکی
ترجمہ: سیّد کاشف رضا

عالمی صورتِ حال پر گفتگو

گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پینٹا گون پر حملوں کے بعد نوم چومسکی نے مختلف انٹرویو دیے۔ ان انٹرویوز میں سے اہم سوالات اور چومسکی کے فراہم کردہ جوابات پیش نظر ہیں۔

ریڈیو بی ۹۲ بلغراد پر سویتلانہ ووکووچ (Svetlana Vukovic) اور سویتلانہ لوکک (Svetlana Lukic) سے گفتگو

سوال: (گیارہ ستمبر کے حملوں کے بعد) فوری صدمے کے بعد یہ خوف پیدا ہوا کہ امریکا جواب میں کیا کرے گا۔ کیا آپ بھی خوف زدہ ہیں؟

چومسکی: متوقع ردعمل سے ہر باہوش آدمی کو ڈرنا چاہئے جس کا اعلان پہلے ہی کیا جا چکا ہے، اور جو غالباً بن لادن کی دعاؤں کا جواب ہے۔ اس ردعمل سے تشدد کے چکر میں تیزی آئے گی اور اس معاملے میں تو اور بھی بڑی سطح پر۔

امریکا پاکستان سے پہلے ہی مطالبہ کر چکا ہے کہ خوراک اور دوسرے سامانِ رسد کی فراہمی روک دے جو افغانستان کے کچھ بھوک سے مرتے ہوئے لوگوں کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ اگر اس مطالبے کو پورا کر دیا جاتا ہے تو بہت سے انسان، جن کا دہشت گردی سے دور کا بھی واسطہ نہیں، ہلاک ہو جائیں گے...... غالباً لاکھوں افراد...... میں پھر دہراتا ہوں: امریکا نے پاکستان سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ لاکھوں افراد کو مار دے جو خود طالبان کا شکار ہیں اور یہ معاملہ اخلاقیات کی انتہائی نچلی سطح سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی اہمیت اس حقیقت سے بھی عیاں ہے کہ اس معاملے کی نشان دہی بس روا روی میں کی جا رہی ہے، اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا جا رہا اور غالباً کوئی اس کا نوٹس بھی نہیں لے گا۔ اس معاملے پر ردعمل کا مشاہدہ کر کے ہم مغرب کے غالب دانش ورانہ کلچر کے بارے میں بہت

کچھ جان سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے اگر امریکی عوام کو ذرا سا بھی اندازہ ہو کہ ان کے نام پر کیا کیا جا رہا ہے تو مجھے اعتماد ہے کہ وہ شدید حیران اور افسردہ ہوں گے۔

اگر پاکستان امریکا کا یہ مطالبہ اور دیگر مطالبات پورے نہیں کرتا تو خود وہ براہ راست حملے کی زد میں آ سکتا ہے اور جس کے اثرات نجانے کیا ہوں۔ اگر پاکستان امریکی مطالبات تسلیم کر لیتا ہے تو یہ بات ناممکن نہیں کہ وہاں کی حکومت کا تختہ ان قوتوں کے ہاتھوں الٹ دیا جائے جو طالبان سے ملتی جلتی ہیں اور اس صورت میں ان کے پاس ایٹمی ہتھیار بھی ہوں گے۔ اس کا اثر سارے خطے بہ شمول تیل پیدا کرنے والی ریاستوں پر پڑ سکتا ہے۔ اس وقت ہم جس جنگ کے امکان پر غور کر رہے ہیں وہ انسانی معاشرے کی اکثریت کو تباہ کر سکتی ہے۔

سوال: گیارہ ستمبر کے بعد دنیا پہلے جیسی نہیں رہے گی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

چومسکی: منگل کے ہولناک حملے عالمی امور میں ایک نئی قسم کی چیز ہیں۔ اپنی شدت اور نوعیت کے حوالے سے نہیں بلکہ ہدف کے حوالے سے۔ ۱۸۱۲ء کے بعد پہلی مرتبہ امریکا کا اپنا کوئی علاقہ حملے بلکہ خطرے کی زد میں آیا ہے۔ امریکا کی نو آبادیوں کو نشانہ بنایا جاتا رہا ہے مگر اس کی سرزمین کو کبھی نہیں۔ ان برسوں کے دوران امریکا نے اپنے ملک میں مقامی آبادی کو تقریباً نابود کر دیا، آدھے میکسیکو کو فتح کیا، اردگرد کے خطے میں متشددانہ مداخلت کی۔ ہوائی اور فلپائن کو فتح کیا (اور اس دوران سینکڑوں ہزاروں فلپینو کو قتل کر دیا) اور خصوصاً گزشتہ نصف صدی کے دوران باقی ماندہ دنیا کے زیادہ تر حصے میں طاقت کا استعمال کیا۔ جو لوگ اس کی زد میں آئے ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اب پہلی مرتبہ بندوق کا رخ دوسری طرف ہوا ہے۔ یہی بات یورپ کے سلسلے میں بھی صادق آتی ہے۔ یورپ کو بھی زبردست تباہیوں کا سامنا رہا ہے مگر یہ جنگیں اندرونی تھیں اور اس دوران وہ شدید ظلم و ستم کے ذریعے باقی دنیا کو فتح کرتا پھرا۔ اس کے شکاروں نے کبھی اس پر حملے نہیں کئے ہاں کچھ مستثنیات ہیں (جیسے برطانیہ میں آئی آر اے)۔ اس لیے یہ فطری امر ہے کہ نیٹو امریکا کی حمایت میں اٹھ کھڑی ہو کیوں کہ ہزاروں برس کے استعماری تشدد نے دانش ورانہ اور اخلاقی کلچر پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے۔

یہ کہنا درست ہے کہ یہ واقعہ عالمی تاریخ میں ایک نیا باب ہے۔ ظلم اور ہلاکتوں کی شدت کے باعث نہیں بلکہ ہدف کے حوالے سے۔ اب مغرب کس ردِعمل کا اظہار کرتا ہے؟ یہ بات اہم ہے۔ اگر امیر اور طاقت ور اپنی صدیوں کی روایات پر عمل پیرا رہتے ہیں اور تشدد کا سہارا لیتے ہیں تو

وہ تشدد کے چکر میں اپنا حصہ ڈالیں گے اور اس کے طویل مدت اثرات ہولناک ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ ردِعمل ناگزیر نہیں۔ آزاد اور جمہوری معاشروں کے عوام اٹھ کھڑے ہوں تو وہ ان پالیسیوں کو زیادہ انسانی اور باعزت راستے پر چلا سکتے ہیں۔

۲۲ ستمبر کو دیا جانے والا ایک مشترکہ انٹرویو

سوال: بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ عرب اقوام کے شہریوں کو یہ ذمہ داری قبول کرنی چاہیے تھی کہ وہ اس سیارے سے دہشت گردوں کو ختم کر دیں یا پھر ان حکومتوں کو جو دہشت گردوں کی حمایت کرتی ہیں۔ آپ کا کیا ردعمل ہے؟

چومسکی: یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ شہریوں سے کہا جائے کہ وہ دہشت گردوں کو اعلیٰ عہدوں پر منتخب کرنے، اُن کی تعریف و توصیف کرنے اور انہیں انعامات دینے کے بجائے انہیں ختم کر دیں، لیکن میں یہ مشورہ ہرگز نہیں دوں گا کہ ہم ''اس سیارے سے اپنے منتخب عہدے داروں، ان کے مشیروں، ان کے دانش ور ساتھیوں اور ان کے حواریوں کو ختم کر دیں۔'' یا پھر اپنی حکومت اور دیگر مغربی حکومتوں کو ان کے دہشت گردانہ جرائم اور دنیا بھر میں دہشت گردوں کے لیے ان کی حمایت کے باعث مٹا دیں۔ تاہم ان ظالم حکومتوں کے شہریوں کو ایسی ذمے داری لینے کا کہنا، جن کی ہم خود حمایت کر رہے ہیں، غیر منصفانہ ہوگا اور پھر جب ہم خود کہیں زیادہ سازگار حالات میں ایسا نہیں کر رہے۔

سوال: بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ تاریخ میں جب بھی کسی قوم پر حملہ ہوا ہے اُس نے جواب دیا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

چومسکی: جب کسی ملک پر حملہ ہو تو وہ اپنا دفاع کرتا ہے، اگر کر سکے۔ جو نظریہ آپ نے پیش کیا ہے اس کے تحت تو نکاراگوا، جنوبی ویت نام اور بہت سے دیگر ملکوں کو بھی چاہئے تھا کہ امریکا میں اپنے خودکش بمبار بھیجتے تاکہ اسے اندر سے تباہ کر دیں۔ فلسطینیوں کو تو داد دینی چاہئے کہ وہ بار بار تل ابیب میں ہی خودکش دھماکے کرتے ہیں۔ یہی تو وہ نظریہ تھا جس نے سیکڑوں برس کی وحشت کے بعد یورپ کو خود اپنے ہاتھوں نابود ہونے کے کنارے تک پہنچا دیا تھا اور اسی لیے اقوامِ عالم نے دوسری جنگِ عظیم کے بعد کم از کم کاغذی طور پر یہ اصول طے کیا کہ ذاتی دفاع کے بجائے طاقت کے استعمال کی ممانعت ہوگی تاآنکہ سلامتی کونسل، بین الاقوامی امن و سلامتی کے تحفظ کے لیے کوئی اقدام نہ کرے۔ خاص طور پر جوابی حملے کی تو ممانعت ہے اور چوں کہ امریکا پر کوئی فوجی حملہ نہیں ہوا

اس لیے یہ خیالات غیر متعلق ہیں۔ کم از کم اس صورت میں تو غیر متعلق ہیں ہی جب ہم یہ تسلیم کرتے ہوں کہ بین الاقوامی قانون کے بنیادی اصولوں کا اطلاق صرف ان پر نہیں ہوتا جو ہمیں برے لگتے ہیں بلکہ خود ہم پر بھی ہوتا ہے۔

اور اگر بین الاقوامی قانون کو ایک طرف رکھ دیں تو ہمارا صدیوں کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ اگر اس نظریے پر عملدرآمد کیا گیا تو نتیجہ کیا نکلے گا اور پھر ایک ایسی دنیا میں جو انسانی تباہی کے ہتھیاروں سے پٹی پڑی ہے...... نتیجہ یہ نکلے گا کہ کرۂ ارض پر انسانیت کا تجربہ لازمی طور پر نابود ہوجائے گا اور یہی وجہ تھی کہ نصف صدی قبل یورپ والوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ باہمی قتل و غارت گری کے جس کھیل میں صدیوں سے ملوث ہیں اسے اب ختم ہوجانا چاہیے۔

سوال: اگر حالات دستیاب راستوں کے زیادہ تفصیلی جائزے کی اجازت دیں تو کیا آپ کو یقین ہے کہ زیادہ تر امریکی یہ بات تسلیم کرسکیں گے کہ شہریوں پر دہشت گردانہ حملوں کے مسئلے کا حل یہ ہے کہ شہریوں پر دہشت گردانہ حملے کیے جائیں اور یہ کہ کنڑ پنتھ کے مسئلے کا حل زیادہ نگرانی اور شہری آزادیوں میں کمی میں ہے؟

چومسکی: مجھے امید ہے ایسا نہیں ہوگا۔ عمدگی سے چلائے گئے لیکن اچھی طرح چلائے ہوئے پروپیگنڈہ کے نظام میں لوگوں کو غیر منطقی، قاتلانہ اور خودکشی پر مبنی روّیے کی طرف لے جانے کی جو صلاحیت موجود ہے اسے بھی کم نہیں سمجھنا چاہیے۔ مثلاً پہلی جنگِ عظیم ہی کو لیجیے۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ طرفین بڑے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے کوئی عجیب جنگ لڑ رہے ہوں۔ لیکن دونوں طرف کے سپاہی بڑی شان سے باہمی قتل و غارت گری کے لیے مارچ کرتے ہوئے روانہ ہوجاتے۔ دانش ور حلقے اور وہ حلقے جنہیں دانش ور اپنی حمایت میں اکسا پاتے تھے وہ ان سپاہیوں کو داد دیتے۔ دائیں بازو، بائیں بازو سب کا یہی حال تھا۔ بلکہ جرمنی، جہاں دنیا میں بائیں بازو کی قوت سب سے زیادہ تھی، وہاں بھی یہی عالم تھا۔ مستثنیات اتنی ہیں کہ انہیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے اور ان میں سے بھی زیادہ تر معروف لوگوں کو اس سارے سلسلے کی نجابت سے متعلق سوال اٹھانے پر جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ ان میں روزا لکسمبرگ، برٹرینڈ رسل اور یوجین ڈبز شامل تھے۔ ولسن کی پروپیگنڈہ ایجنسیوں اور لبرل دانش وروں کی پرجوش حمایت کے سبب ایک معتدل رجحانات کا حامل ملک چند ہی ماہ میں جرمن مخالف ہسٹیریائیوں سے بھر گیا۔ جو اُن لوگوں سے انتقام لینے پر کمربستہ ہوگئے جنہوں نے وحشیانہ جرائم کیے تھے۔ ان جرائم میں سے اکثر تو برطانیہ کی وزارتِ اطلاعات کے ذہن

کی اختراع تھے۔ لیکن یہ سب کچھ ناگزیر نہیں اور ہمیں حالیہ برسوں کی عوامی جدوجہد کے مہذبانہ اثرات کی طاقت کو بھی کم نہیں سمجھنا چاہئے۔ ہمیں محض اس لیے تباہی کی جانب قدم نہیں اٹھانے چاہئیں کہ ہمیں اس کا حکم دے دیا گیا ہے۔

۲۹ ستمبر بروز ہفتہ ریڈیو نیوزی لینڈ پر جان کیمبل کو انٹرویو
(یہ انٹرویو ۲۶ ستمبر بروز بدھ ریکارڈ کیا گیا)

جان کیمبل: آپ کی کتاب '۵۰۱ واں سال' میں ذکر ہے کہ آپ نے دفاعی منصوبہ بندی گائیڈ کے پینٹاگون کے ۱۹۹۲ء والے مسودے کی نقل حاصل کی۔ اس میں اس وقت کے وزیر دفاع (جو اتفاقاً ڈک چینی تھے) نے ۲۰۰۰ء تک کی بجٹ پالیسی کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ یہ دستاویز غیر معمولی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ امریکا اپنے مفاد کی خاطر کس طرح پہلے سے طے شدہ خارجہ پالیسی اپناتا ہے۔ کاش میں اس کتاب میں سے کافی کچھ نقل کرسکتا پھر بھی یہ اقتباس پڑھوں گا:

''امریکا کو طاقت پر اجارہ داری اور اپنی عالمی قوت کو ضرور برقرار رکھنا ہے۔ اس کے بعد امریکا نئے نظام کا تحفظ کرے گا تاہم دوسروں کو قانون کے دائرے کے اندر اپنے ان مفادات کے حصول کی کوشش کی اجازت دی جائے گی جنہیں واشنگٹن طے کرے گا۔ ترقی یافتہ صنعتی ملکوں کے مفاد کی خاطر امریکا یہ امر یقینی بنائے گا کہ ان اقوام کی طرف سے ہماری قیادت کو چیلنج کرنے یا بنے بنائے سیاسی نظم کو الٹنے کی کوشش کرنے یا محض وسیع تر علاقائی یا عالمی کردار ادا کرنے کے خواب دیکھنے کی حوصلہ شکنی کرے۔''

اس دستاویز میں آگے اس بات کا تذکرہ ہے کہ نیٹو اس لیے اہم ہے کیوں کہ اس کے باعث امریکا کو یورپ میں مزید اثر ونفوذ حاصل ہوتا ہے۔ میں نقل کرتا ہوں: ''ہم یہ امتیازی ذمے داری برقرار رکھیں گے کہ ان زیادتیوں کی طرف خصوصی توجہ دیں جن سے نہ صرف ہمارے بلکہ ہمارے اتحادیوں اور دوستوں کے مفادات کو خطرہ ہو۔ صرف ریاست ہائے متحدہ ہی یہ طے کرے گی کہ زیادتی کیا ہے اور کب اسے امریکی طور پر درست کیا جانا چاہیے۔'' اب یہ بتایئے کہ دنیا اس خارجہ پالیسی کے بارے میں کس حد تک واقفیت رکھتی ہے۔

چومسکی: بھئی، اگر لوگوں کو ان چیزوں کا علم نہیں تو لگتا ہے انہوں نے تاریخ کا سبق نہیں پڑھا۔ ریاستیں اسی طرح کرتی ہیں۔ ان میں سے کچھ اتنی طاقت ور ہوتی ہیں کہ ایسے کام بڑی سطح پر

کرسکیں۔ باقی ریاستیں چھوٹے پیمانے پر یہ سب کچھ کرتی ہیں۔ لیکن یہ رویہ تو ریاست کے حساب سے معمول کی بات ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکا ۱۹۴۵ء سے اب تک بین الاقوامی منظر پر غالب ترین قوت ہے اور ہمارے پاس ڈی کلاسیفائڈ (خفیہ خانوں سے نکالی جانے والی) دستاویزات کا ایک وسیع ریکارڈ موجود ہے جس کے مطالعے سے اسی طرح کی چیزیں سامنے آتی ہیں اور اگر آپ برطانوی وزارت خارجہ کا شروع کے برسوں کا ریکارڈ دیکھیں تو وہاں بھی ایسی ہی چیزیں ملیں گی۔ اگرچہ میں نے دوسرے ملکوں کے ریکارڈ کا تفصیلی مطالعہ نہیں کیا لیکن مجھے یقین ہے وہاں بھی ایسی ہی چیزیں ملیں گی۔ میں نے کچھ کچھ آسٹریلوی ریکارڈ ضرور دیکھا ہے وہ بھی تقریباً ایسا ہی ہے۔

ظاہر ہے سطح اور پیمانے کا فرق تو ہوتا ہی ہے۔ اس لیے اگر آپ دوسری جنگ عظیم سے پہلے کا امریکی ریکارڈ دیکھیں تو اس میں درج منصوبے اتنے زیادہ عظیم الشان نہیں ملیں گے۔ ہیں وہ بھی موجودہ ریکارڈ سے ملتے جلتے، لیکن وہ اس خطّے تک محدود ہیں جس کے بارے میں امریکیوں کا خیال تھا کہ وہ اس پر غلبہ پا سکتے ہیں۔ جیسے مغربی نصف کرّے کا خطّہ یا کم از کم مغربی نصف کرّے کا نصف شمالی۔ لیکن اس کے بعد یہ سارے منصوبے پھیل گئے اور اب جو آپ پڑھتے ہیں تو ایسی چیزیں سامنے آتی ہیں جن کی توقع کی جاسکتی ہے۔ بڑی طاقتوں سے تو ان ہی چیزوں کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اگر آپ مستقبل سے متعلق کچھ دیکھنا چاہیں تو میں آپ پر زور دوں گا کہ آپ امریکی خلائی کمان (US Space Command) کی دستاویزات دیکھیں (وہ خفیہ نہیں رہیں)۔ امریکی خلائی کمان کو خلا کو ''فوجیانے'' (Militarization) کا کام سونپا گیا ہے اور اس نے گزشتہ چند برسوں میں بڑی توجہ طلب دستاویزات شائع کی ہیں اور ان میں قدرے تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ یہ سب کچھ میزائل دفاع (Missile defence) کے پردے میں ہو رہا ہے مگر یاد رکھیں تمام جارحانہ اقدامات کو لوگ ہمیشہ ''دفاعی'' (defensive) ہی کا نام دیتے ہیں۔ ہٹلر نے بھی یہی کیا۔ اس لیے جب بھی آپ 'دفاع' کا لفظ سنیں تو بس یہی سمجھیں کہ کسی نہ کسی قسم کی جارحیت (Offense) کا منصوبہ ہے اور یہ بات ہے بھی درست۔ کوئی بھی اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لیتا کہ شمالی کوریا ہماری طرف کوئی میزائل پھینکنے والا ہے۔ اگر وہ بڑے پیمانے پر ہلاکت خیز اقدام کرنا چاہیں تو ان کے پاس آسان تر راستے موجود ہیں، جیسا کہ ہم نے چند روز قبل دیکھا۔ مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ خلا تک اسلحے کی دوڑ بڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم آگے بڑھ کر خلا کو فوجیا

لیس اور بات یہ ہے کہ یہ کوئی دوڑ بھی نہیں کیوں کہ امریکا اس عمل میں شریک واحد ملک ہے۔

۱۹۶۷ء میں معاہدہ برائے بیرونی خلا (Outer Space Treaty) عمل میں آیا جس پر امریکا نے بھی دستخط کیے۔ اس کے تحت خلا میں اسلحہ رکھنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ گزشتہ چند برسوں میں اس معاہدے کا معاملہ اقوام متحدہ میں اٹھا تو سب نے متفقہ طور پر اس کی حمایت کی، سوائے ریاست ہائے متحدہ امریکا کے جو ووٹ دینے سے اجتناب کرتی رہی۔ اس پورے سال اقوام متحدہ کا کمیشن برائے تخفیف اسلحہ عضوِ معطل بنا رہا کیوں کہ امریکا خلا کو فوجیانے پر پابندی کے اقدامات کی اجازت نہیں دے رہا اور خلائی کمان والے کہتے ہیں کہ ہم خلا کو اسی طرح دیکھتے ہیں جیسے انگریز اور بعد میں جرمن سو سال قبل سمندر کو دیکھا کرتے تھے۔ اس وقت بحری افواج کو ترقی دی گئی، جیسے کہ اس سے قبل بڑی افواج کو دی جاتی تھی، تاکہ عالمی سطح پر غلبہ یقینی بنایا جا سکے اور دنیا بھر میں تجارتی اور سرمایہ کاری سے متعلق مفادات کا تحفظ کیا جا سکے۔ آج خلا کا بھی وہی حال ہے اور اگلی سرحد وہی ہے۔ ہم وہاں موجود واحد ملک ہیں اور ہمیں ہی اسے کنٹرول کرنا ہے۔ تو بھئی یہ صرف میزائل دفاع نہیں یہاں تو جارحانہ اسلحے کا معاملہ ہے اور اس کا مقصد، جیسا کہ وہ بتاتے ہیں، یہ ہے کہ دنیا بھر میں امریکا کے تجارتی اور سرمایہ کارانہ مفادات کا تحفظ یقینی بنایا جائے۔ مگر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بحری افواج کو ترقی دینے کا نتیجہ کیا نکلا۔ اس سے انگریزوں کو سمندروں پر غلبہ پانے کا موقع تو ملا لیکن پھر جرمن بھی میدان میں کود پڑے اور اس وقت پہلی جنگِ عظیم رونما ہوئی۔ اسی طرح دوسری جنگِ عظیم ہوئی اور اگر کوئی تیسری جنگِ عظیم ہوئی تو ہمارے پاس ٹیکنالوجی اس سطح کی ہے کہ وہ جنگ آخری ہی ہوگی۔ خیر! منصوبہ بھی اسی کا بنایا جا رہا ہے اور اس کی وجوہات بھی وہی ہیں جو آپ ایک صدی قبل کے برطانیہ اور جرمنی کے وزارتِ خارجہ کے ریکارڈز میں دیکھتے ہیں یا اس وقت کے امریکی ریکارڈز میں جو قریب واقع خطّے سے متعلق تھے یا پھر ان کے اُن منصوبوں میں جن پر گزشتہ ۵۰ برس سے وہ دنیا بھر میں عمل پیرا ہیں۔

تو جناب یہ تو تاریخ ہے۔ اس میں ایسی کوئی حیرانی نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن یہ ایک ایسی چیز ہے جس کے بارے میں آپ کو کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا اگر آپ ایک ایسی دنیا کے خواہش مند ہیں جس میں آپ کے پوتے پوتیاں زندہ رہیں۔ نیوزی لینڈ نے ان چیزوں کو روکنے کے لیے قابلِ تقلید کام کیا ہے لیکن اس کام کو مزید پھیلانا چاہیے ورنہ بڑی مشکل ہوگی۔ وہ لوگ بڑے کھلے ڈلے طریقے سے یہ بھی بتا ڈالتے ہیں کہ یہ سب کام (خلا کو فوجیانا وغیرہ) کسی حد تک عالمگیریت کا نتیجہ

ہیں۔ وہ اور امریکی خفیہ ایجنسیاں پیش گوئی کرتی ہیں کہ اگلے تقریباً ۲۰ سال بعد اگر عالمگیریت اسی راستے پر چلتی رہی (میرا مطلب ہے وہ عمل جسے یہ لوگ عالمگیریت کہتے ہیں یعنی معاشی سکڑاؤ کی کارپوریٹ قسم) تو ان کے اپنے خیال میں اس سے دنیا میں خلیج بڑھے گی، عدم مساوات میں اضافہ ہوگا، حاملین (Haves) اور محرومین (Have-nots) میں تفاوت بڑھے گی اور اس طرح دنیا میں زیادہ سے زیادہ لوگ محرومین کی صف میں شامل ہوجائیں گے۔ وہ یہ بات پسند نہیں کریں گے، ردعمل کا اظہار کریں گے اور انہیں قابو کرنے کی ضرورت پڑے گی اور انہیں قابو کرنے کا ایک راستہ خلا کو فوجیانا ہے۔ یہ ہے وہ چیز جس کا منصوبہ بنایا جارہا ہے۔ آپ دستاویزات کا مطالعہ کریں، آپ کو بہت سی چیزوں کا علم ہوجائے گا۔

جان کیمبل: گزشتہ چند ہفتوں میں میں نے ایک ایسی چیز دیکھی جس سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ آپ جیسے لوگ یا جان پلگر، الیگزینڈر کاک برن، رابرٹ فسک اور ایڈورڈ سعید دنیا میں امریکا کے کردار کی پیچیدگی کی نشان دہی کر رہے ہیں۔ یہ لوگ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ان دنوں کسی چیز کے بارے میں کچھ تحریر کرنا کتنا مشکل ہے کیوں کہ غیر متوقع حلقوں سے جوابی حملے بھی کیے جاتے ہیں۔ حال ہی میں 'دی نیشن' میں کرسٹوفر ہچنز نے ایک مضمون لکھا جس میں آپ پر حملہ کیا گیا اور آپ اور رابرٹ فسک اور جان پلگر جیسے لوگوں کا مذاق اڑانے کی کوشش کی گئی۔ ہچنز کہتا ہے کہ آپ لوگ طالبان اور اسامہ بن لادن کو معاف کر دیتے ہیں اور سارا الزام امریکا کے سرتھوپ دیتے ہیں۔

چومسکی: میں نے ان کا مضمون پڑھا اور کچھ حیران بھی ہوا۔ انہوں نے جن اہداف کا انتخاب کیا وہ عجیب تھے۔ میرا مطلب ہے ان کی نظر ''وال اسٹریٹ جرنل'' پر کیوں نہیں پڑی؟ حملوں کے بعد سے ''وال اسٹریٹ جرنل'' غالباً واحد اخبار ہے جس نے امریکا سے متعلق مشرقِ وسطیٰ میں پائے جانے والے رویوں کے بارے میں بہت سے سنجیدہ مضامین شائع کیے ہیں۔ میں نے ان مضامین کا اپنے انٹرویوز اور مضامین میں کافی حوالہ دیا ہے۔ ان مضامین میں زیادہ تر توجہ ''امیر کبیر مسلمانوں'' پر مرکوز کی گئی ہے...... یعنی بینکاروں، پیشہ ور ماہرین اور ایسے تاجروں پر جن کا امریکا سے واسطہ ہے...... اور ان افراد کے امریکا پر اعتراضات شائع کیے گئے ہیں جو، جیسا کہ جرنل ہمیں بتاتا ہے، پہلے سے معلوم شدہ ہیں۔ یہ تقریباً وہی اعتراضات ہیں جن کی نشان دہی فسک یا پلگر یا میں کرتے رہے ہیں۔ سب کو ان اعتراضات کا پتہ ہے اور یہ ہیں بھی اہم...... جیسا کہ جرنل نے

نشان دہی کی ہے۔ ''یو ایس اے ٹوڈے'' نے بھی اس سلسلے میں مضامین شائع کیے ہیں۔ ہر وہ شخص جس میں ذرا سی بھی عقل ہے کوشش کرے گا کہ ان دہشت گردانہ حملوں کا سبب جان سکے۔ ہاں اگر آپ کا مقصد تشدّد میں اضافے کو یقینی بنانا ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ ایسے حملے اور ہوں تو دوسری بات ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ آپ مروجہ طریقہ کار کی پیروی کرتے ہیں اور ایسے واقعات کی وجہ تلاش کرتے ہیں۔ لندن میں آئی آر اے والے بم دھماکے کرتے ہیں تو انگریزوں کا ردِعمل بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ ''چلو بھئی بوسٹن پر بم باری کرتے ہیں جہاں سے ان (دہشت گردوں) کو فنڈ ملتے ہیں۔'' چاہے ڈکیتی ہو یا گیارہ ستمبر جیسی ہلاکت خیزی، اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً جس کی نشان دہی میں نے کی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی تلاش ''وال اسٹریٹ جرنل'' کر رہا ہے۔ اور پھر آپ کو خود سے بھی سوال پوچھنا پڑتا ہے کہ ہمیں ان جائز وجوہات کے بارے میں کس ردِعمل کا اظہار کرنا ہے۔

اب بچنز صاحب یہ کہنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ آپ کو وجوہات تلاش نہیں کرنی چاہئیں کیوں کہ یہ اُس چیز کو حق بہ جانب قرار دینے کے مترادف ہے۔ یہ حق بجانب قرار دینا نہیں۔ اگر برطانیہ آئی آر اے کے دھماکوں کے پس پشت وجوہات تلاش کرتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ ''چلو شمالی آئرلینڈ کے مسئلے کا کوئی حل نکالیں'' تو ایسا کرنا انہیں حق بہ جانب قرار دینا نہیں۔ ایسا کرنا عقل مندی اور تشدّد کی شدّت کم کرنے کی کوشش ہے۔ اگر اس پر اعتراض کیا جائے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ ''چلو بھئی ہم قبائلی جنگوں کا عزم بالجزم کرتے ہیں۔ چلو ہم شمالی آئرلینڈ کے کٹر پنتھیوں جیسے بن جاتے ہیں جو اپنے ہر مخالف کی گردن اڑانے کے درپے ہوتے ہیں اور اس کی وجہ بھی نہیں پوچھتے۔'' اگر آپ چاہیں تو یہ بھی کر سکتے ہیں اور آپ کو معلوم ہی ہے کہ یہ راستہ کہاں جاتا ہے۔

جان کیمبل: ہمارے سامنے یہ تلخ حقیقت ہے کہ ہم خود پر حملوں سے بہت زیادہ خوف زدہ ہو جاتے ہیں جب کہ ہم خود حملے کرتے ہیں تو ایسا نہیں ہوتا۔ کیا یہ بات پریشان کن نہیں؟

نوم چومسکی: گیارہ ستمبر کو جو کچھ ہوا وہ خوفناک ہلاکت خیزی تھی، سب اس پر متفق ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ تاریخ کا ایک نیا موڑ ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس میں کچھ حقیقت بھی ہے۔ ان وجوہات کے باعث نہیں جو بیان کی جا رہی ہیں بلکہ کچھ اور وجوہات کے باعث — جو ظاہر و باہر ہیں اور جن کا ذکر میں نے اپنی کتاب ''۵۰۱ واں سال'' میں کیا ہے۔

گزشتہ ۵۰۰ سال میں کیا ہوتا رہا۔ یورپ اور اس کے بغل بچہ شمالی امریکا اور بحر الکاہل

کے ممالک باقی دنیا کو سیکڑوں برس سے فتح کرتے چلے آرہے ہیں اور وہ بھی کسی خوش گوار طریقے سے نہیں۔ ان برسوں میں کانگو نے بیلجیئم کے ایک کروڑ افراد کو قتل نہیں کیا۔ معاملہ اس کے الٹ تھا۔ ہندوستان نے انگلستان پر حملہ نہیں کیا، الجزائر نے فرانس پر چڑھائی نہیں کی۔ جب ریاست ہائے متحدہ امریکا نے فلی پین فتح کیا تو امریکیوں نے سیکڑوں ہزاروں افراد قتل کر دیے مگر فلی پین نے امریکا پر دھاوا نہیں بولا۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکا کی قومی سرزمین (میں 'قومی سرزمین' کی بات کر رہا ہوں۔ جاپان نے تو اس کی دو نوآبادیوں پر بم باری کی تھی) ۱۸۱۲ء کی جنگ کے بعد سے کبھی خطرے کا شکار نہیں ہوئی، جب برطانیہ نے واشنگٹن کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ یورپ میں بھی قاتلانہ جنگیں ہوتی رہی ہیں لیکن یہ یورپی خود تھے جو ایک دوسرے کو حیران کن رفتار سے ذبح کرتے رہے۔ سترہویں صدی کی ایک جنگ میں جرمنی کی ایک تہائی آبادی ہلاک کر دی گئی تھی اور بیسویں صدی کے بارے میں تو کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں۔ لیکن ہوتا یہی رہا کہ بندوقیں ہمیشہ ہم سے دوسری طرف ہی رُخ کیے رہیں۔ اب پہلی مرتبہ اتنی قابلِ ذکر سطح پر یہ ہوا ہے کہ بندوقوں کا رُخ ہماری طرف ہے۔ اس لیے صدمے کی بات تو یہ ہے اور اسی باعث ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہم ہیں کون اور ہم نے کیا کیا ہے۔

جان کیمبل: گزشتہ ہفتے جان پلگر نے اپنی رجائیت سے مجھے حیران کر دیا اور کہا کہ ان معاملات سے متعلق اب بحث ہونے لگی ہے۔ جیسا کہ آپ نے بھی ''وال اسٹریٹ جرنل'' کا ذکر کیا کہ وہ امریکی خارجہ پالیسی سے متعلق خیال انگیز رپورٹنگ کر رہا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہم گیارہ ستمبر کے واقعات کے نتیجے کے طور پر معاشرے بلکہ تمام معاشروں کے جابر عناصر کو مسترد کر پائیں گے؟

نوم چومسکی: میں جان پلگر کے جذبات سے متفق ہوں اور انہیں کافی پسند بھی کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمارے پاس یقیناً موقع ہے اور آپ خود دیکھ سکتے ہیں۔ جب ''یو ایس اے ٹوڈے'' جیسا مشہور قومی جریدہ ایسے سنجیدہ مضامین چھاپ سکتا ہے جن میں یہ ذکر ہو کہ امریکا فوجی قبضے میں موجود علاقوں کے لیے اسرائیل کی حمایت کرکے دراصل کس شے کی حمایت کر رہا ہے، تو یہ واقعی ایک تبدیلی ہے— ایک انقلابی تبدیلی۔ جیسا کہ میں نے ذکر کیا، ''وال اسٹریٹ جرنل'' میں بھی چند رپورٹیں شائع ہوئی ہیں اور اس معاملے پر کافی بحث ہو رہی ہے۔ میں بات کر رہا ہوں قومی پریس کی اور میرا خیال ہے کہ زیادہ تر دنیا میں اسی طرح کی بحث ہو رہی ہے۔

گزشتہ دو ہفتوں کے دوران میں نے دنیا بھر کے ریڈیوز وغیرہ کو انٹرویو دیتے پھرنے کے علاوہ تقریباً کچھ نہیں کیا اور مجھ سے اسی طرح کے سوال پوچھے جا رہے ہیں۔ یہ سوال اس سے پہلے نہیں اٹھائے جاتے تھے۔ اس لیے ہاں، معاملات کا رخ تبدیل کرنے کا موقع تو واقعی موجود ہے اور خلا کو فوجیانے جیسے موضوعات پر بھی ہمارے پاس ابھی وقت ہے کہ گفت وشنید کریں تاکہ ایک عظیم تباہی — بلکہ نابود کر دینے والی تباہی سے بچا جا سکے۔

۱۲ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو ایم ایس این بی سی (MSNBC) کی گفت گاہ (Chatroom) میں نوم چومسکی سے لیا جانے والا پینل انٹرویو جس کے میزبان ول فیمیا تھے

گریگ بریانٹ: اسرائیل کے لیے ہماری متواتر حمایت کی ''اصل وجہ'' کیا ہے اور اگر ہم یہ حمایت ترک کر دیں تو نتیجہ کیا نکلے گا۔

نوم چومسکی: ذاتی طور پر میرا یہ خیال نہیں کہ ہمیں اسرائیل کی حمایت ترک کر دینی چاہیے۔ میں امریکا کی اسرائیلی پالیسی کا ناقد رہا ہوں لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہے کہ یہ پالیسی اسرائیل کے عوام کے لیے نقصان دہ ہے۔ یہ پالیسی اسرائیلی حکومت کی حمایت میں ہے مگر میری رائے میں عوام کے لیے نقصان دہ ہے۔ میرے خیال میں کرنا ہمیں یہ چاہیے کہ اب تقریباً ۲۵ برس سے عالمی سطح پر جو عظیم تر اتفاق رائے اس معاملے پر ہوا ہے اس کا حصہ بن جائیں۔ اس اتفاق رائے کے تحت بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ سرحدوں (یعنی جون ۱۹۶۷ء سے قبل کی سرحدیں) میں دو ریاستی سمجھوتے کی بات کی گئی ہے۔ علاقے کی تمام ریاستوں بہ شمول اسرائیل اور فلسطین کے حقوق تسلیم کر کے ان کی سلامتی کے تحفظ کی بات کی گئی ہے۔ ۲۵ برس سے پوری دنیا کا زیادہ تر حصہ یہی موقف اختیار کیے ہوئے ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ۲۵ برس قبل اس موقف کی حامل ایک قرارداد امریکا نے ویٹو کر دی تھی اور امریکا اس کے بعد سے اب تک اس قسم کی پہل (Initiative) میں رخنہ اندازی کرتا رہا ہے اور اب بھی کر رہا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ یہ چیز اخلاقیات یا عقل مندی پر مبنی ہے۔

جان شنڈیل: اگر امریکا فلسطین اور اسرائیل دونوں کے لیے سیاسی اور مالی اعتبار سے یکساں حمایت کی پالیسی اپنا لے تو کیا اس سے خطے کے استحکام پر مثبت اثر پڑے گا اور خصوصاً اس

وقت کیا یہ ممکن ہوگا کہ ہم یہ کام بھی کرلیں اور دہشت گردی کے سامنے امریکا کے جھک جانے کا تاثر بھی نہ ملے۔

نوم چومسکی: جی ہاں۔ اس کا خطّے کے استحکام اور سیاسی، سماجی و معاشی صحت پر واقعی بڑا مثبت اثر پڑے گا۔ دہشت گردی کے آگے جھکنے سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور یاد رکھیے! نہ صرف اس خطّے میں، بلکہ دنیا بھر میں اور بہت سے لوگ بھی امریکا کو دہشت گردی کا حامی گردانتے ہیں کیوں کہ وہ فوجی قبضے اور امریکی اقدامات کو دہشت گردی سمجھتے ہیں۔ اس لیے اگر ہم اس چیز سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں، جسے بہت سے لوگ دہشت گردی کی حمایت کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، تو یہ دہشت گردی کے آگے جھکنے کے مترادف نہیں ہوگا۔ ہمیں وہ کرنا چاہیے جو صحیح ہو اور اس میں وہ صحیح بھی شامل ہے جو ہمارے لیے صحیح ہے اور وہ بھی جو اس خطّے کے لوگوں کے لیے صحیح ہے۔ اسرائیل کے فوجی قبضے میں موجود علاقوں میں آبادکاری کی حمایت کرکے امریکا اسرائیل کے عوام کی کوئی مدد نہیں کررہا۔ اس طرح سے فلسطین کی مقامی آبادی کو سزا دی جارہی ہے اور اس پر انہیں بہت غصہ اور رنج ہے۔ اس پالیسی سے کسی کی مدد نہیں ہورہی۔

اب وہ (اسرائیلی) بڑی مشکل میں پھنس گئے ہیں کیوں کہ اب ان کے لیے مشکل ہے کہ ان غیر قانونی نوآبادیوں کو ترک کردیں جن کی ہم حمایت کرتے رہے ہیں۔ لیکن کرنا یہی پڑے گا۔ اس بارے میں کچھ الجھاوے ضرور ہیں۔ مثلاً گزشتہ برس کیمپ ڈیوڈ میں جو تجاویز پیش کی گئیں انہیں یہاں بہت فیاضانہ اور سخاوت پر مبنی قرار دیا گیا لیکن دنیا میں اور کہیں بھی انہیں اس طرح نہیں دیکھا گیا۔ اگر آپ نقشے پر ذرا سی نظر دوڑائیں تو آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ ایسا کیوں ہے۔ یہ بات بھی کھٹکتی ہے کہ یہ نقشے یہاں کیوں شائع نہیں کیے گئے۔ اسرائیل میں اور دوسری جگہوں پر آپ کو یہ نقشے مل جائیں گے لیکن یہاں نہیں۔ اچھا تو اگر آپ نقشوں کا جائزہ لیں تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ ان تجاویز کو کیوں یکسر ناقابل قبول قرار دیا گیا۔

ول فیمیا: امریکا اگر اپنی مشرق وسطیٰ سے متعلق پالیسی تبدیل کردے تو کیا مشرقِ وسطیٰ سے اس کے تعلقات ٹھیک ہوجائیں گے یا یہ کینہ دور ہو ہی نہیں سکتا؟

نوم چومسکی: آپ جتنی دیر کریں گے تعلقات میں درستگی اتنی ہی مشکل ہوتی جائے گی۔ دس برس قبل یہ کام آج کی بہ نسبت زیادہ آسان تھا اور امریکا و اسرائیل جتنی دیر یہ پالیسیاں جاری رکھیں گے اتنی ہی ان کے لیے مشکلات بڑھتی جائیں گی۔ ہاں اس پالیسی میں تبدیلی سے سارے مسائل

حل نہیں ہو جائیں گے، یہ تو ایک ابتداء ہوگی۔ مسائل اور بھی ہیں جیسے میں نے وال اسٹریٹ جرنل میں شائع ہونے والے امیر مسلمانوں کے بیانات کا حوالہ دیا۔ یہ سب لوگ اس پر بھی شدید غصے میں ہیں کہ امریکا عراق کی شہری آبادی کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے اور اس دوران صدام حسین کو مضبوط بھی بنا رہا ہے۔ ہم یہ بات بھول بھی جائیں تب بھی وہ اس بات سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ امریکا صدام حسین کی حمایت کرتا رہا۔ اس کی شدید ترین ہلاکت خیزیوں کے دوران بھی — اس وقت بھی جب وہ کردوں کو زہریلی گیس سے مار رہا تھا۔ وہ سب کچھ جانتے ہیں اور اس کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں۔ وہ لوگ خطّے کی حکومتوں کے لیے امریکی حمایت کے بھی شدید مخالف ہیں جن میں سے زیادہ تر بہت منحوس حکومتیں ہیں — ظالم، بدعنوان، مائل بہ تشدد اور نہایت ہی ناخوش گوار حکومتیں — اور یہ حکومتیں امریکی حمایت پر ہی تکیہ کرتی ہیں۔

اسٹیفنی ڈینئلز: کیا اس وقت امریکا کے لیے بین الاقوامی عدالتیں بھی ایک آپشن ہیں؟ اگر امریکا ان کا دائرہ اختیار اور اس کا قانونی ہونا تسلیم کر لے تو کیا کسی کو (امریکی فوج یا اقوام متحدہ کی فوج کو) اس امر کا مجاز کیا جاسکتا ہے کہ وہ افغانستان جائے اور کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر بن لادن کو گرفتار کر لے۔

نوم چومسکی: ثبوت کے بغیر تو ظاہر ہے نہیں۔ اب تو نیٹو ممالک بھی کہہ رہے ہیں کہ وہ ثبوت کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے اور کسی کو یہ نہیں معلوم کہ ان واقعات کے پیچھے بن لادن ہی ہے کہ نہیں۔ لیکن ہاں عدالتیں واقعی موجود ہیں۔ لیکن مثلاً بین الاقوامی فوجداری عدالت ہے تو ہم وہاں جا نہیں سکتے کیوں کہ امریکا اس کا دائرہ اختیار تسلیم کرنے سے انکار کر چکا ہے۔ لیکن عالمی عدالت ضرور ہے اور اگر امریکا چاہے تو وہ خصوصی عدالت بھی قائم کرسکتا ہے جیسے یوگوسلاویہ کے لیے کیا گیا۔ پھر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل بھی موجود ہے۔ جس کے روبرو اگر سنجیدہ وجوہات پیش کی جائیں تو وہ ٹھوس اقدامات کرسکتی ہے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے سامنے ٹھوس نظائر موجود ہیں اور ان میں سے سب سے زیادہ ظاہر وہ نظائر ہیں جن میں عالمی عدالت نے فیصلہ دیا اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے قرارداد منظور کی — جو کہ دنیا کے مقتدر ترین ادارے ہیں۔ بیس برس قبل امریکا نے نکاراگوا کے خلاف جنگ کا آغاز کیا۔ یہ ایک ہولناک جنگ تھی۔ لاکھوں آدمی مارے گئے تھے۔ ملک عملی طور پر تباہ ہوگیا تھا۔ نکاراگوا نے واشنگٹن میں بم دھماکے کر کے جواب نہیں دیا۔ وہ اپنا کیس لے کر عالمی

عدالت چلے گئے۔ عالمی عدالت نے ان کے حق میں فیصلہ دیا اور امریکا کو حکم دیا کہ وہ اپنی طرف سے ''قوت کا غیر قانونی استعمال'' (مطلب ہے بین الاقوامی دہشت گردی) روک دے اور کافی مقدار میں تاوان بھرے۔ خیر امریکا نے جواب میں عدالت کو توہین آمیز طریقے سے مسترد کر دیا اور فوراً بعد اپنے حملے میں اضافہ کر دیا۔ اس موقع پر نکارا گوا سلامتی کونسل میں گیا جس نے ایک قرارداد منظور کی جس میں تمام ریاستوں کو کہا گیا کہ بین الاقوامی قانون کی پاسداری کریں۔ انہوں نے کسی کا نام نہیں لیا لیکن ہر ایک کو معلوم تھا کہ اشارہ ریاست ہائے متحدہ امریکا کی طرف ہے۔ خیر امریکا نے قرارداد ویٹو کر دی۔ پھر نکارا گوا جنرل اسمبلی میں گیا جس نے دو سال میں دو مرتبہ ایسی ہی قرارداد منظور کی جس کی مخالفت صرف امریکا اور اسرائیل نے کی۔ ایک سال ایل سلواڈور نے بھی مخالف کی۔ لیکن ظاہر ہے امریکا ایک طاقت ور ملک ہے اور اگر وہ قانونی راستوں کی مخالفت کر دے تو ان کی پیروی نہیں کی جا سکتی۔ تو جناب نکارا گوا کچھ بھی نہیں کر سکا۔ لیکن دوسری جانب اگر امریکا ان راستوں کی پیروی کرنے کی ٹھان لے تو کوئی اسے روک بھی نہیں سکتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سب اس کی حمایت کریں گے۔

ول فیمیا: ''نئی بین الاقوامیت'' کے نظریے میں دہشت گردی مخالف اتحاد کہاں فٹ آتا ہے اور کیا یہ اتحاد و اختلاط باقی رہے گا۔

نوم چومسکی: ہمیں اس دہشت گردی مخالف اتحاد پر بڑی محتاط نظر ڈالنی ہوگی۔ دیکھنا ہوگا کہ کون کون اس میں شامل ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ روس بڑی خوشی سے بین الاقوامی اتحاد میں شریک ہو رہا ہے کیوں کہ اسے خوشی ہے کہ وہ چیچنیا کے خلاف جنگ میں جس ہولناک خوں ریزی کا ارتکاب کر رہا ہے اس میں اب اسے امریکا کی حمایت بھی حاصل ہو جائے گی۔ وہ اسے دہشت گردی کے خلاف جنگ بیان کرتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ بجائے خود ایک قاتلانہ اور دہشت گردانہ جنگ ہے۔ چین اس اتحاد میں شمولیت پر خوش ہے کیوں کہ وہ مغربی چین میں مسلمان گروپوں کے خلاف اپنی لڑائیوں میں امریکی حمایت کا خواہاں ہے۔ یہ گروپ افغانستان میں ۲۰ برس قبل بننے والے اتحاد کا حصہ تھے اور اب چین میں اپنے حقوق کے لیے لڑ رہے ہیں۔ چین انہیں سختی سے دبانا چاہتا ہے اور اس کام میں امریکی حمایت پر بہت خوش ہوگا۔ انڈونیشیا بھی ساتھ ملنے پر خوش ہے کیوں کہ اسے اپنی اندرونی بغاوتوں، مثلاً آچے کی بغاوت، کو کچلنے کے لیے مسلسل امریکی حمایت کی ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے انہیں امریکی حمایت پہلے ہی سے حاصل ہے اور انہیں اس سے

بہت زیادہ حمایت درکار ہے۔ الجزائر، جو دنیا کی سفاک ترین قاتل ریاستوں میں سے ایک ہے، بڑی خوشی سے امریکا کی حمایت کرے گا تاکہ وہ الجزائر کے عوام پر جو تشدّد کر رہا ہے اور ان کا جو قتل عام کر رہا ہے اس کے لیے اسے امریکی حمایت حاصل ہو جائے اور اگر آپ دنیا پر نظر دوڑائیں تو جو لوگ خوشی خوشی اس اتحاد میں شریک ہو رہے ہیں وہ ان وجوہات کے باعث ایسا کر رہے ہیں جو آپ کو معلوم ہوں تو آپ کے سینے پر سانپ لوٹ جائے۔ اس اتحاد کے لیے داد تو بہت دی جا رہی ہے لیکن اگر آپ اس کی تشکیل کی وجوہات دیکھیں تو یہ نتیجہ نکالنے میں دیر نہیں ہوگی کہ یہ جلد ختم بھی ہو جائے گا۔ اگر نئی بین الاقوامیت یہی ہے تو ہمیں نہیں چاہیے کہ اس کا حصہ بنیں۔ ہمیں چاہیے کہ اس کی شدّت سے مخالفت کریں۔

آرتھر بوناميا: شہری ہونے کے ناطے ہم انسانیت اور انصاف پر مبنی خارجہ پالیسی کے حق میں کس طرح اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

نوم چومسکی: ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہم بڑے استحقاق یافتہ لوگ ہیں۔ ہم ایک بہت آزاد، بہت جمہوری معاشرے میں رہ رہے ہیں۔ دنیا کی بہت سی دوسری جگہوں کے برعکس ہم ریاستی سزا کے خوف سے آزاد ہو کر ہر قسم کا اقدام کر سکتے ہیں، بول سکتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے پاس ہر قسم کے راستے موجود ہیں — ہم پڑوسیوں سے ملاقاتیں کر سکتے ہیں، گرجا گھروں میں یا کسی بھی تنظیم میں جا کر لوگوں سے ملاقات کر سکتے ہیں، کچھ شائع کر سکتے ہیں، کچھ منظم کر سکتے ہیں، مظاہرے کر سکتے ہیں، سیاسی ایکشن لے سکتے ہیں — ہر کام کر سکتے ہیں۔ یہ سب مؤثر ثابت ہو سکتا ہے۔ ماضی میں یہ ہو چکا ہے اور اب بھی یہ ہو سکتا ہے۔ ذرائع کی کمی ہے ہی نہیں۔ اگر کوئی کمی ہے تو صرف ان راستوں کو اپنانے میں ہماری آمادگی کی ہے۔ راستے موجود ہیں۔ میں کچھ ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جو ہٹلر کے خلاف بھی جنگ لڑنے کے حق میں نہیں تھے لیکن امن تحریک کا یہ موقف نہیں رہا۔ سنجیدہ امن تحریک کا موقف وہی ہے جس کا اظہار ابھی پوپ نے کیا ہے۔ انھوں نے کہا، اور بجا کہا، کہ ایک ہولناک جرم کیا گیا ہے اور جب جرم کا ارتکاب ہوتا ہے تو جو اس کے ذمہ دار ہیں انھی کو سزا ملنی چاہیے اور انھیں انصاف کے روبرو لایا جانا چاہیے۔ لیکن اس دوران بڑی تعداد میں بے گناہ لوگوں کو نقصان پہنچانے سے دریغ کرنا چاہیے۔ اگر کوئی میرے گھر ڈاکہ ڈالے اور مجھے پتہ چل جائے کہ فلاں دریا کے پار جو بستی ہے وہاں سے وہ لوگ آئے تھے تو میں اٹھ کر اس بستی کے ہر شخص کو قتل کرنا شروع نہیں کر دوں گا۔ ایسا نہیں ہوتا۔ ہوتا یہ ہے کہ آپ قانونی راستہ اختیار

کرتے ہیں۔ یہ راستے دستیاب ہیں اور ہمارے پاس بہت سے نظائر بھی موجود ہیں۔ امریکا کو چاہئے — اور اگرچہ یہ اتنا آسان نہیں پھر بھی امریکا ایسا کرسکتا ہے — کہ اس ہلاکت خیزی کا جو بھی ذمہ دار ہے اس کے خلاف ایک قابلِ اعتبار کیس پیش کرے۔ یہ اتنا آسان نہیں ہوگا اور شاید اسی لیے انہوں نے ایسا کیا بھی نہیں۔ لیکن شروعات کے طور پر ایسا کرنا ہی ہوگا۔ اور پھر ایسے اقدامات ہیں جو بین الاقوامی اداروں کے تعاون سے کیے جاسکتے ہیں۔

افغانستان پر امریکی حملوں پر ردعمل ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۱ء

اب تک امریکا و برطانیہ کا جو ردعمل رہا ہے توقع اسی کی تھی۔ خبر یہ ہے کروز میزائلوں اور بلندی پر پرواز کرنے والے بمبار طیاروں کی مدد سے حملہ کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ طالبان کے زیرِ قبضہ علاقوں کے باہر خوراک بھی پھینکی گئی ہے۔ موخر الذکر اقدام تو اتنا تعلقات عامہ کی خاطر ہے کہ اس کی پردہ پوشی کی کوشش بھی نہیں کی گئی۔ بظاہر حملوں میں مسلمان ممالک شریک نہیں، غالباً احتجاج کے خوف سے انہیں شریک نہیں کیا گیا۔ ابھی تو آغاز ہوا ہے اور ہمارے پاس اطلاعات بھی اتنی کم ہیں کہ کوئی بات اعتماد سے نہیں کہی جاسکتی مگر لگتا ہے کہ اس وقت دنیا کا جو موڈ ہے اس کا بوسٹن گلوب میں شائع ہونے والی اس خبر سے واضح طور پر اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو قاہرہ سے آئی اور جس کی سرخی ہے:

''امریکی حملے کا احتجاج اور خوف سے استقبال۔'' خبر میں ایک مصری بیرے کے اس قول کو نقل کیا گیا ہے۔ ''میں تمہیں خوراک دے رہا ہوں اور میں ہی تمہیں قتل کرتا پھرتا ہوں؟ یہ بات سوچ کر میں پاگل ہوجاتا ہوں۔''

میں یہ دیکھ کر کافی حیران ہوا کہ امریکا نے ٹونی بلیئر کے ذریعے جو شہادت اور ثبوت فراہم کیا وہ کتنا کم زور ہے۔ تاریخ کی سب سے بڑی بین الاقوامی تفتیش کے بعد انہیں ملا کیا؟ اتنا کم کہ مجھے بھی اس کی توقع نہیں تھی۔ اس سے تو بہت سے ماہرین کی اس رائے کو تقویت ملتی ہے کہ مجرموں کا تعلق لامرکز نیٹ ورکس سے تھا اور شاید ان کے پاس مواصلات کی سہولت بھی محدود تھی اور یہ کہ ان نیٹ ورکس میں داخل ہونا مشکل ہے۔ طالبان کے خلاف الزامات تو تقریباً نہ ہونے کے برابر تھے۔ اگر مشتبہ دہشت گردوں کو پناہ دینا ایسا جرم ہے جو بم باری کا مستوجب ہے پھر تو زیادہ تر دنیا اور خود امریکا پر فوری طور پر حملہ کردیا جانا چاہیے۔ اس بات پر تو تبصرے کی گنجائش ہی نہیں ہونی

چاہیے اور ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ طالبان کی طرف سے مذاکرات اور بن لادن کی تحویل کی پیشکشیں سنجیدہ بھی تھیں کہ نہیں کیوں کہ مغرب نے تو انہیں صاف صاف مسترد کر دیا اور اس کے بجائے بم پھینکنے کو ترجیح دی — ایک روائتی طریقہ — اگر چہ تاریخ کو دوبارہ سے لکھتے وقت ایسے معاملات پر منڈھ کا دبیز پردہ تاریکی دیا جاتا ہے۔ ماضی میں جھوٹ کی منظم طریقے سے ملاوٹ کرنا بجائے خود ایک مذموم اقدام ہے لیکن انسانی لحاظ سے اس کے سنجیدہ اثرات بھی ہیں۔ جیسا کہ ہم ایک مرتبہ پھر دیکھ رہے ہیں۔ وہ قانونی راستے ابھی تک موجود ہیں جن کی پیروی دیگر ریاستیں کرتی رہی ہیں وہ ریاستیں جو گیارہ ستمبر کے واقعات سے کہیں زیادہ تباہ کن دہشت گردانہ حملوں کا شکار ہوئیں۔ یہ بات کھٹکتی ہے کہ یہ راستے زیرِ غور بھی نہیں لائے گئے اور میں نے بالائی سطح پر اُن نظائر کی بھی نشان دہی کرتے ہوئے کسی کو نہیں پایا جو بالکل مناسب اور غیر متنازعہ ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ بین الاقوامی عدالتِ انصاف کا فیصلہ اور سلامتی کونسل کی قرارداد جسے امریکا نے ویٹو کر دیا، اُن کی کسی کو خبر ہی نہیں۔ یہ ہے تاریخ پر نظرِ ثانی کرنے کے عمل کی وہ فتح جسے اگر آرویل بھی دیکھتا تو حیرت سے اُس کا منھ کھلا کا کھلا رہ جاتا۔ یہ ایک ایسی نظریاتی کامیابی ہے جو کم اہمیت کی حامل نہیں — اخبارات کی سرخیاں یہی بتاتی ہیں۔ یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں کہ امریکی حملے کے خوف کے بعد امریکی مطالبے پر (اگر ہم نیویارک ٹائمز کی خبر پر اعتبار کریں) پاکستان کی طرف سے افغان سرحد بند کرنے کے بعد سے اب تک کتنے مسکین اور بے گناہ افغان موت کے مُنھ میں جا چکے ہیں۔ کتنے افغان خوراک کی فراہمی میں ناکامی سے مر چکے ہیں اور ان کے لیے تو فضا سے خوراک پھینکنے کی ضرورت ہی نہیں تھی — یہ کام تو پہلے روز سے کیا جانا ممکن تھا، اس میں تو کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ خوراک تو ٹرکوں کے کاروانوں کے ذریعے بھی بھیجی جا سکتی تھی، جیسا کہ جب بین الاقوامی امدادی کارروائیاں شروع ہوئیں تو ظاہر بھی ہو گیا۔ میں اس بات کا شدت سے خواہش مند تھا کہ اس مرتبہ تو میرے لیے کچھ سامانِ حیرت ہوتا۔ اس مرتبہ تو روایتی رویے سے ہٹ کر کچھ فیصلے کیے جاتے۔ اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو افغانستان کے لوگوں کے لیے مستقبل قریب بہت بھیانک ہے اور تشدد کا چکر تو معروف انداز میں تیز ہو سکتا ہے۔ اس کے اثرات کیا ہوں گے اس پر غور کرنا کچھ ایسا خوش گوار نہیں۔

ڈیوڈ برسامیان ریڈیو کے پروڈیوسر اور ادیب ہیں۔ ہاورڈ زن، ایڈورڈ سعید، اقبال احمد اور چومسکی سے ان کے طویل انٹرویوز کتابی صورت میں شائع ہوچکے ہیں۔

نوم چومسکی

ترجمہ: سیّد کاشف رضا

”امریکا ایک بڑی دہشت گرد ریاست ہے“

ڈیوڈ برسامیان سے گفتگو

سوال: گیارہ ستمبر کے واقعات کے بعد سے ریاست ہائے متحدہ امریکا میں غیض وغضب اور وحشت پر بنی جذبات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ مساجد بلکہ ایک سکھ گوردوارے پر حملوں اور قتل وغیرہ کی اطلاعات ملی ہیں۔ یہاں بولڈر کے قصبے میں جو لبرل شہرت رکھتا ہے، یونیورسٹی آف کولوراڈو کی دیوار پر یہ نعرہ درج کیا گیا ہے ”عربو! گھر جاؤ یا افغانستان اور گھر جاؤ، صحرائی کالو!“ دہشت گردانہ حملوں کے بعد سے جو صورت حال سامنے آئی ہے اُسے آپ کس پس منظر میں دیکھتے ہیں۔

نوم چومسکی: صورت حال ملی جلی ہے۔ جو کچھ آپ نے کہا وہ یقیناً ہو رہا ہے جب کہ دوسری طرف اس کے مخالف رجحانات بھی موجود ہیں۔ اُن جگہوں پر جہاں میرے براہ راست رابطے موجود ہیں اور دوسرے لوگوں سے بھی میں نے یہی سنا ہے۔ آج صبح کے نیویورک ٹائمز میں نیویورک کے موڈ سے متعلق خبریں ہیں۔ ان میں اُن جگہوں سے متعلق خبریں بھی ہیں جہاں دہشت گرد حملوں کے شکار افراد کی یاد میں تقریبات ہو رہی ہیں۔ خبروں میں یہ نشان دہی کی گئی ہے کہ جوابی حملہ کرنے کی بہ نسبت صبر و تحمل سے کام لینے کے مطالبات اور امن کی علامات زیادہ ہیں اور لوگوں کا موڈ ملا جلا ہے بلکہ درحقیقت عام طور پر لوگ کسی پرتشدد اقدام کے مخالف ہیں۔ یہ ایک دوسری قسم کی رو ہے جو ان لوگوں کے لیے بھی حمایت واعانت کے جذبات رکھتی ہے جنہیں یہاں صرف اس لیے نشانہ بنایا جا رہا ہے کہ ان کی رنگت ذرا سی سیاہ لگتی ہے یا اُن کے نام کچھ عجیب سے ہیں۔ تو جناب مخالف رو بھی موجود ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے تاکہ صحیح راہ پر چلنے والے لوگ کامیابی حاصل کرسکیں۔

سوال: یہ بات نوٹ کی گئی ہے کہ ذرائع ابلاغ نیو یورک اور پینٹا گون پر حملوں کا پس منظر فراہم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ کیا آپ اس سلسلے میں کوئی مفید معلومات فراہم کریں گے۔

نوم چومسکی: دیکھیے دو قسم کی معلومات ہیں جو اس سلسلے میں مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان حملوں کی وجوہات بھی دو ہیں، جو مختلف ہونے کے باوجود آپس میں متعلق ہیں۔ فرض کیجیے کہ اس حملے کی بنیاد کسی طرح بن لادن کے نیٹ ورک میں ہے اور یہ بات قابل قبول بھی نظر آتی ہے، اس لیے یہ فرض کر لیتے ہیں کہ یہ بات درست ہے۔ تو اگر یہ بات درست ہے تو پھر دو قسم کی معلومات ہیں جن سے ہمیں کچھ تعلق رکھنا چاہیے اور یہ دونوں قسمیں باہم متعلق تو ضرور ہیں لیکن ہیں الگ الگ۔ ایک ہے بن لادن کا نیٹ ورک اور دوسری ہے اس خطے کی آبادی۔ یہ دونوں ایک ہی چیز نہیں اگرچہ ان دونوں میں تعلق ضرور ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ ان دونوں سے متعلق بحث سب سے آگے آگے ہونی چاہیے۔ جہاں تک بن لادن کے نیٹ ورک کا تعلق ہے تو مجھے شک ہے سی آئی اے سے زیادہ اگر کسی کو اس کے متعلق علم ہو کیوں کہ یہ سی آئی اے ہی تھی جس نے اس کی تعمیر میں مدد دی۔ یہ وہ نیٹ ورک ہے جس کی ترقی، اگر آپ صدر کارٹر کے قومی سلامتی کے مشیر زبگنیو برزیزنسکی کی بات پر اعتبار کریں، تو ۱۹۷۹ء میں شروع ہوئی۔ برزیزنسکی کا دعویٰ ہے کہ ۱۹۷۹ء کے وسط میں اسی نے افغانستان کی حکومت کے خلاف لڑنے والے مجاہدین کی خفیہ امداد کا سلسلہ شروع کرایا تھا تاکہ روسیوں کو گھیر گھار کر ''افغان پھندے'' میں جکڑا جا سکے اور اس کا یہ فقرہ ''افغان پھندا'' یاد رکھے جانے کے قابل ہے۔ وہ اس بات پر پھولے نہیں سماتا کہ چھ ماہ بعد حکومت کی امداد کے لیے فوجیں بھیج کر روسی افغان پھندے میں پھنس ہی گئے۔ اور اس کے اثرات کیا نکلے؟ سب کو معلوم ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا نے مصر، پاکستان، فرانسیسی خفیہ اداروں، سعودی عرب کی مالی مدد اور اسرائیلی شراکت سے ایک بڑی فوج کھڑی کر لی۔ ایک بڑی رضا کار فوج جو تقریباً ایک لاکھ یا اس سے بھی زائد افراد پر مشتمل تھی اور انھوں نے یہ فوج دنیا کے سب سے زیادہ جنگ جو شعبوں سے حاصل کی جو قسمت کی خوبی سے انقلابی اسلام پسند تھے جنھیں یہاں اسلامی بنیاد پرست کہا جاتا ہے۔ یہ فوج تمام دنیا سے بنائی گئی اور اس میں زیادہ تر افراد کا تعلق افغانستان سے نہیں تھا۔ ان سب کو 'افغانی' کہا جاتا ہے لیکن بن لادن کی طرح یہ بھی دیگر علاقوں سے آگئے تھے۔

بن لادن بہت جلد اس فوج میں شامل ہو گیا۔ وہ فنڈنگ کے نیٹ ورک میں شامل تھا اور غالباً یہ ان نیٹ ورکس میں سے ہے جو ہنوز موجود ہیں۔ ان لوگوں کو سی آئی اے، پاکستان، مصر اور

دیگر ملکوں کی طرف سے تربیت دی گئی، مسلح کیا گیا اور منظم کیا گیا تاکہ یہ روسیوں کے خلاف جہاد کرسکیں۔ اور انہوں نے جہاد کیا۔ انہوں نے روسیوں کے خلاف جہاد کیا۔ وہ دہشت کو روسی سرزمین کے اندر تک لے گئے۔ بہت سے تجزیہ کاروں کا خیال ہے کہ ہوسکتا ہے انہی افراد کے باعث روسی انخلا میں تاخیر ہوئی ہو۔ یہ جنگ ان کی واحد کارروائی یا دلچسپی نہیں تھی۔ ۱۹۸۱ء میں اسی نیٹ ورک سے متعلق گروہوں نے مصر کے صدر سادات کو قتل کیا جنہوں نے ان کے بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ۱۹۸۳ء میں ایک خودکش بم بار نے، جس کا تعلق غالباً انہی نیٹ ورکس سے تھا، لبنان سے درحقیقت پوری امریکی فوج کو نکال باہر کروا دیا اور یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۸۹ء تک آتے آتے افغانستان میں ان کا جہاد کامیابی سے ہم کنار ہو چکا تھا۔

جیسے ہی امریکا نے سعودی عرب میں مستقل فوجی موجودگی کی بنیاد رکھی، بن لادن اور دوسرے لوگوں نے اعلان کیا کہ ان کے نقطۂ نظر میں یہ فوجی موجودگی روس کے افغانستان پر قبضے جیسی ہے اور پھر انہوں نے اپنی بندوقوں کا رُخ امریکا کی طرف کر دیا جیسا کہ ۱۹۸۳ء میں بھی ہو چکا تھا جب امریکا کی فوجیں لبنان آئی تھیں۔ سعودی عرب بھی مصر کی طرح ان نیٹ ورکس کا ایک بڑا دشمن ہے اور یہ نیٹ ورکس چاہتے بھی یہی ہیں کہ مصر، سعودی عرب اور مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقا کی ان حکومتوں کا تختہ الٹ دیں جنہیں یہ غیر اسلامی قرار دیتے ہیں۔ اور پھر یہ سلسلہ جاری رہا۔

۱۹۹۷ء میں انہوں نے مصر میں تقریباً ۶۰ سیاحوں کو قتل کر دیا اور مصر کی سیاحتی صنعت کو تباہ کر ڈالا۔ اور یہ اپنی سرگرمیاں تمام خطے میں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مشرقی افریقا اور مشرقِ وسطیٰ میں ان کی سرگرمیاں کئی برسوں سے جاری ہیں۔ یہ ایک ہی گروپ ہے اور یہ گروپ ریاست ہائے متحدہ امریکا کی ۸۰ء کی دہائی کی جنگوں سے پھوٹا ہے بلکہ اگر آپ برزیزنسکی کی بات پر اعتبار کریں تو اس کی پیدائش اس سے بھی قبل اس وقت ہوئی جب امریکیوں نے ''افغان پھندا'' تیار کیا۔ ان کے متعلق کہنے کو اور بھی بہت کچھ ہے مگر یہ تصویر کا صرف ایک رُخ ہے۔ تصویر کا دوسرا رُخ ہے خطّے کے عوام۔ ان عوام اور مذکورہ بالا نیٹ ورکس کا آپس میں تعلق ظاہر ہے موجود ہے۔ بن لادن نیٹ ورک اور دوسرے گروپ اس خطے کے عوام کی مایوسی، غصّے اور تلخی سے کافی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان عوام میں امیر سے غریب اور سیکولر سے لے کر انقلابی اسلام پسندوں تک سبھی شامل ہیں۔ وال اسٹریٹ جرنل نے بہت اچھا کیا کہ امیر مسلمانوں کے روّیوں سے متعلق بہت سے مضامین شائع کیے۔ یعنی ان لوگوں کے حق سے جرنل کو زیادہ دلچسپی ہے مثلاً کاروباری افراد، بینکار، پیشہ ور ماہرین اور مشرقِ وسطیٰ

کے خطے سے تعلق رکھنے والے دوسرے لوگ جو اپنی تکالیف کا کھل کر اظہار کرتے ہیں۔

یہ لوگ اپنی تکالیف کا اظہار مضافاتی بستیوں اور گلیوں کے غریب لوگوں کی بہ نسبت زیادہ نرم الفاظ سے کرتے ہیں لیکن ان کی رائے واضح ہے اور سب کو پتہ ہے یہ رائے کیا ہے۔ ایک چیز ہے۔ یہ سب لوگ امریکا کی طرف سے خطے کی غیر جمہوری اور عوام کو دبا کر رکھنے والی حکومتوں کی حمایت اور جمہوری راستے کھولنے کی کسی بھی کوشش میں رخنہ ڈالنے پر امریکی اصرار پر بہت برافروختہ ہیں۔ اگلے روز آپ نے خبروں میں سنا ہوگا، میرا خیال ہے بی بی سی پر ایک خبر تھی کہ الجزائر کی حکومت اس جنگ میں ملوث ہونے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ اناؤنسر نے کہا کہ دوسرا رُخ تو دکھایا ہی نہیں، جو یہ ہے کہ وہاں بہت دہشت گردی ایسی بھی ہو رہی ہے جو بظاہر ریاستی دہشت گردی ہے۔ اس کے کافی ٹھوس ثبوت موجود ہیں۔ وہاں کی حکومت ظاہر ہے عوام کو مزید دبانے میں دلچسپی رکھتی ہے اور اس کام میں امریکی امداد کو خوش آمدید کہے گی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ الجزائر کی حکومت موجود ہی اس لیے ہے کہ اس نے جمہوریت انتخابات میں رخنہ ڈالا تھا جس میں وہ اسلامی بنیاد رکھنے والے گروہوں کے ہاتھوں شکست کھانے والی تھی۔ وہاں موجودہ لڑائی جھگڑے کا آغاز ہی اسی سے ہوا اور ایسی ہی باتیں اس خطے میں دیگر مقامات پر بھی ہوتی رہی ہیں۔

جرنل کی طرف سے جن "پیسے والے مسلمانوں" کے انٹرویو لیے گئے انہوں نے شکایت کی کہ امریکا نے "عوام کو دبانے والی حکومتوں کو فروغ دے کر" آزادانہ اقتصادی ترقی کا راستہ روکا ہوا ہے۔ دیکھیں کیا فقرہ استعمال کیا ہے انہوں نے۔ لیکن سب سے بڑی تشویش جو "وال اسٹریٹ جرنل" کے مذکورہ مضامین میں اور اس خطے سے متعلق کچھ بھی جاننے والے کسی بھی آدمی نے ظاہر کی ہے اور جس کا اظہار ان "پیسے والے مسلمانوں" نے بھی کیا جو اتفاقاً بنیادی طور پر امریکا نواز ہیں، وہ تشویش ہے امریکا کے دہرے معیار پر مبنی پالیسیاں، جو ان کی نظروں میں عراق اور اسرائیل کے معاملات میں بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ عراق ہی کا معاملہ لیں جہاں گزشتہ دس برس سے امریکا اور برطانیہ سول معاشرے کو تباہ و برباد کیے جا رہے ہیں۔ پھر میڈلین البرائٹ کا وہ بدنام زمانہ بیان جس میں انہوں نے کہا تھا کہ عراق میں اگر ۵ لاکھ بچے مر گئے تو یہ قیمت بہت زیادہ ہے لیکن ہم یہ قیمت ادا کرنے پر آمادہ ہیں، تو ایسا بیان ان لوگوں کو اچھا نہیں لگتا جو یہ سوچتے ہیں کہ اگر امریکا اور برطانیہ ۵ لاکھ بچے مار دیں تو یہ بات اہمیت رکھتی ہے اور اس دوران یہ دونوں ملک صدام حسین کو بھی مضبوط

و مستحکم کیے جا رہے ہیں۔ تو جناب یہ ہے اس دہری پالیسی کا ایک پہلو۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکا فلسطینی علاقوں پر اسرائیلی فوجی قبضے کا سب سے بڑا حمایتی ہے اور اس قبضے کو اب ۳۵ واں سال ہے۔ یہ قبضہ ابتدا ہی سے بہت سخت، ظالمانہ اور دباؤ پر مبنی رہا ہے اور پھر وہاں ۲۵ برس سے سفارتی کوششوں میں بھی رخنہ اندازی کی جا رہی ہے۔

اس سلسلے میں سادہ سے حقائق بھی رپورٹ نہیں کیے جاتے۔ مثال کے طور پر مشرقِ وسطیٰ میں حالیہ لڑائی ۳۰ ستمبر کو جیسے ہی شروع ہوئی اسرائیل نے فوراً اگلے ہی روز امریکی ہیلی کاپٹروں کو (اسرائیل ہیلی کاپٹر خود تیار نہیں کرسکتا) شہری نشانوں پر حملے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اگلے چند روز کے دوران انہوں نے اپارٹمنٹ کمپلیکس اور دیگر مقامات پر کئی درجن افراد ہلاک کر ڈالے۔ یہ ساری لڑائی مقبوضہ علاقوں میں ہو رہی تھی اور فلسطینی علاقے سے ایک گولی بھی نہیں چلائی گئی۔ فلسطینی پتھر استعمال کر رہے تھے۔ تو جناب یہاں لوگ فوجی قبضے کی حالت میں قابضین پر پتھر برسا رہے تھے اور اگر معاملہ فوجی اہداف کا ہو تو یہ مزاحمت عالمی معیارات کی رو سے حق بجانب ہے۔ ۱۳ اکتوبر کو ایک دہائی میں اسرائیل کو فوجی ہیلی کاپٹر فراہم کرنے کا سب سے بڑا سودا کر دیا۔ اس کے تحت ہیلی کاپٹروں کی فراہمی اگلے چند ماہ تک جاری رہی۔ اس کی خبر بھی نہیں دی گئی اور جہاں تک میں آگاہ ہوں، اب تک نہیں دی جا رہی۔ لیکن وہاں کے لوگ یہ سب جانتے ہیں چاہے وہ اسرائیلی اخبارات نہ بھی پڑھتے ہوں (جہاں اس کی خبر فوراً چھپ گئی تھی)۔ وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہیں اور انہیں وہاں حملہ آور ہیلی کاپٹر نظر آتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ یہ امریکی ہیلی کاپٹر ہیں جو یہ جانتے بوجھتے ہوئے بھیجے گئے ہیں کہ ان کے استعمال کے سلسلے میں کسی قسم کی کوئی شرط عائد نہیں کی گئی اور اس وقت تک یہ بات معلوم ہو چکی تھی۔ چند ہفتے بعد اسرائیل نے ان ہیلی کاپٹروں کو فلسطینی رہنماؤں کے سیاسی قتل کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا نے کچھ فہمائش کی مگر پھر مزید ہیلی کاپٹر بھیج دیے جو امریکی اسلحہ کے ذخائر میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور جدید تھے۔ اس دوران امریکا یہودی آبادکاری کی پالیسیوں کی بھی حمایت کرتا رہا جن کے باعث مقبوضہ علاقوں کے کافی بڑے حصے کو حاصل کیا جا چکا ہے اور جو اس مقصد کے لیے بنائی گئی ہیں تاکہ ایک آزاد اور قابلِ عمل ریاست کی ترقی اور ارتقاء کو بالکل ناممکن بنا دیں۔ امریکا ان پالیسیوں کے لیے فنڈز اور سفارتی حمایت فراہم کرتی ہے۔ ریاست متحدہ امریکا وہ واحد ریاست ہے جس نے جنیوا کنونشن کی شرائط کے تحت ان پالیسیوں پر مبنی عالمی اتفاق رائے میں رخنہ اندازی

کی۔ اس پالیسی کے شکار افراد اور خطے کے دیگر لوگ یہ سب کچھ جانتے ہیں اور اسرائیل کا مقبوضہ علاقوں پر قبضہ تو شروع ہی سے ظالمانہ فوجی قبضہ رہا ہے۔

سوال: کیا آپ ان میں کچھ اور مثالوں کا اضافہ کرنا چاہیں گے؟

نوم چومسکی: اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔ مثلاً یہ حقیقت کہ امریکا اور ظالم حکومتوں کی حمایت کرتا رہا ہے اور اس نے جمہوریت کی جانب پیش رفت میں رخنہ اندازی کی ہے۔ مثلاً میں نے الجزائر کا ذکر کیا یا مثلاً ترکی میں بلکہ سارے جزیرہ نمائے عرب میں بہت سی ظالم اور عوام کو دبانے والی حکومتوں کی سرپرستی امریکا کرتا ہے۔ یہ بات صدام حسین کے متعلق بھی حقیقت ہے جس کی حمایت اس کے شدید ترین مظالم کے دوران بھی جاری رکھی گئی۔ اس میں وہ دور بھی شامل ہے جب وہ کردوں کو زہریلی گیس سے ہلاک کر رہا تھا۔ اس کے لیے امریکا اور برطانیہ کی حمایت جاری رہی۔ اس سے ایک دوست اور اتحادی کا سا سلوک کیا گیا اور وہاں کے لوگ یہ سب کچھ جانتے تھے۔ جب بن لادن ایسا الزام لگاتا ہے، جیسا کہ اس نے ابھی دوبارہ بی بی سی سے نشر کیے جانے والے انٹرویو میں کیا، تو لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس بارے میں بات کر رہے ہیں۔

چلیے ایک اور بڑی مثال لیتے ہیں۔ مارچ ۱۹۹۱ء میں خلیج کی جنگ کے فوراً بعد جب عراق کی فضاؤں میں امریکا کی مکمل حکمرانی تھی تو عراق کے جنوبی حصے میں ایک بغاوت ہوئی تھی جس میں عراقی جنرل بھی شریک تھے۔ وہ صدام حسین کا تختہ الٹنا چاہتے تھے۔ انہوں نے امریکا سے امداد یا حمایت نہیں مانگی صرف یہ کہا کہ انہیں عراق سے چھینے گئے اسلحے تک رسائی حاصل کرنے دی جائے مگر امریکا نے اس سے انکار کر دیا۔ اس طرح امریکا نے خاموشی سے اور بڑے طریقے سے صدام حسین کو اجازت دے دی کہ وہ اس بغاوت کو کچلنے کے لیے فضائی طاقت استعمال کر لے۔ اس کی وجوہات کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھیں۔ نیویورک کے مشرقِ وسطیٰ کے مکتوب نگار ایلن کوول نے امریکا اور اس کے اتحادیوں کا یہ ''حیرت انگیز طور پر متفقہ نقطۂ نظر'' بیان کیا کہ: ''عراقی رہنما کے گناہ جو کوئی بھی ہوں وہ مغرب کو اور اس خطے کو سلامتی کی زیادہ بہتر امید فراہم کرتا ہے بہ نسبت ان لوگوں کے جو اس کے مظالم کا نشانہ بنتے رہے ہیں۔'' ٹائمز نے سفارتی مکتوب نگار تھامس فریڈمین نے مشاہدہ کیا، تنقیدی انداز میں نہیں، کہ واشنگٹن اور اس کے اتحادیوں کے لیے ''آہنی مکّے والی عراقی فوج''، جو عراق کو اسی طرح متحد رکھ سکے جیسے صدام کے ''آہنی مکّے'' نے رکھا ہے، ایک عوامی

بغاوت کی بہ نسبت زیادہ قابل ترجیح ہے۔ اس عوامی بغاوت کو خون میں نہلا دیا گیا اور اس میں غالباً امریکی بم باری سے بھی زیادہ لوگ مار ڈالے گئے۔ ہوسکتا ہے یہاں کے لوگ یہ سب کچھ دیکھنا نہ چاہتے ہوں لیکن تمام اخبارات کے صفحاتِ اوّل پر یہ سب خبریں موجود تھیں۔ میں دوبارہ کہوں گا کہ یہ سب کچھ اس خطے کے عوام کو معلوم ہے۔ یہ تو صرف ایک مثال ہے۔ یہ ان وجوہات میں سے ایک وجہ ہے کہ خطے کے امریکا نواز بینکار اور کاروباری حضرات میں کیوں، جمہوریت مخالف حکومتوں کی حمایت کرنے اور اقتصادی ترقی رکوانے پر امریکا کی مذمت کر رہے ہیں۔

سوال: اب ذرا مقاصد اور ان کے حصول کے راستوں کے مابین تعلق پر بات ہوجائے۔ چلیے یہ کہتے ہیں کہ آپ کا مقصد بہت نیک ہے۔ آپ ان ہولناک دہشت گردانہ جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کو انصاف تک لانا چاہتے ہیں۔ تو اس مقصد کے حصول کے لیے راستوں سے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔

نوم چومسکی: فرض کریں آپ امریکا کے کسی صدر کو انصاف تک پہنچانے کے لیے عدالتی کارروائی کی بات کریں۔ وہ بھی تو ہولناک دہشت گردانہ اقدامات کے مجرم ہیں۔ اس سب کا ایک راستہ موجود ہے اس سلسلے میں نظائر موجود ہیں۔ ۸۰ء کی دہائی میں نکاراگوا امریکا کے ایک پرتشدد حملے کا نشانہ بنا جس میں لاکھوں ہزار لوگ مارے گئے۔ ملک کافی حد تک تباہ کر دیا گیا اور ہوسکتا ہے اب اس کے اثرات سے کبھی نہ نکل سکے۔ اس ملک پر اس حملے کے جو اثرات ہوئے وہ اگلے روز نیویارک میں پیش آنے والے سانحوں سے شدت میں کہیں بڑھ کر تھے۔ نکاراگوا والوں نے واشنگٹن میں بم دھماکے کرا کے جواب نہیں دیا۔ وہ عالمی عدالت گئے جس نے ان کے حق میں فیصلہ دیا اور امریکی مداخلت کو ''طاقت کا غیر قانونی استعمال'' قرار دے کر اس کی مذمت کی۔ ''طاقت کے غیر قانونی استعمال'' کا مطلب ہے بین الاقوامی دہشت گردی۔ عدالت نے امریکا کو آئندہ اس عمل سے باز رہنے اور کافی تعداد میں زرِتلافی ادا کرنے کا بھی حکم دیا۔

امریکا نے بڑے توہین آمیز طریقے سے عدالتی فیصلے کو رد کر دیا اور اس فیصلے کا جواب حملے میں فوری طور پر شدت لا کر دیا۔ اس لیے نکاراگوا سلامتی کونسل میں گیا جس نے ایک قرارداد منظور کی جس میں تمام ریاستوں سے کہا گیا کہ وہ بین الاقوامی قانون کی پاس داری کریں۔ امریکا نے یہ قرارداد ویٹو کر دی۔ وہ جنرل اسمبلی گئے، وہاں بھی ایسی ہی ایک قرارداد تقریباً متفقہ طور پر منظور کی گئی

جس کی امریکا اور اسرائیل نے متواتر دو سال تک مخالفت کی (ایک مرتبہ ایل سلواڈور بھی ان کے ساتھ تھا)۔ یہ ہے وہ طریقہ جس پر ایک ریاست کو چلنا چاہیے۔ اگر نکاراگوا بھی اتنا ہی طاقتور ہوتا تو وہ ایک مجریہ عدالت بھی قائم کرسکتا تھا۔ یہ ہیں وہ اقدامات جو ریاست ہائے متحدہ کو کرنے چاہئیں اور اگر وہ ایسا کرے تو کوئی اس میں رخنہ بھی نہیں ڈالے گا اور اُس خطے کے تمام عوام بشمول امریکا کے اتحادیوں کے اس سے یہی کہہ رہے ہیں۔ یاد رکھیے الجزائر کی دہشت گرد حکومت کی طرح مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقا کی حکومتیں ان دہشت گرد نیٹ ورکس کی مخالفت میں امریکا کے ساتھ شامل ہوکر بہت خوش ہوں گی جو خود ان پر حملہ آور ہیں اور الجزائر کی حکومت ان تمام حکومتوں میں سب سے منحوس ہے۔ یہ سب حکومتیں ان نیٹ ورکس کے بڑے اہداف ہیں۔ لیکن یہ حکومتیں بھی کچھ نہ کچھ شہادت طلب کر رہی ہیں اور یہ حکومتیں ایسا اس لیے کر رہی ہیں تاکہ بین الاقوامی قانون پر کم از کم تھوڑا سا عمل کرنے کے اپنے عزم پر کاربند رہ سکیں۔ مصر کا موقف بہت پیچیدہ ہے۔ وہ اُس ابتدائی سسٹم کا بھی حصہ تھا جس نے بن لادن کا نیٹ ورک منظم کیا۔ جب سادات کا سیاسی قتل ہوا تو وہی اس کا پہلا شکار بنے۔ تب سے اب تک وہ اس کا ایک بڑا شکار رہے ہیں۔ وہ ان نیٹ ورکس کو تباہ کرنا پسند کریں گے۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ وہ یہ کام تبھی کریں گے جب یہ شہادت مل جائے کہ کون کون حملوں میں ملوث ہے اور پھر یہ کہ یہ سارا کام اقوام متحدہ کے منشور کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے کیا جائے اور تمام کارروائی سلامتی کونسل کی نگرانی میں ہو اور اسی راستے پر آگے بڑھنا چاہیے۔

سوال: کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جسے ایک نیک مقصد کہا جارہا ہے، کیا اس کے لیے وہ جنہیں ہم ''ناگوار کردار'' کہتے ہیں یا منشیات کے سوداگروں اور سیاسی قتل کے مرتکبین کے ساتھ اتحاد کرنا کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا۔

نوم چومسکی: یاد رکھیے کہ سب سے زیادہ ناگوار کرداروں میں اُس خطے کی حکومتیں، ہماری اپنی حکومت اور اس کے اتحادی شامل ہیں۔ اگر ہم سنجیدہ ہیں تو ہمیں یہ سوال بھی پوچھنا پڑے گا کہ نیک مقصد ہے کیا؟ کیا جیسا کہ برزیزنسکی کا دعویٰ ہے روسیوں کو ۱۹۷۹ء میں گھیر گھار کے افغان پھندے تک لے جانا نیک مقصد تھا؟ روسی جارحیت کے خلاف مزاحمت کی حمایت کرنا تو ایک بات ہے لیکن خود اپنے مقاصد کے لیے اسلامی جنونیوں کی ایک دہشت گرد فوج منظم کرنا دوسری بات۔ ہمیں اب جو سوال کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ: اس اتحاد کے بارے میں کیا خیال ہے جو ان دنوں قائم کیا جارہا ہے

اور جس کے لیے امریکا کوششیں کر رہا ہے؟ پھر ہمیں یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ امریکا خود ایک سرکردہ دہشت گرد ریاست ہے۔ ریاست ہائے متحدہ، روس، چین، انڈونیشیا، مصر، الجزائر ان سب سے اتحاد کے بارے میں کیا خیال ہے جو سب کے سب امریکا کے تعاون سے تشکیل پانے والے ایک ایسے بین الاقوامی نظام کو ابھرتے دیکھ کر خوش ہوں گے جو خود انہیں دہشت گردانہ اقدامات کی کھلی چھٹی دے دے گا۔ مثال کے طور پر روس چیچنیا میں اپنی قاتلانہ جنگ کے لیے امریکی حمایت پر بہت خوش ہوگا۔ کیوں کہ وہی افغانی روس کے خلاف بھی لڑ رہے ہیں بلکہ شاید روس کے اندر بھی دہشت گردی کی سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ اسی طرح بھارت کشمیر میں اپنی کارروائیوں پر امریکی حمایت پر خوش ہوگا۔ انڈونیشیا آچے میں اپنے قتل عام کے لیے حمایت حاصل کر کے خوش ہوگا۔ الجزائر، جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی خبروں میں سنا، اس بات پر خوش ہوگا کہ اسے ریاستی دہشت گردی میں توسیع کا اختیار دے دیا جائے۔ یہی معاملہ چین کے ساتھ ہے جو اپنے مغربی صوبوں میں علیحدگی پسند فوجوں سے لڑائی کر رہا ہے جن میں وہ ''افغانی'' بھی شامل ہیں جنہیں روسیوں کے خلاف جنگ کے لیے چین اور ایران نے منظم کیا تھا اور کچھ اطلاعات کے مطابق یہ کام ۱۹۷۸ء سے شروع کر دیا گیا تھا اور یہی معاملہ باقی ساری دنیا کے ساتھ بھی ہے۔

سوال: آپ کا یہ تبصرہ کہ امریکا ایک ''سرکردہ دہشت گرد ریاست'' ہے بہت سے امریکیوں کو حیرت زدہ کر سکتا ہے۔ کیا آپ اس کی وضاحت کریں گے؟

نوم چومسکی: میں نے صرف ایک مثال دی۔ نکاراگوا کی۔ امریکا وہ واحد ملک ہے جس کی بین الاقوامی دہشت گردی کے باعث عالمی عدالت نے مذمت کی اور جس نے سلامتی کونسل کی اس قرارداد کو مسترد کر دیا جس میں تمام ریاستوں کو بین الاقوامی قانون کی پاس داری کرنے کو کہا گیا تھا۔ یہ تو ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ اس کے مقابلے میں دیگر ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جنہیں نسبتاً چھوٹی کہا جائے گا۔

یہاں اوکلاہوماسٹی میں جب بم دھماکہ ہوا تو ہر شخص غصے میں تھا اور یہ ٹھیک بھی تھا۔ کچھ دنوں تک اخبارات میں یہ شہ سرخیاں لگتی رہیں کہ اوکلاہوماسٹی بیروت کا منظر پیش کرنے لگا ہے۔ میں نے بھی نہیں دیکھا کہ کوئی اس بات کا بھی اشارہ کرے کہ خود بیروت، بیروت کا منظر پیش کر رہا ہے، اور اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہاں ۱۹۸۵ء میں ریگن انتظامیہ نے ایک بم دھماکہ کرایا تھا جو

اوکلاہوما سٹی کے بم دھماکے سے ملتا جلتا تھا۔ اس بم دھماکے کے لیے بھی ایک مسجد کے باہر ایک ٹرک بم رکھا گیا اور بم دھماکے کا وقت ایسا فٹ کیا گیا کہ مسجد سے نکلنے والے زیادہ سے زیادہ لوگ ہلاک ہو جائیں۔ اس دھماکے میں ۸۰ افراد ہلاک اور دو سو زخمی ہو گئے، جو ایک مسلم مذہبی رہنما کو نشانہ بنانے کے لیے کیا گیا تھا جسے وہ لوگ (امریکی) پسند نہیں کرتے تھے اور وہ اس دھماکے میں بچ گیا۔ یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم آپ اس حملے کو کیا نام دیں گے جس میں عراق کے غالباً دس لاکھ عام شہری اور تقریباً ۵ لاکھ بچے ہلاک ہو چکے ہیں اور یہ وہ قیمت ہے جو ہماری وزیر خارجہ کہتی ہیں کہ وہ ادا کرنے پر آمادہ ہیں۔ کیا اس کے لیے کوئی نام ہے؟ ایک اور معاملہ ہے اسرائیلی مظالم کی حمایت کا۔ پھر ایک معاملہ ہے ترکی کی جانب سے اس کی اپنی کرد آبادی کو تباہ کرنے کی حمایت کا، جس کے لیے کلنٹن انتظامیہ نے فیصلہ کن امداد یعنی اسلحے کا ۸۰ فیصد فراہم کیا اور جیسے جیسے مظالم بڑھتے گئے اس امداد میں اضافہ ہوتا گیا یا پھر سوڈان کا معاملہ لیجیے۔ اگرچہ یہ امریکی مظالم کے ضمن میں ایک حاشیے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا اور اتنی کم اہمیت کا حامل ہے کہ اس کا گیارہ ستمبر کے حملوں کے پس منظر سے متعلق خبروں میں بس چلتے چلتے ذکر کر دیا جاتا ہے۔ یہ سارے تبصرہ نگار اس وقت کس ردعمل کا اظہار کرتے۔ اگر بن لادن کا نیٹ ورک امریکا کی ادویاتی ترسیل کا نصف حصہ تباہ کر دیتا اور یہ کی دوبارہ پوری کرنے کی سہولیات بھی ختم کر ڈالتا؟ یا پھر اسرائیل میں یہ اقدام کرتا؟ یا کسی بھی ایسے ملک میں جہاں کے عام لوگ ''اہمیت'' رکھتے ہیں؟ اگرچہ یہ کوئی منصفانہ مماثلت نہیں کیوں کہ امریکا نے تو ایک غریب ملک کو ہدف بنایا جس کے پاس ادویات اور ویکسین بہت تھوڑی سی مقدار میں تھی اور وہ جن کی کمی دوبارہ پوری بھی نہیں کر سکتا۔ کسی کو نہیں معلوم کہ اس واحد ظلم کے نتیجے میں کتنی ہزار یا دسیوں ہزار اموات واقع ہوئیں اور جب اموات کی تعداد کا تذکرہ ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے اسکینڈل بنایا جا رہا ہے۔ اگر کوئی یہی سب کچھ امریکا سے کرے یا اس کے اتحادیوں سے کرے تو آپ کو اندازہ ہے ردعمل کیا ہوگا؟ سوڈان کے معاملے میں تو ہم کہتے ہیں ارے ہاں، بہت برا ہوا، ذرا سی غلطی ہو گئی، چلیے، اب دوسرے موضوع پر بات کرتے ہیں۔ دنیا بھر میں دوسرے لوگ اس ردعمل کا اظہار نہیں کرتے۔ جب بن لادن اس بم باری کی یاد دلاتا ہے تو لوگوں کو اس کی بات میں وزن نظر آتا ہے اور وہ لوگ بھی اُس کی باتوں کو وزن دیتے ہیں جو اسے پسند نہیں کرتے اور اس سے خوف کھاتے ہیں اور وہ باقی جو کچھ کہتا ہے بدقسمتی سے یہی سب کچھ ان باتوں کے لیے بھی درست ہے۔

چلیے چھوڑیے خود اپنے خطے کی طرف لوٹتے ہیں جسے ہنری اسٹمسن نے ''یہاں اس طرف ہمارا چھوٹا سا خطہ'' کہا تھا۔ کیوبا کا معاملہ لیجیے۔ ۱۹۵۹ء سے شروع ہونے والی دہشت کے، جس میں بڑے سنگین مظالم بھی شامل ہیں، اتنے برسوں بعد اب تو کیوبا کو یہ حق حاصل ہونا چاہیے تھا کہ امریکا کے خلاف خود امریکا کے نظریے کی روشنی میں تشدد کا سہارا لے۔ اس نظریے کی روشنی میں جس پر کبھی سوال نہیں اٹھایا جاتا۔

بدقسمتی سے ایسے مزید واقعات بہت آسانی کے ساتھ بیان کیے جاسکتے ہیں نہ صرف امریکا سے متعلق بلکہ دوسری دہشت گرد ریاستوں سے متعلق بھی۔

سوال: اپنی کتاب 'دہشت گردی کی ثقافت' میں آپ لکھتے ہیں کہ ''ثقافتی منظران لبرل فاختاؤں کی سوچ سے خاص طور پر واضح ہوجاتا ہے جو باعزت انحراف کی حدود طے کر دیتی ہیں۔'' تو یہ لبرل فاختائیں گیارہ ستمبر کے واقعات کے بعد سے کس کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔

نوم چومسکی: چوں کہ میں عمومی بات کرنا پسند نہیں کرتا اس لیے ایک ٹھوس مثال لیتے ہیں۔ ۱۶ ستمبر کو نیویورک ٹائمز نے خبر دی کہ امریکا نے پاکستان سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ افغانستان کو خوراک پر مبنی امداد کی فراہمی منقطع کر دے۔ اس بات کو اشارتاً پہلے بھی کہا جاتا رہا تھا۔ لیکن اس روز کھلے الفاظ میں کہہ دیا گیا۔ واشنگٹن نے پاکستان سے جو دیگر مطالبات کیے اُن میں یہ مطالبہ بھی شامل تھا کہ ''ٹرکوں کے اُن کاروانوں کے سلسلے کو منقطع کر دیا جائے جو افغانستان کی عام آبادی کو خوراک اور دیگر سامان رسد فراہم کرتے ہیں۔'' وہ خوراک جو غالباً لاکھوں افراد کو بھوکا مرنے سے بچائے ہوئے ہے (جان برنس، اسلام آباد، نیویورک ٹائمز)۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی ایک نامعلوم تعداد، غالباً لاکھوں افراد میں بھوک سے مرتے ہوئے افغان ہلاک ہوجائیں گے۔ کیا یہ لوگ طالبان ہیں؟ نہیں۔ یہ لوگ طالبان کے شکار ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ وہ ہیں جنھیں ملک چھوڑنے سے روک دیا گیا ہے اور وہ اپنے ہی ملک میں پناہ گزین بن کر رہ رہے ہیں۔ لیکن جناب ایک بیان سامنے آتا ہے کہ ٹھیک ہے چلو ہم آگے بڑھ کر نامعلوم تعداد میں بلکہ غالباً لاکھوں بھوک سے مرتے ہوئے افغانوں کو مار ڈالتے ہیں جو طالبان کا شکار ہیں۔ اس پر کیا ردِعمل سامنے آیا؟

۱۶ ستمبر کے بعد اگلے تقریباً تمام روز میں نے دنیا بھر کے ریڈیو اور ٹیلی وژن دیکھنے اور

سننے میں گزارا میں نے خوب دھیان سے سنا۔ یورپ اور ریاست ہائے متحدہ میں کوئی ایک شخص بھی اس واقعے پر ایک لفظ پر مبنی ردعمل بھی نہیں سوچ سکا۔ باقی دنیا میں اس بارے میں کافی ردعمل کا اظہار ہوا ہے کہ خود یورپ کی حدود میں یونان میں ردعمل ہوا۔ اس پر ہمارا ردعمل کیا ہونا چاہیے تھا۔ فرض کیجیے کوئی ایسی طاقت ہوتی کہ یہ کہتی، آؤ چلو ایسا کچھ کریں جس میں دس لاکھ امریکی بھوکے مر جائیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں یہ ایک سنگین مسئلہ ہوگا؟ اور میں پھر کہوں گا کہ یہ کوئی منصفانہ مماثلت نہیں۔ جہاں تک افغانستان کا معاملہ ہے وہ واشنگٹن کی طرف سے امریکا کی جنگ میں استعمال ہونے کے بعد گلنے سڑنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس ملک کا زیادہ تر حصہ کھنڈر بن چکا ہے اور وہاں کے لوگ مایوس ہیں اور پہلے ہی دنیا میں بدترین انسانی حالت میں زندگی گزار رہے ہیں۔

سوال: نیشنل پبلک ریڈیو جسے ۸۰ء کی دہائی میں ریگن انتظامیہ نے ''ریڈیو ماناگوا'' کہہ کر مطعون کیا تھا اسے بھی باعزت بحث کی لبرل طرز کا حامی سمجھا جاتا ہے۔ ۱۷ ستمبر کو اس کے پروگرام ''آل تھنگز کنسڈرڈ'' کے میزبان نوحا ایڈمز نے ایسے ہی سوال اٹھائے تھے۔ کیا سیاسی قتل کی اجازت دے دینی چاہیے؟ کیا سی آئی اے کے اختیارات اور دائرہ کار میں مزید اضافہ کر دینا چاہیے؟

نوم چومسکی: سی آئی اے کو سیاسی قتل کرنے کی اجازت بالکل نہیں دینی چاہیے۔ لیکن یہ تو بہت چھوٹی بات کہی میں نے۔ کیا سی آئی اے کو بیروت میں ایسے کار بم دھماکے کی اجازت دینی چاہیے جس کا میں نے تذکرہ کیا؟ اور جو اتفاقاً اب راز بھی نہیں رہا۔ اسے مرکزی دھارے میں شامل ذرائع ابلاغ میں نمایاں طریقے سے رپورٹ کیا جا چکا ہے تو اسے با آسانی بھلا دیا جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں اور ایسے معاملات میں صرف سی آئی اے ہی شریک نہیں۔ کیا انہیں (امریکا کو) نکاراگوا میں ایک دہشت گرد فوج منظم کرنے کی اجازت دی جانی چاہیے تھی جسے سرکاری طور پر یہ کام سونپا گیا تھا، جس کی وضاحت خود وزارت خارجہ نے اپنے منہ سے کی تھی، کہ وہ ''آسان اہداف'' پر حملے کرے۔ آسان اہداف سے مراد تھی صحت کے کلینک اور وہ زرعی کوآپریٹوز جو اپنا دفاع نہیں کر سکتے؟ اسے آپ کیا کہیں گے؟ یا پھر بن لادن کے نیٹ ورک جیسے نیٹ ورک کھڑے کرنا؟ ہاں خود بن لادن کو نہیں بلکہ پس منظر میں موجود نیٹ ورکس۔ کیا امریکا کو اس بات کی اجازت دی جانی چاہیے کہ وہ اسرائیل کو حملہ آور ہیلی کاپٹر فراہم کرے تاکہ سیاسی قتل کرتا پھرے اور شہری اہداف پر حملے کرے۔ یہ کام سی آئی اے نہیں کرتی یہ کام کلنٹن انتظامیہ نے کیے اور اس پر کوئی

اعتراض بھی نظر نہیں آیا بلکہ اس کی تو خبر ہی نہیں دی گئی۔

سوال: کیا آپ دہشت گردی کے سیاسی استعمالات کی مختصراً وضاحت فرمائیں گے؟ اور ہمارے ''نظریاتی سسٹم'' میں یہ کہاں ٹھیک بیٹھتی ہے؟

نوم چومسکی: امریکا سرکاری طور پر اُس جنگ کے عزم پر کاربند ہے جسے وہ ''کم شدت کی جنگ'' قرار دیتا ہے۔ یہ ہے سرکاری نظریہ۔ اگر آپ برّی فوج کے مینوئل میں کم شدت کی لڑائی کی تعریف ملاحظہ فرمائیں اور پھر بری فوج ہی کے مینوئل میں موجود ''دہشت گردی'' کی سرکاری تعریف سے اس کا موازنہ کریں یا امریکا کے قانونِ مجریہ سے اس کا موازنہ کریں تو آپ یہ دریافت کریں گے کہ یہ دونوں اصطلاحات ایک سے معنی رکھتی ہیں۔ دہشت گردی سے مراد ہے سیاسی، مذہبی اور دیگر مقاصد کے حصول کی خاطر شہری آبادی کے خلاف دباؤ پر مبنی راستے اختیار کرنا۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کا دھماکہ یہی تو تھا، اگرچہ یہ ایک خصوصاً ہولناک قسم کا دہشت گردانہ جرم تھا اور یہ ہے سرکاری نظریہ۔ میں نے کچھ مثالوں کا تذکرہ کیا۔ میں ایسی اور بھی کئی مثالوں کا تذکرہ کرسکتا ہوں جو سیدھا سیدھا ریاستی اقدامات کا حصہ ہیں اور ظاہر ہے امریکا ان اقدامات میں شریک واحد ملک نہیں۔ مزید یہ کہ یہ تمام چیزیں تو معلوم ہونی چاہئیں۔ یہ بات شرم ناک ہے کہ یہ چیزیں معلوم نہیں ہیں۔ اگر کوئی شخص ان چیزوں سے متعلق جاننا چاہے تو وہ مضامین کا ایک مجموعہ پڑھ سکتا ہے جو دس برس قبل ایک بڑے ناشر نے شائع کیا تھا۔ اس مجموعے کا نام ہے ''مغرب کی ریاستی دہشت گردی'' اور اسے الیکس جارج نے مدّون کیا۔ اس میں بہت سے معاملات کا تذکرہ ہے۔ اگر یہاں پر لوگ خود اپنے متعلق کچھ جاننا چاہتے ہیں تو یہی وہ چیزیں ہیں جن کا علم انہیں ہونا چاہیے۔ یہ ساری باتیں وہ ہیں جن کا ان اقدامات سے شکار افراد کو ظاہر ہے علم ہے، لیکن ان اقدامات کے کارگزاران سے نظریں پھیرنا پسند کرتے ہیں۔

ہندوستان کے انگریزی ناول نگاروں میں ارون دھتی رائے نے اپنی پہلی ہی کتاب سے نمایاں حیثیت حاصل کرلی۔ اس ناول کو بوکر ادبی انعام سے نوازا گیا۔ اس ناول کے بعد ارون دھتی رائے نے سماجی ایکٹوزم کی راہ اختیار کی اور بڑے بڑے ڈیم بننے سے بے گھر ہو جانے والے افراد کی ابتلا کی طرف توجہ دلائی۔ حال ہی میں توہینِ عدالت کے جرم میں ہندوستان کی سپریم کورٹ نے اس کو ایک دن کی قید اور جرمانے کی سزا دی۔ برطانوی اخباروں کے بقول وہ آسکر وائلڈ کے بعد، سب سے زیادہ مشہور قیدی ادیب ہے۔ جنوبی ایشیا میں جوہری ہتھیاروں کی دوڑ پر ان کا مضمون بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ سہ ماہی "آج" کے مدیر اجمل کمال ارون دھتی رائے کے مضامین کا اردو میں ترجمہ کر رہے ہیں۔

ارون دھتی رائے

ترجمہ: اجمل کمال

جنگ امن ہے

اتوار ۷ اکتوبر ۲۰۰۱ کو جب افغانستان پر رات کی تاریکی اتر رہی تھی، امریکی حکومت نے، "دہشت گردی کے خلاف عالمی اتحاد" (جو غالباً اقوام متحدہ کا جانشین ادارہ ہے) کی حمایت سے، افغانستان پر ہوائی حملے شروع کیے۔ ٹی وی چینلوں کی اسکرینوں پر کمپیوٹر کے تخلیق کردہ کروز میزائل، اسٹیلتھ بم باری، ٹوماہاک اور بنکر بسٹر اور مارک ۸۲ ہائی ڈریگ بم جگمگاتے رہے۔ ساری دنیا میں کم سن لڑکے ان اسکرینوں کو گلز چڑھی آنکھوں سے تکتے رہے اور نئے وڈیو گیم خریدنے کی ضد سے دستبردار ہو گئے۔

اقوام متحدہ سے، جواب اپنی اہمیت کھو کر محض ایک بے اثر مخفف رہ گئی ہے، ان ہوائی حملوں کی رسمی اجازت لینے تک کا تکلف نہیں کیا گیا۔ (جیسا کہ میڈلین البرائٹ نے ایک بار کہا تھا، "امریکا کے لیے جب ممکن ہوتا ہے تو وہ سب کے ساتھ مل کر کارروائی کرتا ہے، اور جب وہ ضروری سمجھتا ہے تو تن تنہا کارروائی کرتا ہے") دہشت گردوں کے خلاف "شہادتوں" کو "اتحاد" میں شامل

دوست ملکوں کو دکھایا گیا۔ ان دوست ملکوں نے ایک دوسرے سے مشورہ کرنے کے بعد اعلان کیا کہ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ یہ شہادتیں کسی عدالت کے لیے قابل قبول ہوں گی یا نہیں۔ اس طرح صدیوں کے عرصے میں وضع کیے جانے والے عدالتی طریق کار کو لمحے بھر میں کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا گیا۔

دہشت گردی کے کسی عمل کا جواز یا بہانہ کسی بھی طرح پیش نہیں کیا جا سکتا، خواہ یہ عمل مذہبی بنیاد پرستوں، پرائیویٹ ملیشیاؤں، اور عوامی مزاحمتی تحریکوں کی جانب سے کیا گیا ہو یا اس کے برعکس یہ تسلیم شدہ حکومتوں کی طرف سے جوابی اقدام کے طور پر شروع کی جانے والی جنگ کی صورت میں ہو۔ افغانستان پر بمباری واشنگٹن اور نیویارک میں ہونے والے واقعات کا بدلہ نہیں ہے۔ یہ دنیا کے لوگوں کے خلاف کی جانے والی دہشت گردی کی ایک اور کارروائی ہے۔ ہلاک کیے جانے ایک ایک فرد کو واشنگٹن اور نیویارک میں مارے جانے والوں کی تعداد میں سے منہا نہیں بلکہ دہشت گردی کے نتیجے میں مارے جانے والوں کی مجموعی تعداد میں شامل کیا جانا چاہیے۔

جنگوں میں لوگ شاذونادر ہی فتح یاب ہوتے ہیں، اور حکومتیں شاذونادر ہی شکست کا منہ دیکھتی ہیں۔ لوگ مارے جاتے ہیں، حکومتیں روپ بدل کر پھر سامنے آ جاتی ہیں۔ پہلے وہ قومی پرچموں کو لوگوں کے دماغوں کے گرد لپیٹ کر ان کی حقیقی فکر کا گلا گھونٹتی ہیں، پھر انھی پرچموں کو اپنی جان بہ رضا و رغبت قربان کرنے والوں کی مسخ شدہ لاشوں کو کفنانے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ دونوں طرف — افغانستان میں بھی اور امریکا میں بھی — عام لوگ اپنی اپنی حکومت کی کارروائیوں کے ہاتھوں یرغمال بنے ہوئے ہیں۔ دونوں ملکوں کے باشندوں کے درمیان ایک ایسا رشتہ ہے جس کے وجود سے وہ بے خبر ہیں — دونوں جگہوں پر انھیں ایک اندھی دہشت کے ساتھ زندگی بسر کرنی ہے جس کے ظہور کی کبھی بھی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔ افغانستان پر گرائے جانے والے بموں کی ہر تعداد کے بدلے میں امریکا میں اینتھریکس کے پھیلاؤ، جہازوں کے اغوا اور دوسری دہشت انگیز کارروائیوں کا اجتماعی خوف پیدا ہوگا۔

آج دنیا کو دہشت اور بربریت کی جس پھیلتی ہوئی دلدل کا سامنا ہے، اس سے نجات پانے کا کوئی آسان طریقہ موجود نہیں۔ آج ضروری ہے کہ دنیا ٹھہر کر اپنی اجتماعی دانش کے قدیم اور جدید دونوں قسم کے کنوؤں میں جھانکے۔ ۱۱ ستمبر کو ہونے والے واقعات نے دنیا کو ہمیشہ کے لیے

تبدیل کر دیا ہے۔ آزادی، ترقی، دولت، ٹیکنولوجی، جنگ — ان تمام الفاظ نے نئے معنی اختیار کر لیے ہیں۔ حکومتوں کے لیے ضروری ہے کہ ان تبدیلیوں کو تسلیم کریں اور اپنی نئی ذمہ داریوں کا کسی قدر ایمانداری اور انکسار کے ساتھ سامنا کریں۔ بدقسمتی سے اب تک بین الاقوامی اتحاد یا طالبان، کسی کے بھی رہنماؤں کی طرف سے احساس ذمہ داری کا کوئی اشارہ سامنے نہیں آیا ہے۔

ہوائی حملوں کے آغاز کا اعلان کرتے ہوئے صدر بش نے کہا، ''ہم ایک امن پسند قوم ہیں۔'' امریکا کے چہیتے ایلچی ٹونی بلیئر نے (جس کے پاس وزیراعظم برطانیہ کا اضافی قلمدان بھی ہے)، اس کی آواز میں آواز ملائی، ''ہم امن پسند لوگ ہیں۔''

چنانچہ اب ہمیں معلوم ہو گیا ہے۔ سؤر گھوڑے ہیں۔ لڑکیاں لڑکے ہیں۔ جنگ امن ہے۔

چند روز بعد ایف بی آئی کے ہیڈکوارٹر میں تقریر کرتے ہوئے صدر بش نے کہا، ''یہ ہماری ذمہ داری ہے۔ یہ ریاست ہائے متحدہ امریکا کی ذمہ داری ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ آزاد قوم ہے۔ ایک قوم جس کی بنیاد ان اقدار پر ہے جو نفرت کو مسترد کرتی ہیں، تشدد کو مسترد کرتی ہیں، قاتلوں کو مسترد کرتی ہیں، اور شر کو مسترد کرتی ہیں۔ ہم تھکنے والے نہیں۔''

دوسری جنگ عظیم کے بعد کے عرصے میں امریکا نے جن ملکوں سے جنگ کی، اور جن پر بمباری کی، ان کی فہرست یہ ہے: چین (۱۹۴۵-۴۶، ۱۹۵۰-۵۳)، کوریا (۱۹۵۰-۵۳)، گواتے مالا (۱۹۵۴، ۱۹۶۷-۶۹)، انڈونیشیا (۱۹۵۸)، کیوبا (۱۹۵۹-۶۰)، بلجیئن کانگو (۱۹۶۴)، پیرو (۱۹۶۵)، لاؤس (۱۹۶۴-۷۳)، ویت نام (۱۹۶۱-۷۳)، کمبوڈیا (۱۹۶۹-۷۰)، گریناڈا (۱۹۸۳)، لیبیا (۱۹۸۶)، ایل سلوادور (۱۹۸۰ کا پورا عشرہ)، نکاراگوا (۱۹۸۰ کا پورا عشرہ)، پناما (۱۹۸۹)، عراق (۱۹۹۱-۹۹)، بوسنیا (۱۹۹۵)، سوڈان (۱۹۹۸)، یوگوسلاویا (۱۹۹۹)۔ اور اب افغانستان۔

یقیناً دنیا کا یہ آزادترین ملک تھکنے کا نام نہیں لیتا۔ لیکن وہ کس قسم کی آزادی ہے جس کا پرچم یہ ملک بلند کر رہا ہے؟ اپنی سرحدوں کے اندر فکر، مذہب اور اظہار کی آزادی، تخلیقی اظہار، غذائی عادات اور (کسی حد تک) جنسی ترجیحات کی آزادی، اور اس کے علاوہ بھی کچھ نہایت شاندار اور مثالی چیزوں کی آزادی۔ لیکن اپنی سرحدوں کے باہر، تسلط قائم کرنے، تذلیل کرنے اور غلام بنانے کی آزادی — جو عموماً امریکا کے اصل مذہب یعنی ''آزاد تجارت'' کے فروغ کے لیے ہے۔ اس لیے امریکا جب اپنی کسی نئی جنگ کو لامتناہی انصاف یا پائیدار آزادی کا نام دیتا ہے تو ہم تیسری دنیا

کے لوگ خوف سے لرز اٹھتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ کچھ لوگوں کے لیے لامتناہی انصاف کا مطلب کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ لامحدود ناانصافی ہوگا۔ اور جو شے کچھ لوگوں کے لیے پائیدار آزادی ہے وہ دوسروں کے لیے پائیدار غلامی ثابت ہوگی۔

دہشت گردی کے خلاف عالمی اتحاد دراصل دنیا کے امیر ترین ملکوں کا گٹھ جوڑ ہے۔ دنیا کا تقریباً تمام اسلحہ یہی ملک تیار اور فروخت کرتے ہیں؛ دنیا میں بڑے پیمانے پر ہلاکت پھیلانے والے — کیمیائی، حیاتیاتی اور ایٹمی — ہتھیاروں کے سب سے بڑے ذخیرے ان ہی ملکوں کے پاس ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ جنگیں ان ہی ملکوں نے لڑی ہیں، یہی جدید تاریخ میں نسل کشی، غلامی، نسلی تطہیر اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے بیشتر واقعات کے ذمہ دار ہیں، اور انھوں نے بے شمار آمروں، اور مطلق العنان حکمرانوں کو حمایت اور مالی اور اسلحے کی مدد فراہم کی ہے۔ ان ملکوں نے تشدد کے عمل کی پرستش کر کے اسے تقریباً الوہی درجہ بخش دیا ہے۔ طالبان، اپنے تمام تر گناہوں کے باوجود، اس گروہ میں شامل ہونے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

طالبان کی تخلیق سرد جنگ کے بعد کے مرحلے میں تباہی، ہیروئن اور بارودی سرنگوں کے عناصر سے ہوئی تھی۔ ان کے رہنما زیادہ سے زیادہ چالیس پینتالیس برس کی عمروں کے ہیں۔ ان میں سے کئی جنگ میں اپنا بازو، اپنی ٹانگ یا اپنی آنکھ گنوا چکے ہیں۔ وہ ایک ایسے معاشرے میں بڑے ہوئے ہیں جو جنگ کے ہاتھوں زخمی اور تباہ ہو چکا ہے۔ بیس برس کے عرصے میں سوویت یونین اور امریکا نے مل کر ۴۵ بلین ڈالر کی مالیت کا اسلحہ افغانستان میں جھونکا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے اس معاشرے میں جدید دور کی اگر کوئی شے پہنچی ہے تو وہ یہی جدید ترین اسلحہ ہے۔ اس ماحول میں بڑے ہونے والے کم عمر لڑکوں نے — جن میں سے اکثر یتیم ہیں — کھلونوں کی جگہ یہی ہتھیار دیکھے، گھر کی محفوظ اور آرام دہ زندگی کا کبھی تجربہ نہیں کیا، کبھی عورتوں کے ساتھ نہیں رہے۔ اب، بالغوں کے طور پر اور حاکموں کی حیثیت سے طالبان عورتوں کو زدوکوب، سنگسار اور زنا بالجبر اور وحشیانہ سلوک کا نشانہ بناتے ہیں، کیوں کہ وہ نہیں جانتے کہ عورتوں کے ساتھ اور کیا سلوک کیا جائے۔ جنگ کے طویل برسوں نے انھیں نرمی سے عاری، مہربانی اور انسانی ہمدردی سے بیگانہ کر دیا ہے۔ وہ اپنے اردگرد گرتے ہوئے بموں کی دھن پر رقص کرتے ہیں۔ اب انھوں نے اپنے وحشیانہ سلوک کا رخ خود اپنے لوگوں کی طرف موڑ دیا ہے۔

صدر بش سے معذرت کے ساتھ، دنیا کے لوگ امریکا اور طالبان کے درمیان انتخاب کرنے

پر مجبور نہیں ہیں۔ انسانی تہذیب کا تمام تر حسن — ہمارا آرٹ، ہماری موسیقی، ہمارا ادب — ان دونوں بنیاد پرست نظریاتی انتہاؤں کے باہر واقع ہے۔ اس بات کا کہ دنیا کے تمام لوگ متوسط طبقے کے صارفین بن جائیں اتنا ہی امکان موجود ہے جتنا اس کا کہ دنیا کے سب لوگ ایک ہی مذہب اختیار کر لیں۔ مسئلہ خیر اور شر، یا اسلام اور مسیحیت کے درمیان کشمکش کا نہیں بلکہ دنیا میں دستیاب گنجائش کا ہے۔ رنگارنگی کو کیسے برقرار رکھا جائے، بالادستی — معاشی، فوجی، لسانی، مذہبی، ثقافتی، کسی بھی قسم کی بالادستی — کی منھ زور خواہش کو کس طرح قابو میں رکھا جائے۔ ماحولیات کا کوئی بھی ماہر آپ کو بتا سکتا ہے کہ یک رنگی کا کلچر کس قدر تباہ کن ہوگا۔ ایسی دنیا جس میں کسی ایک ملک کو بالادستی حاصل ہو ایک ایسے ملک کی طرح ہوگی جہاں حکومت کے مقابل صحت مند حزب اختلاف کا وجود نہ ہو۔ یہ کسی نہ کسی طرح کی آمریت بن جائے گی۔ یہ بالکل ایسا ہوگا کہ دنیا کے سر پر پلاسٹک کی ایک تھیلی لپیٹ کر اسے سانس لینے سے روک دیا جائے۔ ایسی کسی بھی تھیلی کو آخرکار پھاڑ کر کھولا جانا لازمی ہوگا۔

اس نئی جنگ کے شروع ہونے سے پہلے، پچھلے بیس سال کے تنازعات میں تقریباً پانچ لاکھ افغان باشندے ہلاک ہو چکے ہیں۔ افغانستان ملبے کا ڈھیر بن گیا، اور اب اس ملبے کو مزید باریک ریت میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ ہوائی حملے شروع ہونے کے دوسرے ہی دن امریکی پائلٹ بم گرائے بغیر واپس اپنے ٹھکانوں پر پہنچنے لگے تھے۔ ایک پائلٹ کے الفاظ میں ''افغانستان اہداف سے مالامال جگہ نہیں ہے۔'' پینٹاگون میں ایک پریس بریفنگ کے دوران امریکی وزیر دفاع ڈونلڈ رمزفیلڈ سے پوچھا گیا کہ کیا امریکا کو اہداف کی کمی پیش آنے لگی ہے۔ اس نے جواب دیا، ''پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم ہر ہدف پر ایک سے زیادہ بار حملے کریں گے۔ اور دوسرے یہ کہ امریکا کو نہیں بلکہ افغانستان کو اہداف کی کمی پیش آ رہی ہے۔'' اس جواب پر بریفنگ روم میں قہقہے بلند ہوئے۔

حملے شروع ہونے کے تیسرے دن امریکی محکمۂ دفاع نے دعویٰ کیا کہ اس نے ''افغانستان پر فضائی برتری حاصل کر لی ہے۔'' (کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ افغانستان کے پاس جو دو یا سولہ طیارے تھے وہ سب کے سب تباہ کر دیے گئے؟)

افغانستان کی زمین پر شمالی اتحاد — طالبان کا پرانا دشمن، چناں چہ بین الاقوامی اتحاد کا نیا دوست — کابل کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔ (یہاں یہ بات کہہ دینی چاہیے کہ شمالی اتحاد کا ریکارڈ کسی بھی اعتبار سے طالبان سے بہتر نہیں رہا ہے۔ تاہم فی الحال اس بات کو سہولت کی خاطر

نظر انداز کیا جا رہا ہے۔) شمالی اتحاد کے بظاہر میانہ رو، "قابل قبول" رہنما احمد شاہ مسعود کو ستمبر کے
شروع میں ایک خودکش حملے میں ہلاک کر دیا گیا تھا۔ باقی اتحاد ذہنی جنگی سرداروں، سابق
کمیونسٹوں، اور سخت گیر ملاؤں کا ایک کمزور گٹھ جوڑ ہے۔ یہ نسلی اعتبار سے منقسم جنگ بازوں کا ایک
گروہ ہے جو ماضی میں افغانستان میں اقتدار کا مزہ چکھ چکے ہیں۔

امریکا کے ہوائی حملے شروع ہونے سے پہلے تک شمالی اتحاد کے قبضے میں افغانستان کا تقریباً
پانچ فیصد علاقہ تھا۔ اب وہ، بین الاقوامی اتحاد کی مدد سے اور اس کے "فضائی تحفظ" میں، طالبان کو
شکست دینے کے لیے تیار کھڑا ہے۔ اس دوران طالبان سپاہی، شکست کو سامنے دیکھ کر، ٹوٹ ٹوٹ
کر شمالی اتحاد سے ملتے جا رہے ہیں۔ چناں چہ لڑنے والے ایک طرف سے دوسری طرف جانے اور
وردیاں تبدیل کرنے میں مشغول ہیں۔ لیکن ایسے کلبیت زدہ کاروبار میں جیسا کہ اس وقت جاری
ہے، ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ محبت نفرت ہے۔ شمال جنوب ہے۔ امن جنگ ہے۔

عالمی طاقتوں کے درمیان افغانستان میں "ایک نمائندہ حکومت قائم کرنے" پر تبادلہ خیال ہو
رہا ہے۔ یا اس کا دوسرا زیر بحث متبادل افغانستان کے ۸۹ سالہ سابق بادشاہ اور ۱۹۷۳ء سے روم
میں مقیم ظاہر شاہ کی بادشاہت کی بحالی ہے۔ کھیل اسی طرح کھیلا جاتا ہے — صدام حسین کی حمایت
کرو، پھر اسے "نکال دو"؛ مجاہدین کو پیسہ اور ہتھیار دو، پھر بمباری کر کے انھیں ریزہ ریزہ کر
دو؛ ظاہر شاہ کو "لے آؤ"، اور اس پر نگاہ رکھو کہ وہ اچھا لڑکا ثابت ہو رہا ہے یا نہیں۔ (کیا کسی ملک
میں نمائندہ حکومت "قائم کرنا" ممکن ہے؟ کیا جمہوریت کو آرڈر پر منگوایا جا سکتا ہے، فالتو پنیر اور
چٹنی کے ساتھ؟)

شہریوں کے ہلاک اور زخمی ہونے کی اکادکا خبریں آنے لگی ہیں، اور شہروں کے خالی ہونے
کی کیونکہ وہاں کے باشندے جان بچانے کے لیے سرحدوں کے پاس جمع ہو گئے ہیں جنھیں ان کے
لیے بند کر دیا گیا ہے۔ بڑی سڑکیں یا تو دھماکوں میں تباہ ہو گئیں یا بند کر دی گئیں۔ جن لوگوں کو
افغانستان میں کام کرنے کا تجربہ ہے ان کا کہنا ہے کہ نومبر کے آتے آتے امدادی قافلوں کے لیے
دسیوں لاکھ افغان باشندوں تک پہنچنا ناممکن ہو جائے گا جو آنے والے موسم سرما میں فاقوں سے
ہلاک ہونے کے نہایت حقیقی خطرے سے دوچار ہیں (اقوام متحدہ کے مطابق ان باشندوں کی تعداد
۷۵ لاکھ ہے)۔ وہ کہتے ہیں کہ جاڑوں کے آنے میں جتنا عرصہ باقی رہ گیا ہے اس میں یا تو جنگ
ہو سکتی ہے یا ان فاقہ زدہ افغانوں تک خوراک پہنچانے کی کوشش۔ دونوں چیزیں بیک وقت نہیں ہو

سکتیں۔

انسانی ہمدردی کی ایک فراخ دلانہ علامت کے طور پر امریکی حکومت نے افغانستان پر ہوائی جہازوں سے ۳۷،۰۰۰ غذائی پیکٹ گرائے ہیں۔اس کا کہنا ہے کہ وہ اس قسم کے پچاس لاکھ پیکٹ گرانے کا ارادہ رکھتی ہے۔اس صورت میں بھی یہ غذا دسیوں لاکھ افغانوں میں سے، جو غذا کے انتہائی ضرورت مند ہیں، صرف نصف ملین یا پانچ لاکھ باشندوں کی صرف ایک وقت کی بھوک مٹا سکے گی۔امدادی کارکنوں نے امریکی حکومت کے اس عمل کو تعلقات عامہ کی ایک کلبیت زدہ اور خطرناک کوشش قرار دے کر اس کی مذمت کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہوائی جہازوں سے غذا کے پیکٹ گرانا بے مصرف سے بھی بدتر ہے۔ اول تو یہ غذا ان لوگوں تک کبھی نہیں پہنچ سکے گی جنھیں دراصل اس کی ضرورت ہے۔اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ جو لوگ ان پیکٹوں کو اٹھانے کے لیے لپکیں گے انھیں بارودی سرنگوں کے پھٹنے سے ہلاک ہونے کا خطرہ درپیش ہو گا۔ایک المناک غذائی دوڑ!

ان سب باتوں کے باوجود غذائی پیکٹوں کو بے حد تشہیر حاصل ہوئی۔ان کے مشمولات کی فہرست کو بڑے بڑے اخباروں کے صفحوں پر جگہ ملی۔ یہ تمام مشمولات غیر لحمیاتی اجزا پر مشتمل تھے، مسلم غذائی قوانین کے عین مطابق (!) زرد رنگ کے ہر پیکٹ میں، جسے امریکی پرچم سے آرائش دی گئی تھی، مندرجہ ذیل چیزیں رکھی گئی تھیں: چاول، مونگ پھلی کا مکھن، بین سلاد، اسٹرابری جام، کرارے بسکٹ، کشمش، چپٹی روٹی، ایک فروٹ بار، سیزننگ، ماچس، پلاسٹک کے برتنوں کا ایک سیٹ، کاغذی رومال، اور باتصویر ترکیب استعمال۔

تین سال کی متواتر خشک سالی کے بعد جلال آباد میں آسمان سے اترتی ہوئی ایرلائن کی خوراک! ثقافتی بے خبری کی یہ سطح، مہینوں کی فاقہ کشی اور پیس ڈالنے والی مفلسی کا مطلب سمجھنے میں یہ قطعی ناکامی، امریکی حکومت کی طرف سے اس شدید انسانی بے بسی تک کو اپنے سیلف امیج کے فروغ کے لیے استعمال کرنے کی یہ کوشش بیان سے باہر ہے۔

ذرا اس منظرنامے کو الٹ کر دیکھنے کی کوشش کیجیے۔ تصور کیجیے کہ طالبان حکومت نیویارک شہر پر بمباری کرتی ہے، متواتر یہ بات کہتے ہوئے کہ اس کا اصل ہدف امریکی حکومت اور اس کی پالیسیاں ہیں۔ اور فرض کیجیے، بمباری کے درمیانی وقفوں میں طالبان افغان پرچم سے سجے ہوئے غذائی پیکٹ گراتے ہیں جن میں نان اور کباب موجود ہیں۔ کیا نیویارک کے بھلے لوگ اس بات پر

کبھی افغان حکومت کو معاف کرسکیں گے؟ خواہ وہ کتنے ہی بھوکے ہوں، خواہ وہ اسے کھانے پر مجبور ہی کیوں نہ ہو جائیں، وہ اس توہین، اس ذلت کو کس طرح فراموش کرسکیں گے؟ نیویارک کے میئر روڈی جیولیانی نے ایک سعودی شہزادے کی طرف سے بھیجا جانے والا ایک کروڑ ڈالر کی امدادی رقم کا چیک لوٹا دیا کیونکہ اس کے ساتھ مشرق وسطیٰ میں امریکی پالیسی کی بابت ایک دوستانہ مشورہ بھی منسلک تھا۔ کیا خودداری ایک ایسی عیاشی ہے جو صرف دولت مندوں کے لیے مخصوص ہے؟

طیش کو مٹانے کے بجائے بھڑکانے کی یہی کوششیں ہیں جو دہشت گردی کو پیدا کرتی ہیں۔ نفرت اور انتقام ایک ساتھ باہر آجائیں تو پھر واپس جا کر اپنے صندوق میں بند ہونے کو تیار نہیں ہوتے۔ ہر ''دہشت گرد'' یا اس کے ''حامی'' کے ہلاک ہونے کے نتیجے میں اس بات کا خاصا امکان موجود ہے کہ اس کی جگہ مستقبل میں کئی دہشت گرد پیدا ہوں گے۔

یہ سلسلہ کہاں جا کر ختم ہوگا؟

تمام خطابت کو ایک طرف رکھتے ہوے، ایک لمحے کے لیے اس حقیقت پر غور کیجیے کہ دنیا ابھی تک ''دہشت گردی'' کی کوئی قابل قبول تعریف متعین نہیں کرسکی ہے۔ جو شخص ایک ملک کے لیے دہشت گرد ہے وہ دوسرے ملک کے نزدیک مجاہد آزادی ہے۔ اس پورے معاملے کی تہہ میں تشدد کی بابت دنیا کا دوہرا رویہ کارفرما ہے۔ ایک بار تشدد کو جائز سیاسی حربے کے طور پر تسلیم کر لینے کے بعد دہشت گردوں (یا باغیوں یا آزادی کے مجاہدوں) کے اخلاقی اور سیاسی طور پر قابل قبول ہونے کی بات ایک دشوار گذار اور اوبڑ کھابڑ راستے پر سفر کے مترادف ہو جاتی ہے۔ امریکی حکومت نے دنیا کے مختلف خطوں میں بڑی تعداد میں باغیوں اور شرپسندوں کو رقم، ہتھیار اور پناہ فراہم کی ہے۔ سی آئی اے اور پاکستانی آئی ایس آئی نے مجاہدین کو تربیت اور اسلحے سے لیس کیا جنھیں ۱۹۸۰ء کے عشرے میں سوویت مقبوضہ افغانستان کی حکومت دہشت گرد تصور کرتی تھی۔ صدر ریگن نے ان کے ساتھ گروپ فوٹو بنوایا تھا اور انھیں امریکا کے بنیادگذار رہنماؤں کے مساوی قرار دیا تھا۔ آج پاکستان — جو اس نئی جنگ میں امریکا کا اتحادی ہے — ان باغیوں کو امداد دیتا ہے جو سرحد پار کر کے ہندوستانی کشمیر میں داخل ہوتے ہیں۔ پاکستان انھیں ''مجاہدین آزادی'' کہہ کر سراہتا ہے، ہندوستان انھیں ''دہشت گرد'' کہتا ہے۔ ہندوستان ان ملکوں کی مذمت کرتا ہے جو دہشت گردی کی حمایت اور اعانت کرتے ہیں، لیکن خود ہندوستان اُن علیحدگی پسند تاملوں کو تربیت فراہم کر چکا ہے جو سری لنکا میں ایک علیحدہ وطن حاصل کرنا چاہتے ہیں — یعنی لبریشن ٹائیگرز آف تامل ایلام

(LTTE) کو جوخوں آشام دہشت گردی کی بے شمار کارروائیوں کی ذمہ دار ہے۔ (بالکل اسی طرح جیسے سی آئی اے نے مجاہدین سے اپنا مقصد پورا کرنے کے بعد انھیں چھوڑ دیا تھا، ہندوستان نے بھی تامل علیحدگی پسندوں کی طرف پیٹھ موڑ لی۔ ۱۹۹۱ء میں ہندوستانی وزیر اعظم راجیو گاندھی کو ہلاک کرنے والی ایل ٹی ٹی ای کی ایک ناراض خودکش بمبار ہی تھی۔)

حکومتوں اور سیاست دانوں کے لیے یہ سمجھنا بہت اہم ہے کہ ان وسیع اور بلاخیز انسانی احساسات کو اپنے محدود مقاصد کے لیے استعمال کرنا ممکن ہے فوری طور پر مفید ثابت ہو، لیکن انجام کار، اور ناگزیر طور پر، اس کے تباہ کن نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ مذہبی جذبات کو سیاسی موقع پرستی کے مقاصد کے لیے استعمال کرنا وہ خطرناک ترین ورثہ ہے جو حکومتیں یا سیاست داں دنیا کے — اور خود اپنے — عوام کو دے سکتے ہیں۔ ایسے معاشروں میں جو مذہبی یا فرقہ وارانہ شدت پسندی کے ہاتھوں پارہ پارہ ہیں، رہنے والے لوگ جانتے ہیں کہ ہر مذہبی متن کو — انجیل سے لے کر بھگوت گیتا تک — غلط تعبیر کے ذریعے ایٹمی جنگ، نسل کشی، کارپوریٹ گلوبلائزیشن، کسی بھی بات کا جواز بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان دہشت گردوں کو جنھوں نے ۱۱ ستمبر کی ہولناک کارروائیاں کیں، تلاش کر کے سزا نہیں دی جانی چاہیے۔ ضرور دی جانی چاہیے۔ لیکن کیا جنگ ان کو گرفت میں لانے کا بہترین طریقہ ہے؟ کیا بھوسے کے ڈھیر کو آگ لگا دینے سے اس میں چھپی ہوئی سوئی مل جائے گی؟ یا اس سے غصہ اور بڑھے گا اور دنیا ہم سب کے لیے سچ مچ کا جہنم بن جائے گی؟

اگر بات اسی پر آ جائے تو آخر آپ کتنے لوگوں کے پیچھے جاسوس لگا سکتے ہیں، کتنے بینک اکاؤنٹ منجمد کر سکتے ہیں، کتنی گفتگوؤں کو چوری چھپے کان لگا کر سن سکتے ہیں، کتنے ای میل پیغامات روک کر پڑھ سکتے ہیں، کتنے خط راستے میں کھول سکتے ہیں، کتنے فون ٹیپ کر سکتے ہیں؟ ۱۱ ستمبر سے پہلے بھی سی آئی اے اتنی کثیر مقدار میں اطلاعات جمع کر چکی تھی جن کی جانچ پڑتال کرنا انسانی استطاعت سے باہر ہے۔ (بعض اوقات حد سے زیادہ اطلاعات بھی سمجھداری کی راہ مسدود کر دیتی ہیں — یہ تعجب کی بات نہیں کہ امریکی جاسوس سیارچوں کو ۱۹۹۸ء میں ہندوستان کی نیوکلیئر آزمائشوں کی قبل از وقت خبر نہ ہو سکی۔ مخبری اور جاسوسی کی یہ مطلوبہ سطح انتظامی، اخلاقی اور شہری آزادی کے اعتبار سے ایک بھیانک خواب کی طرح ہوگی۔ اس کے نتیجے میں ہر شخص اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے گا۔ اور آزادی — جو سب سے زیادہ، سب سے زیادہ قیمتی شے ہے — سب سے

پہلے شکار ہو جائے گی۔ یہ تو ابھی سے زخمی اور لہولہان ہو چکی ہے۔

ساری دنیا کی حکومتیں خوف کی موجودہ فضا کو بڑی سفاکی اور چالاکی سے اپنے مفادات کو بڑھاوا دینے کے لیے استعمال کر رہی ہیں۔ ہر قسم کی نا قابل اعتبار سیاسی قوتوں کو بے لگام چھوڑا جا رہا ہے۔ مثال کے طور ہندوستان میں کل ہند عوامی مزاحمتی فورم کے ارکان کو، جو دہلی میں جنگ اور امریکا کے خلاف پمفلٹ بانٹ رہے تھے، گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ ان پمفلٹوں کو چھاپنے والے پریس کے مالک کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ دائیں بازو سے تعلق رکھنے والی حکومت نے (جو اپنے اندر وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دَل جیسے انتہاپسند ہندو گروپوں کو پناہ دیے ہوئے ہے) اسٹوڈنٹس اسلامک مومنٹ آف انڈیا (SIMI) پر پابندی لگا دی ہے اور اب وہ ایک قدیم دہشت گرد مخالف ایکٹ کو زندہ کرنے کی فکر میں ہے جسے اس وقت واپس لے لیا گیا تھا جب انسانی حقوق کے کمیشن نے اطلاع دی تھی کہ اس کا جائز سے زیادہ ناجائز استعمال ہو رہا ہے۔ ہندوستان کے کروڑوں شہری مسلمان ہیں۔ کیا انھیں بیگانہ کر دینے سے کوئی مفید مقصد حاصل ہو سکتا ہے؟

جب تک یہ جنگ جاری ہے، ہر روز مشتعل جذبات متواتر دنیا میں پھیل رہے ہیں۔ بین الاقوامی ذرائع ابلاغ کو جنگ زدہ خطے تک آزاد رسائی حاصل نہیں۔ یوں بھی، مین اسٹریم ذرائع ابلاغ نے، خصوصاً امریکا میں، زمین پر لیٹ کر فوجی ترجمانوں اور سرکاری اہلکاروں سے پریس ہینڈآؤٹس کے ذریعے اپنے پیٹ میں گدگدیاں کروانے کا وطیرہ اختیار کر لیا ہے۔ افغان ریڈیو اسٹیشن بمباری سے تباہ کیے جا چکے ہیں۔ طالبان ہمیشہ سے پریس کو شک کی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں۔ پروپیگنڈا کی جنگ میں کسی کو درست اندازہ نہیں ہے کہ کتنے لوگ مارے جا چکے ہیں یا کتنی تباہی ہو چکی ہے۔ قابل اعتبار اطلاعات کی عدم موجودگی میں ہر قسم کی عجیب و غریب افواہیں پھیلتی ہیں۔

دنیا کے اس خطے میں زمین سے کان لگا کر سنیں تو آپ کو پھیلتے ہوئے غصے کی دھمک سنائی دے سکتی ہے۔ خدارا اب اس جنگ کو روکیے۔ بہت لوگ مارے جا چکے ہیں۔ اسمارٹ میزائل اپنے نشانے میں اتنے زیادہ اسمارٹ نہیں۔ وہ دبائے ہوئے غصے کے پورے پورے ذخیروں کو دھماکے سے زندہ کر رہے ہیں۔

صدر جارج بش نے حال ہی میں دعویٰ کیا: ''جب میں کارروائی شروع کروں گا تو دس ڈالر مالیت کے خالی خیمے پر بیس لاکھ ڈالر قیمت کا میزائل پھینک کر ایک اونٹ کی پیٹھ کو زخمی نہیں کروں

گا۔ یہ فیصلہ کن کارروائی ہو گی۔'' صدر بش کو معلوم ہونا چاہیے کہ افغانستان میں ایسا کوئی ہدف موجود نہیں جو اس کے میزائل کی قیمت کا ہم پلّہ ہو۔ شاید محض اپنے حساب کتاب کو درست رکھنے کے لیے ہی سہی، اسے سستے میزائل تیار کرانے چاہییں جنھیں دنیا کے غریب ملکوں میں کم مالیت کے اہداف اور کم قیمت زندگیوں کو نشانہ بنانے کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ لیکن عالمی اتحاد کی اسلحہ ساز کمپنیوں کے لیے یہ بات تاجرانہ دانش مندی کے منافی ہو گی۔ مثال کے طور پر یہ بات کارلائل گروپ کے نزدیک — جسے انڈسٹری اسٹینڈرڈ نے دنیا کی سب سے بڑی پرائیویٹ ایکویٹی فرم قرار دیا ہے اور جس کے زیرِانتظام ۱۲ بلین ڈالر کا سرمایہ ہے — یہ بات بالکل لغو ہو گی۔ کارلائل گروپ دفاعی شعبے میں سرمایہ کاری کرتا ہے اور فوجی تنازعات اور اسلحے پر کیے جانے والے اخراجات کے ذریعے منافع کماتا ہے۔

کارلائل کو چلانے والے افراد بے داغ ریکارڈ رکھتے ہیں۔ سابق امریکی وزیرِ دفاع فرینک کارلوچی کارلائل کا چیئرمین اور مینیجنگ ڈائرکٹر ہے (کالج میں وہ ڈونلڈ رمزفیلڈ کا روم میٹ تھا)۔ کارلائل کے دوسرے پارٹنروں میں سابق امریکی وزیرِ خارجہ جیمز اے بیکر سوم، جارج سوروز اور فریڈ میلک (جو جارج بش سینئر کی انتخابی مہم کا نگران تھا) شامل ہیں۔ ایک امریکی اخبار — بالٹی مور کرانیکل اینڈ سینٹینل — کا کہنا ہے کہ صدر جارج بش سینئر ایشیائی منڈیوں میں کارلائل گروپ کے لیے سرمایہ کاری کے موقعوں کی تلاش میں ہے۔ اطلاعات کے مطابق اس نے ممکنہ حکومتی گاہکوں کو ''تحائف'' پیش کرنے کے لیے خاصی خطیر رقمیں مخصوص کی ہیں۔

اوہو! جیسا کہ پرانی فرسودہ کہاوت ہے، یہ سب خاندانی معاملہ ہے۔

پھر اس خاندانی کاروبار کی دوسری شاخ ہے — تیل۔ یاد رکھیے، صدر جارج بش (جونیئر) اور نائب صدر ڈک چینی دونوں نے اپنی دولت امریکی تیل کی صنعت میں کام کر کے کمائی ہے۔

ترکمانستان میں، جو افغانستان کی شمال مغربی سرحد پر واقع ہے، دنیا کے تیسرے سب سے بڑے گیس کے ذخیرے اور تیل کے چھ ارب بیرل کے ذخیرے موجود ہیں۔ گیس اور تیل کے یہ ذخائر، ماہرین کے کہنے کے مطابق، امریکا کی توانائی کی ضروریات کو اگلے تیس سال تک (اور کسی ترقی پذیر ملک کی ضروریات کو کئی صدیوں تک) پورا کر سکتے ہیں۔ امریکا نے تیل کو ہمیشہ اپنے سلامتی کے معاملات میں شامل کیا ہے اور اس کی حفاظت کے لیے ہر قسم کے اقدامات کو جائز سمجھا ہے۔ ہم میں سے کم ہی لوگوں کو اس بات پر شبہ ہو گا کہ خلیج فارس کے علاقے میں امریکا کی فوجی

موجودگی کا تعلق انسانی حقوق کی بابت اس کی تشویش سے کم اور تقریباً مکمل طور پر تیل کے شعبے میں اس کے اسٹریٹیجک مفاد سے ہے۔

بحیرۂ خزر (کیسپیئن) کے خطے میں پائے جانے والے تیل اور گیس کے ذخائر کا رخ فی الحال مغرب میں واقع یورپی منڈیوں کی طرف ہے۔ جغرافیائی اور سیاسی اعتبار سے ایران اور روس امریکی مفادات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ ۱۹۹۸ء میں ڈِک چینی نے — جو اس وقت ہیلی برٹن کمپنی کا چیف تھا، جو تیل کی صنعت میں نمایاں مقام رکھتی ہے — کہا تھا: ''میں کسی ایسے موقعے کا تصور نہیں کر سکتا جب ایک پورا جغرافیائی خطہ اتنے اچانک اور دفاعی طور پر اتنے اہم انداز سے ابھر کر سامنے آیا ہو جیسے کیسپیئن کا خطہ سامنے آیا ہے۔ بالکل یوں لگتا ہے جیسے مواقع راتوں رات پیدا ہو گئے ہوں۔'' بالکل درست!

گزشتہ کئی برسوں سے ایک بہت بڑی امریکی تیل کمپنی یونوکول افغانستان سے ہو کر پاکستان اور اس سے آگے بحیرۂ عرب تک جانے والی پائپ لائن بچھانے کی اجازت کے لیے طالبان کے ساتھ مذاکرات کر رہی تھی۔ اس مقام سے یونوکول جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کی ابھرتی ہوئی منڈیوں تک رسائی حاصل کرنے کی امید رکھتی ہے۔ ۱۹۹۷ء میں طالبان ملاؤں کے ایک وفد نے امریکا کا دورہ کیا تھا اور ہوسٹن میں امریکی وزارت خارجہ کے اہلکاروں اور یونوکول کے ایگزیکٹوز سے بھی ملاقات کی تھی۔ اس موقعے پر سرعام پھانسیاں دینے سے طالبان کے شغف اور افغان عورتوں کے ساتھ ان کے سلوک کو انسانیت کے خلاف جرائم کے طور پر پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی جیسا کہ آج کل پیش کیا جا رہا ہے۔ اگلے چھ مہینوں تک امریکا میں عورتوں کی ناراض تنظیموں کو اس مسئلے پر کلنٹن انتظامیہ پر بہت زیادہ دباؤ ڈالنا پڑا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ اُس سودے کو رکوانے میں کامیاب رہیں۔ اور اب ایک بار پھر امریکی تیل کی صنعت کو ایک سنہری موقع ملا ہے۔

امریکا میں اسلحے کی صنعت، تیل کی صنعت، ذرائع ابلاغ کے بڑے بڑے نیٹ ورک، اور بلاشبہ امریکی خارجہ پالیسی، کا کنٹرول انھیں تجارتی گروپوں کے ہاتھوں میں ہے۔ چنانچہ یہ توقع کرنا احمقانہ بات ہوگی کہ ہتھیاروں اور تیل کے ذخیروں اور دفاعی معاہدوں کی یہ باتیں کبھی درست تفصیل کے ساتھ بڑے ذرائع ابلاغ میں جگہ پا سکیں گی۔ اور پھر یوں بھی امریکی عوام کو، جنھیں تازہ زخم لگا ہے، جن کے ذہن صدمے سے ماؤف اور تکلیف میں مبتلا ہیں، جن کے وقار کو ٹھیس لگے ابھی

بہت دن نہیں ہوے، جن کے پیارے المناک موت کا شکار ہوئے ہیں، اور جن کا غم و غصہ تازہ اور تیز ہے، "تہذیبوں کے تصادم" اور "حق بمقابلہ باطل" کی باتیں بالکل درست معلوم ہوتی ہیں۔ اور سرکاری ترجمان یہ باتیں وٹامن کی گولیوں یا ڈپریشن کم کرنے والی دوا کی روزانہ خوراک کی طرح پابندی سے ان تک پہنچاتے ہیں۔ پابندی سے دی جانے والی اس دوا کے نتیجے میں مین لینڈ امریکا ایک ایسا ہی معما بنا رہے گا جیسا کہ وہ اب تک ہے — عجیب طور سے الگ تھلگ اور بے خبر رہنے والے لوگ، جن کی باگیں ایک مداخلت کار اور بے باک حکومت کے ہاتھوں میں ہیں۔

اور دوسری طرف ہمارا یعنی باقی سب کا کیا حال ہے جو اس احمقانہ پروپیگنڈا کے بے حس ہدف ہیں؟ جو مونگ پھلی کے مکھن اور اسٹرابری جام میں لتھڑی ہوئی جھوٹ اور بربریت کی اس غذا پر پل رہے ہیں جو روزانہ ہمارے دماغوں پر بالکل اسی طرح گرائی جاتی ہے جیسے افغانستان پر زرد غذائی پیکٹ برسائے جا رہے ہیں؟ کیا ہم نظریں چرا کر یہ غذا کھاتے رہیں گے، محض اس لیے کہ ہم بھوکے ہیں، یا پھر ہم آنکھیں کھول کر، پلک جھپکائے بغیر اس المناک ڈرامے کو دیکھیں گے جو افغانستان میں کھیلا جا رہا ہے، اور آخرکار اجتماعی طور پر استفراغ کریں گے اور ایک آواز ہو کر کہیں گے کہ بس، اب بہت ہو چکا؟

اب جبکہ نئی صدی کا پہلا سال خاتمے کے قریب ہے، میں سوچتی ہوں — کیا ہم اپنے خواب دیکھنے کے حق سے دستبردار ہو چکے ہیں؟ کیا ہم کبھی دوبارہ حسن کا تصور کرنے کے قابل ہو سکیں گے؟ کیا ایسا پھر کبھی ممکن ہو گا کہ ہم دھوپ میں چھپکلی کے نوزائیدہ بچے کی حیران پلکوں کے جھپکنے کے سست رفتار عمل کا مشاہدہ کر سکیں، یا کسی گلہری کو، جس نے ہم سے سرگوشی میں کچھ کہا ہو سرگوشی میں جواب دے سکیں، اور اس عمل میں ہمیں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا اور افغانستان کا خیال نہ آئے؟

Arundhati Roy

ارون دھتی رائے
انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

لامتناہی انصاف کا حساب کتاب

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گون پر ہونے والے ناقابل مدافعت خودکش حملوں کے بعد ایک امریکی نیوز کاسٹر نے کہا: ''نیکی اور بدی شاذونادر ہی خود کو اتنے واضح طور پر ظاہر کرتے ہیں جیسا پچھلے منگل کے دن ہوا۔ ایسے لوگوں نے جنھیں ہم نہیں جانتے، اُن لوگوں کو قتل کیا جنھیں ہم جانتے ہیں۔ اور انھوں نے یہ سب ایک تحقیر آمیز مسرت کے ساتھ کیا۔'' اس کے بعد وہ جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور رونے لگا۔

اصل نکتہ اسی بات میں پوشیدہ ہے: امریکا ایسے لوگوں کے خلاف جنگ کر رہا ہے جنھیں وہ نہیں جانتا، کیونکہ وہ لوگ عموماً ٹی وی اسکرینوں پر نمودار نہیں ہوتے۔ اپنے دشمن کو مناسب طور سے شناخت کرنے اور اس کی فطرت کو سمجھنے کی کوشش شروع کیے بغیر امریکی حکومت نے، پبلسٹی اور کھوکھلی، شرمندہ کن خطابت کے شوروغل کے درمیان، ''دہشت گردی کے خلاف ایک بین الاقوامی اتحاد'' قائم کر لیا، اپنی زمینی، ہوائی، اور بحری فوج کو اور ذرائع ابلاغ کو متحرک کر لیا، اور ان سب کو جنگ پر آمادہ کر لیا۔

مسئلہ یہ ہے کہ امریکا جب ایک بار جنگ کے ارادے سے نکل کھڑا ہوتا ہے تو پھر جنگ کیے بغیر واپس نہیں لوٹ سکتا۔ اگر وہ اپنے دشمن کو تلاش نہ کر سکے تو وطن میں بیٹھے مشتعل لوگوں کی خاطر، اسے اپنا دشمن گڑھنا پڑتا ہے۔ ایک بار جنگ شروع ہو جائے تو وہ اپنی حرکیات، اپنی منطق اور اپنا جواز خود پیدا کر لیتی ہے، اور بہت جلد ہماری نظروں سے یہ بات اوجھل ہو جاتی ہے کہ یہ جنگ دراصل شروع کس لیے ہوئی تھی۔ اس وقت ہم جس منظر کا مشاہدہ کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ دنیا کا طاقت ور ترین ملک، غصے سے بے اختیار ہو کر، خود کو ایک نئی قسم کی جنگ لڑنے کی نہایت قدیم جبلت کے سپرد کر رہا ہے۔ اِس وقت جب اسے اپنی حفاظت کا مسئلہ درپیش ہوا ہے تو تمام روایتی وارشپ، کروز میزائل، اور ایف سولہ طیارے اچانک گئی گزری، فرسودہ اشیا معلوم ہونے لگے

ہیں۔ حملے سے باز رکھنے کی ضمانت کے طور پر امریکا کے ایٹمی ہتھیاروں کے ذخیرے کی حیثیت ہم وزن کباڑ سے زیادہ کی نہیں رہ گئی۔ ڈبے کھولنے والے کٹر، قلمی چاقو اور سرد غصہ وہ ہتھیار ہیں جن سے نئی صدی کی جنگیں لڑی جائیں گی۔ غصہ تار کا ایک ٹکڑا ہے۔ وہ کسی کو دکھائی دیے بغیر کسٹم سے گذر جاتا ہے۔ سامان کی تلاشی میں کسی کو نظر نہیں آتا۔

امریکا کس سے لڑ رہا ہے؟ ۲۰ ستمبر کو ایف بی آئی نے کہا کہ اسے ہائی جیکروں میں سے بعض کی شناخت کے بارے میں شبہات ہیں۔ ٹھیک اسی دن صدر بش نے کہا، ''ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں اور کن ملکوں کی حکومتیں ان کی اعانت کر رہی ہیں۔'' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدر کو کچھ ایسی چیزیں بھی معلوم ہیں جو ایف بی آئی اور امریکی عوام کے علم سے باہر ہیں۔

۲۰ ستمبر کو امریکی کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے صدر بش نے امریکا کے دشمنوں کو ''آزادی کے دشمن'' قرار دیا۔ ''امریکی پوچھتے ہیں: وہ ہم سے کیوں نفرت کرتے ہیں؟ دراصل وہ ہماری آزادی سے نفرت کرتے ہیں، ہماری مذہبی آزادی سے، ووٹ دینے، ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھا ہونے اور ایک دوسرے سے اختلاف کرنے کی آزادی سے۔'' یہاں لوگوں سے سلسلہ وار دو باتوں پر آنکھیں بند کر کے یقین کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ ایک تو یہ کہ ''دشمن'' وہی ہے جسے امریکی حکومت دشمن قرار دے رہی ہے، حالانکہ اس کے پاس اس کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ اس دشمن کے عمل کے محرکات وہی ہیں جنھیں امریکی حکومت ان کے محرکات کے طور پر بیان کر رہی ہے، اور اس کے پاس اس کی بھی کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔

اسٹریٹیجک، فوجی اور اقتصادی وجوہ سے یہ امریکی حکومت کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ اپنے عوام کو یہ باور کرائے کہ آزادی، جمہوریت اور امریکی طرز زندگی سے ان کی وابستگی خطرے کی زد میں ہے۔ صدمے، غم اور غصے کے موجودہ ماحول میں اس تصور کو مقبول بنانا آسان کام ہے۔ تاہم، اگر یہ تصور حقیقت پر مبنی ہوتا تو یہ بات سمجھنا سخت دشوار ہے کہ حملے کے لیے امریکا کی اقتصادی اور فوجی بالادستی کی علامات، یعنی ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون، کو کیوں منتخب کیا گیا۔ ان کے بجائے مجسمۂ آزادی پر حملہ کیوں نہ کیا گیا؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ حملے کا محرک امریکی آزادی اور جمہوریت نہیں بلکہ وہ تاریخی حقائق ہوں جن کی رو سے امریکا نے ہمیشہ (امریکا سے باہر) آزادی اور جمہوریت کی عین ضد — یعنی فوجی اور معاشی دہشت گردی، انتشار، فوجی آمریت، مذہبی شدت پسندی اور ناقابل تصور نسل کشی — کی عملی طور پر حمایت کی ہے؟ امریکی عوام کے لیے، جو ابھی اتنے بڑے

صدمے سے دوچار ہوے ہیں، بلاشبہ اس بات کا سامنا کرنا بہت دشوار ہے کہ وہ اپنی آنسو بھری آنکھیں دنیا کی طرف اٹھائیں اور انھیں دنیا کی آنکھوں میں بے اعتنائی دکھائی دے۔ یہ بے اعتنائی نہیں ہے۔ یہ محض تعجب کی غیر موجودگی ہے۔ اس بات کا گھسا پٹا شعور ہے کہ جو کچھ دوسروں کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ بالآخر اپنے ساتھ بھی پیش آتا ہے۔ امریکی عوام کو یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ نفرت کا ہدف وہ نہیں بلکہ ان کی حکومت کی پالیسیاں ہیں۔ ان کو اس بات پر ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ ان کے غیر معمولی موسیقاروں، ادیبوں، اداکاروں، ان کے شاندار کھلاڑیوں اور ان کی فلموں کو دنیا بھر میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ ۱۱ ستمبر کے حملوں کے بعد ان کے آگ بجھانے والوں، جان بچانے والوں اور عام سرکاری اہلکاروں نے جس حوصلے اور وقار کے ساتھ اپنا فرض انجام دیا اس سے ہم سب متاثر ہوے ہیں۔

جو کچھ ہوا اس پر امریکا کا صدمہ بے پناہ ہے، اور بے پناہ طور پر واضح ہے۔ یہ توقع کرنا بھونڈی بات ہوگی کہ وہ اپنے صدمے کو دوسروں کے صدموں سے ملا کر دیکھنے یا اس کی شدت کو دھیما کرنے کی کوشش کرے۔ تاہم یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہوگی کہ امریکا اس غمناک موقعے کو یہ جاننے کی کوشش کرنے کے بجاے کہ ۱۱ ستمبر کے واقعات کیوں رونما ہوے، اس مقصد کے لیے استعمال کرے کہ دنیا بھر کے لوگوں کا غم اور غصہ صرف ہلاک ہونے والے امریکی شہریوں کا ماتم کرنے اور ان کی ہلاکت کا انتقام لینے کے لیے وقف کر دیا جائے۔ کیونکہ ایسی صورت میں دشوار سوالات پوچھنے اور تلخ باتیں کہنے کی ذمہ داری باقی لوگوں پر، یعنی ہم پر، آ پڑے گی۔ اور اس تمام کوشش، اور غلط موقعے پر کہی جانی والی باتوں کے لیے ہمیں ناپسند کیا جائے گا، نظرانداز کیا جائے گا اور آخرکار خاموش کرا دیا جائے گا۔

دنیا کو شاید یہ بات کبھی معلوم نہ ہو پائے کہ ان ہائی جیکروں کو جنھوں نے ان مخصوص مسافر طیاروں کو اغوا کر کے ان مخصوص امریکی عمارتوں سے ٹکرا دیا، اس عمل پر کس بات نے مجبور کیا تھا۔ وہ شہرت کے خواہش مند نوجوان نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے پیچھے خودکشی کے رقعے یا سیاسی پیغامات نہیں چھوڑے۔ کسی تنظیم نے ان حملوں کا ذمہ دار ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ اپنے عمل پر ان کے اعتقاد نے زندہ رہنے کی فطری انسانی جبلت پر، اور یاد رکھے جانے کی خواہش پر بھی، غلبہ پا لیا تھا۔ شاید ایسا تھا کہ وہ اپنے غصے کی شدت کو اپنے کیے ہوے اس عمل سے کم تر کسی چیز کے ساتھ جوڑ کر ہلکا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اور ان کے اس عمل نے دنیا میں، جیسا کہ

ہم اسے جانتے تھے، ایک بہت بڑی دراڑ پیدا کر دی ہے۔ درست معلومات کی عدم موجودگی میں سیاست داں، سیاسی مبصر اور مضمون نگار (مثلاً میں) اس عمل میں خود اپنے سیاسی تصورات، اپنی تعبیرات شامل کریں گے۔ یہ قیاس آرائی، اور جس سیاسی فضا میں یہ واقعات پیش آئے اس کا تجزیہ محض ایک اچھی چیز ہی ہو سکتی ہے۔

لیکن دنیا پر جنگ کے بادل چھا رہے ہیں۔ جو کچھ کہنے کو باقی ہے اسے جلدی سے کہہ دیا جانا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ امریکا خود کو ''دہشت گردی کے خلاف اتحاد'' کی قیادت پر فائز کر لے، اس سے پہلے کہ وہ دوسرے ملکوں کو آمادہ (اور مجبور) کرے کہ وہ اس کے تقریباً خدائی منصوبے ـــ یعنی آپریشن لامتناہی انصاف ـــ میں عملی طور پر شامل ہو جائیں (اس نام پر یہ اعتراض ہوا کہ مسلمان اسے اپنی ہتک تصور کریں گے کیونکہ ان کے نزدیک لامتناہی انصاف صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے، اور اس اعتراض کے پیش نظر اس کا نام بدل کر پائیدار آزادی کر دیا گیا)، اس سے پہلے کچھ باتوں کی وضاحت کر دینا ضروری ہے۔ مثلاً لامتناہی انصاف یا پائیدار آزادی کس کے لیے؟ کیا امریکا کی یہ جنگ امریکا میں ہونے والی دہشت گردی کے خلاف ہے یا عام طور پر ہر دہشت گردی کے خلاف؟ اس کے ذریعے دراصل کس شے کا انتقام لیا جا رہا ہے؟ تقریباً سات ہزار جانوں کے ضیاع، مین ہیٹن میں واقع پچاس لاکھ مربع فٹ دفتری رقبے کی تباہی، پینٹاگون کے ایک حصے کے انہدام، کئی لاکھ ملازمتوں کے اختتام، بعض ایرلائن کمپنیوں کے دیوالے اور نیویارک اسٹاک ایکسچینج میں آنے والی گراوٹ کا؟ یا یہ شے اس تمام نقصان سے بڑھ کر ہے؟ ۱۹۹٦ء میں میڈلین آلبرائٹ سے، جو اس وقت امریکی وزیر خارجہ تھی، قومی ٹیلی وژن پر یہ سوال کیا گیا تھا کہ جو پانچ لاکھ عراقی بچے امریکا کی جانب سے لگائی گئی اقتصادی پابندیوں کے نتیجے میں ہلاک ہوئے ہیں ان کے بارے میں وہ کیا محسوس کرتی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ ایک بے حد دشوار انتخاب ہے، لیکن ساری چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے، اس کا خیال ہے کہ یہ امریکی مقاصد کے حصول کی مناسب قیمت ہے۔ یہ جواب دینے پر البرائٹ کو اس کی ملازمت سے برطرف نہیں کیا گیا۔ وہ امریکی حکومت کے خیالات اور احساسات کی نمائندگی کرتے ہوئے بدستور دنیا بھر کے دورے کرتی رہی۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ عراق پر لگائی گئی پابندیاں بدستور برقرار رہیں۔ بچے اب بھی ہلاک ہو رہے ہیں۔

تو یہ بات ہمارے سامنے ہے۔ تہذیب یافتہ اور وحشی دنیا کا مبہم فرق، بے گناہ لوگوں کی ہلاکت اور ''تہذیبوں کے تصادم'' اور ناگزیر ہلاکتوں کا فرق۔ لامتناہی انصاف کا باریک بین اور رعونت

آمیز حساب کتاب۔ دنیا کو ایک بہتر جگہ بنانے کے لیے کتنے عراقیوں کو ہلاک کرنے کی ضرورت ہو گی؟ ہلاک ہونے والے ایک انوسٹمنٹ بینکر کے بدلے میں مجاہدین کی کتنی جانیں درکار ہوں گی؟ ہم سحر زدہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور دنیا بھر کے ٹی وی اسکرینوں پر آپریشن پائیدار آزادی اپنے طے شدہ راستے پر آگے بڑھ رہا ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کا اتحاد دنیا کے ایک غریب ترین، تباہ شدہ اور جنگ کے نتیجے میں بدحال ملک افغانستان کے گرد گھیرا تنگ کر رہا ہے، جس میں قائم طالبان کی حکومت اسامہ بن لادن کو پناہ دیے ہوئے ہے، یعنی اُس شخص کو جسے ۱۱ ستمبر کے حملوں کے لیے ذمہ دار قرار دیا جا رہا ہے۔

افغانستان میں اگر کوئی شے اب بھی تباہ کیے جانے کے لیے دستیاب ہے تو وہ اس کے باقی ماندہ شہری ہیں، جن میں پانچ لاکھ کی تعداد اپاہج اور یتیم بچوں کی ہے۔ ایسی ہولناک کہانیاں سنی جاتی ہیں کہ وہاں کے دور افتادہ دیہات میں، جہاں سڑک کے راستے پہنچنا ناممکن ہے، جب ہوائی جہازوں سے مصنوعی بازو اور ٹانگیں گرائی جاتی ہیں تو انھیں حاصل کرنے کی کوشش میں بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ افغانستان کی معیشت برباد ہو چکی ہے۔ درحقیقت کسی حملہ آور فوج کے لیے اصل دشواری یہ ہے کہ افغانستان میں کوئی ایسے روایتی مقامات نہیں ہیں جن کی مدد سے کسی فوجی پیش قدمی کا نقشہ تیار کیا جا سکے — بڑے شہر، شاہراہیں، صنعتی کارخانے، واٹر ٹریٹمنٹ پلانٹ۔ کھیت اجتماعی قبروں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ پورا دیہی علاقہ بارودی سرنگوں سے اٹا ہوا ہے، جن کی تعداد کا تازہ ترین تخمینہ ایک کروڑ ہے۔ امریکی حکومت کو یہ سرنگیں ہٹا کر وہاں سڑکیں تعمیر کرنی ہوں گی اس سے پیشتر کہ اس کی فوج وہاں داخل ہو سکے۔

امریکا کی طرف سے ہونے والے حملے کے خوف سے دس لاکھ شہری اپنے گھروں سے بھاگ کر افغانستان اور پاکستان کی سرحد کے پاس جمع ہو گئے ہیں۔ اقوام متحدہ کا اندازہ ہے کہ اسّی لاکھ افغان شہری ایسے ہیں جنھیں ہنگامی امداد کی ضرورت ہے۔ جوں جوں ضرورت کی اشیا ختم ہو رہی ہیں، غذائی اور انسانی امداد کی تنظیموں سے نکل جانے کو کہا جا رہا ہے۔ بی بی سی کی رپورٹ ہے کہ اس علاقے میں موجودہ دور کا بدترین انسانی المیہ شروع ہو چکا ہے۔ ذرا نئی صدی کے لامتناہی انصاف کو دیکھیے۔ تباہ حال لوگ بمباری سے ہلاک کیے جانے کے انتظار میں فاقوں سے مر رہے ہیں۔

امریکا میں اس قسم کی بے ہودہ باتیں کی گئی ہیں کہ افغانستان کو شدید بمباری کے ذریعے پتھر کے زمانے میں پہنچا دیا جائے گا۔ کسی کو مہربانی کر کے وہاں یہ اطلاع پہنچانی چاہیے کہ افغانستان پہلے ہی

سے پتھر کے زمانے میں ہے۔ اگر یہ بات کسی طرح تسکین کا سبب بن سکتی ہو تو یہ بھی بتا دیا جائے کہ اسے اس مقام تک پہنچانے میں امریکا کی کوششیں بھی پیش پیش رہی ہیں۔ امریکی عوام کو افغانستان کے محل وقوع کا اندازہ کرنے میں قدرے دقت ہوگی (ہمیں ایسی خبریں ملی ہیں کہ اس ملک کے نقشے دھڑا دھڑ بک رہے ہیں)، لیکن واقعہ یہ ہے کہ امریکی حکومت اور افغانستان پرانے واقف کار ہیں۔

۱۹۷۹ء میں افغانستان پر سوویت فوجوں کے حملے کے بعد سی آئی اے اور پاکستان کی آئی ایس آئی نے اتنا بڑا خفیہ آپریشن شروع کیا جس کی مثال سی آئی اے کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان کا مقصد افغانوں کی توانائی کو مجتمع کرنا اور اسے سوویت فوجوں کے خلاف صف آرا کر کے اسے ایک مقدس جنگ یا جہاد کی صورت دینا تھا جس کے زیر اثر سوویت یونین میں شامل مسلمان اکثریت کی ریاستیں کمیونسٹ اقتدار کے خلاف اٹھ کھڑی ہوں اور آخر کار اسے متزلزل کر دیں۔ جس وقت یہ جہاد شروع ہوا تھا اس کا مقصد سوویت یونین کے لیے ویتنام جیسی صورت حال پیدا کرنا تھا۔ وہ اس سے کہیں زیادہ بڑی چیز ثابت ہوا۔ برسوں کے عرصے میں سی آئی اے نے، آئی ایس آئی کی مدد سے، چالیس مسلمان ملکوں سے تقریباً ایک لاکھ مجاہدین کو بھرتی کیا اور انھیں مالی مدد فراہم کی تاکہ وہ امریکا کی بالواسطہ جنگ میں سپاہیوں کے طور پر حصہ لیں۔ مجاہدین کی فوج کے عام سپاہیوں کو اس بات کا علم نہ تھا کہ ان کا جہاد دراصل انکل سام کی طرف سے لڑی جانے والی جنگ ہے۔ (ستم ظریفی یہ ہے کہ امریکا کو بھی علم نہ تھا کہ وہ اپنی رقم سے اپنے ہی خلاف لڑی جانے والی ایک مستقبل کی جنگ تیار کر رہا ہے۔)

۱۹۸۹ میں، دس سال تک مسلسل مزاحمت کا سامنا کرنے کے بعد سوویت فوجیں واپس چلی گئیں اور اپنے پیچھے ایک تباہ شدہ معاشرہ چھوڑ گئیں۔

افغانستان میں خانہ جنگی جاری رہی۔ جہاد پھیل کر چیچنیا، کوسووو اور آخر کار کشمیر تک جا پہنچا۔ سی آئی اے نے رقم اور اسلحے کی فراہمی جاری رکھی، لیکن اخراجات میں اضافہ ہو گیا تھا اور اس کے لیے زیادہ سے زیادہ رقم کی ضرورت پڑ رہی تھی۔ مجاہدین نے کاشتکاروں کو انقلابی ٹیکس کے طور پر افیون کاشت کرنے کا حکم دیا۔ آئی ایس آئی نے افغانستان بھر میں ہیروئن کی فیکٹریوں کا جال بچھانے میں مدد دی۔ سی آئی اے کی آمد کے دو سال کے اندر اندر پاکستان اور افغانستان کا سرحدی علاقہ دنیا بھر میں ہیروئن کی پیداوار کا سب سے بڑا مرکز بن گیا اور امریکی گلیوں میں ہیروئن کی فراہمی

سب سے زیادہ یہیں سے ہونے لگی۔ اس تجارت کا منافع، جو اندازے کے مطابق سالانہ سو بلین اور دو سو بلین ڈالر کے درمیان ہے، مزید شدت پسندوں کی بھرتی اور تربیت کے لیے استعمال ہونے لگا۔

۱۹۹۵ء میں طالبان نے، جو خطرناک اور سخت گیر بنیاد پرستوں کا ایک مختصر سا گروہ تھے، خانہ جنگی کے نتیجے میں افغانستان کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ ان کو سی آئی اے کی پرانی رفیق کار آئی ایس آئی کی مالی مدد، اور کئی پاکستانی پارٹیوں کی سیاسی حمایت حاصل تھی۔ طالبان نے ملک میں دہشت کا راج قائم کیا۔ افغانستان کے عام شہری، خصوصاً عورتیں، ان کا پہلا شکار تھے۔ انھوں نے عورتوں کے اسکول اور کالج بند کر دیے، عورتوں کو سرکاری ملازمتوں سے نکال دیا، اور اس قسم کے شرعی قوانین نافذ کر دیے جن کی رو سے ''بدکردار'' عورتوں کو سنگسار کیا جاتا اور غیر اخلاقی حرکات کرنے والی بیواؤں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ انسانی حقوق کے سلسلے میں طالبان کے سابقہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے یہ بات امکان سے باہر معلوم ہوتی ہے کہ جنگ یا عام شہریوں کی ہلاکت کا خطرہ انھیں اپنے راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہوگا۔

جو کچھ اب سے پہلے پیش آیا ہے اس کو نظر میں رکھتے ہوئے کیا اس سے زیادہ ستم ظریفی کی کوئی بات ہو سکتی ہے کہ امریکا اور روس اس ملک کو نئے سرے سے تباہ کرنے کے لیے اکٹھے ہو گئے ہیں؟ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا تباہ شدہ ملک کو اور تباہ کیا جا سکتا ہے؟ افغانستان پر بمباری سے صرف ملبہ الٹ پلٹ ہو جائے گا، کچھ پرانی قبریں کھل جائیں گی اور مُردوں کی نیند خراب ہوگی۔

افغانستان کی ویران سرزمین سوویت کمیونزم کا قبرستان اور ایک ایسی یک فریقی دنیا کا آغاز ثابت ہوئی جس پر امریکا کا تسلط ہے۔ اس نے وہ فضا قائم کرنے میں مدد دی جس پر نئی سرمایہ داری اور گلوبلائزیشن نے اپنا راج شروع کیا، اور اس پر بھی امریکا کا تسلط ہے۔ اور اب افغانستان ان سپاہیوں کا قبرستان بننے والا ہے جنھوں نے امریکا کے لیے یہ جنگ لڑی اور جیتی تھی۔

اور امریکا کے اُس قابلِ اعتماد اتحادی کا کیا بنا؟ پاکستان نے بھی اس عمل میں بے حد نقصان اٹھایا ہے۔ امریکا نے ان فوجی آمروں کا ساتھ دینے میں کوئی شرم محسوس نہیں کی جنھوں نے اس ملک میں جمہوریت کو جڑ پکڑنے سے روکا ہے۔ سی آئی اے کی آمد سے پہلے وہاں دیہی علاقے میں افیون کے خریداروں کی ایک بہت چھوٹی سی تعداد موجود تھی۔ ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۵ء کے درمیان ملک میں ہیروئن کی لت کے شکار افراد کی تعداد صفر سے بڑھ کر پندرہ لاکھ ہو گئی۔ ۱۱ ستمبر سے پہلے ہی تیس لاکھ

افغان شہری سرحد کے قریب خیموں پر مشتمل پناہ گزیں کیمپوں میں رہ رہے تھے۔ پاکستان کی معیشت رو بہ زوال ہے۔ فرقہ وارانہ تشدد، گلوبلائزیشن کے تحت کی جانے والی معاشی اصلاحات اور منشیات کے تاجروں کے ہاتھوں پاکستانی معاشرہ پارہ پارہ ہو رہا ہے۔ سوویت حملے کا مقابلہ کرنے کی غرض سے قائم کیے گئے دہشت گردوں کے تربیتی کیمپوں اور مدرسوں نے، جو اژدہے کے دانتوں کی طرح ملک کے طول و عرض میں اگے ہوئے ہیں، ایسے بنیاد پرستوں کو جنم دیا ہے جن کو ملک کے اندر بھی زبردست پذیرائی حاصل ہے۔ طالبان، جن کو برسوں تک پاکستان کی مالی، مادّی اور عملی حمایت حاصل رہی ہے، پاکستان کی اپنی سیاسی پارٹیوں کے ساتھ اتحاد قائم کیے ہوئے ہیں۔

اب امریکی حکومت پاکستان سے کہہ رہی ہے کہ جس پالتو حیوان کو خود اس نے پاکستان کے پچھواڑے پرورش کیا تھا اس کی گردن پر چھری پھیر دی جائے۔ امریکا کی حمایت کا اعلان کرنے کے بعد صدر مشرف کو عین ممکن ہے کہ اپنے ملک میں خانہ جنگی جیسی کسی شے کا اندیشہ محسوس ہونے لگے۔

ہندوستان، کچھ تو اپنے جغرافیائی محل وقوع کے باعث اور کچھ اپنے سابقہ رہنماؤں کی بصیرت کی بدولت، خوش قسمتی سے اب تک اس گریٹ گیم میں گھسیٹے جانے سے بچا ہوا ہے۔ اگر وہ اس کھیل کا حصہ بن جاتا تو غالب امکان یہ ہے کہ ہماری جمہوریت، جیسی کچھ بھی وہ ہے، برقرار نہ رہ پاتی۔ آج، جبکہ ہم میں سے کچھ لوگ دہشت زدہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، ہندوستانی حکومت جوش سے کولھے ہلا ہلا کر امریکا سے درخواست کر رہی ہے کہ وہ اپنے فوجی اڈے پاکستان کے بجائے ہندوستان میں قائم کرے۔ پاکستان جن نتائج کا سامنا کر رہا ہے انھیں دیکھنے کے بعد یہ بات صرف عجیب نہیں بلکہ ناقابل تصور معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان اس راستے پر چلنے کا خواہش مند ہو۔ تیسری دنیا کا کوئی بھی ملک جس کی معیشت مخدوش اور معاشرتی بنیاد اس قدر پیچیدہ ہو، اسے اب تک اچھی طرح معلوم ہو جانا چاہیے تھا کہ امریکا جیسی کسی عالمی طاقت کو اندر آنے کی دعوت دینا (خواہ وہ ٹھہرنے کے لیے آ رہا ہو یا محض یہاں سے گذر کر آگے جا رہا ہو) بالکل ایسی بات ہے جیسے آپ کسی اینٹ کو اپنی کار کی ونڈاسکرین میں سے گذرنے کی دعوت دے رہے ہوں۔

آپریشن اینڈیورنگ فریڈم بظاہر امریکی طرز زندگی کے تحفظ کے لیے لڑی جانے والی جنگ ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس کا انجام اس طرز زندگی کی بیخ کنی پر ہو۔ اس کے نتیجے میں دنیا بھر میں مزید دہشت اور مزید غصہ پیدا ہوگا۔ امریکا میں رہنے والوں کے لیے اس کا مطلب زندگی بھر مریضانہ

غیر یقینی پن کی صورت میں رہنا ہوگا۔ کیا میرا بچہ اسکول میں محفوظ ہے؟ کہیں سب وے میں اعصابی گیس نہ چھوڑ دی گئی ہو۔ کیا میرا محبوب آج رات گھر پہنچے گا؟ حیاتیاتی جنگ کے بارے میں کئی انتباہ سامنے آ چکے ہیں — چیچک، طاعون، اینتھریکس، فصلوں کو تباہ کر دینے والے کیمیائی مادّے سے بھرا ہوا پورا جہاز۔ اکادکا لوگوں کا متواتر مرتے رہنا شاید ایٹم بم کے ہاتھوں ایک ساتھ ہلاک ہو جانے سے کہیں بدتر ثابت ہو۔

امریکی حکومت، اور بلاشبہ دنیا بھر کی حکومتیں جنگی ماحول کو شہری آزادیوں کو محدود کرنے، آزادی اظہار کو ختم کرنے، مزدوروں کو بے روزگار کرنے، نسلی اور مذہبی اقلیتوں کو سراسیمہ کرنے، عوامی بھلائی پر کیے جانے والے خرچ میں کٹوتی کرنے اور دفاعی صنعتوں کو زیادہ سرمایہ فراہم کرنے کے مقصد سے استعمال کریں گی۔ لیکن اس کا حاصل کیا ہوگا؟ صدر بش دنیا کو شرپسندوں سے خالی کرنے میں اتنی ہی کامیابی حاصل کر سکتا ہے جتنی دنیا کو ولیوں سے بھرنے میں۔ امریکی حکومت کے لیے یہ سوچنا بھی انتہائی لغو بات ہے کہ وہ تشدد اور جبر میں اضافہ کر کے دنیا سے دہشت گردی کو ختم کر سکتی ہے۔ دہشت گردی صرف علامت ہے، مرض نہیں۔ دہشت گردی کا کوئی ملک نہیں ہے۔ وہ کوک، پیپسی اور نائیک کی طرح ایک بین الاقوامی، گلوبل کاروبار ہے۔ گڑبڑ کا ذرا سا اشارہ ملنے پر دہشت گرد اپنا کاروبار سمیٹ کر اپنی فیکٹریوں کو کسی دوسرے ملک میں منتقل کر سکتے ہیں۔ بالکل ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کی طرح۔

دہشت گردی کو ایک مظہر کے طور پر شاید کبھی ختم نہ کیا جا سکے۔ لیکن اگر اسے کسی طرح محدود کیا جانا ہے تو اس کے پہلے قدم کے طور پر امریکا کو یہ بات کم از کم تسلیم کرنی ہوگی کہ وہ اس سیارے پر دوسری قوموں، دوسرے انسانوں کے ساتھ رہ رہا ہے جو خواہ ٹی وی اسکرین پر دکھائی نہ دیتے ہوں مگر اپنی محبتیں، اپنے غم، اپنی کہانیاں، اپنے گیت، اپنے دکھ درد اور، سب سے بڑھ کر، اپنے حقوق رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے بجائے، جب امریکی وزیر دفاع ڈونلڈ رمزفیلڈ سے پوچھا گیا کہ وہ کس بات کو اس نئی جنگ میں امریکا کی فتح سے تعبیر کرے گا، تو اس نے کہا کہ جب وہ دنیا سے یہ بات منوا لے گا کہ امریکیوں کو اپنا طرزِ زندگی قائم رکھنے کا حق حاصل ہے تو وہ سمجھے گا کہ امریکا نے فتح حاصل کر لی۔

۱۱ ستمبر کا واقعہ اس بات کی ایک ہولناک یاددہانی ہے کہ دنیا ایک خوفناک راستے پر جا رہی ہے۔ یاددہانی کا یہ خط ممکن ہے بن لادن ہی نے لکھا ہو (کسے معلوم؟) اور اسے اسی کے ہرکاروں نے

مطلوبہ پتے پر پہنچایا ہو، لیکن کوئی تعجب کی بات نہیں ہوگی اگر یہ خط ان لوگوں کی طرف سے آیا ہو جو امریکا کی پرانی جنگوں کے شکار ہوئے تھے۔ کوریا، ویت نام اور کمبوڈیا میں ہلاک ہونے والے لاکھوں لوگ، ۱۹۸۲ء میں امریکی حمایت سے لبنان پر اسرائیلی حملے کے نتیجے میں ہلاک ہونے والے ۱۷،۵۰۰ افراد، آپریشن ڈیزرٹ اسٹورم میں مارے جانے والے دو لاکھ عراقی، غرب اردن پر اسرائیلی قبضے کی مزاحمت کرتے ہوئے ہلاک ہونے والے ہزاروں فلسطینی۔ اور یوگوسلاویا، صومالیہ، ہائیتی، چیلے، نکاراگوا، ایل سلواڈور، ڈومینیکن ریپبلک اور پناما میں مارے جانے والے دسیوں لاکھ لوگ جن کی موت کے ذمہ دار دہشت گردوں، آمروں اور نسل کشی کرنے والوں کو امریکا نے حمایت، مالی امداد، تربیت اور اسلحے سے لیس کیا تھا۔ اور یہ فہرست کسی بھی طرح مکمل نہیں ہے۔

امریکی عوام، ایک ایسے ملک کے شہری ہوتے ہوئے جو اتنی جنگوں اور تنازعوں میں ملوث رہا ہے، اب تک بہت خوش قسمت رہے ہیں۔ ۱۱ ستمبر کا حملہ پچھلے سو برس کے عرصے میں ان کی سرزمین پر ہونے والا محض دوسرا حملہ ہے۔ پہلا حملہ پرل ہاربر پر ہوا تھا۔ اُس حملے کے جواب نے ایک طویل راستہ اختیار کیا لیکن اس راستے کا اختتام ہیروشیما اور ناگاساکی پر ہوا تھا۔ اس بار دنیا سانس روکے ان قیامتوں کا انتظار کر رہی ہے جو حالیہ حملے کے جواب میں ٹوٹنے والی ہیں۔

حال ہی میں کسی نے کہا تھا کہ اگر اسامہ بن لادن کا وجود نہ ہوتا تو امریکا کو اسے ایجاد کرنا پڑتا۔ لیکن ایک طرح سے اسے امریکا ہی نے ایجاد کیا ہے۔ وہ ان جہادیوں میں سے ہے جو ۱۹۷۹ء میں افغانستان میں سی آئی اے کا آپریشن شروع ہونے کے کچھ عرصے بعد وہاں پہنچے تھے۔ بن لادن کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اسے سی آئی اے نے پیدا کیا اور اب وہ ایف بی آئی کو مطلوب ہے۔ پندرہ دن کے اندر اندر اس نے اس قدر ترقی کی ہے کہ ایک مشتبہ فرد سے سب سے بڑا ملزم بن گیا اور اب ایک ایسا مجرم ہے جسے زندہ یا مردہ پکڑا جانا لازمی ہے۔

کسی بھی اعتبار سے ۱۱ ستمبر کے حملوں میں بن لادن کے ملوث ہونے کی کوئی شہادت فراہم کرنا (جو کسی قانونی عدالت کے نزدیک قابل قبول ہو) ناممکن ہے۔ اب تک سامنے آنے والی سنگین ترین شہادت بظاہر یہی ہے کہ اس نے ان حملوں کی مذمت نہیں کی ہے۔

بن لادن جس مقام پر اور جن حالات میں رہ رہا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے عین ممکن ہے کہ اس نے ان حملوں کی منصوبہ بندی اور عملی کام میں ذاتی طور پر حصہ نہ لیا ہو، کہ وہ اس عمل میں محض ایک متاثر کن شخصیت کی حیثیت رکھتا ہو، جیسے کسی کمپنی کا سی ای او (چیف ایگزیکٹو آفیسر) ہوتا ہے۔ اسے

حوالے کیے جانے کے امریکی مطالبے پر طالبان کا ردعمل غیر معمولی طور پر معقول رہا ہے: شہادت فراہم کرو تو ہم اسے حوالے کر دیں گے۔ اس پر صدر بش کا کہنا یہ ہے کہ امریکی مطالبے پر کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی۔

(جب کمپنیوں کے سی ای اوز کے دوسرے ملکوں کے حوالے کیے جانے کی بات چل رہی ہو تو کیا ہندوستانی حکومت بھی امریکا کے سامنے اپنا مطالبہ رکھ سکتی ہے کہ وارن اینڈرسن کو اس کے حوالے کیا جائے؟ وہ یونین کاربائیڈ نامی کمپنی کا چیئرمین تھا جس کے کارخانے سے خارج ہونے والی زہریلی گیس نے ۱۹۸۴ء میں بھوپال میں سولہ ہزار افراد کو ہلاک کر دیا تھا۔ ہم نے تو اس کے سلسلے میں تمام ضروری شہادتیں بھی جمع کر لی ہیں۔ یہ سب دستاویزی شہادتیں فائلوں میں موجود ہیں۔ کیا اُسے مہربانی کر کے ہمارے حوالے کیا جائے گا؟)

لیکن درحقیقت اسامہ بن لادن کون ہے؟ بلکہ مجھے سوال دوسرے طریقے سے پوچھنا چاہیے۔ درحقیقت اسامہ بن لادن کیا ہے؟ یہ امریکا کا خاندانی راز ہے۔ یہ امریکی صدر کا خفیہ ہم زاد ہے۔ ان تمام چیزوں کا وحشی توام جو تہذیب یافتہ اور خوب صورت ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں۔ دنیا کو امریکی خارجہ پالیسیوں نے — گن بوٹ ڈپلومیسی، ایٹمی ہتھیاروں کے ذخیرے، پوری دنیا پر تسلط کے بھونڈے پن سے ظاہر کیے ہوئے عزائم، غیر امریکی لوگوں کی جانوں سے پُرتحقیر بے نیازی، امریکا کی وحشیانہ فوجی مداخلتوں، آمرانہ اور ظالم حکومتوں کو ملنے والی امریکی حمایت، اور غریب ملکوں کی معیشت پر ٹڈی دل کی طرح حملہ کرنے والے بے رحم امریکی ایجنڈے نے — دنیا کو جس فالتو پسلی کی بے مصرف حیثیت بخش دی ہے، اسامہ بن لادن کو اسی فالتو پسلی سے تخلیق کیا گیا ہے۔ امریکا کی پیش قدمی کرتی ہوئی ملٹی نیشنل کارپوریشنیں جو ہمارے اردگرد کی ہوا، ہمارے قدموں تلے کی زمین، ہماری پیاس بجھانے والے پانی، ہمارے ذہنوں میں آنے والے خیالات تک پر قبضہ جما رہی ہیں۔ اب جبکہ خاندانی راز طشت ازبام ہو چکا ہے، دونوں جڑواں بھائی اپنی شناخت ایک دوسرے میں گم کرتے جا رہے ہیں، ایک دوسرے کے متبادل معلوم ہونے لگے ہیں۔ دونوں کی بندوقیں، بم، پیسہ اور منشیات دنیا بھر میں ایک دائرے میں گھوم رہے ہیں۔ (جو اسٹنگر میزائل افغانستان میں امریکی ہیلی کاپٹروں کا خیرمقدم کریں گے، وہ وہی ہیں جو سی آئی اے نے مجاہدین کو مہیا کیے تھے۔ امریکی نشئی جو ہیروئن پیتے ہیں وہ افغانستان سے آتی ہے۔ بش انتظامیہ نے ابھی کچھ عرصے پہلے افغانستان کو منشیات سے جنگ کرنے کی غرض سے ۴۳ ملین ڈالر کی امداد دی تھی...)

اب بش اور بن لادن اپنی خطابت میں کام آنے والے الفاظ بھی ایک دوسرے سے مستعار لینے لگے ہیں۔ دونوں افراد ایک دوسرے کو سانپ کے سر سے مشابہ قرار دیتے ہیں۔ دونوں خدا کا نام اور پچھلے ہزار سال کے نیکی اور بدی کے استعارے استعمال کرتے ہیں۔ دونوں غیر مبہم طور پر سیاسی جرائم میں ملوث ہیں۔ دونوں خطرناک طور پر مسلح ہیں — ایک فحش حد تک طاقت ور شخص کے ایٹمی ہتھیاروں سے، دوسرا مکمل طور پر بے بس شخص کی بھڑکتی ہوئی تباہ کن طاقت سے۔ یاد رکھنے کی اہم بات یہ ہے ان دونوں میں سے کسی کو بھی دوسرے کا متبادل نہیں سمجھا جا سکتا۔

دنیا کو صدر بش کی جانب سے دیا جانے والا الٹی میٹم — اگر کوئی ہمارے ساتھ نہیں تو ہمارے دشمنوں کے ساتھ ہے — احمقانہ رعونت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا انتخاب ہے جو دنیا کے لوگ نہ کرنا چاہتے ہیں، نہ انھیں کرنا چاہیے اور نہ انھیں کرنے پر مجبور کیا جانا چاہیے۔

واقعہ نیویارک میں ہوا مگر اس کے اثرات دور دور تک محسوس کیے گئے۔ ٹیلی وژن نے ان مناظر کو ساری دُنیا میں نشر کر دیا اور دنیا بھر کے ادیبوں، دانش وروں نے فوری، عوامی تاثرات کے ساتھ ساتھ عالمی بحران کے واضح نشان بھی دیکھے۔ اورحان پامک ترکی کے ممتاز ناول نگار ہیں۔ ان کے کئی ناولوں کے تراجم انگریزی میں شائع ہوچکے ہیں، جن میں سے تازہ ترین ناول ''میرا نام سُرخ ہے'' نقادوں کی توجہ کا مرکز یوں بھی بنا ہوا ہے کہ اس میں ترکی کے ماضی اور مشرق و مغرب کی آویزش کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اورحان پامک نے یہ مضمون ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو لکھا۔ ترکی زبان سے انگریزی میں ترجمہ میری اسن نے کیا اور یہ ترجمہ ''نیویارک ریویو آف بکس'' کے شمارہ بابت ۱۵ نومبر ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ یہ مضمون بطور خاص ہمارے ان ادیبوں کو پڑھنا چاہیے جو سیاسی حالات پر تبصرہ کرنے سے بدکتے ہیں۔ سیاسی امور پر بات کرتے ہوئے فن کارانہ دانش وری کا اظہار بھی ممکن ہے!

اورحان پامک

ترجمہ: آصف فرخی

ذلّت کے مارے ہوؤں کا غصّہ

میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ ناگہانی آفات مل جل کر رہنے کے جذبے کو مضبوط تر کر دیتی ہیں۔ میرے بچپن میں استنبول کی عظیم آتش زنی اور دو سال پہلے کے زلزلے کے فوراً بعد میرا پہلا اور جبلّی احساس یہ تھا کہ اپنے جذبات میں دوسروں کو بھی شریک کروں، اس آفت کے بارے میں دوسروں سے تبادلۂ خیال کروں۔ مگر اب کی بار، استنبول کے چھوٹے سے کافی ہاؤس میں ٹیلی وژن کے سامنے بیٹھے ہوئے، بندرگاہ کے نزدیک پشتے پر جہاں گاڑی بان، تپ دق کے مریض اور قلی زیادہ آتے ہیں، جس وقت نیویارک کے جڑواں مینار نما عمارتیں جل رہی تھیں اور ٹوٹ کر گر رہی تھیں،

میں نے اپنے آپ کو مایوسی کی حد تک اکیلا پایا۔

جوں ہی دوسرا ہوائی جہاز ٹاور سے ٹکرایا، ترکی کے ٹیلی وژن چینلز نے ''لائیو'' نشریات شروع کر دیں۔ کافی ہاؤس میں ایک چھوٹا سا ہجوم ٹیلی وژن پر ان ناقابل یقین امیجز کو معروضی تعجب کے ساتھ دیکھ رہا تھا، حیرت زدہ مگر بہ ظاہر زیادہ گہرا اثر قبول کیے بغیر۔ میں ان عمارتوں کے درمیان رستا بستا تھا۔ جیب میں پھوٹی کوڑی کے بغیر میں ان سڑکوں پر گھومتا رہا تھا۔ ان ٹاورز میں، میں نے لوگوں سے ملاقات کا وقت طے کیا تھا اور وقت پر پہنچا تھا۔ مگر، جیسے کسی خواب میں جہاں اپنی تنہائی میں اضافہ ہوئے چلا جاتا ہے، میں چپ رہا۔

میں باہر نکل کر سڑک پر آ گیا اس لیے کہ جو کچھ ہو رہا تھا میں اس کو دیکھنا برداشت نہیں کر سکتا تھا اور اس لیے بھی کہ میں نے جو کچھ دیکھا تھا اس میں دوسروں کو شریک کرنا چاہتا تھا۔ ذرا دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ کشتی کے انتظار میں کھڑی ہوئی بھیڑ میں، پشتے پر ایک عورت رو رہی ہے۔ اس کے چہرے کے تاثر اور اس کے چاروں طرف موجود لوگوں کے چہروں سے میں نے فوراً بھانپ لیا کہ وہ اس لیے نہیں رو رہی ہے کہ مین ہٹن میں اس کے رشتہ دار ہیں بلکہ وہ یہ سمجھ رہی ہے کہ دُنیا کے انجام کا وقت آ رہا ہے۔ میرے بچپن میں جب یہ خوف عام تھا کہ کیوبا کا بحران تیسری جنگ عظیم کو جنم دے گا، میں نے اسی طرح پریشان حال عورتوں کو روتے ہوئے دیکھا تھا جب کہ استنبول میں متوسط طبقے کے خاندان دال اور نمکین سویّوں کی تھیلیاں جمع کر کے ذخیرہ کر رہے تھے۔ میں کافی ہاؤس میں واپس آ گیا اور ٹیلی وژن پر ان مناظر کو اسی بے اختیار جنون اور ضبط کے ساتھ دیکھنے لگا جیسے باقی دُنیا دیکھ رہی تھی۔ بعد میں، جب میں سڑک پر دوبارہ چل رہا تھا تو مجھے اپنا ایک پڑوسی ملا۔ ''جناب، آپ نے دیکھا، انہوں نے امریکا پر بم مار دیا'' اس نے کہا اور غصّے کے ساتھ اضافہ کیا، ''انہوں نے ٹھیک کیا۔''

یہ برہم بوڑھا قطعاً مذہبی نہیں ہے۔ یہ ٹوٹ پھوٹ کی مرمّت کے چھوٹے موٹے کام اور باغ بانی کر کے دو وقت کی روٹی حاصل کرتا ہے، شام کو نشے میں دُھت ہو جاتا ہے اور اپنی بیوی سے بحث کرتا ہے۔ اس نے ابھی تک ٹیلی وژن پر وہ ہولناک مناظر نہیں دیکھے تھے مگر صرف اتنا سُن لیا تھا کہ کچھ لوگوں نے امریکا کے ساتھ کچھ خوف ناک کام کر دکھایا ہے۔ میں نے بہت سے دوسرے لوگوں کو اس ابتدائی ردِّعمل سے ملتے جلتے غصّے کا اظہار کرتے ہوئے سنا (جب کہ بوڑھے کو اس ردِّعمل پر بعد میں افسوس ہوا)۔ ترکی میں اس اوّلین لمحے میں بہت سے لوگوں نے دہشت

کی، بربریت کی بات کی اور یہ کہ یہ حملہ کس قدر قابلِ نفرت اور ہولناک تھا۔ پھر بھی، انہوں نے بے گناہ لوگوں کے قتل عام کی مذمت کے بعد ایک ''لیکن'' کا اضافہ کیا اور امریکا کی معاشی وسیاسی قوت پر دبے دبے یا مخاصمانہ انداز میں تنقید کی۔ اس دہشت گردی کے سائے میں جو''مغرب'' کی نفرت پر مبنی ہے اور بڑی درندگی سے بے گناہ لوگوں کو ہلاک کر ڈالتی ہے، عالمی معاملات میں امریکی کردار کے بارے میں بحث کرنا بہت مشکل بھی ہے اور شاید اخلاقی طور پر قابلِ اعتراض بھی۔ مگر دہشت گردی کی شدید کارروائی پر غصے کی شدت کے دوران اور قوم پرستانہ غیظ وغضب کے دوران بعض لوگوں کے لیے ایسے الفاظ ادا کرنا آسان ہوتا ہے جو بے گناہ لوگوں کے قتل عام تک پہنچ سکتے ہوں۔ اس لحاظ سے، کچھ کہنے کی خواہش ہوتی ہے۔

سب لوگوں کو آگاہ ہونا چاہیے کہ یہ حالیہ بم باری جتنا طول پکڑے گی اور امریکا کے اپنے لوگوں کی تسکین کے لیے افغانستان یا دنیا کے کسی دوسرے حصے میں جتنے بے گناہ لوگ مارے جائیں گے، وہ مصنوعی تناؤ اسی قدر فزوں تر ہوتا جائے گا جو بعض لوگ ''مشرق'' اور ''مغرب''؛ ''اسلام'' اور ''مسیحی تہذیب'' کے درمیان پیدا کرنا چاہ رہے ہیں اور اس سے اُسی دہشت گردی کو مزید فروغ حاصل ہوگا کہ یہ فوجی کارروائی جس کو روکنے اور سزا دینے کے لیے کی جارہی ہے۔ اب اخلاقی طور پر یہ ناممکن ہے کہ ان دہشت گردوں کی ناقابل یقین سفاکی کے تعلق سے جو ہزاروں بے گناہ لوگوں کی موت کے ذمے دار ہیں، امریکا کے عالمی غلبے پر بحث کی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ سمجھنے کی کوشش بھی کرنی چاہیے کہ دھکیل کر ایک طرف کر دیے جانے والے غریب ممالک کے لاکھوں لوگ، جن کو اپنی تاریخ کے انتخاب کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے، امریکا کے خلاف اس قدر غصے میں کیوں ہیں۔

ہمارے لیے واجب نہیں، بہرحال کہ ہر مرتبہ ایسے غصے کو ہم دردی کے ساتھ دیکھیں۔ مزید برآں، تیسری دنیا کے اسلامی ممالک میں امریکا مخالف جذبات بجائے خود غصے سے زیادہ ایک ایسا آلہ ہیں کہ جسے خود اپنے ہاں جمہوریت کے فقدان کو چھپانے اور مقامی آمروں کے اقتدار کو تقویت پہنچانے کے عمل کے لیے بروئے کار لایا جائے۔ امریکا کے ساتھ قریبی تعلقات ڈھالنے کے لیے سعودی عرب جیسے مُہر بند معاشرے اس طرح ظاہر کرتے ہیں گویا ساری دنیا پر ثابت کر کے دم لیں گے کہ اسلام اور جمہوریت کا ایک دوسرے کے ساتھ گزارا نہیں اور اس طرح ان لوگوں کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی جو اسلامی ممالک میں سیکولر جمہوریتوں کے قیام کے لیے کوشاں ہیں۔ اسی طرح،

امریکا کے ساتھ ایک سطحی مخاصمت، جیسی کہ ترکی میں ہے، ملک کا انتظام چلانے والوں کو یہ اجازت دیتی ہے کہ نا اہلی اور بدعنوانی کے ذریعے وہ رقم کھاپی کر اُڑا دیں جو انہیں بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے حاصل ہوئی ہے اور یوں امیر، غریب کے درمیان اس فرق کو چھپالیں جو ترکی میں ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ چکا ہے۔

امریکا میں آج ایسے لوگ بھی ہیں جو بغیر کسی شرط کے، فوجی حملوں کی حمایت کرتے ہیں تاکہ امریکا کی دفاعی قوت کا مظاہرہ کیا جاسکے اور دہشت گردوں کو "سبق" سکھایا جاسکے۔ کچھ لوگ بڑی خوش طبعی کے ساتھ ٹی وی پر گفتگو کرتے ہیں کہ امریکی جہاز کہاں بم گرائیں، گویا وہ ویڈیو گیم کھیل رہے ہوں۔ ان مبصرین کو احساس ہونا چاہیے کہ جنگ میں شرکت کرنے کے فیصلے اگر اضطراری طور پر کیے جائیں اور تمام معاملات پر سوچ بچار کے بغیر کیے جائیں تو یہ اس مخاصمت کو بڑھاوا دیں گے جو اسلامی ملکوں اور فلاکت زدہ خطوں میں رہنے والے لاکھوں کروڑوں لوگ مغرب کے لیے محسوس کرتے ہیں...... وہ لوگ جو ایسی حالت میں رہتے ہیں کہ جو ذلّت اور کمتری کے احساس کو جنم دیتی ہے۔ نہ تو اسلام ہے اور نہ غربت ایسے دہشت گردوں کے لیے براہ راست حمایت کو جنم دیتے ہیں کہ جن کی تندخوئی اور ہوشیاری کی کوئی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ بلکہ وہ کچل دینے والی ذلّت ہے جو تیسری دنیا کے ممالک میں وبا بن کر چھا گئی ہے۔

تاریخ کے کسی دور میں امیر اور غریب کے درمیان خلیج اتنی وسیع نہیں رہی۔ یہ دلیل پیش کی جاسکتی ہے کہ امیر ملکوں کی دولت ان کا اپنا کارنامہ ہے اور اس سے دنیا کے غریبوں کا سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ مگر تاریخ کے کسی بھی دور میں امراء کی زندگیوں کو اس قدر پُراثر طریقے سے دنیا بھر کے غریبوں کی توجہ کا مرکز نہیں بنایا گیا جس طرح ٹیلی وژن اور ہالی ووڈ کی فلموں نے کیا ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ بادشاہوں کی زندگی کے قصّے غریبوں کی تفریح ہیں۔ لیکن اس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ کسی بھی دور میں دُنیا کے امیر اور طاقت ور معاشرے اتنے نمایاں طور پر دُرست، حق بجانب اور منطقی نہیں رہے۔

آج کسی بھی غریب، غیر جمہوری اسلامی ملک کا عام شہری یا سرکاری ملازم جو تیسری دنیا کے کسی ملک یا سابق سوشلسٹ جمہوریہ میں دو وقت کی روزی روٹی کے لیے جدوجہد کر رہا ہے، اس بات سے آگاہ ہے کہ دنیا کی دولت میں اس کا حصہ کس قدر خیالی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ وہ جن حالات میں زندہ ہے، وہ کسی "مغرب والے" کے مقابلے میں زیادہ دُرشت اور تباہ کن ہیں اور یہ

کہ اسے مختصر تر زندگی کی سزا دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ احساس بھی ہے کہ اس کی غربت کسی حد تک اس کی یا اس کے باپ دادا کی حماقت اور ناکارہ پن کا قصور ہے۔ مغرب کی دنیا میں ذلت کے اس مغلوب کن جذبے کا شاید ہی کسی کو احساس ہو کہ جس سے دُنیا کی بیش تر آبادی گزرتی ہے۔ لوگوں کو اپنی عقل سلیم کھوئے بغیر اور دہشت گردوں، شدت پسند قوم پرستوں یا کٹر پنتھیوں کے دام میں الجھے بغیر اس احساس پر حاوی آنا ہے۔ یہی ہے سنجیدہ اور مصائب ذاتی اقلیم ہے کہ جس کی گہرائی کا اندازہ، غربت اور حماقت کو دل کشی عطا کرنے والے طلسمی حقیقت نگاری کے ناول لگا سکتے ہیں اور نہ مقبول عام سفرناموں کی عجوبہ نگاری اور اسی ذاتی اقلیم میں رہتے ہوئے آج کی دنیا کے بیشتر افراد ایک روحانی بدحالی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مغرب کو جس مشکل کا سامنا ہے وہ صرف یہی دریافت کرنا نہیں ہے کہ کون سا دہشت گرد بم بنا رہا ہے کس خیمے، کس غار یا کس شہر کی کس گلی میں بلکہ ان کو اس غریب اور ٹھکرائی ہوئی اور غلطیوں کی سزاوار اکثریت کو سمجھنا بھی ہے جو مغربی دُنیا میں نہیں رہتی۔

جنگی نعرے، قوم پرستانہ تقریریں اور تیز و تند طوفانی فوجی حملے اکثر اپنا اُلٹ ہی رُخ اختیار کرتے ہیں۔ افہام و تفہیم میں اضافے کے بجائے، مغرب کے کئی حالیہ اقدامات، رویے اور پالیسیاں بڑی تیزی کے ساتھ دنیا کو امن سے دور لیے جا رہی ہیں۔ ان میں ویزا کی وہ پابندیاں بھی شامل ہیں جو مغربی یورپ کے کئی ممالک نے یورپی اتحاد سے باہر کے ملکوں پر عائد کر دی ہیں، قانون میں سختی کے وہ اقدامات بھی جو مسلمانوں اور غریب اقوام کے باشندوں کی نقل و حمل کو روک دیں گے، اسلام اور ہر غیر مغربی چیز کی بابت شکوک و شبہات، جارحانہ اور سوقیانہ زبان جو پوری کی پوری اسلامی تہذیب کو دہشت اور مذہبی جنون کا علم بردار سمجھتی ہے۔ استنبول کے ایک فلاکت مارے بوڑھے کو کیا چیز ایک لمحے کے غصے میں نیویارک پر دہشت گردی کے حملے کی توثیق پر اکساتی ہے یا اسرائیلی جارحیت سے بے زار آ جانے والے ایک فلسطینی نوجوان کو ان طالبان کی مدح پر مائل کرتی ہے جو عورتوں پر تیزاب اس لیے پھینک دیتے ہیں کہ وہ چہرا کھلا رکھتی ہیں۔ یہ اسلام نہیں ہے جسے احمقانہ طور پر مشرق اور مغرب کے درمیان تصادم قرار دیا گیا ہے۔ نہ یہ غربت ہے۔ یہ بے چارگی کا وہ احساس ہے جس کا خمیر ذلت اور بربادی سے اٹھتا ہے، اپنی بات سمجھا سکنے اور دوسروں تک اپنی آواز پہنچانے میں ناکامی سے اٹھتا ہے۔

اس دولت مند اور جدت پسند طبقے کے افراد نے، جس نے ترکی کی جمہوریت کی بنیاد ڈالی،

معاشرے کے غریب اور پچھڑے ہوئے طبقوں کے دباؤ پر یہ ردِعمل ظاہر کیا کہ ان کو سمجھنے کی کوشش کے بجائے قانون کے نفاذ میں سختی، ذاتی عمل پر پابندیاں اور مسلح افواج کی بندش بڑھا دی۔ انجامِ کار، جدّت کاری کا یہ عمل ادھورا ہی رہا اور ترکی ایک محدود جمہوریہ بن پایا جس میں عدم رواداری حاوی رہی۔ اب جب کہ ہم مشرق اور مغرب کے درمیان جنگ کے لیے لوگوں کو آواز بلند کرتے ہوئے سنتے ہیں تو مجھے خوف آتا ہے کہ باقی کی دنیا بھی ترکی کی جیسی ہوجائے گی، جہاں تقریباً مستقل طور پر فوجی حکومت کی عمل داری رہتی ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ یہ برخود غلط اور خود مطمئن مغربی قوم پرستی باقی کی دُنیا کو اس سرکش مناقشے کی طرف دھکیل دے گی کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں، دوستوئیفسکی کے ''زیرِزمین آدمی'' کی طرح جو ''منطقی'' مغربی دنیا کے خلاف اپنا ردِعمل ظاہر کرتا ہے۔عورتوں کے چہروں پر تیزاب پھینکنے والے ''اسلام پسندوں'' کی حمایت پر کوئی بھی بات اس طرح نہیں اُکسا سکتی، جیسے کہ اس دنیا کے فلاکت زدگان اور مقہورین کو سمجھنے میں مغرب کی ناکامی اس جلتی پر تیل کا کام دے سکتی ہے۔

مصر کی ممتاز ناول نگار اور سماجی وسیاسی مبصر نوال السعداوی حقوقِ نسواں کی علم بردار کے طور پر معروف ہیں۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں اور ان کی کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ پچھلے دنوں مصر کے بعض قدامت پرست طبقوں نے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کردیا تھا۔ نوال السعدادی نے اس کا بڑے مدلل طریقے سے جواب دیا اور انسانی حقوق کی کئی تنظیموں نے ان کا ساتھ دیا جس کے بعد یہ فتویٰ واپس لے لیا گیا۔

اس مضمون میں ایک مقام پر نوال السعدادی نے مشرقِ وسطیٰ کے تین بڑے مذاہب کو مادر سری قرار دیا ہے۔ اس ترجمے میں اس پیراگراف کو حذف کردیا گیا ہے کہ روایت کی اس انداز پر تشریح ہمارے ہاں ناگوار خاطر بھی ہوسکتی ہے۔ اس مضمون کی مترجم، اردو کی ممتاز شاعرہ اور نثر نگار ہیں۔

نوال السعداوی

ترجمہ: فہمیدہ ریاض

جھوٹے دیوتا، اصلی بُت

میری آنکھ آج صبح ایک خوش گوار حدت سے بھرے نارنجی کمرے میں ایسے کُھلی کہ دھوپ میرے بستر پر برس رہی تھی۔ کہیں میں اپنے گاؤں کفرتحلی میں تو نہیں تھی؟ نیل کے طاس میں وہ میرا گاؤں! یادوں کی دھارا بہہ رہی تھی۔ کل کی یادیں، ستّربرس پرانی یادیں...... سات برس کی ایک بچّی، اپنے اسکول کے ساتھیوں کے ساتھ سڑکوں پر مظاہرے میں نعرے لگاتی ہوئی۔ شاہ فاروق کے خلاف...... سوئز میں برطانوی فوج کے خلاف!

نہیں ...... میں مصر میں نہیں ہوں۔ یہ تو ڈرہیم ہے۔ میں نومبر میں پہلے یہاں آئی ہوں۔ اس دن بھی آسمان ایسا ہی شفاف نیلا تھا جیسا آج ہے۔ اس نے میرے گاؤں کے آسمان کی طرح میرا خیرمقدم کیا تھا۔ میں ان مذہبی جنونیوں سے بچنے کے لیے امریکا آئی ہوں جو مجھے دھمکیاں دے رہے تھے۔ وہی لوگ جن کی انوار السادات نے حمایت کی تھی تاکہ ان کی مدد سے اپنے مخالفین

پر غالب آجائے۔ وہی لوگ جو ۱۶ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو اس پر پلٹ پڑے۔

وہ دن میں کبھی نہ بھولوں گی۔ جیل کی کوٹھری میں میں فرش پر لیٹی ہوئی تھی۔ میرے اردگرد گیارہ دوسری عورتیں بھی تھیں جن کو سادات نے جیل میں ڈال دیا تھا۔ ان میں اس کے خیالات جدا جدا تھے۔ کوئی مارکسی تھیں، کوئی مذہبی مجنون اور ان سب کے بیچ میں مَیں بھی تھی۔ کچھ عورتیں بالکل مایوس تھیں۔ سمجھتی تھیں کہ عمر بھر اب انہیں جیل میں رہنا پڑے گا۔ سادات کی موت کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ جیسے کچھ ہفتے پہلے تک نیویورک میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کا کوئی تصور تک نہیں کرسکتا تھا اور یہ بھی کون تصور کرسکتا تھا کہ دونوں وارداتیں کرنے والے تقریباً ایک ہی لوگ ہوں گے۔ پورے ایک ہفتے پہلے میں نیویورک کے جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ پر اُتری تھی۔ یہاں سے میں مونٹ لیئر یونیورسٹی جارہی تھی جہاں مجھے مہمان پروفیسر بن کر ایک تعلیمی سال گزارنا تھا۔ مجھے شدید صدمہ پہنچا تھا مگر ٹیلی وژن دیکھنے سے، دھماکے سے گرتے ٹاور کی بار بار دوہرائی جانے والی تصویریں دیکھنے سے میں نے قصداً اجتناب کیا۔ یہ میرے لیے نئی تصویریں نہیں تھیں۔ میں مشرق وسطیٰ کی ہوں۔ میں نے بہت دھماکے دیکھے ہیں۔ بہت بم باریاں دیکھی ہیں، بہت سی عمارتیں گرتی ہوئی، بہت سے شہری مارے جاتے ہوئے..... فلسطین، عراق، صومالیہ، لیبیا، الجیریا، افغانستان، ایران..... گزشتہ صرف بیس برس میں بربادی کا شکار ہونے والے ملکوں میں یہ صرف چندایک کے نام ہیں۔

میں دہشت گردی کی ہر واردات سے باشندوں کے ہر قتل سے نفرت کرتی ہوں۔ لیکن یہ پہلی بار ہورہا ہے کہ مجھ پر اس سوال کی بوچھار کی گئی ہے، ''جب آپ کو پتہ چلا کہ اتنے معصوم لوگ مارے گئے تو آپ کو کیا محسوس ہوا؟'' میں نے حیرت سے سوچا ہے کہ یہ سوال کبھی پہلے کیوں نہیں پوچھا گیا، کیا یہ ممکن ہے کہ کسی خاص وجہ سے امریکیوں کی زندگی، فلسطینیوں، عراقیوں، صومالیوں، افغانیوں، ایرانیوں سے زیادہ قیمتی ہو؟

ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کے بعد فون بجتا ہی رہا۔ صحافی پوچھنا چاہتے تھے کیا دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسلام میں دہشت گردی کا ارتکاب زیادہ ہوتا ہے؟ کیا یہ خدا کے نام پر خودکش حملوں کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ ایک چوتھائی صدی سے میں تین ابراہیمی مذاہب کا مطالعہ کرتی رہی ہوں۔ یہودی، عیسائیت اور اسلام۔ میں نے یہ سیکھا ہے کہ یہ تینوں مذاہب ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔

ان تینوں مذاہب میں انسان کے خدا سے رشتے، عورت اور مرد کے باہمی رشتے، خدا کی راہ

میں جان دینے کی اہمیت اور منکرین اور دوسرے مذاہب کے پیروکاروں سے جہاد کے ساتھ جو اقدار وابستہ کی گئی ہیں انہوں نے میری توجہ خاص طور پر کھینچی۔

تاریخ خون آلودہ ہے۔ یہ خون یہودیوں کا ہے، عیسائیوں اور مسلمانوں کا ہے۔ تاریخ "خدا" اور "وطن" کے نام پر کی جانے والی جنگوں سے بھری پڑی ہے۔ حکمران ان دونوں میں تمیز نہیں کرتے۔ امریکی صدر بش کے نزدیک افغانستان میں مارے جانے والا امریکی فوجی شہید ہے اور ہیرو ہے۔ وہ خدا اور ریاست ہائے متحدہ امریکا کی خاطر اپنی جان قربان کرے گا۔ مذہبی اور قومی ترانے ایک ہی چیز ہیں۔ امریکا پہ رحمت خدا کی۔ خدا پہ بھروسہ ہمارا، خدا کے سائے میں ہم ایک قوم۔

تو پھر آخر اتنے لوگ یہ کیوں سمجھ رہے ہیں کہ صرف اسلام ہی خدا کی راہ میں جان دینے کی ہمت افزائی کرتا ہے یا قوموں کو جہاد پر اکساتا ہے؟

باہر سے یہودیت، عیسائیت اور اسلام پدرسری نظاموں کے مذاہب لگتے ہیں لیکن ان کی باطنی تاریخ میں ڈوبیں تو ہم دریافت کریں گے کہ یہ دراصل مادرسری اصل کے حامل ہیں...

مذاہب بیک وقت سیاسی، معاشی، سماجی اور تہذیبی نظریات ہوتے ہیں جن کو ان کی روحانی جہات سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ جسم اور روح کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا اور کسی بھی ملک میں سیاست کو مذہب سے کاٹ کر علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ پچھلے چند ہفتوں میں یہ حقیقت جس طرح آشکار ہوئی ہے وہ کسی اندھے کو بھی نظر آسکتی ہے۔ بش، بلیئر، بن لادن اور پوپ، ایک ہی زبان بول رہے ہیں۔ یہ سب خدا کا نام لے رہے ہیں اور تیل کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔

افغانستان سے جنگ شروع کرتے ہوئے صدر بش کی تقریر سے مذہب برس رہا تھا۔ وہ "بدی" اور شیطان (بن لادن) سے جنگ شروع کر رہے تھے جس کا مقصد ابدی انصاف کا حصول تھا۔ گیارہ برس قبل ان کے والد، بڑے بش نے اس وقت کے ابلیس، صدام حسین کے خلاف خلیج میں "نیکی" کی جنگ لڑی تھی اور پوپ کے دورۂ ازبکستان کو بھی نہ بھولیے۔ کیسپین کے خطے میں وہ دوسرے ممالک بھی گئے۔ افغانستان پر حملے کے لیے روحانی راستہ ہموار کرنا تھا جس کے بعد اسے خطے کے وافر تیل کے ذخائر پر اختیار قائم ہوگا۔

ہمارے خطوں میں خدا کا نام جنگ کے اصل سبب کو چھپانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ اصل سبب تیل ہے۔ افریقا میں "خدا" کا لفظ ہیروں کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ بڑے بش نے خلیج میں تیل کی جنگ کو کویت کو "ابلیس" سے آزاد کرانے کی جنگ کا نام دیا۔ چھوٹے بش

افغانستان میں تیل کی جنگ کو دہشت گردی کے خلاف جنگ اور عورتوں کو شیطان سے نجات دلانے کی جنگ کا نام دے رہے ہیں۔ لیکن امریکا کی تیل کی پالیسیاں چھپائی نہیں جاسکتیں۔

۱۹۹۷ء میں قومی سلامتی کونسل کی مُشیر شیلا ہیزلن نے جو بین الاقوامی توانائی کے مسائل کے تجزیہ کی ذمہ دار تھیں، یہ تصدیق کی تھی کہ کیسپیئن علاقے میں توانائی کے ذرائع کو سرعت سے قابل استعمال بنانا امریکا کی پالیسی ہے۔ انہوں نے وضاحت کی تھی کہ امریکا خصوصاً تیل کی دولت سے مالا مال ان ممالک کو خود مختار دیکھنا چاہتا ہے اور یہاں سے تیل و گیس کی فراہمی کے لیے روس کی اجارہ داری ختم کرنا چاہتا ہے۔ امریکا یہ بھی چاہتا ہے کہ توانائی کے ذرائع (گیس، تیل) مختلف علاقوں سے حاصل کر کے مغربی دنیا کے لیے ان ضروری اشیا کی مستقل اور بآسانی فراہمی کو یقینی بنائے رکھے۔

سوویت یونین کے زوال کے بعد ترکی سے لے کر چین تک درمیان پڑنے والے ممالک حریصانہ شکاری نگاہوں کی زد میں ہیں۔ امریکا کو اگر واحد بالاتر عالمی قوت بنے رہنا ہے تو عرب خطوں اور کیسپیئن خطوں کے توانائی کے ذرائع پر قبضہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ کیسپیئن کے ذخائر پر قبضہ کر کے عرب ذخائر کا نعم البدل بھی مل سکتا ہے۔ ہمارے خطے میں جب سے تیل دریافت ہوا ہے خدا کا نام تیل کے لیے ہی استعمال ہو رہا ہے۔ مابعد جدیدیت دور کے لوگوں نے خدا کی جگہ تہذیب اور ثقافت کو دی تھی۔ اسی لیے ''تہذیبوں کے تصادم'' کے نظریے نے جنم لیا۔ یاد کیجیے کہ ''خدا'' دراصل ''تیل'' کی جگہ استعمال ہو رہا ہے۔ چوں کہ تیل عرب میں تھا لہٰذا اسلام اور مغرب میں تہذیبی تصادم تو ہونا ہی تھا۔ ۱۹۲۰ء میں امریکا نے اس وقت کی بالاتر قوت برطانیہ سے ایک معاہدے پر دستخط کروائے تھے کہ مشرق وسطیٰ کا تیل صرف معاہدے میں شامل ہر دو طاقتوں کے باہمی اشتراک سے ہی نکالا جائے گا۔

۱۹۳۲ء میں کویت، بحرین اور سعودی عرب میں تیل دریافت ہونے کے بعد سے تیل کے حصول کی یہ کشمکش جاری ہے۔ امریکا اور سابق سوویت یونین کے مابین کشمکش کا یہ اہم حصہ تھا۔ یہ کوئی تہذیبوں کا تصادم نہیں تھا۔ ۱۹۴۸ء میں امریکا اور برطانیہ نے تیل پر اختیار قائم رکھنے کے لیے اسرائیل کی ریاست کے قیام میں مدد دی۔ مصر، ایران، شام، عراق اور سعودی عرب میں تیل پر امریکی اختیار کی ہر مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے، سی آئی اے سرگرم رہی۔ شام میں ۱۹۴۹ء کا اور ایران میں ۱۹۵۳ء کے انقلابات یاد کیجیے۔ اس کے بعد ۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۳ء کی جنگیں ہوئیں۔ ان

جنگوں میں میرے گاؤں کے کتنے جوان مارے گئے تھے؟ مگر اتنے برس میں ایک بار بھی میں نے جنگ کے سبب کے لیے ''تیل'' کا لفظ نہیں سنا۔ صرف خدا کا نام سنا۔

سیاسی اور مذہبی دوئی نے مابعد جدیدیت کے دور میں نیا جنم لیا ہے۔ اس کی بنیاد پر سب کچھ دو پہلوؤں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک پہلو وہ جو پوری دنیا پر منطبق ہے اور دوسرا وہ جو تہذیبی لحاظ سے مشروط ہے۔ یہ دونوں غلط بھی ہوسکتے ہیں اور صحیح بھی۔ یہ ان کے استعمال پر منحصر ہے۔ آج کل تہذیبوں کے تصادم کی فکر ایک آفاقی زبان کو مسخ کرنے کی واضح مثال ہے، ''مغرب بمقابلہ اسلام''۔ جغرافیائی اور مذہبی لحاظ سے مغرب اسلام سے علیحدہ ہے۔ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بن لادن اور بش قتل کے وہ طریقے اختیار کرسکتے ہیں جن کا تہذیب سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ بش پہلے سے خبردار کردیتے ہیں اس لیے وہ مہذب ہیں۔ بن لادن پہلے خبردار نہیں کرتے اسی لیے غیر مہذب ہیں۔ اس طرح مسئلہ صرف خبردار کرنے تک محدود ہے، مہذب اور غیر مہذب میں فرق صرف اتنا ہی رہ گیا ہے۔

بش افغانستان میں ریڈ کراس اور شہریوں پر بم برساتے ہیں اور کروڑوں مسلمان انہیں دہشت گرد سمجھتے ہیں۔ بن لادن ورلڈ ٹریڈ ٹاور اور پینٹا گون پر حملہ کرتے ہیں اور مسلمان انہیں مجاہد آزادی قرار دیتے ہیں۔ مہذب امریکی، جیسے سینیٹر جرمی ہیلمز مجوزہ بین الاقوامی ٹریبونل کو اس شرط پر قبول کرنے پر تیار ہیں کہ امریکا اس کے دائرہ اختیار میں شامل نہ ہو۔ میڈلین البرائٹ جیسی مہذب خواتین کے خیال میں ہر ماہ پانچ ہزار عراقی بچوں کی موت امریکی عیسائی اقدار اور تیل کے تحفظ کے لیے قابل قبول ہیں۔

دو برس پہلے سیئٹل میں دنیا بھر سے آئے ہوئے ہزاروں غصّے سے بھرے شہریوں نے سرمایہ داری کی طاقت کم کرنے کی کوشش کی تھی اور مقتدر قوتوں کو جھنجھوڑنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ تقریباً دو مہینے پہلے روئے ارض پر بسنے والے چند غصّے سے بھرے شہریوں نے ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے صدر دفاتر پر حملہ کیا اور دنیا کو خوف زدہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ بین الاقوامی کارپوریشنیں آسانی سے دوبارہ یہ عمارتیں بنا سکتی ہیں مگر وہ کروڑوں متحد اور منظم مخالفین کی مزاحمت نہیں کرسکتیں۔

سلمان رشدی جیسے بعض مبصر بھی ہیں جنھوں نے نیویارک ٹائمز میں ۲ نومبر کو شائع ہونے والے مضمون میں اس خیال کا اظہار کیا کہ دہشت گردی کے خاتمے کے لیے اسلام کو جدید دور سے صلح کرنی پڑے گی۔ لیکن کون کہتا ہے کہ دوسرے مذہبوں کے مقابلے میں اسلام جدیدیت کی زیادہ

مخالفت کرتا ہے؟ جدیدیت اور مابعد جدیدیت سے ہمارا مقصد کیا ہے؟ دہشت گردی مذہبی ہو، معاشی ہو، سیاسی یا فوجی ہو، ہمیں اس کی جڑوں کو ختم کرنا ہوگا اور اس مین انفرادی دہشت گردی کے ساتھ ریاستی دہشت گردی بھی شامل ہے۔ دنیا کے زیادہ تر ممالک امریکا اور اسرائیل کو دہشت گرد ریاستیں سمجھتے ہیں۔ یقیناً ہمیں مذہب کو سیاست سے علیحدہ کرنا ہے اور اسے دوبارہ اس دائرے میں لے جانا ہے جس کا تعلق ہر انسان کی اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ ہمیں سیکولر، انسان دوست معاشروں کی صرف اسلامی ملکوں میں نہیں بلکہ ہر جگہ اور سب سے بڑھ کر عیسائی امریکا اور یہودی اسرائیل میں ضرورت ہے۔ ہمیں ان نوآبادیاتی اصولوں کو خیر باد کہنا ہوگا جو جدید اور مابعد جدید ادوار پر مسلّط ہے۔ ہمیں ان بین الاقوامی تنظیموں کے خلاف جدوجہد کرنی ہے جو دنیا بھر پر ایسا نظام مسلط کرنا چاہتی ہیں جس کے ذریعے بلافرق مذہب رنگ و جنس ہم سب کا استحصال کیا جائے۔ ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن تہذیبی امتیاز نہیں کرتی۔ اُمید ایک طاقت ہے۔ ہر چیز کے باوجود میں پُر امید ہوں۔

There is no greater fool than the one who would follow a fool

عربی زبان کے ممتاز ترین ناول نگار نجیب محفوظ کی ۹۰ ویں سالگرہ پچھلے دنوں منائی گئی۔ قاہرہ کے اخبار "الاہرام" میں ان کے مستقل کالم میں سے یہ انتخاب، بالترتیب ۲۷/ستمبر، ۴/ اکتوبر اور ۲۲/ نومبر کی ہفتہ وار انگریزی اشاعتوں میں سے لیے گئے ہیں۔

نجیب محفوظ
ترجمہ انور احسن صدیقی

طاقت اور انصاف

امریکا پر حملوں کی داستان کا ایک اخلاقی پہلو بھی ہے، لیکن افسوس کی بات ہے کہ اس طرف کسی کی بھی توجہ نہیں معلوم ہوتی۔ وہ اخلاقی پہلو، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان تباہ کن واقعات کے بہت سارے اخلاقی پہلوؤں میں سے اہم ترین اخلاقی پہلو، یہ ہے کہ تنہا طاقت سلامتی کی ضمانت نہیں ہے۔ کوئی خواہ نوع انسانی کو تاریخ میں اعلیٰ ترین ترقی یافتہ اور سب سے زیادہ فقید المثال ہتھیاروں کا مالک کیوں نہ ہو جن میں ایٹمی، جراثیمی، کیمیاوی اور ایسے دیگر ہتھیار شامل ہوں جن کے بارے میں ہم نے اب تک کچھ نہیں سنا ہے، پھر بھی وہ ایک خوفناک ضرب کا شکار ہو سکتا ہے۔

موجودہ معاملے میں جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، دہشت گردوں کو محض تیز چاقوؤں کی ضرورت تھی۔ صرف اس حقیقت سے اس امر کا واضح طور پر اظہار ہو جاتا ہے کہ خالی خولی فوجی طاقت کس قدر ناکافی ہے۔

سلامتی کی واحد ضمانت انصاف ہے۔ اگر امریکا دنیا کے رہ نما کی حیثیت سے زیادہ منصفانہ رویہ اختیار کرتا تو کوئی اس کو تباہ کرنے کا منصوبہ نہ بناتا۔

حملوں کا صرف ایک مطلب ہے: آج کی دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ امریکی طاقت کو ان کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے۔ بے شک امریکا کی طاقت دہشت گرد تنظیموں کا خاتمہ کر سکتی ہے یا کسی بھی منحرف کو کچل سکتی ہے۔ لیکن جب تک ناانصافی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا اس وقت تک تشدد اور خانہ جنگی کا خاتمہ بھی نہیں ہوگا۔ جیسا کہ ایک پرانی عرب کہاوت میں

کہا گیا ہے، حکمرانی کی روح انصاف ہے۔ امریکا کو اس امر کی ضرورت ہے کہ وہ نہ صرف ایسے جرائم کے مرتکب بڑے لوگوں کا خاتمہ کرے بلکہ دنیا میں ناانصافی کے اسباب کا بھی خاتمہ کرے۔

اگر امریکا دنیا پر کامیابی کے ساتھ حکمرانی کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ہر قیمت پر لازمی ہے کہ وہ ایسا ہی کرے۔

(محمد سلماوی کے ذریعے کیے گئے ایک انٹرویو پر مبنی)

جمال الدین نقوی کراچی یونی ورسٹی میں انگریزی پڑھاتے رہے ہیں اور پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے ضیاء الحق دور میں قید و بند کی صعوبت بھی اٹھائی۔ وہ گاہے بگاہے سیاسی امور اور بین الاقوامی تعلقات پر انگریزی اخبارات کے لیے لکھتے رہتے ہیں۔ جمال الدین نقوی کا یہ مضمون کراچی کے انگریزی روزنامے ''ڈان'' میں ۳۰/ستمبر ۲۰۰۱ء کو شائع ہوا۔

جمال الدین نقوی
ترجمہ: آصف فرخی

دیرپا آزادی کی تلاش میں

امریکا پر حالیہ دہشت گرد حملوں کے سبب ہونے والی تباہی اور اموات کی وسعت نے امریکا کے ساتھ ساتھ پوری دنیا کو حیران پریشان کر دیا۔ دنیا کی ساری قومیں، کیا چھوٹی اور کیا بڑی، مشرق اور مغرب، وہ اقوام بھی جنہیں تہذیب یافتہ قرار دیا جاتا ہے اور وہ بھی جن کو کم تہذیب یافتہ سمجھ جاتا ہے، ایسی کیفیت میں تھیں جو صدمے سے بڑھ کر تھی۔ وہ انسانی ہم دردی کے اظہار میں زار و قطار رو دیے۔

امریکا کا ابتدائی ردِعمل، ظاہری طور پر، ایسا تھا کہ جس سے ان کی دماغی حالت مترشح ہو رہی تھی، ان کے درشت مزاج سیاست دانوں اور افسروں کے بیانات سنجیدہ کے بجائے بالکل ہی ہکا بکا رہ جانے کی حالت کو ظاہر کر رہے تھے۔ ایک رہنما نے اسے ''ایک اور پرل ہاربر'' قرار دیا اور یوں ایک سامراجی فوجی طاقت کے خودکش ڈیسپراڈوز (desperados) کے ایک ٹولے کے برابر لاکھڑا کیا۔ ایک اور نے اسے ''امریکا کے خلاف اعلانِ جنگ'' قرار دیا۔ کسی اور نے کہا کہ تہذیب یافتہ دُنیا پر ''غیر مہذب وحشی'' حملہ آور ہو رہے ہیں۔ روم کے ایوانوں پر ہُن چڑھائی کرنے چلے آئے ہیں!

یہ نفسیاتی کیفیت ابھی تک برقرار ہے۔ حال ہی میں امریکی صدر بش کی زبان سے، جو کبھی

بھی اپنی بذلہ سنجی یا تقریری مہارت کے لیے اس طرح مشہور نہیں ہوئے جیسے کہ مثال کے طور پر کینیڈی یا کلنٹن تھے، ''صلیبی جنگ'' کے الفاظ نکل گئے۔ ان الفاظ کے سیاق وسباق معلوم ہیں۔ ان سے امریکا کے دوستوں کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوسکتا۔ بلکہ خود پاپائے روم نے بھی مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کے مظالم پر معافی چاہی ہے۔

مگر پھر بھی امریکا کا صدمہ سمجھ میں آتا ہے۔ کچھ وقت گزرنا ضروری ہے کہ امریکا اپنے ہوش وحواس قائم کرکے، ان حملوں سے نمٹنے کی حکمت عملی طے کرلے اور ان کے ذمہ دار افراد کو عدالتی کارروائی کے سامنے لے آئے۔

سیاست کی اپنی جدلیات ہوتی ہیں۔ اس کی مجبوری یہ ہے کہ یہ ایک لمحے کو مطلق بنا دیتی ہے (it absolutizes the moment)۔ ماضی کا تناظر اور مستقبل کا امکان پس پردہ کر دیے جاتے ہیں۔ امریکی اعلان کے مطابق، سب سے زیادہ مشکوک اسامہ بن لادن اور اس کے ساتھ ساتھ طالبان حکومت ہیں۔ لیکن یہ لوگ اچانک کہیں سے نمودار نہیں ہوگئے۔ ان کو نشوونما، تربیت اور اسلحہ خود امریکا نے چند عشروں پہلے فراہم کیا جب امریکا، افغانستان پر روس کے قبضے کے خلاف لڑ رہا تھا۔

کہا یہ جاتا ہے کہ باپ کا گناہ بیٹوں کے سامنے آتا ہے۔ اب وہی فوجی قوتیں اپنے خالق اور ان داتا کے خلاف ہوگئی ہیں۔ امریکی حکومت کو مطلق احساس نہیں کہ وہی فصل کاٹ رہی ہے جو اس نے اس قدر شاداں وفرحاں ہوکر بوئی تھی۔ کم یا زیادہ مہذب ہونا محض اضافی اصطلاحات ہیں۔ تاریخ اس طرح کے اتار چڑھاؤ کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

دہشت گرد حملے کے خلاف امریکی ردعمل ان چند ہفتوں میں واضح شکل اختیار کرگیا ہے۔ جیسا کہ ظاہر تھا، سارا زور انتظامی اور فوجی اقدام پر ہے۔ یہ ناگزیر ہوں گے مگر یہ معاملے کے قلب تک نہیں پہنچتے۔ یہ نہ تو علاج کرسکتے ہیں نہ حفاظت۔ یہ محض سزا دے سکتے ہیں۔ اتنی بات سمجھنے کے لیے زیادہ غور وفکر کی ضرورت نہیں کہ یہاں جس تصادم کا معاملہ ہے وہ دو فوجی طاقتوں کے درمیان تصادم نہیں ہے۔ آخری تجزیے میں، یہ وہ تصادم ہے جس میں ایک جانب خوش حالی ہے اور دوسری طرف مایوسی، محرومی اور ناانصافی جس کی وجہ سے بعض لوگ وہ واحد سہارا بھی چھوڑ دیتے ہیں جو ان کے پاس رہ گیا ہے، زندگی کا سہارا۔

یہ سچ ہے کہ خوش حالی کو یکساں طور پر تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ خوش حالی خلا

میں جاری نہیں رہ سکتی۔ یہ خوش حالی کے اپنے فائدے کی بات ہے کہ معاشرے کا کوئی جزو یا کوئی معاشرہ یوں دیوار سے نہ لگا دیا جائے جہاں پہنچ کر اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالنا، انتقام کا ایک جائز عمل معلوم ہونے لگے۔

جس انداز سے افیون کی کاشت سے نمٹا گیا تھا، وہ خاصی سبق آموز ہے۔ دُنیا میں کئی خطّے ایسے تھے جن کا دارومدار افیون کی کاشت پر تھا۔ ان کے پاس آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ انتخاب واضح تھا: یا تو افیون کی فصل یا پھر فاقہ کشی۔ افیون کی کاشت روکنے کی کوششیں اسی وقت بارآور ہوسکیں جب کسانوں کو نقد معاوضے ادا کیے گئے۔ نابرابری اور ناانصافی شاید ہمارے خوابوں ہی میں پوری طرح ختم ہوسکیں...... یا شاید دوسری دُنیا میں...... مگر باقی رہ جانے والوں کی اس دُنیا میں، ایک حد ایسی بھی ہے جہاں پہنچ کر محرومی سب سے زیادہ غیر منطقی اور تباہ کن طریقے سے پلٹ کر واپس آئے گی اور چوٹ لگائے گی۔

امریکا میں ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ اکیسویں صدی ہی کٹر پنے (بنیاد پرستی) اور اس کے لوازم کے خلاف جنگ کی صدی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی اُلٹی چلا کر دہرائی جارہی ہے۔ اس صدی میں محنت کش نے سرمائے کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا تھا جب کہ یہ دونوں ہی، یعنی محنت اور سرمایہ، صنعتی نظام کے پہیے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے پر منحصر اور بیک وقت موجود ہیں۔

یہ عین فطری بات ہے کہ لوگ خواب دیکھیں اور ایسے عقیدے رکھیں جو حقیقت سے دور ہوں۔ ان خوابوں میں ایسے منفی پہلو بھی ہوسکتے ہیں جن کو الگ کر کے نکالنے کی ضرورت ہو۔ مگر مجموعی طور پر یہ اتفاق رائے ہے کہ موجودہ صدی، عالمی امن، معاشی ترقی اور جمہوری عمل کی صدی ہے۔ مگر بڑے بڑے جوہری ذخائر تباہ کیے جارہے ہیں اور نہ فوجی صنعتی پیچاک کو معنی خیز طور پر توڑا جارہا ہے۔ جب تک یہ پیچاک اپنی جگہ قائم رہے گا، ایک نہ ایک دشمن کو تلاش کرنا ہوگا...... یا ایجاد کرنا پڑے گا۔

مزید برآں، دہشت گردی کے خلاف جنگ کے لیے اقوام متحدہ کے اعلامیے کو امریکا نے اپنی اس خواہش کے مطابق ڈھال لیا ہے کہ اپنی خارجہ پالیسی کے مقاصد کی تکمیل کر سکے۔ اسامہ بن لادن اور طالبان کے علاوہ، دہشت گرد گروہ اسرائیل اور فلسطین میں مصروف عمل ہیں۔ دونوں میں خود کش دستے موجود ہیں۔ مگر امریکا عربوں اور اسرائیل کے درمیان امن معاہدے کے مذاکرات میں مصروف ہے اس لیے اسامہ اور طالبان کے خلاف اس کا زور کم رہا ہے۔ جہاں تمام

ملکوں نے دہشت گردی کے خلاف اقوام متحدہ کے اعلامیے کی حمایت کی ہے، بہت سی اقوام نے بھانپ لیا ہے کہ امریکا نے اس کے ساتھ کیا داؤ پیچ کیے ہیں اور اس طرح دہشت گرد حملوں کے فوراً بعد جس اتحاد کا مظاہرہ ہو رہا تھا وہ غائب ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر یورپی برادری نے امریکی طریق کار کے بارے میں اپنے تحفظات ظاہر کیے ہیں۔ چین کو بھی شک ہے کہ آیا امریکا کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت ہیں۔ روس نے افغانستان کے خلاف فوجی کارروائی کی مخالفت کی ہے۔

ان کے علاوہ کئی اور ممالک نے بھی اس بارے میں اپنے تأملات ظاہر کیے ہیں۔ بعض کو شکوہ ہے کہ امریکی کارروائی خصوصی طور پر دہشت گردی کے خلاف نہیں ہے۔ دہشت گردی کے خلاف لڑائی اسی وقت منصفانہ ہو سکتی ہے جب اس کے لیے کوئی خصوصی عدالت ہو، جس طرح جنگی جرائم کے لیے بین الاقوامی عدالت قائم ہے۔

ظاہر ہے کہ پاکستان کے بازو مڑوڑے جا رہے ہیں۔ تاہم یہ کہنا ضروری ہے کہ حکومت نے اپنے سامنے موجود اور محدود پتوں کو بڑی مہارت کے ساتھ کھیلا ہے۔ مگر یہ بجائے خود ایسا معاملہ ہے جس سے علیحدہ سے نمٹنے کی ضرورت ہے۔ یہاں چند نکات کی نشان دہی ضروری ہے کہ ان پر غور کیا جا سکے:

افغانستان کے لیے امریکا کو جس طرح پاکستان کی مدد کی ضرورت ہے، اس پر ضیا الحق سرکار یاد آجاتی ہے جس نے پاکستان کو 'فرنٹ لائن' ریاست بنا دینے کی امریکی ضرورت کے خوب دام وصول کیے۔ امریکا کو فراہم کی جانے والی مدد کے لیے ظاہر ہے کہ پاکستان کو اس بار بھی فراخ دلی کے ساتھ معاوضہ ملے گا۔ مگر ضیا الحق کے پاؤں کے نیچے جو بٹیر آ گیا تھا اس نے ملک کو اخلاقی یا معاشی استحکام بخشنے کے نام پر کچھ نہیں کیا۔

موجودہ صورتِ حال میں متوقع فائدے بھی اگر اسی طرح کھلے خزانوں لٹا دیے گئے تو پاکستان اپنے آپ کو اسی دلدل میں پائے گا کہ جس میں وہ فی الوقت پھنسا ہوا ہے۔

دوسرے یہ کہ جمہوریت کی بحالی کی اشد ضرورت اب کم زور پڑ گئی ہے۔ اس ضمن میں امریکی دباؤ اب پسِ پشت جا پڑا ہے۔ خود ملک کے اندر بھی، قومی اہمیت کے اس شدید مسئلے کو تمام قومی قوتوں کو بروئے کار لانے کے لیے استعمال نہیں کیا گیا، جن میں قومی سیاسی جماعتیں بھی شامل ہیں۔ طویل معیاد میں دیکھا جائے تو جمہوریت نہ صرف پاکستان کے عوام کے لیے سودمند ہے بلکہ امریکا اور باقی دنیا کے مفاد میں بھی جاتی ہے۔

تیسرے یہ کہ حکومت کی روک تھام کے باوجود، افغانستان سے مہاجرین کی بے پناہ یورش ناگزیر ہے۔ اس کے ساتھ پاکستان میں فرقہ پرست تصادم میں اضافہ لازم ہے۔ پاکستان کو ان اضافی مسائل کا حل ڈھونڈنا ہوگا۔

دہشت گرد حملوں کا ہدف ورلڈ ٹریڈ سینٹر تھا۔ اس کی اپنی کہانی ہے۔ عالم گیری (Globalization) ناگزیر ہے۔ اس کا رُخ واپس نہیں موڑا جاسکتا۔ مگر پہاڑ کی چوٹی کی طرح، عالم گیر معیشت کی چوٹی کا انحصار بھی نچلی اور معاون سطحوں کی وسیع ہوتے حلقوں پر ہے۔ دوسرے الفاظ میں، زندگی میں زروجواہر بھی ہیں، داغ دھبے بھی اور درمیانی بے رنگ خطے بھی۔ یہ سب ایک ہی نمونے کے اندر گندھ کر نقش ونگار بناتے ہیں۔

دُنیا میں تجارت وصنعت کے ناخداؤں کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اس طرح آگے سفر نہیں کرسکتے کہ جیسے ڈبوں سے الگ کٹا ہوا انجن۔ انہیں پوری ریل گاڑی کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔ عالم گیری کے خلاف احتجاج کرنے والے چاہے دہشت گرد نہ ہوں مگر وہ کٹر پنتھیوں کی جلتی پر تیل چھڑکتے رہیں گے۔ نفرت کے معاملے میں ہم خیال ہوکر وہ آئندہ کے دہشت گردوں کے دلوں کے تار چھیڑتے رہیں گے۔

بنی نوع انسان نے بھوک پر فتح پالی ہے۔ اگر عزم وارادہ ہوتو انسانیت کی نچلی ترین سطحوں پر قلت کی تلافی کا اطمینان دلایا جاسکتا ہے کہ پھر مرجانے اور مار ڈالنے کی خواہش اور دہشت گرد بننے کا جذبہ دور کہیں ماضی میں پیچھے رہ جائے۔

کشور ناہید

آگ کے شعلوں کے درمیان نظر آتا سچ

۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ہم اپنے میڈیا کو برا بھلا کہتے تھے اور بار بار بی بی سی کا حوالہ دیتے تھے۔ بار بار بی بی سی سننے کے لیے اکٹھے ہوتے تھے۔ ایران عراق جنگ کے دوران، سی این این بہت بھرپور طریقے پر رواں تبصرہ اور کارروائی سناتا رہا۔ چوں کہ یہ سارے واقعات ہم سے دور ہو رہے تھے ہم نے پھر یہ ایمان رکھا کہ یہ سچ بول رہے ہیں۔ گیارہ ستمبر سے پہلے ہم یہی سوچتے اور کامل یقین رکھتے تھے کہ ہمارا میڈیا سرکاری پروپیگنڈہ کرنے والا ہے اور سچ مغربی میڈیا بولتا ہے۔ مگر گیارہ ستمبر نے بہت سے تعلقات کے پول کھولنے کے علاوہ میڈیا کا پول بھی کھولا اور وہ بھی مغربی میڈیا اور مغربی ممالک کے صحافیوں کا کہ جو اس وقت اسلام آباد کے چپے چپے پر قابض ہیں۔ بھوکوں کی طرح کہانیاں تلاش کر رہے ہیں اور جو شخص بھی یہ کہہ دیتا ہے کہ میں نے اسامہ کو دیکھا ہے یا اس سے بات کی ہے، بس اس کا انٹرویو، تصویریں اور فیچر بنا رہے ہیں۔

آج سے پہلے بی بی سی کے نمائندے کو یہ سوال نہیں سوجھا تھا کہ آخر اتنی بڑی تعداد میں مولوی کہاں سے آ گئے۔ آج سے پہلے انہوں نے تفتیشی رپورٹ بھی تیار نہیں کی تھی کہ جو کل کے مجاہدین تھے آج کے دہشت گرد کیسے بن گئے۔ آج سے پہلے وہ لبرل لوگوں کو بڑی آسانی سے کمیونسٹ کہہ کر ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیتے تھے۔ آج سے دس برس پہلے طالبان کو حکمراں کرنے اور ان کی حکومت کو تسلیم کر لینے کی کسے جلدی پڑی تھی۔

مگر آج کرسٹینا امان پور مجھے آ کر پوچھتی ہے کہ آخر پاکستانی ایک طرف تو امریکا جانے کے لیے بیتاب ہیں اور دوسری طرف امریکا سے نفرت کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ میں نے جب اسے کہا کہ جب سے تم نے پی ایل ۴۸۰ گندم پاکستان بھیجی، جب سے اونٹوں کے گلے میں تھینک یو امریکا کے بورڈ لٹکوا کر ہمارے سربراہوں نے جلوس نکالے، جب سے امریکی مفادات کے لیے پاکستان میں بڈابیر سے لے کر سارے کمانڈو تربیتی کیمپ روسیوں کے خلاف بھجوانے کے لیے پاکستان کے مخصوص طبقات کو استعمال کیا گیا، ہر بار جمہوریت کے قتل پر تم خاموش رہے، پاکستان میں زمین داریاں اور وڈیرہ شاہی ختم نہ کرنے پر تم خاموش رہے تو آج جب وہ فصل

پک کے تیار ہو چکی ہے تو رونا کیا اور افسوس کیسا۔

پھر میڈیا کا یہ عالم ہے کہ جب انٹرنیٹ نے شور مچایا کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں تو ۴۰۰۰ یہودی کام کرتے تھے۔ ان میں سے تو ایک بھی کام پر نہ آیا۔ تو کیا یہ کام ان کا نہ تھا۔ تو فوراً کہہ دیا گیا کہ ۱۳۲ یہودی مارے گئے۔ پہلے دن کہا گیا کہ چار بلڈنگوں کے اوپر کیمرے لگے ریکارڈ کر رہے تھے، پہلے جہاز کے ٹکرانے کو بعد میں اس کا ذکر بھی نہیں آیا۔ پہلے دن انٹرنیٹ پر آیا کہ سامنے کی بلڈنگ کے اوپر دو لوگ کھڑے پہلے جہاز کے ٹکرانے کے منظر کر ریکارڈ کر رہے تھے اور تالی بجا رہے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ یہودی تھے۔ یہ کہانی ٹیلی وژن نے بتائی ہی نہیں۔

فلسطینیوں کے خوش ہونے اور تالیاں بجانے والی فلم ۱۹۹۱ء کی ہے جسے دیدہ دلیری سے تازہ فلم کہہ کر دنیا کی رائے فلسطینیوں کے خلاف کرنے کے لیے بار بار دکھایا گیا۔

پاکستان کے ایک اہم ذمہ دار ڈپلومیٹ (ریٹائرڈ) نے کہا کہ مجھے تو آٹھ ماہ سے معلوم ہے کہ امریکیوں نے کہا تھا کہ اس دفعہ کی سردیوں سے پہلے ہم طالبان کا صفایا کر دیں گے۔ کوئی میڈیا اس اہم ریٹائرڈ افسر سے بات ہی نہیں کر رہا ہے۔ انٹرویو بھی نہیں کر رہا۔

ساڑھے تین سال بعد کلنٹن صاحب کہہ رہے ہیں کہ میں نے پاکستان کی حکومت کو کہا تھا کہ ہم کمانڈو بھیج کر فلاں فلاں کو مروا دیتے ہیں مگر اس وقت کی جمہوری سیاسی حکومت نہیں مانی تھی۔ یہی بات جاوید ہاشمی اور ایاز امیر انٹرویو میں کہہ رہے ہیں۔

مغربی میڈیا کی بے ایمانی کا تو یہ حال تھا کہ جن ممالک کے لوگ ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں مرے ہیں، اس فہرست میں پاکستان کا نام کئی دن تک شامل نہ تھا۔ جب بہت شور مچا تو پھر چند دن ہوئے، ان کو پاکستان اور اسلام دونوں یاد آ گئے۔

پاکستان میں ہر جگہ ہر شہر میں اگر مولویوں نے جلوس نکالے ہیں تو سول سوسائٹی کے نمائندوں نے امن کے لیے جلوس نکالے اور مظاہرے کیے مگر ان واقعات کو اور ان مظاہروں کو مغربی میڈیا بالکل لفٹ نہیں کرا رہا۔ سبب یہ کہ اس طرح تو پاکستان کے لوگوں کو دنیا بالغ نظر اور روشن خیال سمجھنے لگے گی جب کہ وہ صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سارے پاکستانی داڑھی والے دہشت گرد ہیں۔ وہ پتلے جلاتے ہیں، نعرے لگاتے ہیں اور جنونی لوگوں کے ساتھی ہیں۔

یہ ہے مغربی میڈیا جس پر ہم اعتبار کرتے تھے۔ یہ وہ میڈیا ہے جس نے لاہور پر قبضے کی ۱۹۶۵ء میں فلم دکھا دی تھی۔ کاش! ہم ان کی منافقت اور خود غرضی کو سمجھ کر دوست اور دشمن میں تمیز کر سکیں۔

برما کے اہم صحافی آنگ زا ان دنوں جلا وطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ "ایراودی" نامی رسالے کے مدیر ہیں۔ اس مضمون کے مترجم نوجوان صحافی ہیں جو کراچی کے ایک روزنامے سے وابستہ ہیں۔

آنگ زا
ترجمہ: مبشر علی زیدی

امریکا پر حملہ اور ذرائع ابلاغ کا بحران

سچ جاننا ہے تو سی این این مت دیکھیے

اس امر میں شک نہیں کہ امریکا پر حملے کے بعد دنیا کی سب سے مستحکم جمہوریت قومی بحران میں ہے...... اور اس کے ذرائع ابلاغ بھی۔

ہائی جیک کیے جانے والے طیارے نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں داخل ہوئے تو دنیا بھر میں کروڑوں افراد نے اپنے ٹیلی وژن پر تازہ مناظر دیکھے۔

یہ ہولناک واقعہ دیکھتے ہوئے ہم میں سے بیش تر نے سوچا کہ یہ کیسے اور کیوں رونما ہوا؟ عوام ایسی باتوں کی وضاحت کے لیے فطری طور پر ذرائع ابلاغ پر انحصار کرتے ہیں۔ اس لیے عالمی خبر رساں اداروں، مثال کے طور پر امریکا کے سی این این اور برطانیہ کی بی بی سی عالمی سروس پر بھاری ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، واقعات کی حقیقی اور درست اطلاعات فراہم کریں۔ لیکن تاحال ہم نے تصویر کا ایک رخ بھی مکمل نہیں دیکھا۔

سی این این اور امریکا کے دوسرے ٹی وی چینلوں کے میزبانوں اور صحافیوں نے شاید ہی کسی وقت یہ سوال اٹھایا ہو کہ ۱۱ ستمبر کا واقعہ کیوں پیش آیا؟ اس کے بجائے وہ بیش تر اوقات "امریکا کیسے بدلہ لے گا؟" اور "دہشت گردوں نے طیارے کیسے اغوا کیے؟" جیسے سوالات پر گفتگو کرتے رہے۔

بات یہ سمجھ میں آئی کہ امریکا ایک تکلیف دہ سوچ کو نظر انداز کرنا چاہتا ہے۔ ایک عشرے قبل

افغانستان سے متعلق اس کی اپنی پالیسیوں نے اسامہ بن لادن کی منصوبہ بندی اور طالبان اقتدار دونوں کو مستحکم ہونے میں مدد دی تھی۔ امریکی سی آئی اے اور پاکستانی خفیہ افسروں نے افغانستان میں سوویت افواج کے خلاف لڑنے کے لیے انتہا پسند مسلمانوں کی تربیت پر اربوں ڈالر صرف کیے تھے۔ سی این این اگر اس بارے میں معلومات فراہم کرے تو اس کا عمل حقیقت اور انصاف پر مبنی ہوگا۔

افسوس کہ اس کے بجائے ہم نے سی این این پر صحافیوں کو یہ کہتے سنا کہ دہشت گردوں کا ایک گروہ یکایک نہ جانے کہاں سے نمودار ہوا اور اس نے امریکا پر حملہ کر دیا۔ یقینی طور پر یہ جھگڑا ۱۱ ستمبر کو شروع نہیں ہوا اور واضح طور پر پس منظر سے کچھ اہم معلومات غائب ہیں جو قابلِ اعتماد صحافت کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔

سی این این کے صحافیوں نے بڑی آسانی سے اس سوال کو نظر انداز کر دیا کہ یہ سفاکانہ واردات کیوں ہوئی؟ ہائی جیکروں نے اپنی جان دے کر امریکا کی سب سے قابلِ فخر علامات پر حملہ کرنے کا تہیہ کیوں کیا ہوا تھا؟ کیا وہ صرف تباہی پھیلانے کے شوقین تھے؟ اگر نہیں تو کس بات نے انہیں یہ راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا؟ ان سوالات پر غور کرنے کے بجائے حملوں کے چند گھنٹے بعد سی این این اعلان کر رہا تھا کہ اسامہ بن لادن سب سے اہم مشتبہ ملزم ہے۔

گویا خوف ناک حملے کا مشرق وسطیٰ سے تعلق فرض کیا جا چکا ہے۔ لیکن سی این این پر عربوں کا نقطہ نظر شاذ ہی پیش کیا گیا ہے۔ بی بی سی عالمی سروس نے البتہ مشرق وسطیٰ کے لوگوں کے کئی انٹرویوز اور تجزیے پیش کیے جن میں پاکستانی صحافی اور ماہرین بھی شامل تھے۔

سی این این کے صحافیوں نے یہ سوال بھی نہیں اٹھایا کہ مشرق وسطیٰ سے متعلق امریکی خارجہ پالیسی کے کس پہلو نے دوسروں کو برہم کیا۔ اس کے بجائے وہ امریکا پر حملے کی نشریات ۲۴ گھنٹے پیش کرتے رہے۔ سی این این پر پاکستان یا افغانستان سے چند آرا یا تجزیے پیش کیے گئے لیکن ہم نے اسکرین پر بہت سے امریکی پرچم دیکھے اور پس منظر میں بہت سے ملّی نغمے سنے۔

الیف بی آئی، سی آئی اے اور پینٹاگون کے حکام کے ساتھ سی این این بھی جلد یہ شور مچانے والوں میں شامل ہوگیا تھا کہ بن لادن اور عرب نژاد امریکی اہم مشتبہ ملزم ہیں۔ ایسے بیانات کے ذریعے بڑی مہارت سے قوم پرستانہ جنگجوپن کے جلتے الاؤ پر تیل ڈالا گیا جو مغربی ذرائع ابلاغ کا مخصوص انداز ہے۔

بعض اہم اخبارات اور سی این این نے غلطی سے سعودی ہوا بازوں کو ہائی جیکر کی حیثیت سے

شناخت کیا جس سے ناظرین میں غلط فہمیاں اور ہوا بازوں کے اہل خانہ میں جھنجھلاہٹ پیدا ہوئی۔

سی این این کی نشریات دیکھتے دیکھتے ہمارے لیے یہ کہنا دشوار ہوگیا کہ سرکاری حکّام کون ہیں اور سی این این کے صحافی کون! کیا یہ ممکن ہے کہ مشینی صحافی موجود ہوں جو صرف سرکاری بیانات نشر کرتے رہیں؟

نیویارک ٹائمز میں ٹیلی وژن تنقید کے شعبے کے سربراہ کرنی جیمز کہتے ہیں ''ذرائع ابلاغ اور حکومت کے درمیان فاصلہ گھٹتا جارہا ہے اور ہمیں اس پر نظر رکھنی چاہیے۔''

سی این این کئی بار رائے عامہ کا جائزہ لے کر یہ بھی بتا چکا ہے کہ کتنے فی صد امریکی جنگ کے خواہش مند ہیں۔ لیکن باقی دنیا کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا سی این این نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ امریکا سے باہر رہنے والے کتنے لوگ جنگ میں کودنا چاہتے ہیں؟

ان فضول اعداد وشمار کے بجائے سی این این کو امریکا کی ان فوجی پالیسیوں کا تجزیہ پیش کرنا چاہیے جن کی وجہ سے ہندچینی، مشرق وسطی، وسطی امریکا، سوڈان اور عراق میں لاکھوں ہلاکتیں ہوئیں۔

خوش قسمتی سے، بے شک چند لمحوں کے لیے ہی، ہم امریکا اور برطانیہ کے لڑاکا طیاروں کو روزانہ بغداد پر حملے کرتے دیکھتے ہیں۔ بظاہر ایسا صدام حسین کو سزا دینے کے لیے کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت اس سے کئی شہری مارے جاتے ہیں۔ ابھی تک سی این این نے جنگ خلیج میں ۲ لاکھ عراقی عوام کے قتل عام کی خبر نہیں دی، نہ اب تک اس نے ''ضمنی نقصان'' کی اصطلاح کی تشریح کی ہے۔

کیا آپ نے کبھی سوڈان میں بم باری کے مناظر دیکھے جس سے اس کا نصف ذخیرہ ادویہ تباہ ہوگیا اور متعدد شہری بھی جاں بحق ہوئے؟ یہ السے سی این این جیسے عالمی ذرائع ابلاغ کی توجہ کبھی حاصل نہیں کرتے۔ کیوں؟ شاید اس لیے کہ ان کی خبر عام کرنے سے بڑے کاروباری افراد اور سیاست دانوں کے مفادات کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ دراصل یہی وہ عمل ہے جسے طبقاتی احتساب (میں اس کا ترجمہ 'منافقت' کرنا چاہتا ہوں) کہا جاتا ہے۔

سی این این کی تمام خبروں کا لازماً سیاسی طور پر محفوظ ہونا ضروری ہے۔ ممکن ہے کہ کبھی فلسطینی عوام کی مظلومیت دکھا دی جائے لیکن مغربی ذرائع ابلاغ پر رائج اسرائیل نواز موقف کا ہی ہے۔ سی این این کے پسندیدہ موضوعات یہ ہیں کہ وائٹ ہاؤس کے حکام آمروں اور منشیات کے سوداگروں کو سزا دینے کی باتیں کر رہے ہیں اور امریکا کس طرح دنیا کو بچانے کے لیے زبردست

جدوجہد کررہا ہے۔

سی این این پر کبھی اس بارے میں خبریں پیش نہیں کی جاتیں کہ امریکی انتظامیہ نے کس طرح کئی ممالک میں اپنے اتحادیوں اور دہشت گردوں، دونوں کو جدید ہتھیار فراہم کر کے تشدد اور اسلحے کو فروغ دینے کا جرم کیا جس کے نتیجے میں بلا امتیاز لاکھوں شہری ہلاک ہوئے۔ دراصل امریکا میں یہ ایک 'حرام' موضوع ہے۔

امریکی عوام اب اس الجھن میں ہیں کہ انہیں اس ظالمانہ طریقے سے کیوں نشانہ بنایا گیا اور ان سے اس بری طرح کیوں نفرت کی جارہی ہے۔ کیا سی این این انہیں یہ بتانے کے لیے کچھ وقت صرف کررہا ہے؟

اگر سی این این اور دوسرے امریکی چینل اپنے عوام کے ساتھ مخلص ہوتے تو وہ زیادہ دیر تک اندھیرے میں نہ رہتے۔ کم از کم انہیں اس عالمی تصادم کے تباہ کن نتائج کا ادراک ہوتا اور ممکن ہے کہ وہ اپنی حکومت کی پالیسیوں پر زیادہ کڑی تنقید کرتے۔

ہم امریکا کے باہر رہتے ہیں اس لیے یہ دیکھنے کے قابل ہیں کہ امریکی ذرائع ابلاغ دنیا بھر کے ناظرین اور قارئین کی طرح کس طرح اپنے عوام کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے امریکی عوام کو کسی معاملے کے ہر پہلو سے تجزیے کی توقع نہ کرنے پر راضی کرلیا ہے، چاہے وہ حالیہ بحران جتنا سنگین ہی کیوں نہ ہو۔

زہر سے بھری جذباتی تقاریر کرنے والے سیاست دانوں کی طرح ذرائع ابلاغ نے شاید ہی کسی کو ٹھنڈے دل و دماغ سے یہ سوچنے پر مجبور کیا ہوگا کہ امریکا نے بدلہ لیا تو کیا نتائج برآمد ہوں گے؟ اس طرح سیاست داں اور ذرائع ابلاغ مسئلہ حل کرنے میں مدد نہیں کررہے بلکہ اسے بڑھانے کے لیے کوشاں ہیں۔

سی این این نے حال ہی میں اپنا بیش تر وقت ''دہشت گردوں کے خلاف جنگ'' کے لیے مخصوص کیا جیسے امریکا کو دوسروں سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ اگر بنگلہ دیش اور بھارت میں نیویارک جیسے حملے سے ہزاروں افراد ہلاک ہوجاتے تو سی این این اور بی بی سی اس کے لیے کتنے دن کی نشریات مخصوص کرتے؟ شاید دو دن سے زیادہ نہیں کیوں کہ بدقسمتی سے یہ ممالک ''عالمی دلچسپی'' کا مرکز نہیں۔

حیرت انگیز طور پر ہزاروں میل دور تھائی لینڈ کے ٹی وی اور ریڈیو جیسے ذرائع ابلاغ نے

امریکا پر حملے کے بارے میں دانش وروں، مذہبی رہنماؤں اور سرکاری حکام کی رائے جاننے، امریکی خارجہ پالیسیوں کے مضمرات جانچنے، سوالات اٹھانے اور پس منظر بیان کرنے کے لیے کئی گھنٹے مختص کیے۔

یہ کہنے والی بات نہیں کہ تھائی صحافی اپنے امریکی ہم پیشہ افراد سے کتنی زیادہ اہلیت رکھتے ہیں۔ ایک سال قبل جب برما کے باغی نوجوانوں نے تھائی لینڈ کے ایک اسپتال پر حملہ کیا تو وہی ٹی وی اور ریڈیو درست اور منصفانہ خبریں فراہم کرنے میں ناکام رہے جس کی وجہ سے تھائی لینڈ میں برمی باشندوں کے خلاف نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ بہت سی خبریں تصدیق کیے بغیر نشر کی گئیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ بہت سے تھائی صحافی اپنے ہم سائے برما کے سیاسی معاملات اور مسائل کی بہت کم سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ ان کی فراہم کردہ ناقص معلومات کی بھاری قیمت تھائی لینڈ میں برمی پناہ گزینوں اور غیر قانونی کارکنوں کو چکانا پڑی۔

صحافیوں کا صرف یہ فرض نہیں کہ خبریں فراہم کریں بلکہ انہیں عوام کو تعلیم بھی دینی چاہیے، خاص طور پر ان موضوعات پر جن کے بارے میں وہ کم جانتے ہیں۔ یہ مشکل کام ہے لیکن اسے انجام دینے کی حتیٰ الامکان کوشش کرنی چاہیے۔

حال ہی میں ایک مباحثے کے دوران 'اے او ایل ٹائم وارنر' کے سربراہ گیری لیون نے اعلان کیا کہ عالمی ذرائع ابلاغ نئی صدی کی سب سے اہم صنعت ہوں گے اور شاید حکومتوں سے بھی زیادہ طاقت ور۔ اس صورت میں ہم صحافیوں پر زیادہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ درست اور مُنصفانہ خبریں فراہم کریں۔ سی این این کے صحافیوں کو اپنے قیمتی وقت میں مخصوص مفادات کے پروپیگنڈے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ انہیں چاہیے کہ تنقیدی جائزے بھی پیش کریں ورنہ ٹی وی اسکرین پر تصویر کا صرف ایک رخ نظر آئے گا۔

حال ہی میں سی این این کی ایک ترجمان نے کہا تھا "اگر جنگ شروع ہوئی تو میرا خیال ہے کہ پینٹاگون ذرائع ابلاغ پر پابندیاں عائد کرے گا۔" اس نے یہ پیش گوئی بھی کی تھی کہ فوج اور ذرائع ابلاغ کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہوگا۔ اگر یہ بات ہے تو سی این این کو چاہیے کہ تمام حدود و قیود کے باوجود جس حد تک ممکن ہو، درست اطلاعات ہی نشر کرے۔

بنی نوعِ انسان کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ ذرائع ابلاغ کے ارکان جس قدر ممکن ہو، ذمے داری سے کام کریں۔ ہم شاید جنگ روک نہیں سکتے لیکن سی این این جیسے ذرائع ابلاغ یقینی

طور پر اس کے نتائج پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ اب یہ ذرائع ابلاغ مسائل کو بگاڑنے کے بجائے انہیں حل کرنے کے عمل کا حصہ بننا شروع کریں۔ دنیا کو تاریخ کے سب سے بڑے خطرے کا سامنا ہے اور یہ صحافیوں اور ذرائع ابلاغ کے دوسرے کارکنوں کا فرض ہے کہ اکیسویں صدی میں اس کی حفاظت کریں۔

بشکریہ زیڈ میگزین

سیّد کاشف رضا

آزاد میڈیا یا نیو اسپیک کا عہدِ زرّیں

غالباً اوائل ۲۰۰۰ء کی بات ہے۔ میں روزنامہ ''جنگ'' کراچی کی نیوز ڈیسک پر بیٹھا تھا کہ شفٹ انچارج نے مجھے ''واشنگٹن پوسٹ'' میں شائع ہونے والی ایک خبر ترجمہ کرنے کے لیے دی۔ خبر جمعیت علمائے اسلام (س) کے رہنما مولانا سمیع الحق سے لیے گئے ایک انٹرویو پر مبنی تھی۔ انٹرویو تو مولانا صاحب ہی کا تھا لیکن گفتگو سے نتائج رپورٹر نے خود اخذ کیے تھے۔ انٹرویو پر مبنی یہ خبر پڑھ کر میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ اس کا ترجمہ کرنا بھی چاہیے کہ نہیں۔

رپورٹر نے یہ انٹرویو مولانا سے دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں لیا تھا جو صوبۂ سرحد کی ایک اہم مذہبی درس گاہ ہے۔ مولانا نے بڑے فخر سے رپورٹر کو بتایا کہ ان کی درس گاہ سے 'لاکھوں' افراد فارغ التحصیل ہو چکے ہیں اور افغانستان پر حکمران 'طالبان' کی اکثریت بھی اسی درس گاہ سے پڑھی ہوئی ہے۔ انہوں نے جہاد کے بارے میں بھی مسلمانوں کے معروف خیالات کی ترجمانی کی۔ رپورٹر نے ان کی باتوں کو ایسا زاویہ (اینگل) دیا جس سے ظاہر یہ ہوا کہ اس مدرسے سے فوج کی فوج اہلِ مغرب کے خلاف تیار ہو ہو کر نکل رہی ہے۔ مولانا نے انٹرویو میں اپنی قوت سے متعلق بلند بانگ دعوے بھی کیے جس سے رپورٹر نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ لوگ جلد ہی حکومت پر، جس کے پاس ایٹم بم بھی ہے، قبضہ کرنے والے ہیں۔

مولانا سمیع الحق کو ضیاء الحق نے پاکستان کی سینیٹ کا رکن بنوایا تھا۔ وہ یا اُن کی جماعت کسی بھی انتخاب میں ایک آدھ سے زائد نشستیں حاصل نہیں کر پائے۔ خود اکوڑہ خٹک سے اُن کی جماعت کا کوئی رکن کبھی منتخب نہیں ہوا۔ ۱۹۸۸ء میں اکوڑہ خٹک کے حلقے سے اُن کی جماعت کا امیدوار اسلامی جمہوری اتحاد کا ٹکٹ حاصل کرنے کے باوجود تیسرے نمبر پر رہا جب کہ آئندہ ہونے والے تین انتخابات میں اُس سے یہ پوزیشن بھی چھن گئی۔ صوبہ سرحد کے ضلع کرک سے اس جماعت کے مولانا شہید احمد ۱۹۸۸ء میں آئی جے آئی اور ۱۹۹۳ء میں متحدہ دینی محاذ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے۔ باقی حلقوں میں یہ جماعت کبھی ایک دو ہزار سے زیادہ ووٹ حاصل نہیں کر پائی۔

یہ تو تھی مولانا سمیع الحق کی جماعت کی حقیقی پوزیشن۔ اب ذرا سوچیے کہ امریکا کے عوام جنہیں اس پوزیشن کا کوئی علم نہیں (رپورٹر صاحب نے بتانا، بلکہ شاید معلوم بھی کرنا ضروری نہیں سمجھا) انہوں نے یہ خبر واشنگٹن پوسٹ میں پڑھی ہوگی تو ان پر کیا اثر ہوا ہوگا۔ یہ ضرور ہے کہ وہاں یہ خبر دلچسپی سے پڑھی گئی ہوگی کیوں کہ مغرب میں ''اسلامی بنیاد پرستی'' کا ہوّا بڑے زور وشور سے کھڑا کر دیا گیا ہے۔ جے یو آئی (س) اور مولانا سمیع الحق کی طاقت کے تناسب (Proportion) کے حساب سے واشنگٹن پوسٹ جیسے اخبار میں انہیں اتنا ڈسپلے ملنا میرے نزدیک جائز نہیں تھا۔ کہیں رپورٹر کو اس سلسلے میں لائن تو نہیں دی گئی تھی، میں نے سوچا اور رپورٹر کے 'عالمانہ تجزیے' کو نکال کر باقی ماندہ خبر ترجمہ کر دی۔

واشنگٹن پوسٹ کی یہ خبر بظاہر جھوٹ پر مبنی نظر نہیں آتی۔ رپورٹر نے مولانا کی باتوں کا تجزیہ کیا، اُس کا بھی اسے حق تھا۔ لیکن یہ خبر منتخب حقیقت (Selective reality) کی ذیل میں آتی ہے جبکہ خبر خصوصاً ایسی حساس خبروں کو نمائندہ حقیقت (Representative reality) کا حامل ہونا چاہیے۔ اگر کسی معاملے میں بہت سے حلقوں کے مفادات داؤ پر لگے ہوں تو اس معاملے میں کسی 'منتخب حقیقت' پر مبنی خبر بنانا پروپیگنڈے کی ذیل میں آتا ہے۔ حقیقت کا کوئی پسندیدہ جزو لے کر اسے ایسے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہی پوری حقیقت نظر آئے = اس طرح قاری کے لیے یہ طے کر دیا جاتا ہے کہ وہ کسی مخصوص نہج پر ہی سوچے۔ کوئی رپورٹر، اخبار یا خبر ایجنسی خبر کے لیے جو زبان استعمال کرتے ہیں اُس کا تجزیہ کر کے ہم یہ طے کر سکتے ہیں کہ آیا یہ خبر صرف خبر ہی ہے یا اس کے ساتھ رپورٹر، اخبار یا خبر ایجنسی کا اس خبر میں موجود واقعے سے متعلق فیصلہ بھی ملفوف ہے۔

جنرل ضیاء الحق کے دور میں روس افغان جنگ کے دوران مغربی اخبارات اور خبر ایجنسیاں روس اور اس کی حمایت یافتہ انتظامیہ سے لڑنے والوں کے لیے 'مجاہدین' کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ سرد جنگ کے بعد یہی 'مجاہدین' امریکا اور مغربی میڈیا کا ہدف بن گئے۔ چناں چہ اب 'مجاہدین' کا لفظ کہیں نظر نہیں آتا۔ لیکن ۲۲ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو فرانس کی خبر ایجنسی، ایجنسی فرانس پریس (AFP) کی پکچر سروس ملاحظہ کرتے ہوئے میری نظر ایک کیپشن پر پڑی جو یوں تھا، ''ایک مجاہد (ایجنسی نے دراصل واحد کے لیے بھی صیغۂ جمع استعمال کرتے ہوئے 'مجاہدین' کا لفظ لکھا ہے) بگرام کی فرنٹ لائن پر ایک چوکی میں مشین گن صاف کر رہا ہے۔''

مجاہد (یا مجاہدین) کا یہ لفظ شمالی اتحاد کے سپاہی کے لیے استعمال کیا گیا جو طالبان فوجیوں

سے لڑ رہے ہیں۔ اس کیپشن میں لفظ 'مجاہدین' کا تجزیہ کیا جائے تو فوٹوگرافر یا خبر ایجنسی کا یہ 'فیصلہ' سامنے آتا ہے کہ شمالی اتحاد کے فوجی طالبان کے خلاف جہاد (جس کا ترجمہ Holy war کیا جاتا ہے) میں مصروف ہیں اور یوں ایک عظیم مذہبی ذمے داری پوری کر رہے ہیں۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ شمالی اتحاد اور مغرب کے مفادات یکساں ہونے پر کرائے کی وردیوں میں ملبوس شمالی اتحاد کے یہ سپاہی ۱۳ برس بعد ایک مرتبہ پھر 'مجاہد' کیسے بن گئے ہیں۔

رابرٹ فِسک برطانوی روزنامے 'دی انڈی پنڈنٹ' سے وابستہ مشہور و معروف صحافی ہے اور مشرقِ وسطیٰ کو تقریباً ۲۴ برس سے کور کر رہا ہے۔ اپنی غیر جانب دارانہ رپورٹنگ کے باعث اسے کئی اعزازات مل چکے ہیں۔ رپورٹنگ کے ساتھ ساتھ وہ مغربی میڈیا، خصوصاً مشرقِ وسطیٰ کے حوالے سے اس کی رپورٹنگ پر گہری نظر بھی رکھتا ہے۔ مغربی میڈیا کی جانب داری کی مثال دیتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں وہ ذکر کرتا ہے کہ پچھلے دنوں سی این این نے اپنے رپورٹروں کو ہدایت کر دی کہ 'جیلو' کی یہودی نوآبادی کو نوآبادی (Settlement) کے بجائے یہودی برادری (Jewish Neighbourhood) کے نام سے پکارا جائے۔ میڈیا پر نظر رکھنے والی یہودیوں کی ویب سائٹ honestreporting.com پر اس کامیابی کا جشن اب تک منایا جا رہا ہے۔ رابرٹ فِسک اس بارے میں اپنے آرٹیکل میں اطلاع دیتے ہوئے بتاتا ہے کہ 'جیلو' کی نوآبادی بیت جلہ کی فلسطینیوں سے چھینی گئی زمین پر قائم کی گئی تھی اور 'جیلو' کا لفظ عربی لفظ 'جلہ' کا عبرانی مترادف ہے۔ اس واضح حقیقت کے باوجود سی این این نے اس نوآبادی کو نوآبادی قرار نہ دینے کے بارے میں ہدایت جاری کر دی۔[۱]

فِسک کے مطابق دی انڈی پنڈنٹ سے بات چیت کرتے ہوئے سی این این کے عملے کے ایک رکن نے کہا کہ ''ہم پر اب دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ ''آبادکار'' (Settler) کا لفظ کسی پس منظر میں استعمال نہ کریں اور اس لفظ کے بجائے آبادکاروں کو محض 'اسرائیلی'' کہنے پر اکتفا کریں۔[۲]

فِسک کے مطابق ماضی میں سی این این ''دہشت گرد'' کا لفظ صرف فلسطینیوں کے لیے استعمال کرتا رہا ہے اور جب ۱۹۹۴ء میں ایک اسرائیلی آبادکار نے حبرون کی ایک مسجد میں ۲۹ فلسطینیوں کو قتل کر دیا تھا تو اس اسرائیلی کو صرف ''انتہاپسند'' (extremist) کہنے پر اکتفا کیا گیا تھا۔[۳]

گیارہ ستمبر کے واقعے کے بعد سی این این کی کوریج سے متعلق ایک جلاوطن برمی صحافی

آنگ زا (Aung Zaw) تحریر کرتا ہے کہ ''حملوں کے چند ہی گھنٹوں کے اندر اندر سی این این مسلسل یہ اعلان کرنے لگا کہ ان کا بڑا مشتبہ ملزم اسامہ بن لادن ہے''۔ ۴۔ آنگ زا کے مطابق واقعے کے بعد اس حوالے سے کوئی تجزیہ پیش کرنے یا پاکستان اور افغانستان کے حلقوں سے کوئی رائے یا پس منظر طلب کرنے کے بجائے سی این این پر ''ہم نے بہت سے امریکی جھنڈے دیکھے جن کے پس منظر میں حُبّ الوطنی پر مبنی گیت گائے جا رہے تھے''۔ ۵۔ آنگ زا نے عراق، سوڈان اور دیگر کئی ملکوں پر امریکی بم باری کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ سی این این نے ان کی رپورٹنگ کے دوران وہاں بڑے پیمانے پر انسانی ہلاکتوں کا حوالہ دینے میں ہچکچاہٹ سے کام لیا۔ آنگ زا کا تجزیہ یہ ہے کہ ''ہم لوگ جو امریکا سے باہر رہ رہے ہیں یہ دیکھ سکتے ہیں کہ امریکا میں میڈیا کس طرح نہ صرف اپنی قوم بلکہ پوری دنیا میں موجود ناظرین کو قابو کرتا ہے''۔ ۶۔

سی این این کی جانب داری کا ایک اور نمونہ اس وقت سامنے آیا جب امریکا نے افغانستان پر حملہ کیا۔ امریکی صدر بش کی تقریر کی کوریج کے دوران جو سلائیڈز سی این این نے چلائی وہ یہ تھی: "War on Terorrism" اور "America Retaliates" حالاں کہ یہ ابھی طے نہیں ہوا تھا کہ امریکا جن لوگوں سے جنگ لڑ رہا ہے وہی دہشت گرد ہیں کہ نہیں۔ جبکہ "Retaliate" کا مطلب ہے، جس نے کوئی عمل کیا ہو اس کے خلاف کوئی ردِعمل ظاہر کرنا۔ طالبان، جن کے خلاف امریکا نے "Retaliate" کیا، ان پر تو امریکا نے ان حملوں میں ملوث ہونے کا الزام بھی نہیں لگایا تھا۔ پھر امریکا پر حملوں سے متعلق جب بش نے یہ کہا کہ ''یہ دہشت گردی کا فعل نہیں، جنگ کا فعل ہے'' ("This is not an act of Terrorism, this is an act of war") تو سی این این نے اسے بھی مصرعِ طرح کی مانند قبول کرلیا۔ نیز امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ اور پینٹا گون کی متعارف کردہ کم و بیش تمام اصطلاحات استعمال کرنے لگا۔

اگست کے مہینے میں بی بی سی نے اپنے نامہ نگاران کو متنبہ کر دیا کہ اسرائیلی سرکار جن فلسطینیوں کو قتل کر دے انہیں "Assassinated" نہ کہا جائے۔ اس انگریزی لفظ سے مراد ایسا سیاسی قتل ہے جو گھات لگا کر کیا گیا ہو۔ بی بی سی نے ہدایت کی کہ ایسے قتل کو ''ٹارگٹ کلنگ'' کہا جائے جیسا کہ خود اسرائیل کہتا ہے۔ دوسری جانب فلسطینی کسی اسرائیلی کو ہلاک کر دیں تو اسے قتل یا Assassination ہی کہا جاتا ہے۔ ۷۔

رابرٹ فسک نے سی این این، بی بی سی اور خبر ایجنسی رائٹرز کی جانب سے ایسے الفاظ کے

استعمال کا حوالہ بھی دیا ہے جو یا تو جانب دارانہ ہیں یا اس انداز سے استعمال کیے جاتے ہیں جیسے ''کوئی اسپورٹس رپورٹر فریقین میں سے کسی کو بھی فاؤل کا ذمے دار نہ ٹھہرانا چاہ رہا ہو'' ۔[8] فسک بتاتا ہے کہ اگر اسرائیلی کسی شہر کا محاصرہ کرلیں تو اسے بندش (closure) کہا جاتا ہے؛ اسرائیل اور مقبوضہ فلسطینی علاقوں کی سرحد، جسے اقوام متحدہ کی منظوری بھی حاصل ہے، اسے "Seamline" یعنی ''سیون دھاگے کی لکیر'' بنا دیا گیا ہے؛ اسرائیل سے ساز باز کرنے والوں کو 'تعاون کرنے والے' (Collaborators) (جو ایک مثبت لفظ ہے) کہا جانے لگا ہے۔ اسرائیل نے جن علاقوں پر زبردستی قبضہ جما رکھا ہے انہیں مقبوضہ (Occupied) کے بجائے متنازعہ (Disputed) کا نام دیا گیا ہے اور عرب سرزمین پر یہودیوں نے غیر قانونی طور پر جو نوآبادیاں بنائی ہیں انہیں برادریاں (Neighbourhoods) کہا جاتا ہے۔[9]

مغربی میڈیا کی جانب دارانہ کوریج کے حوالے سے نارمن سولومن نے بھی کافی کام کیا ہے اور اس سلسلے میں اُس کی ایک کتاب ''پُرفریب میڈیا کی عادات'' (The Habits of Highly Deceptive Media) شائع ہوچکی ہے۔ اپنے ایک مضمون میں اس نے ذکر کیا ہے کہ جب ۲۰۰۰ء میں اسرائیلی وزیراعظم ایہود بارک نے جنوبی لبنان کے علاقے سے اسرائیلی فوجیں واپس بلائیں تو امریکی میڈیا نے جنوبی لبنان کے اس علاقے کا تذکرہ ''اسرائیلی سیکورٹی زون'' کہہ کر کیا۔ ''اسرائیلی سیکورٹی زون'' وہ اصطلاح تھی جو اس علاقے پر قبضے کے بعد اسرائیل نے اس علاقے کے لیے استعمال کرنا شروع کی تھی۔ یہ اصطلاح استعمال کرتے ہوئے امریکی میڈیا کو ذرا بھی خیال نہ آیا کہ وہ ایک آزاد و خودمختار ملک کے ایک ایسے علاقے کا تذکرہ کررہے ہیں جس پر اسرائیل نے غاصبانہ اور حد درجہ غیر منصفانہ طریقے سے قبضہ کررکھا تھا اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی اس قبضے کو کئی مرتبہ ناجائز قرار دے کر اس کے خاتمے کی قراردادیں منظور کرچکی تھی (یہ اور بات ہے کہ ان قراردادوں کے نفاذ میں اُس جوش و خوش کا مظاہرہ نہیں کیا گیا جیسا کویت پر عراقی قبضے کے سلسلے میں کیا گیا)۔

ایڈورڈ ہرمن نے اپنے ایک مضمون ''اسرائیل کی منظور شدہ نسلی تطہیر'' میں اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ امریکی میڈیا کیسے اسرائیل کی اصل پالیسیوں پر پردہ ڈالے رکھتا ہے۔ سربوں کی بوسنیا اور پھر کوسووو کے مسلمانوں سے جنگ کے دوران امریکا کی سرکاری پالیسی یہ تھی کہ وہ سربوں کے خلاف اور مسلمانوں کے ساتھ تھا۔ کوسووو کے بحران کے دوران ۱۹۹۸ء سے ۲۰۰۰ء کے اختتام

تک تین برسوں کے اندر نیویارک ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ، لاس اینجلس ٹائمز، ٹائم اور نیوز ویک میں کوسوو کا ذکر کرتے ہوئے تقریباً ۱۲ سو مرتبہ ''نسلی تطہیر'' کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ اس تعداد میں سے ۸۰ فیصد مرتبہ یہ اصطلاح سربوں کی پالیسی کا تذکرہ کرتے ہوئے استعمال ہوئی جب کہ دوسری جانب ۱۹۹۰ء کی پوری دہائی کے دوران اسرائیل کا تذکرہ کرتے ہوئے امریکی میڈیا نے صرف ۱۴ مرتبہ یہ اصطلاح استعمال کی اور اس میں سے بھی صرف ۵ مرتبہ اس کا تذکرہ اسرائیلی پالیسی کے حوالے سے کیا گیا۔ ۱۱ہرمن کے مطابق ''سرب اسرائیلیوں کی طرح اپنا موعودہ علاقہ واپس لینے'' کی طویل مدت پالیسی کے تحت کوسوو کے البانویوں کو علاقے سے باہر نہیں نکال رہے تھے، بلکہ ان کی یہ حکمت عملی جنگ کا ایک حصہ تھی۔ نہ کوسوو کے البانویوں کا جائیداد حاصل کرنے کا حق اسرائیل میں موجود عربوں کی طرح محدود کیا گیا۔ نہ ان کے گھر مسمار کیے گئے جیسا کہ اسرائیل نے عربوں کے ساتھ کیا۔ ۱۲

امریکی میڈیا کے امریکی حکومت کے تابع فرمان ہونے کی بات اُس وقت کھل کر سامنے آ گئی جب افغانستان پر امریکی حملے کے بعد اسامہ بن لادن کے ترجمان کا ایک بیان قطر کے نجی نیوز چینل ''الجزیرہ'' پر جاری ہوا اور امریکا نے اپنے میڈیا کو ہدایت کی کہ اسامہ بن لادن اور اس کے اہم ساتھیوں کے بیانات تمام و کمال شائع نہ کیے جائیں۔ ۱۳امریکی حکومت نے خدشہ ظاہر کیا کہ ان بیانات میں اسامہ کے خفیہ اور کوڈڈ پیغامات شامل ہو سکتے ہیں۔ امریکی میڈیا کے اہم ٹی وی نیٹ ورکس کو یہ بیانات پورے شائع نہ کرنے کی ہدایت امریکا کی قومی سلامتی کی مشیر کونڈولیزا رائس نے کی۔ اس ہدایت پر واشنگٹن پوسٹ کے ایگزیکٹو ایڈیٹر لیونارڈ ڈاؤنی جونیئر نے اپنے ردِعمل کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا کہ'' ہمارا معیاری (Standard) طریقۂ کار تو یہی ہے کہ ہم (حکومت کی) بات سن لیں''۔ ۱۴نیویارک ٹائمز کے ایگزیکٹو ایڈیٹر ہوول رینز نے کہا کہ'' ہمارا طویل عرصے سے معمول یہی رہا ہے کہ اگر حکومت سلامتی کے امور سے متعلق ہم سے بات کرنا چاہے تو ہم اس کے لیے تیار ہوتے ہیں اور اگر ہمارے خیال میں کوئی اطلاع حساس ہو تو ہم اس کے سلسلے میں رہنمائی حاصل کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے''۔ ۱۵''سلامتی کے امور'' اور ''حساس اطلاعات'' جیسی اصطلاحات بھی اُن آمرانہ اور غیر منصفانہ اصطلاحات میں شامل ہیں جنہیں ہر امریکی حکومت اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتی ہے اور جن کے خوش صوت آہنگ کے سامنے ہر دلیل بے کار ہو جاتی ہے۔ ایڈورڈ ہرمن نے زبان کے اس ''تخلیقی'' استعمال کا پردہ اپنے دو مضامین '' نئے عالمی

نظام کے اہم ترین الفاظ'' (Key words of the New world order) اور ''لفظوں کی چالیں اور پروپیگنڈہ'' (Word tricks and propaganda) میں چاک کیا ہے۔[16]

ان دنوں جب کہ ''مسلم انتہا پسندوں'' کے خلاف اہلِ مغرب کا جوش و خروش مزید بڑھ رہا ہے، اس بات کا امکان اور بھی زیادہ ہے کہ مغربی میڈیا میں کچھ مخصوص لفظوں کو اب مخصوص لوگوں کے خلاف استعمال کیا جائے گا۔ فرانس کی خبر ایجنسی ''ایجنسی فرانس پریس'' مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج سے لڑنے والوں کے لیے عموماً Militant کا لفظ استعمال کرتی رہی ہے۔ جس کے معنی فیلن کی انگریزی اُردو ڈکشنری کے مطابق ''محارب'' کے ہیں۔ ۱۹ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو اے ایف پی نے ایک تصویر جاری کی جس میں ایک مسلمان بیوہ کو بھارتی صدر سے اپنے مرحوم شوہر کا بعد از مرگ ایوارڈ وصول کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ تصویر کے کیپشن کے یہ جملے قابل غور ہیں کہ مرحوم ''گرینیڈیر محمد اکرام کشمیر میں ''دہشت گردوں'' کے خلاف آپریشن میں سرچ پارٹی کے ایک رکن کی حیثیت سے شریک رہا۔ آپریشن کے دوران محمد اکرام کو ''دہشت گردوں'' نے ہلاک کر دیا''۔[17]

۲۱ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو برطانوی خبر رساں ایجنسی رائٹر نے فیصلہ دیا کہ ''افغانستان کے حکمراں طالبان نے پیر کو اپنے پروپیگنڈے میں اضافہ کرتے ہوئے ریاست ہائے متحدہ پر الزام لگایا کہ اُس نے ایک اسپتال پر بم باری کی ہے اور (ان کے خلاف) کیمیائی ہتھیار استعمال کیے ہیں''۔[18] یہ جملہ خبر کا آغاز ہے۔ خبر کی ڈیٹ لائن ''کابل/واشنگٹن'' ہے جبکہ بائی لائن ''سیّد صلاح الدین اور جل سارجنٹ'' ہے۔ افغانستان پر امریکی حملوں سے متعلق خبر میں ''واشنگٹن'' کی ڈیٹ لائن؟ بظاہر یہی لگتا ہے کہ سیّد صلاح الدین (جو دراصل اسلام آباد سے خبریں بھیجتے ہیں) کی اسٹوری میں جل سارجنٹ یا رائٹر کی نیوز ڈیسک نے درستگی کے نام پر مداخلت بے جا فرمائی ہے۔ اسپتال پر بم باری اور اس کے نتیجے میں عام شہریوں کی ہلاکت کی اگلے روز تمام آزاد ذرائع سے تصدیق بھی ہوگئی۔

رہا پروپیگنڈے کا سوال، تو طالبان بیچارے تو اس کی اہمیت سے آگاہ ہی نہیں ورنہ وہ انسانی سانحے کی، جو جنگ میں لابدی ہوتے ہیں، رپورٹنگ کے لیے صحافیوں کو اپنے ملک میں داخلے کی اجازت ضرور دیتے۔ اس ملک میں اتحادیوں کے مقابلے کے لیے کوئی ''گوئبلز'' موجود نہیں۔

مسلمان دنیا ''مسلم بنیاد پرستی'' کے پروپیگنڈے کا مقابلہ نہیں کر پا رہی تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسے ابھی پروپیگنڈے کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں۔ عرب ملکوں کی تو بات ہی رہنے دیں کہ کسی ایک عرب ملک میں بھی جمہوری حکومت قائم نہیں۔ پاکستان، بنگلہ دیش اور انڈونیشیا

جمہوریت کا پھل چکھ چکے ہیں لیکن یہاں کی جمہوری حکومتوں نے بھی نجی شعبے میں میڈیا کی زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کی۔ قطر کا الجزیرہ چینل حالیہ بحران میں ایک اچھے نیوز چینل کی صورت میں سامنے آیا ہے لیکن قطر کی بادشاہت اسے کتنے روز پھلنے پھولنے کا موقع دیتی ہے — اس سلسلے میں ابھی کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ پھر اس چینل کے ہاتھ کاٹنے کے لیے ایک طرف تو طالبان کی حمایت کا الزام لگا کر اس کے خلاف مہم چلائی جارہی ہے اور دوسری طرف بڑی کارپوریشنیں اور نیوز چینل اس پر وقت خریدنے کی کوشش کررہے ہیں۔

فلم بھی ذرائع ابلاغ کا ایک مؤثر میڈیم ہے اور مغرب کی ٹیکنالوجیکل ترقی نے اس کو اور بھی مؤثر بنا دیا ہے۔ ہالی وڈ کی فلموں کے ذریعے بھی امریکا کی سرکاری پالیسی کو عوام کے ذہنوں کے ساتھ ساتھ دلوں میں بھی جگہ دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سرد جنگ کے زمانے میں ہالی وڈ کی فلموں میں سوویت یونین (جسے صدر ریگن نے ''ایول ایمپائر'' کا لقب دیا تھا) کو امریکا کا دشمن دکھایا جاتا تھا۔ اس موضوع پر اتنی فلمیں بنیں کہ لوگ غلط اور صحیح (Right and Wrong) میں انتخاب کے بجائے ہم اور تم (Us and They) میں سے ایک کا انتخاب کرنے لگے اور امریکا میں موجود بائیں بازو کے لوگوں کو غدار سمجھا جانے لگا۔ دوسری جانب نازی جرمنوں کے خلاف فلموں سے عوام میں یہ تاثر پختہ کیا گیا کہ امریکا اور اس کے اتحادی (جو بعد میں نیٹو کے رکن بن گئے) انسانی حقوق، انسانی آزادیوں اور انسانی تہذیب کے ارتقاء کے سب سے بڑے علم بردار ہیں۔

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکا اور اس کے اتحادیوں کو ایک نئے دشمن کی ضرورت پڑی تو 'اسلامی بنیاد پرستی' کا ہوّا کھڑا کر دیا گیا۔ حالاں کہ مذہبی کٹر پنتھ سرد جنگ کے زمانے میں بھی موجود تھا۔ ضرورتوں کے حساب سے پروپیگنڈے کا رُخ کیسے تبدیل ہوجاتا ہے اس کی ایک دلچسپ مثال ہالی وڈ کی فلموں ہی سے پیش کی جاسکتی ہے۔

افغانستان پر روسی جارحیت کے بعد امریکا اور اس کے دیگر اتحادیوں نے سوویت یونین کے ایک ایسے دشمن کا ساتھ دینے کی ٹھانی جو نظریاتی اعتبار سے کمیونزم اور سوشلزم کا کٹر مخالف تھا اور جسے روسی نظریات اور روسی جارحیت کے خاتمے کے کاز سے دلی لگاؤ تھا۔ اتحادیوں نے اس دور میں ان ہی ''مسلم بنیاد پرستوں'' کو ہر طرح کی امداد فراہم کی۔ اس دور میں ہالی وڈ میں ایک فلم ''ریمبو تھری'' بنائی گئی جس میں سلویسٹر اسٹالون کو افغان ''مجاہدین'' کے شانہ بشانہ روسیوں کے خلاف لڑتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد ''مسلم بنیاد پرستی'' کے بارے میں امریکی

سرکاری پالیسی تبدیل ہوگئی تو انڈر سیج (Under Siege) اور ٹرولائز (True Lies) جیسی فلمیں بنیں جن میں ''مسلم بنیاد پرستوں'' کو دشمن کی حیثیت سے دکھایا گیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغربی اور خصوصاً امریکی میڈیا اپنی حکومتوں کی پالیسی کی لکیر کی فقیری کیوں کرتا ہے۔ ان اصطلاحوں کو استعمال کیوں کرتا ہے جو امریکی و مغربی حکومتوں کی سرکاری پالیسی سے مطابقت رکھتی ہیں اور یوں وہ ان مظالم میں براہ راست شریک کیوں ہوتا ہے جو امریکا اور مغربی حکومتیں تیسری دنیا پر روا رکھے ہوئے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مغربی اور امریکی میڈیا دراصل 'کارپوریٹ میڈیا' ہے۔ اسے انصاف اور غیر جانب داری کی ان اقدار سے کوئی غرض نہیں جن کا ڈھنڈورا مغرب کے جمہوری ذہن رکھنے والے دانش ور پیٹتے رہتے ہیں۔ امریکی دانش ور نوم چومسکی کا تو خیال ہے کہ مغربی میڈیا کی روایات ماضی میں بھی کوئی زیادہ شان دار نہیں رہیں۔

ایک اور وجہ یہ ہے کہ امریکی میڈیا اور امریکی سرکاری پالیسیوں میں یہ توافق ان کے مشترکہ مفادات کا نتیجہ ہے۔ امریکا دنیا بھر میں استحکام (ایک اور خوش معنی لیکن ظالمانہ لفظ جسے استعماری طاقتیں اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے استعمال کرتی ہیں) کے لیے جو کوششیں کر رہا ہے ان کے پیچھے اصل مقصد کیا کارفرما ہے؟ مختلف ملکوں پر اپنی منڈیاں کھولنے کے لیے استعماری طاقتوں اور ان کے پروردہ بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے دباؤ کے کیا معنی ہیں؟ بات دراصل یہ ہے کہ امریکا اور دیگر استعماری طاقتیں دنیا بھر میں بڑی بڑی (کثیر قومی) کارپوریشنوں کے مفادات کی نگرانی کر رہی ہیں۔ ان میں سے بعض کارپوریشنوں کا سرمایہ دنیا کے بعض ترقی یافتہ ملکوں کے مجموعی سرمائے سے بھی زائد ہے۔ ان کارپوریشنوں کو دنیا بھر میں پھیلنے کی آزادی دینے کا ایک خوب صورت سا نام ''عالمگیریت'' ہے۔ ان کارپوریشنوں نے خود امریکی حکومت کو بھی یرغمال بنا رکھا ہے۔ امریکی انتخابات سے قبل ہر امیدوار فنڈ جمع کرنا شروع کر دیتا ہے۔ کامیابی کے لیے زیادہ سے زیادہ فنڈ جمع کرنا شرطِ اولین ہے۔ اس کے بغیر امیدوار کامیابی سے انتخاب لڑ بھی نہیں سکتا۔ کامیابی کے بعد امیدوار خود کو فنڈ کرنے والی کارپوریشنوں کے مفادات کی نگرانی مقتدر اداروں میں جا کر کرتے ہیں۔ یہ کارپوریشنیں ٹیکسوں اور قرضوں میں چھوٹ، نیز اعانتوں (Subsidies) اور ری بیٹ کی مد میں حکومتوں سے کھربوں ڈالر کے مفادات حاصل کرتی ہیں اور منافع میں ذرا سی کمی پر ہزاروں ملازمین کو بہ یک جنبشِ قلم نکال باہر کرتی ہیں (۱۱ ستمبر سے ۲۱ اکتوبر تک صرف ایوی ایشن سے وابستہ کارپوریشنیں دنیا بھر میں ۸۵ ہزار ملازمین کو فارغ کر چکی

ہیں ۱۹۔ استعماری طاقتیں ان کارپوریشنوں کی مدد سے تیسری دنیا کے وسائل خصوصاً خام مال پر قابو پانا چاہتی ہیں۔ دوسری جانب وہ ان ممالک کی منڈیوں پر قبضہ کر کے وہاں اسی خام مال پر مبنی مصنوعات مہنگے داموں فروخت کرنا چاہتی ہیں۔ یہ ایک نئی استعماریت ہے اور امریکا کا کارپوریٹ میڈیا نہ صرف اس نئی استعماریت کے فروغ میں مغربی طاقتوں کا سب سے بڑا معاون ہے۔ بلکہ اس سے بہرہ مند بھی ہو رہا ہے۔

۱۹۸۳ء میں ایک امریکی مصنف بین بیگڈ یکیان (Ben Bagdikian) نے 'ذرائع ابلاغ میں اجارہ داری' (The Media Monopoly) نامی کتاب لکھی جس میں بتایا گیا کہ "ذرائع ابلاغ کے زیادہ تر اداروں پر تقریباً ۵۰ کارپوریشنیں قابض ہیں۔" اس کتاب کے ہر نئے ایڈیشن کے ساتھ کارپوریشنوں کی یہ تعداد کم پڑتی گئی۔ ۱۹۸۷ء کے ایڈیشن میں یہ تعداد ۲۹ بتائی گئی، ۱۹۹۰ء کے ایڈیشن میں ۲۳، ۱۹۹۲ء کے ایڈیشن میں ۱۴ اور ۱۹۹۷ء کے ایڈیشن میں دس۔ اس سال (۲۰۰۱ء) اس کا جو ایڈیشن شائع ہوا ہے اس میں یہ تعداد چھ بتائی گئی ہے۔ امریکا کے بڑے ٹی وی چینلوں سی بی سی، این بی سی، اے بی سی، فاکس، سی این این، سی این بی سی، ایم ایس این بی سی اور فاکس نیوز چینل پر ان ہی چھ بڑوں کا قبضہ ہے۔ ۲۰ یہ کارپوریشنیں جو منافع خوری کے حوالے سے بدنام ہیں۔ ان کارپوریشنوں میں وایاکام، جنرل الیکٹرک، ڈزنی کارپوریشن، ریوپرٹ مرڈوک کی نیوز کارپوریشن اور ٹائم وارنر شامل ہیں۔ ان تمام کارپوریشنوں نے ایک دوسرے کے حصص بھی خرید رکھے ہیں اور بیگڈ یکیان کے مطابق یہ کارپوریشنیں مشترکہ منصوبوں میں بھی ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں۔ ۲۱

یہ بڑی کارپوریشنیں چھوٹی کارپوریشنوں کو انضمام (Merger) کے نام پر ہڑپ کر لیتی ہیں۔ یوں نہ صرف میڈیا پر ان کی اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے بلکہ مقابلے کا رجحان بھی ختم ہو جاتا ہے اور ناظرین، سامعین اور قارئین کے پاس بہت کم متبادل ذرائع رہ جاتے ہیں جن پر وہ اطلاعات کی وصولیابی کے سلسلے میں بھروسہ کر سکیں۔

صرف ایک میڈیا ٹائیکون روپرٹ مرڈوک کا تذکرہ کرتے ہوئے ایڈورڈ ہرمن نے لکھا ہے کہ وہ ایک ٹی وی نیٹ ورک، ایک مووی اسٹوڈیو، ۱۳۲ اخبارات اور کتابوں کے اشاعت گھروں (بشمول ہارپر کولنز) اور ۲۵ رسائل و جرائد کا مالک ہے۔ اس کے دیگر اثاثے اس کے علاوہ ہیں۔ یہ بڑے بڑے "میڈیا مغل" دائیں بازو کے نظریات کے حامی ہیں جو استعماری حکومتوں کی ہمیشہ سے

پیٹھ تھپتھپاتا رہا ہے۔ ایڈوڈ ہرمن کے مطابق یہ ٹائیکون اپنے اداروں کی اہم پوزیشنوں پر کسی بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے کو جگہ نہیں دیتے بلکہ الٹا ''بائیں بازو والوں کے تعصب'' کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں۔ ریوپرٹ مرڈوک اور جان میلون نے چند برس پیش تر عہد کیا تھا کہ وہ مشترکہ طور پر ایک ایسا نیوز چینل شروع کریں گے جو ''بائیں بازو کے تعصبات'' کا مقابلہ کر سکے۔[۲۲] یہ لوگ بائیں بازو کے کسی شخص کو ملازمت دیتے بھی ہیں تو اسے بہت جلد بکری (بلکہ پنجابی کا لفظ ''بھیڈو''، بمعنی بھیڑ کا مذکر، زیادہ مناسب رہے گا) بنا دیتے ہیں۔

'ٹائمز' کا ذکر کرتے ہوئے ایڈورڈ ہرمن اس کے ایک رپورٹر اینتھونی لیوس کا حوالہ دیتا ہے۔ جب اسرائیلی عدالت نے کئی دہائیوں سے ملازمت کرنے والے فلسطینیوں کے خلاف تشدد کے استعمال کی حد طے کر دی (خاتمہ تب بھی نہیں کیا) تو لیوس نے لکھا کہ یہ اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ اسرائیل ''قوموں کے لیے روشنی'' ہے (۱۴ ستمبر ۱۹۹۹ء)۔ ۱۹۸۲ء میں اسرائیل نے لبنان پر جارحیت کی تو اسے اُس نے ''ایک بڑا جوا'' کہنے پر اکتفا کیا (۱۱ جولائی ۱۹۸۲ء)۔ ۱۹۹۳ء کی جارحیت پر کہا کہ اس سے ''ڈپلومیسی کے مواقع بہتر بنائے جا سکتے ہیں (۵ اگست ۱۹۹۳ء)۔ ہرمن کے مطابق ٹائمز میں فواد عجمی، برنارڈ لیوس اور اسٹیون ایمرسن جیسے عرب مخالف دانش وروں کی کتابوں پر ڈھیروں مثبت تبصرے شائع ہوئے جبکہ اسٹیفن گرین اور رابرٹ فریڈمین کی کتابوں پر منفی تبصرے کیے گئے جو امریکی اور اسرائیلی پالیسی کے خلاف جاتی تھیں۔ اسی موضوع پر نوم چومسکی کی کتاب 'تقدیر گرفتہ مثلث' (Fateful Triangle) اور ایڈورڈ سعید اور ہچنز کی ''شکاروں پر الزام'' (Blaming the Victims) نہایت اہم ہونے کے باوجود تبصرے کی مستحق ہی قرار نہ پا سکیں۔[۲۳]

جارج آرویل نے اپنے مشہور ناول ''انیس سو چوراسی'' (1984) میں ایک ایسی زبان کا تذکرہ کیا ہے جو سرکار کی ٹکسالوں میں ڈھالی جاتی ہے اور جس کے لفظ سرکاری پالیسیوں کے قاصد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آرویل نے اس زبان کو ''نیو اسپیک'' (Newspeak) کا نام دیا۔ آرویل کے مطابق اس سرکاری زبان کا سرکاری میڈیا کے ذریعے اتنا چرچا کیا جاتا ہے کہ اُس کے الفاظ و اصطلاحات اور ان میں پوشیدہ مفاہیم عوام کے ذہنوں اور دلوں کو فتح کر لیتے ہیں اور پھر عوام ان الفاظ سے مبدا و مقاصد پر غور و خوض کیے بغیر بس ان کے کان میں پڑتے ہی ان کی محبت میں جوش و خروش سے مغلوب ہو جاتے ہیں اور ان الفاظ و اصطلاحات کے مخالف تصورات ان کے لیے

ناقابل برداشت ہوجاتے ہیں۔ آج اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ ایک ایسی ہی نیو اسپیک کی ٹکسال بن چکا ہے جس کے ڈھالے ہوئے الفاظ مغرب کا کارپوریٹ میڈیا بڑے زور و شور سے چار دانگِ عالم میں رائج کر رہا ہے۔ ان کے پروپیگنڈے کے باعث تیسری دنیا کے عوام ان لفظوں کی کرنسی ویلیو سے مرعوب ہیں۔ امریکا میں مقیم کالج یا یونی ورسٹی میں پڑھنے والا کوئی عام مسلمان خود کو 'فنڈامنٹلسٹ' کہلوانا گوارا نہیں کرے گا حالاں کہ اگر اس سے یہ پوچھا جائے کہ کیا وہ دین اسلام کے بنیادی ارکان پر ایمان رکھتا ہے تو اس کا جواب اثبات میں ہوگا۔ آرویل کی نیو اسپیک لفظی تھی۔ نئی نیو اسپیک لفظی بھی ہے اور تصویری بھی۔ بلکہ یہ تو اپنی آمریت کے نفاذ کے لیے اظہار کے دوسرے تمام وسیلوں کا سہارا بھی لیتی ہے۔ تصویری نیو اسپیک یہ کہتی ہے کہ ہر داڑھی والا فنڈامنٹلسٹ ہے۔ داڑھی والا کوئی بھی شخص دہشت گردی کی علامت (icon) بن چکا ہے اور ۱۱ ستمبر کے واقعات کے بعد امریکا میں سکھوں پر حملے اس کے گواہ ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ آرویل اپنے ناول کے ضمیمے میں نیو اسپیک کے اصولوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''نیو اسپیک کا مقصد نہ صرف (Ingsoc) ۲۴ کے چاہنے والوں کے لیے موافق دماغی عادات اور دنیا سے متعلق بصیرت کے لیے ذریعۂ اظہار فراہم کرنا بلکہ سوچ کے دیگر تمام طور طریقوں کو ناممکن بنانا بھی تھا''۔ ۲۵

آرویل نے یہ ناول ایک خیالی اور مطلق العنان (totalitarian) آمریت سے متعلق لکھا تھا۔ جانے اسے معلوم تھا یا نہیں کہ سرمایہ دار ملکوں کے ''آزاد'' میڈیا کے طفیل جبر کو فرد کے خارج کے علاوہ اس کے داخل کی عمیق ترین سطحوں تک نافذ کرنا ممکن بنایا جا سکے گا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ آرویل کا یہ لفظ ''نیو اسپیک'' بھی اپنے معنی سمیت اغوا کیا جا چکا ہے۔ ابھی چند روز قبل میں نے اس لفظ کو ''یہودیوں کے مخالف'' میڈیا پر نظر رکھنے والی ویب سائٹ honestreporting.com میں ''اسرائیل مخالف'' رپورٹروں کے خلاف استعمال کیے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

نوم چومسکی اور ایڈورڈ ہرمن نے مشترکہ طور پر ایک کتاب ''رضامندی کی تشکیل'' (Manufacturing Consent) لکھی ہے۔ ان کے مطابق میڈیا کسی مخصوص مقصد کے لیے عوام کی رضامندی کو اس طرح ڈھالتا یا مینوفیکچر کرتا ہے جیسے فیکٹری میں مصنوعات تیار کی جاتی ہے۔

اس کتاب میں فاضل مصنفین نے اُن ''زیرِ سطح ساختیاتی عوامل'' اور ''فلٹرز'' کا ذکر کیا ہے جن کے فراہم کردہ پیرامیٹرز کے اندر رہ کر میڈیا کام کرتا ہے۔ ان مجبوریوں اور فلٹرز میں معمول کی کارکردگی دکھانے کے لیے مالکان کا پریشر اور مالی دباؤ، اشتہارات دینے والوں کے مفادات سے ہم آہنگی کی خواہش، ''ذرائع'' تک پہنچنے کا طریقہ کار جو صحافیوں کو سرکاری اور تاجر خبر ساختگان پر انحصار کرنے پر مجبور کر دیتا ہے، تنقید کا خوف جو صحافیوں کو مسلسل دباؤ میں رکھتا ہے اور منڈی کے فروغ کا ماحول شامل ہیں۔ ۲۶

مشہور آسٹریلوی صحافی اور فلم میکر جان پلگر نے کیکو اداتا (Kiko Adatta) کی ایک تحقیق نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میڈیا مالکان کو منافع اور اشتہارات کا کتنا چاؤ ہے اور خبر کی حرمت کی کتنی کم پرواہ ہے۔ اداتا کے مطابق نیوز چینلز پر خبروں کو کوکا کولا کے اشتہارات کے آہنگ سے مطابقت رکھنے والی طوالت تک محدود کر دیا گیا ہے اور ''امریکا میں ٹی وی پر خبروں پر مشتمل ''ساؤنڈ بائٹ'' کی اوسط طوالت جو ۱۹۶۸ء میں ۴۲٫۳ سیکنڈ تھی اب کم ہو کر ۹٫۹ سیکنڈ رہ گئی ہے۔ ۲۷

امریکا کے معروف منحرف دانش ور رابرٹ میک چیزنی نے ڈیوڈ برسامیان کو ایک انٹرویو کے دوران بتایا کہ میڈیا کے اصل ریگولیٹر تو وال اسٹریٹ اور میڈیسن ایونیو ہیں، جو امریکا کے بزنس ہیڈ کوارٹر ہیں۔ ۲۸ اس کے مطابق اتحادیوں نے جب جاپان اور جرمنی پر قبضہ کیا تو وہاں میڈیا کی اجارہ داریاں توڑ دیں اور امریکا میں بھی میڈیا کو آزاد کرنے کے لیے سب سے پہلے اجارہ داریاں ختم کرنی ضروری ہیں۔

میڈیا مالکان کو منافع کا کتنا چاؤ ہے اس کی کچھ وضاحت تو ہو گئی۔ انہیں عام آدمی کی کتنی کم پرواہ ہے اس کی مثال دیتے ہوئے میک چیزنی اپنے اسی انٹرویو میں کہتا ہے کہ ''۱۹۴۰ء کے عشرے میں ہر بڑے روزنامے میں کم از کم ایک یا دو لیبر رپورٹر یا ایڈیٹر ضرور ہوتے تھے اور اس وقت ملک بھر میں تقریباً ایک ہزار لیبر رپورٹر موجود تھے۔ اب ملک بھر میں لیبر رپورٹروں کی مجموعی تعداد پانچ یا چھ رہ گئی ہے۔ ۲۹ میک چیزنی کے مطابق اخبارات زیادہ تر ''اَپر مڈل کلاس'' کی دلچسپی کی خبریں شائع کرتے ہیں اور انہوں نے آبادی کے ۳۰ سے ۴۰ فیصد حصے کو نظر انداز کر رکھا ہے اور کچھ اخبارات تو غریب علاقوں میں فروخت کے لیے پیش ہی نہیں کیے جاتے۔

آج کل یہ میڈیا مالکان چین کی سوا ارب آبادی پر مشتمل مارکیٹ پر قبضے کے خواب دیکھ

رہے ہیں اور اس کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کے لیے تیار ہیں۔ میک چیزنی کے مطابق اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں چینی ناراض نہ ہوجائیں" ریوپرٹ مرڈوک کی ایشیائی کمپنی اسٹار سیٹلائٹ نے بی بی سی کو مواصلاتی رابطے کی اپنی لائن سے ہی اُتار دیا۔ (پھر) مرڈوک کے اشاعت گھر ہارپر کولنز نے (ہانگ کانگ کے سابق برطانوی گورنر جنرل) کرس پیٹن کی یادداشتیں شائع کرنے کا پروگرام بنایا۔ پیٹن انسانی حقوق کے چینی ریکارڈ کا ناقد تھا۔ چینیوں نے اس کتاب کی اشاعت پر اعتراض کیا اور مرڈوک نے ان کی بات مان لی۔[۳۰]

اس مثال سے واضح ہوتا ہے کہ یہ میڈیا مالکان تو وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بنا سکتے ہیں، امریکا اور اس کی اتحادی استعماری ریاستیں تو پھر برسوں سے ان کی سنگی ساتھی اور ان کے مفادات کی محافظ، نگران اور نمائندہ ہیں۔

اس بات کا تذکرہ تو کافی ہوگیا کہ مغربی میڈیا اپنی حکومتوں، خصوصاً امریکا کی بات کیوں مانتا ہے۔ اب ذرا یہ تذکرہ بھی ہوجائے کہ حکومت اپنی بات منوانے میں اتنی دلچسپی کیوں رکھتی ہے۔ تیسری دنیا میں زیادہ تر حکومتیں میڈیا سے حزب اختلاف کو دبانے یا اس کی کوشش کرنے کا کام لیتی ہیں۔ مغرب میں ایسا نہیں ۔وہاں میڈیا کے پاس اتنا سرمایہ اور اخلاقی قوت موجود ہے کہ حکومت انہیں اس حد تک تابع فرمان نہیں کرسکتی۔ نہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ حزب اختلاف کی جماعتیں بھی میڈیا کے مفادات (یعنی کارپوریٹ مفادات) کی حفاظت کی حامی ہوتی ہیں اس لیے اپوزیشن کے خلاف حکومتی پارٹی کے پروپیگنڈے میں میڈیا ایک حد تک غیر جانب دار رہتا ہے۔ پھر بھی امریکی میڈیا کا جھکاؤ ڈیموکریٹک پارٹی کے بجائے ری پبلکن پارٹی کی طرف زیادہ ہے۔ اگر کوئی تیسری قوت ابھرنے کی کوشش کرے تو میڈیا اسے گھاس نہیں ڈالتا۔ امریکا کے گزشتہ صدارتی انتخابات میں گرین پارٹی کے رالف نیڈر کے ساتھ یہی ہوا۔

امریکی حکومتیں میڈیا کو اندرونِ ملک عوام مخالف پالیسیوں کی حمایت بڑھانے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ اس کے لیے وہ خوش وضع اور خوش معنی لفظیات کا سہارا لیتی ہیں۔ امریکا کی خارجہ پالیسی، خصوصاً دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اب تک، تیسری دنیا کے ملکوں کے لیے انتہائی خوفناک رہی ہے۔ یہ مغربی میڈیا ہی ہے جس کے طفیل امریکی عوام بھی اس کی استعماری پالیسیوں کی کم و بیش حمایت کرتے ہیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد امریکا میں جو "رائے عامہ کے جائزے" (Opinion polls) لیے گئے ان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ امریکی میڈیا تیسری دنیا کے ملکوں

پر امریکی مظالم کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ ایسا محسوس ہو جیسے امریکا کی قومی ٹیم کسی غیر ملکی ٹیم کے خلاف میچ کھیل رہی ہو جس میں قومی ٹیم کی حمایت سب پر فرض ہوتی ہے۔ بقول جان پلگر ''زیادہ تر خبریں بھی ہالی وڈ سے متاثر ہوتی ہیں جنہیں حیرت انگیز ٹیکنالوجی کی مدد سے ایمپلی فائی کیا جاتا ہے تاکہ مغربی دنیا کی مجرمیت (Culpability) کو کم کیا جاسکے۔ اس بات پر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ بہت سے لوگ ان خبروں میں خون کی لکیریں تلاش نہیں کر پاتے''۔ ۳۱ اس بات کا تذکرہ پہلے کیا جاچکا ہے کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد کس طرح ایک دشمن کی تلاش میں مغرب نے ''اسلامی بنیاد پرستی'' کا ہوا کھڑا کیا۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکا اور مغرب کے جنگ بازوں نے واویلا کھڑا کیا کہ ابھی امریکا کا کام (استعماریت؟) ختم نہیں ہوا۔ ۱۹۹۰ء میں امریکا نے عراق کو گھیر گھار کے اس سے کویت پر حملہ کرایا اور خلیج میں استحکام (Stability) کو لاحق خطرات کے بہانے دنیا میں تیل کے وسیع ترین ذخیرے پر قابض ہوگیا۔ انھی دنوں سابق امریکی صدر نکسن نے ''موقع کو قابو کرو'' (Seize the Moment) نامی کتاب لکھی اور صدر جارج بش نے ''نئے عالمی نظام'' کا نظریہ پیش کیا۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد سے اب تک ہم ''نئے عالمی نظام'' کے عہد میں زندہ ہیں۔

''نئے عالمی نظام'' کی اصطلاح بھی استعماریت کے ہاتھوں خوش گوار اصطلاحوں اور لفظوں کے اغوا کی ایک اور مثال ہے۔ نوم چومسکی کے مطابق نئے عالمی نظام "New World Order" کی اصطلاح سب سے پہلے نمیبیا کے صدر جولیس نائیریرے کی زیر صدارت ساؤتھ کمیشن کی ایک رپورٹ میں سامنے آئی تھی۔ اس اصطلاح کو زمین کے جنوبی حصے کی اقوام نے اس مطالبے کے ساتھ استعمال کیا تھا کہ اب انہیں بھی حقوق فراہم کیے جائیں۔ ۳۲

جارج بش نے اس اصطلاح کو اغوا کرنے کے بعد اس کا اپنے زیر اثر میڈیا پر ایسا پروپیگنڈہ کرایا کہ یہ اب ان ہی سے منسوب ہے۔ دانش ورانہ حلقوں میں ان ہی دنوں سیموئل ہنٹنگٹن نے تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ پیش کیا جس کے تحت زمین پر سرد جنگ کے خاتمے کے بعد اب اگلا تصادم تہذیبوں، خصوصاً مغربی اور اسلامی تہذیب کے مابین ہوگا۔ یوں ایک نئے عالمی تصادم اور ''نئے عالمی نظام'' کے لیے تھیوریٹیکل گنجائش بھی پیدا کر دی گئی۔ چناں چہ گزشتہ گیارہ برسوں میں دوستی اور دشمنی کی لائنیں ان ہی خیالات کے تحت کھینچی جارہی ہیں اور مسلمان دنیا کو مغرب کی وضع اور تشریح کردہ ''اسلامی بنیاد پرستی'' کی طرف دھکیلا جارہا ہے۔ کوشش یہ ہے کہ پوری

دنیا میں حاملین (Haves) اور محرومین (Have-nots) کے درمیان جنگ کو مؤخر بلکہ منسوخ کر دیا جائے اور اس کے بجائے انسانیت کو تہذیبی تصادم جیسے فضول جھگڑوں میں الجھا دیا جائے۔

مغربی میڈیا اور امریکی استعمار کے مشترکہ مظالم کا نتیجہ یہ ہے کہ روانڈا میں آٹھ لاکھ جیتے جاگتے انسانوں کو قتل کر دیا گیا اور انسانیت کے کان پر جوں تک نہ رینگی، بلکہ دنیا میڈیا کی زبان سے 'راوی چین ہی چین لکھتا ہے' سنتی رہی... لیکن گیارہ ستمبر کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پینٹا گون کے واقعات کے بعد یہ کہا جا رہا ہے کہ اب ہم ایک تبدیل شدہ دنیا میں رہ رہے ہیں۔ عراق پر اتحادیوں کی بم باری شروع ہوئی تو بغداد میں موجود سی این این کے رپورٹر پیٹر آرنیٹ نے ایک جملہ کہا جو سی این این والے کئی مہینوں تک اپنی جھلکیوں میں دہراتے رہے "بغداد کے اوپر آسمان چمک اٹھے ہیں" (The skies over Baghdad have been illuminated) جب کہ دوسری طرف نارمن سولومن کے بقول "خلیج کی جنگ میں بغلیں بجانے والے (رپورٹر) لیڈی ڈیانا کی موت پر رو رہے تھے۔ ۳۳" سولومن نے اس سلسلے میں اسٹالن کا ایک قول بھی نقل کیا ہے جو مبینہ طور پر (کیا پتہ اسے بھی نیواسپیک نے پھیلایا ہو) اس سے پوٹسڈم کانفرنس کے دوران سرزد ہوا تھا: "ایک آدمی کی موت سانحہ ہے، لاکھوں آدمیوں کی موت — محض شماریات۔" ۳۴

استعمار کے کارپوریٹ مفادات کی نظر چین اور بھارت کی وسیع منڈیوں پر ہے۔ چین نے ابھی تک اپنی منڈی کو بین الاقوامی میڈیا کے لیے نہیں کھولا۔ بھارت یہ کام کر چکا ہے اور وہاں کثیر قومی کارپوریٹ میڈیا مسلسل پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف جنگی جنون ابھار رہا ہے۔ یہ بھارتی میڈیا بھارتی حکمرانوں کے مفادات کا بھی محافظ ہے جو بھارت کو ایک نئی استعماری طاقت کی شکل دینے کے لیے کوشاں ہیں۔ اس میڈیا کی موجودگی میں پاک بھارت تعلقات میں حائل خلیج کو افہام و تفہیم اور مذاکرات کے ذریعے پاٹنا اور بھی مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن بھارت کے طفل استعمار کو اس کی پرواہ نہیں، وہ سلامتی کونسل کی مستقل نشست کے پیچھے پڑا ہے اور بھارت کے کروڑوں بھوکے زبانِ حال سے پوچھ رہے ہیں:

ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

بھارت یہ کہتا ہے کہ وہ سلامتی کونسل کا مستقل رکن بن کر تیسری دنیا کے مفادات کی رکھوالی کرے گا۔ اس کے اردگرد بھی تیسری دنیا کے چھ ممالک موجود ہیں۔ کوئی ان کے عوام میں سروے کروا کے دیکھ لے کہ وہ بھارت سے کتنے خوش ہیں۔ اہنسا کے علم بردار گاندھی جی کے بھارت کا یہ نیا

روپ ملاحظہ فرمایئے: امریکا کے جدید ترین میزائل دفاعی پروگرام کی حمایت دنیا میں صرف اور صرف دو ممالک نے کی ہے — ایک اسرائیل اور دوسرا بھارت۔

مغربی کارپوریٹ میڈیا کا تذکرہ کرتے ہوئے میں خود کو اس اعتراف پر بھی مجبور پاتا ہوں کہ ہمارا میڈیا بھی کوئی قابل فخر کردار ادا نہیں کررہا۔ ماضی میں بھی ہمارے میڈیا اور خصوصاً اردو اخبارات نے ضیاء الحق کی نیو اسپیک کو عوام میں رائج کرنے میں جو شرمناک کردار ادا کیا وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ عیسائی سازش، ہندو سازش اور قادیانی سازش جیسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے یہ بات مکمل طور پر فراموش کردی جاتی ہے کہ پاکستان میں لاکھوں عیسائی، ہندو اور قادیانی رہتے ہیں جو اپنے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کے باوجود پاکستان کی خوشیوں پر خوش ہوتے ہیں، پاکستان کے دکھوں پر دکھی ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ پاکستان ہی کے شہری ہیں۔

مغربی استعمار اور اس کا پروردہ میڈیا دنیا کو ایک ایسی جنگ (یا جنگوں اور تصادم کے سلسلے) کی طرف لے جارہا ہیں جس میں محرومین ہی جنگ کا ایندھن بنیں گے۔ یہ جنگ ان خوابوں کی بنیاد پر ہوگی جو پیٹ بھرنے کے بعد ہی دیکھے جاسکتے ہیں۔ امریکا کا خواب یہ ہے کہ جو خواب وہ بسر کررہا ہے وہ نہ ٹوٹے اور وہ آئندہ کئی برسوں تک اپنی ایندھن کی ضروریات سے بے فکر ہوجائے۔ بھارتی قوم پرستوں کو افغانستان تک پھیلی ہوئی اشوک اعظم کی سلطنت نظر آتی ہے۔ مسلمان قوم پرستوں کو فرانس کے شہر ٹورز (Tours) اور آسٹریلیا کے دارالحکومت ویانا تک فتح کے پھریرے لہراتی فوجیں نظر آتی ہیں۔ ہٹلر جرمنوں کو دنیا کی معزز ترین نسل سمجھتا تھا اور دنیا بھر کی ارذل نسلوں کو غلام بنانا جرمنوں کا حق سمجھتا تھا اور مسولینی کو سلطنت روما کی یاد آتی تھی۔ ان سب خوابوں میں دوسروں کے خوابوں کا کوئی احترام نہیں۔ یہ خواب نہیں وہ کابوس (night mares) ہیں جن سے انسانیت کو خطرہ ہے۔ انسانیت کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ ایک کثیر ثقافتی اور کثیر تہذیبی دنیا کی تشکیل کے لیے تہذیبوں کے درمیان کالمے کی ابتدا کی جائے۔ تاریخ کی دوسری عظیم تہذیبوں کی طرح اسلامی تہذیب کے باسی بھی ایک وسیع، بھرپور اور زرخیز روایت کے امین ہیں۔ اپنا شاندار ماضی وہ بھولے نہیں۔ وہ ویت نامیوں کی طرح نہیں جن کا دائرہ نگاہ صرف ان کے اپنے ملک تک محدود تھا اور جنہوں نے ویت نام سے باہر امریکا کی چڑیا بھی نہیں ماری۔ اگر مسلمانوں کو گنی پگ (guinea-pig) سمجھ کر منانے کی کوشش کی گئی تو وہ اکیلے نہیں بلکہ ساری دنیا کو لے ڈوبیں گے۔

مغربی استعمار اور اس کا پروردہ میڈیا دنیا کو ایک ایسی جنگ (یا جنگوں اور تصادم کے سلسلے)

کی طرف لے جا رہے ہیں جس میں محرومین ہی جنگ کا ایندھن بنیں گے۔ یہ جنگ ان خوابوں کی بنیاد پر ہوگی جو پیٹ بھرنے کے بعد ہی دیکھے جا سکتے ہیں۔ امریکا کا خواب یہ ہے کہ جو خواب وہ بسر کر رہا ہے وہ نہ ٹوٹے اور وہ آئندہ کئی برسوں تک اپنی ایندھن کی ضروریات سے بے فکر ہو جائے۔ بھارتی قوم پرستوں کو افغانستان تک پھیلی ہوئی اشوک اعظم کی سلطنت نظر آتی ہے۔ مسلمان قوم پرستوں کو فرانس کے شہر ٹورز (Tours) اور آسٹریا کے دارالحکومت ویانا تک فتح کے پھریرے لہراتی فوجیں نظر آتی ہیں۔ ہٹلر جرمنوں کو دنیا کی معزز ترین نسل سمجھتا تھا اور دنیا بھر کی ارذل نسلوں کو غلام بنانا جرمنوں کا حق سمجھتا تھا اور مسولینی کو سلطنت روما کی یاد آتی تھی۔ ان سب خوابوں میں دوسروں کے خوابوں کا کوئی احترام نہیں۔ یہ خواب نہیں وہ کابوس ہیں جن سے انسانیت کو خطرہ ہے۔ انسانیت کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ ایک کثیر ثقافتی اور کثیر تہذیبی دنیا کی تشکیل کے لیے تہذیبوں کے درمیان مکالمے کی ابتدا کی جائے۔ تاریخ کی دوسری عظیم تہذیبوں کی طرح اسلامی تہذیب کے باسی بھی ایک وسیع، بھرپور اور زرخیز روایت کے امین ہیں۔ اپنا شان دار ماضی وہ بھولے نہیں۔ وہ ویت نامیوں کی طرح نہیں جن کا دائرۂ نگاہ صرف ان کے اپنے ملک تک محدود تھا اور جنہوں نے ویت نام سے باہر امریکا کی چڑیا بھی نہیں ماری۔

مسلمانوں کو گنی پگ بنانے میں اہم ترین کردار مغربی میڈیا نے ادا کیا ہے۔ جارج آرویل کا کابوس ڈکشنریوں سے لفظوں کو اغوا کر کے انہیں انسانی ذہنوں کو یرغمال بنانے کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ آرویل نے کہا تھا "کھوپڑی کے اندر موجود چند مکعب سینٹی میٹر جگہ کے علاوہ کچھ بھی ہمارا نہیں رہا"۔ ۳۵ یہی 'چند مکعب سینٹی میٹر' استعمار کے آلۂ کار کارپوریٹ میڈیا کا ہدف ہیں۔ کیا ہم آرویل کے کابوس کو اس بات کی اجازت دیں گے کہ وہ پوری دنیا کی تقدیر کو اپنے شکنجوں میں جکڑ لے؟ نہیں۔ دنیا ابھی اتنی تاریک نہیں ہوئی۔ افغانستان پر امریکی حملوں کے خلاف جہاں کراچی، دہلی، جکارتا، ڈھاکہ اور کوالالمپور کے مسلمانوں نے احتجاج کیا ہے وہیں برلن، پیرس، کلکتہ اور لندن میں بھی مظاہرے ہوئے ہیں۔ یورپ اور امریکا کے عالمگیریت مخالف تیسری دنیا کے غریبوں کی جنگ مغرب میں لڑ رہے ہیں۔

دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

حواشی:

۱۔رابرٹ فسک Israel's wooden language and CNN's 'Cowering'
۳ ستمبر ۲۰۰۱ء (http://msanews.mynet.net)

۲۔ایضاً

۳۔ایضاً

۴۔آنگ زا، (Aung Zaw) For the truth, don't turn to CNN

۵۔ایضاً

۶۔ایضاً

۷۔رابرٹ فسک۔ BBC staff told not to call Israeli killings 'assassination'
دی انڈی پنڈنٹ، لندن ۴ اگست ۲۰۰۱ء۔
(assassin کا لفظ، دراصل عربی زبان کے لفظ "حشیشین" سے ماخوذ ہے۔ حشیشین قرامطی فرقے کے رہنما اور مشہور تاریخی شخصیت حسن بن صباح کے ان رضا کاروں کو کہا جاتا تھا جو جنت کے وعدے پر مختلف سیاسی و مذہبی شخصیات کو گھات لگا کر قتل کر دیتے تھے۔)

۸۔رابرٹ فسک۔ ایضاً

۹۔رابرٹ فسک When murder is not called by its real name
دی انڈی پنڈنٹ، لندن ۱۸ اگست ۲۰۰۱ء۔

۱۰۔نارمن سولومن (Normon Solomon) US Media: A Security Zone for Israel
مشمولہ زیڈ میگزین بابت جولائی / اگست ۲۰۰۰ء

۱۱۔ایڈورڈ ایس ہرمن Israel's Approved Ethnic Cleansing: Part-3
مشمولہ زیڈ میگزین بابت جون ۲۰۰۱ء

۱۲۔ایضاً

۱۳۔رائٹرز ۱۱ اکتوبر ۲۰۰۱ء، US asks media not to print full bin Laden comments

۱۴۔ایضاً

۱۵۔ایضاً

۱۶۔ایڈورڈ ایس ہرمن (i) Keywords of the New world order مشمولہ زیڈ میگزین بابت اپریل ۲۰۰۰ء، (ii) Word Tricks and Propaganda مشمولہ زیڈ میگزین بابت جون ۱۹۹۷ء

۱۷۔اے ایف پی پکچر سروس۔ ۱۹ اکتوبر ۲۰۰۱ء، India-defence-award- widow

۱۸۔رائٹرز۔ ۲۱ اکتوبر ۲۰۰۱ء، Taliban crank up propaganda war against US

۱۹۔روزنامہ جنگ۔ سنڈے میگزین۔ ۲۰ اکتوبر ۲۰۰۱ء

۲۰۔ نارمن سولومن The Media Big Six مشمولہ زیڈ میگزین بابت جون ۲۰۰۰ء

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔ ایڈورڈ ایس ہرمن: The Illiberal Media مشمولہ زیڈ میگزین۔

۲۳۔ ایڈورڈ ایس ہرمن: All the Book Reviews Fit to Print: Part II مشمولہ زیڈ میگزین بابت جولائی/اگست ۲۰۰۰ء

۲۴۔ Ingsoc کا لفظ آرویل نے اپنے ناول ۱۹۸۴ء میں 'English Socialism' کے متبادل کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد وہ آمرانہ نظریہ ہے جس کی تصویر کشی آرویل نے اس ناول میں کی ہے۔

۲۵۔ جارج آرویل "۱۹۸۴ء" صفحہ ۲۴۱ پینگوئن بکس ایڈیشن ۱۹۷۸ء

۲۶۔ ایڈورڈ ایس ہرمن۔ The Illiberal Media

۲۷۔ جان پلگر Hidden Agendas (John Pilger)، باب Introduction
(http://pilger.carlton.com)

۲۸۔ رابرٹ میک چیزنی (Robert McChesney) کا انٹرویو Monopolies, NPR&PBS انٹرویور: ڈیوڈ برسامیان (David Barsamian) مشمولہ زیڈ میگزین بابت فروری ۲۰۰۰ء

۲۹۔ ایضاً

۳۰۔ ایضاً

۳۱۔ جان پلگر The ultimate goal of the attacks on Afghanistan
۱۹ اکتوبر ۲۰۰۱ء (http://pilger.carlton.com/print)

۳۲۔ نوم چومسکی World Order, Old and New (Noam Chomsky) صفحہ ۴
مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی۔ ایڈیشن ۲۰۰۰ء

۳۳۔ نارمن سولومن Good Grief: When it Reigns, it Pours مشمولہ زیڈ میگزین بابت نومبر ۱۹۹۷ء

۳۴۔ ایضاً

۳۵۔ جارج آرویل Nineteen Eighty Four صفحہ ۲۵ پینگوئن بکس ایڈیشن ۱۹۷۸ء

پبلک اور پرائیوٹ ......ادیب اپنی دونوں حیثیتوں کو بروئے کار لاکر ایسے معاملات کے بارے میں لکھ سکتا ہے۔ اجتماعی رائے اور ذاتی تاثر ..... یہ دونوں ہی اس کے کام کا حصّہ ہوسکتے ہیں۔کشور ناہید کی تحریروں سے یہ دونوں رخ نمایاں ہیں۔ ان کی نثری تحریریں جو یہاں شامل کی گئی ہیں، اخباری کالم ہیں جو روزنامہ ''جنگ'' (راولپنڈی) میں شائع ہوئے۔ احساس کی ایک اور سطح، جو شخص وانفرادی تاثر پر مبنی ہے، ان تازہ نظموں سے ظاہر ہورہی ہے۔

کشور ناہید

ساری دعائیں اس کے لیے ہیں

اے میرے کشمیر کے بچو
تم کو امن ملے
اے میرے فردا کے خوابو
تم کو رنگ ملے
وہ مائیں جن کی آنکھوں نے خون بہت دیکھا ہے
وہ اب اُجلے کھیتوں میں
سنہری فصلیں دیکھیں
وہ راہیں کہ جن کو جنازے تکتے تکتے شام ہوئی
وہ صبحیں امن کی دیکھیں
ساری دعائیں اس کے لیے ہیں
جو کشمیر کے بچوں کے ہاتھوں میں
چیری اور گلاب کی ٹہنی دے گا
امن اور محبت سے محروم
کنجِ زعفران کو

دور تلک چہکتے پرندوں کی آوازیں دے گا
ساری دعائیں اس کے لیے ہیں۔

ہم غلاموں کی بس ایک شرط ہے

مرغیوں کے چوزے
جس طرح غلاظت کے ڈھیر پہ چونچیں مارتے ہیں
بالکل اسی طرح ہمیں، ہماری غربت کے ڈھیر پہ
لڑنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔
زمین پہ چلتے کیڑوں کی طرح
ہمیں بنا پوچھے مار دیا جاتا ہے
پکڑ لیا جاتا ہے
احتجاج کرو تو جیل خانوں میں
بند کر دیا جاتا ہے
وہ کہ جن کے اسلحہ خانے کا بارود پرانا ہو رہا ہے
اس کو استعمال کرنے کے لیے، دنیا میں نئے سے نیا
شوشہ چھوڑ دیتے ہیں۔
وہ جب چاہیں، جہاں چاہیں
کسی بھی ملک پہ بم گرا سکتے ہیں
وہ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ فسطائیت کے
کارندوں کو ہم دیکھیں اور خاموش رہیں۔
وہ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ
ان کے حکم پہ کسی کو بھی دہشت گرد کہیں۔
وہ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ان کے دیے ہوئے

لقمے کے سوا کچھ نہ کھائیں
کچھ نہ بولیں
کچھ نہ سوچیں
وہ یہ کیوں نہیں کرتے کہ
ہمیں ایک ہی دفعہ غلام بنالیں
اس کی قیمت کے عوض
ہمارے دیہاتوں سے غربت ختم کر دیں
ہمارے فٹ پاتھ پہ سونے والوں کو پناہ گاہیں دے دیں
ہمیں ذہنی غلامی سے جسمانی غلامی تک لاکر
کیسینو لے جائیں اور مائیکل جیکسن کو سنوائیں۔

سچ بتا!

کہتے ہیں مارنے والے سے بچانے والا
مضبوط ہوتا ہے،
پھر یہ جو بم چلا رہے ہیں
کابل، بیت اللحم اور کشمیر کے بچوں کو خون
میں نہلا رہے ہیں
یہ مارنے والے اس بچانے والے سے کیسے بچے ہوئے ہیں"
کیسے چھپے ہوئے ہیں
سہاگنوں کو بیوائیں بنانے والے
ماؤں کی گودوں کو اجاڑنے والے
بستے گھروں کو شمشان بنانے والے۔
اے بچانے والے

تو جن بچوں سے کھلونے چھنتے دیکھ رہا ہے
سرحدوں پہ چمگادڑوں کی طرح
بندوقوں کی گولیاں چلتے دیکھ رہا ہے
پانی کے گلاس میں تازہ لہو انڈیلتے دیکھ رہا ہے
تیرے بچانے کے گُر کس نے چھین لیے۔
میں اخباروں میں مرنے والوں کی تصویریں
کاٹ کاٹ کر اپنا کمرہ بھر چکی ہوں
زنا کے ہاتھوں لٹنے والی لڑکیوں کے
رحم میں پلتے بچوں کو دیکھ کر رو رہی ہوں
سچ بتا تو اپنے گھر بلا کر بھی کیا
تو میرے ساتھ ایسا ہی سلوک کرے گا؟
سچ بتاؤں مجھے طاقت نہیں چاہیے امن چاہیے۔

۲۰۰۱ء میں سی این این دیکھ کر

چالیس سال سے دفتر کی کرسی پر بیٹھے بیٹھے
میرے ہِپس کا سائز دوگنا ہوگیا ہے
لنچ کے ڈبے کا کھانا کھاتے کھاتے
میرے جبڑے چبڑے کے ہوگئے ہیں
گھوڑے کی طرح ایک ہی راستے پہ چلتے چلتے
میری آنکھوں پر بھی پردے لگ گئے ہیں۔
دفتروں میں سازشوں اور غلاظتوں کو
دیکھ دیکھ کر
میرے ذہن کو بھی ہر بات مشکوک لگنے لگی ہے۔
آزادی سے گھومنے پھرنے کا تصور بارودی سرنگوں نے ختم کر دیا ہے۔

ہوائی سفر کے دوران، آپ کے جسم کو اتنی مرتبہ
ٹٹولا جاتا ہے
کہ آپ خود پر بھی شک کرنے لگتے ہیں۔
آنکھیں کمپیوٹر کی نذر ہو گئیں
اور ہاتھوں کو ٹیلی فون کھا گیا ہے۔
حفاظت کی دہلیز پہ ہمیں کتنا بے امان
کر دیا گیا ہے۔
جاننا چاہتے ہو، تو آؤ میرے ساتھ بیٹھو۔
نفرتوں کے صحیفے سنو! سی این این دیکھو!

ہم کون سی جنت کی سمت رواں ہیں؟

ایک قوم جس کے پاس نہ کھانے کو گھاس ہے
اور نہ روئی
جس کے پاس چلنے کو نہ سڑک ہے
اور نہ سواری
جس کے پاس زندہ رہنے کی آزادی ہے
نہ موت سے بچنے کی پناہ گاہ
ایک قوم جہاں لوگوں کے گھر نہیں رہے
بات کرنے کو لوگ نہیں رہے
جن کے بچوں کو ناشتے میں بم
اور سوتے وقت مسلسل بم باری کی لوریاں ملتی ہیں
اس ملک کی سرحدوں کا تعین موت کرتی ہے۔
تمہیں یاد تو ہوگا
اس قوم کی وسیع تاریخ تھی

بڑے جری جوان تھے
اور گُل رخ عورتیں تھیں
وہاں کے مردوں کے سروں پہ ٹھہری
دستاروں سے ہوا بھی بچ کر چلتی تھی۔
اس قوم کے گُل رخ چہروں کو ریت سے پاٹ دیا گیا
فصلوں کو بنجر کر دیا گیا
بچیوں کو نقابوں میں قید کر دیا گیا
اور نابالغوں کے ہاتھ میں بندوقیں تھما دی گئیں
مجھے لگتا ہے
اس ساری کہانی میں سبق ہے ہمارے لیے
ہم کہ جو بم مارنے والوں کے دوست بنے
ہم کہ جو طالبان کے دشمن بنے
ہم کون سی جنت کی سمت رواں ہیں؟
کل جب کوئی ہماری اگائی ہوئی فصل نہیں خریدے گا
ہماری عورتوں کے کاتے ہوئے
سوت کی منڈیاں ختم ہو جائیں گی
جب ہمارے اپنے، اپنوں کے خون کے پیاسے ہوں گے
تب ہم کس کے دوست
اور کس کے دشمن ہوں گے؟
روٹی جو آپ کے مُنھ سے چھنتی ہے
روٹی جو کوئی دوسرا آپ کے سامنے پھینکتا ہے
کون سی روٹی کل ملے گی
کون سا شہر کل رہے گا
وہ لمحہ جب دوست اور دشمن کی تمیز نہ رہے
جب امید آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے سے گریز کرے

اس کیفیت میں ٹنگے ٹنگے
کون سا شخص کل رہے گا
کون سا شہر کل رہے گا؟

سوچ کی بیساکھیاں

سُنا ہے ہرات، غزنی اور قندھار میں
سارے پرندے مر گئے
سارے جانور بھی مر گئے
سارے درخت سوکھ گئے
انسان تو کیڑے مکوڑوں کی طرح مار دیے گئے
اب تو ڈرنے کے لیے بھی کچھ نہیں رہا
بچوں نے موت کو اتنے قریب سے دیکھا ہے
کہ اب کوئی خوف ان کے آنگن میں نہیں ٹھہرتا ہے
اب وہ جانتے ہیں خوف بھرتے ہاتھوں سے
روٹی توڑنا اور چبانا
اب یہ بڑے ہو گئے تو کیا کریں گے
ریت گھڑی کے ذریعے وقت معلوم کرنے کے دن
ان کی زندگی میں نہیں تھے
انہیں تو بمباری کی آواز سے
یہ خبر ہو جاتی تھی
کہ اس وقت دن کا کون سا پہر تھا
ماہرینِ آثارِ قدیمہ بھی آ کر
ان بچوں کی ذہنی عمر کا اندازہ نہیں لگا سکتے ہیں۔

۱۹۱۰ء میں ۲۲ سالہ محمد اکرم صدیقی کو، جو ہندوستان کی انگریزی حکومت کے ملازم تھے، توچی کے قبائلی علاقے سے اغوا کرلیا گیا۔ اغوا کرنے والوں کا حال انہوں نے اپنی روداد میں لکھا جو ''قیدِ یاغستان'' کے نام سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد سے یہ کتاب کئی مرتبہ شائع ہوئی ہے۔ اس روداد کے دوران مصنف کے تجزیے موجودہ صورتِ حال سے بڑی حد تک متعلق معلوم ہوتے ہیں۔ جس کا اندازہ ان چند اقتباسات سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔

محمد اکرم صدیقی

قیدِ یاغستان

بیان کیا جاتا ہے کہ چار پانچ سال پہلے توچی میں بالکل امن وامان تھا۔ لوگ آرام سے زندگی بسر کرتے اور بے خطر شب ہائے تار میں سفر کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ان بدمعاشوں نے، جو اپنی پاداشِ کردار اور سرکار انگلشیہ کے خوف انصاف سے اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے تھے، متفق ہوکر زور پکڑا، اور غارت گری کا پیشہ اختیار کیا۔ پہلے پہل ان کا غصہ صرف کشت وخون اور غارت مال تک ہی محدود تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ لوگوں کی بدقسمتی سے ان کو ایک سودمند تجارت کی چاٹ لگ گئی۔ وہ قتل کرنے کی بجائے آدمیوں کو زندہ پکڑ لے جاتے اور گراں بہا فدیے پر ان کو وارثوں کے ہاتھ بیچ دیتے۔ اس تجارت نے یہاں تک فروغ پکڑا کہ اب یہ ان کا مستقل پیشہ بن گیا ہے۔ حصول فدیہ میں کامیابی کے لیے وہ اپنے بے گناہ قیدیوں کو طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں دیتے اور بحالتِ مایوسی نہایت بے رحمی سے قتل کر ڈالتے ہیں۔

افغانستان یا غیر علاقے کے جو لوگ ڈاکہ زنی کرتے ہیں تین گروہوں پر منقسم ہیں۔ ایک تو افغانستان کی سرحدی رعیت کے وہ لوگ جنہیں ناداری کی وجہ سے اپنا پیٹ پالنا مشکل ہے۔ یہ لوگ

سرکاری علاقے میں مار دھاڑ کرنا کار ثواب سمجھتے ہیں اور مال غنیمت کو ''ہم خرما'' کا مصداق۔ یہ لوگ چھ چھ سات سات کے گروہوں میں خاموشی سے نکل جاتے ہیں اور لوٹ مار کر کے واپس آ جاتے ہیں اور پھر اپنے کاروبار میں مشغول رہتے ہیں۔

ان سے بڑھ کر سرحدی غیر علاقے کے قزاق ہیں۔ ان کا بھی باقاعدہ پیشہ قزاقی ہے۔ ان کا مدعا غنیمت کے علاوہ پولیٹکل نظریہ بھی ہے۔ وہ ڈاکہ زنی کو پولیٹکل مراعات کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اپنی بہادری کے اظہار کا موقع بھی تصور کرتے ہیں۔

لیکن ان سب سے بڑھ کر فراریوں کا وہ فرقہ ہے جنھوں نے اپنی زندگیاں قزاقی، رہزنی اور کشت و خوں کے لیے وقف کر رکھی ہیں۔ ان کا پیشہ اور مدعا صرف قزاقی ہے۔ خواہ وہ مال دار ہوں یا غریب، بچے ہوں یا بوڑھے۔ چوں کہ ہمارا واسطہ صرف اسی گروہ سے پڑنے والا ہے، اس لیے ان کا حال ذرا تشریح سے لکھنا ضروری ہے۔

یہ لوگ اپنے آپ کو فراری کہتے اور کہلاتے ہیں اور اس نام کو مایہ ناز سمجھتے ہیں۔ اگرچہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ وارداتیں کر کے خوف انصاف سے بھاگے ہوئے ہیں یا جیل اور حوالات کو توڑ کر مفرور ہو گئے ہیں لیکن وہ اس لفظ کو مہاجر کا مترادف سمجھتے ہیں۔ یعنی کافر کی سلطنت سے ہجرت کر کے اسلامی سلطنت میں آباد ہیں اور ان کا پاکیزہ مدّعا یہ ہے کہ کافر سلطنت کی رعیت کو کبھی چین نہ لینے دیں۔

فکر ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں افغانستان میں ہجرت کر چکے ہوئے ہیں اور وہاں پر خاص خاص رعایات کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔ کسی قسم کی محنت مزدوری ان کے واسطے ننگ و عار ہے اور قتل و غارت سرمایہ فخر۔ عموماً چھپروں کے جھونپڑوں میں آباد ہوتے ہیں اور اپنے گاؤں علیحدہ بساتے ہیں۔ ایک ایک گاؤں میں بھی اپنے آپ کو قومیت کے لحاظ سے علیحدہ رکھتے ہیں۔ ہر ایک قوم اپنے اپنے دھاڑوی علیحدہ گروہوں میں بھیجتی ہے۔ چوں کہ یہ لوگ منظم طریقوں، جاسوسوں اور دلالوں کے ذریعہ اس کاروبار کو نبھاتے ہیں، اس لیے سب سے زیادہ خطرناک یہی لوگ ہیں۔ ان لوگوں کی قزاقی کے مقاصد یہ ہوتے ہیں۔

(۱) مال غنیمت۔

(۲) سرکار انگلشیہ سے دشمنی۔

(۳) اپنے ذاتی دشمنوں اور قوم کے دشمنوں سے بدلہ اور

(۴) ڈاکہ زنی کو جہاد سمجھ کر ثواب آخرت کی تمنا۔

جس زمانے سے ہمارا دردناک قصہ تعلق رکھتا ہے اس وقت میری عمر ۲۲ سال کی تھی۔ میں بسلسلہ ملازمت ملٹری ورکس پشاور سے تبدیل ہوکر کوہاٹ درہ کے راستہ ۱۷ فروری ۱۹۱۰ء بنوں پہنچا۔ جہاں وادی ٹوچی میں بنوں سے عیدک تک ۲۷ میل سیکشن کا چارج لینے کے لیے مجھے حکم ملا۔ اکثر یارواغیار نے وہاں کے خطرات کو مبالغہ آمیز افسانوں کے رنگ میں بیان کیا اور مجھے ہیبت زدہ بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا لیکن سرحدی ملازمت میں رہ کر اور ایک دو فیلڈ فورس کے سرد و گرم دیکھنے کے بعد میں اس خطرہ کو زیادہ اہمیت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ تاہم میں نے گیریسن انجینئر صاحب سے ایک معقول درخواست کی کہ اس علاقے میں ایک نیا آدمی ہوں اور آتے ہی میرا تعین ایک خطرناک جگہ پر خلاف مصلحت ہے۔ انہوں نے نہایت تسلی آمیز لہجہ میں فرمایا کہ ٹوچی بے شک خالی از خطرہ نہیں، لیکن یہ سب وبال غیر مسلموں کے لیے ہے اور مسلمانوں کو وہاں کوئی خوف نہیں۔ یہ جواب سن کر میں خاموش ہو رہا۔

☆☆

تاریخ عالم اس حقیقت کو صاف بتا رہی ہے کہ آغاز آفرینش سے اب تک جس قوم نے دوسری پر غلبہ پایا جب تک مغلوب کی ہستی کو مٹا نہ دیا آرام نہ لیا۔ آریاؤں نے جب ہندوستان کے قدیم باشندوں پر فتح پائی تو ان سے کیا کیا تعدی نہ کی۔ ان کو یہاں تک رذیل بنایا کہ اپنی غلامی میں لینا عار سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ بے چارے دست ظلم سے تنگ آکر جنگلوں اور پہاڑوں میں جا چھپے اور اب ان کی ہستی برائے نام رہ گئی ہے۔ کولمبس نے جب نئی دنیا دریافت کی اور وہاں کے لوگوں کو مطیع کیا تو انہوں نے اسپین والوں کے ہاتھوں کون سا ظلم تھا جو نہ سہا ہو اور کون سی بے عزتی تھی جو نہ اٹھائی ہو اور اب ڈھونڈنے پر ان مظلوموں کی کتنی بستیاں اس سارے براعظم میں ملیں گی؟ یہودیوں نے عیسائیوں کے دست تطاول سے کیا کیا سختیاں جھیلیں۔ مسلمانوں نے اسپین والوں کے ہاتھوں کیا کیا ستم نہ اٹھائے۔ غرض جس نے غلبہ پایا دوسرے کو پیس ڈالا۔

قرون وسطیٰ میں مغربی قوموں کی بہیمیت اور بربریت کی کوئی زندہ یادگار باقی ہے تو ہمارے ان خونخوار فراریوں کی قوم ہے۔

☆☆☆
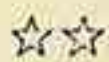
چند امور کی جانب خاص توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ یعنی موزیوں کا مسکن افغانی سلطنت کے علاقہ خوست میں ہونے کی وجہ سے سرکار انگلشیہ کا کوئی بس ان پر نہ چل سکتا تھا اور ظالم بغیر روپیہ لیے مجھے کبھی نہ چھوڑتے۔ روپیہ دینا حکام کو منظور نہ تھا، اس لیے گورنمنٹ کے پاس میری رہائی کا واحد ذریعہ پولیٹکل دباؤ یا ڈپلومیٹک چاپلوسی تھا لیکن اس دباؤ اور اس درخواست کے لیے پہلی تنقیح میرا خوست میں مقید ہونا ثابت کرنا تھا۔ اگر یہ ثابت نہ ہو تو دباؤ اور درخواست فضول تھی اور اگر یہ ثابت ہوجائے تو حکام افغانستان اسے اپنی سلطنت کی بدنامی کا باعث خیال کرتے تھے۔ چنانچہ حاکم خوست نے باوجودیکہ وہ یقینی طور پر میرے تمام حالات سے واقف تھا، کس طرح تجاہل عارفانہ کرتے ہوئے میری وہاں پر موجودگی سے صاف انکار کردیا بلکہ واقعات کو سننا بھی گوارا نہ کیا۔ ایسے حالات میں ہماری سرکار کوئی حتمی ثبوت بہم پہنچا بھی دیتی تو اس کا نتیجہ صرف ایک ہی ہوتا ہے کہ وہ ہمیں قتل کردیتے تاکہ کوئی ثبوت باقی نہ رہے۔ چنانچہ اخیر میں بالکل یہی صورت پیش آئی اور حاکم خوست نے ہمارے قتل کا حکم بھیج دیا۔

☆☆

باقی ماندہ سے میں نے ایک زیادہ مستعمل راستہ اختیار کرلیا جو شرق کی جانب جاتا تھا۔ کچھ دور جاکر ایک عمارت نظر آئی جس پر پہلے دور سے طرح طرح کے گمان گزرتے تھے۔ نزدیک پہنچ کر معلوم ہوا کہ "زیارت" ہے۔ اس پر فاتحہ پڑھ کر آگے بڑھا۔ اشتہا کی وجہ سے جسم میں بہت کمزوری محسوس ہونے لگی اور یقین سا ہوگیا کہ اگر تھوڑی دیر اور بھوکا رہنا پڑا تو طاقتیں جواب دے جائیں گی۔ ہر چند غور کیا لیکن کوئی خوردنی چیز خیال میں نہ آئی۔ مجبوراً مویشیوں کا گوبر جو کہیں کہیں راستے میں خشک پڑا تھا میں نے اکٹھا کرنا شروع کیا اور اپنے تھیلا دار چھاتے میں ڈالتا گیا۔ گوبر کو دیکھ کر اور خاص کر کھانے کا خیال کرکے بھوک بہت چمک اٹھی اور انتظار دشوار ہوگیا۔ میں سمجھتا تھا کہ شرعاً اس کا کھانا مجھ پر حلال ہوگیا۔ کیونکہ میں قریب بمرگ ہو رہا ہوں۔ میں نے پانی کی تلاش کی اور چار بجے کے قریب راستہ سے دور مجھے چشمے کے نشان بصورت نرسل نظر آئے۔ جاکر دیکھا کہ استادہ پانی کا اچھا وسیع چشمہ ہے جس کے گرد اور درمیان بلند نرسل کے پودے کھڑے ہیں، جس کے باعث پانی کا رنگ سبز نظر آتا ہے۔ اس پانی میں مینڈک بھی اچھل کود رہے ہیں۔ میں نے جاکر کپڑوں کو اتار دیا اور پاؤں پانی میں ڈال بیٹھ گیا۔ آہ! اس دشت غربت میں اس وقت کیا سماں ہے۔ چاروں طرف دھوپ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ تکان سے چور ہو رہا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا

ہے گویا شدت سے بخار ہو رہا ہے۔ بھوک سے بے حال اور جنگل بیاباں کی نہ ختم ہونے والی منزل درپیش۔ یکہ وتنہا چشمہ کے کنارے بیٹھا ہوں۔

دشتِ غربت ہے علالت بھی ہے تنہائی بھی
اور ان سب پہ فزوں بادیہ پیمائی بھی

آہستہ آہستہ میں چشمے میں داخل ہوا۔ مینڈک کو میں نے پکڑا اور بھوک کی شدت سے چاہا کہ کچا چبا جاؤں لیکن یہ ایک ناممکن العمل خواہش تھی۔ چھوڑ دیا۔ پھر پکڑا، پھر چھوڑ دیا۔

بجان زندہ دلاں سعدیا کہ ملک وجود
نیر زد آنکہ وجودے ز خود بیازا ری

آخر میں کنارے کے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ تھیلے سے زادراہ یعنی گوبر نکالا۔ تھوڑا سا لے کر پانی میں بھگویا اور نکال کر پتھر پر رکھ دیا۔ خوب نرم ہو گیا تو میں نے ہاتھ سے توڑا۔ اس کے اندر گیہوں کے دانے نظر آئے۔ ایک ٹکڑا لے کر منھ کی طرف لایا لیکن طبیعت نے اجازت نہ دی۔ میں اٹھ کر ایک بلند پتھر پر کھڑا ہو گیا اور زور سے چلایا کہ میں بھوک سے مجبور ہو کر مردار کھانے لگا ہوں۔ اگر کوئی میری آواز سنتا ہو تو اس حرام خوری سے مجھے بچالے۔ لیکن یہ ایک مجنونانہ حرکت، جس کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا تھا۔ واپس آ کر پھر کھانے کی کوشش کی، لیکن ناکام۔ پھر باہر نکل کر چلایا۔ اس طرح تین دفعہ کیا۔ چوتھی دفعہ میں نے خدا سے یہی التجا کی کہ اے میرے مالک! میں نے انسانی قوت کو تین بار پکارا ہے لیکن مجھے کوئی مدد نہیں ملی۔ اب میں تیرے سامنے چلاتا ہوں کہ اے خدا میرا آخری دم حلال روزی پر ختم کر اور اس حرام خوری سے نجات دلا۔ سے دل کی اس التجا سے ایک خاص اثر میرے دل پر ہوا اور مجھے تسکین سی معلوم ہونے لگی۔ میں نے پانی سے معدے کو پر کرلیا۔ گوبر کو تھیلے میں ڈال لیا اور اللہ پر توکل کر کے یہ کہتا ہوا چل دیا۔

باغباں تو ہی کسی شاخ پہ بٹھلا دے مجھے
بے پر و بال ہوں اور طاقت پرواز نہیں

☆☆

جب یہ مذہبی دیوانہ شہادت کے نشہ میں سرشار مال غنیمت کے حصول کی آرزو اپنے دامن آز میں سنبھالے گھر بار چھوڑ کر اپنے بیوی بچوں کو دائمی الوداع کہہ کر اپنے گاؤں سے نکلتا ہے تو اس کے دلی جذبات کیا ہوتے ہوں گے۔ اس کے وطن کے ملاؤں نے ایسی ڈاکہ زنی کے فعل کے لیے

نہ صرف مذہبی جواز ہی پیش کر رکھا ہے بلکہ اسے جہاد کا لقب دے کر اس کو اس کام پر ابھارا ہوا ہے۔ اس طرح وہ ڈاکہ کو ایک کارِ شنیع سمجھ کر اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف عمل پیرا نہیں ہوتا بلکہ اسے کارِ ثواب جان کر کرتا ہے۔ اس لیے عام ڈاکوؤں اور چوروں کی ذہنیت سے اس کی قلبی کیفیت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ وہ ایک خاص اصول کے ماتحت سر بکف آتا ہے اور ڈاکے میں بھی خاص اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنے انتقامی جذبہ پر ایک خاص حد تک ضبط رکھتا ہے۔ اگر چہ عام طور پر معمولی سی بات پر قتل کر دینا اس کی عادت میں داخل ہے پھر بھی جب وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ مقبوضہ علاقے کے کسی مقرر کردہ ہندو کے مکان پر ڈاکہ ڈالتا ہے تو سخت مجبوری کے سوا انسانی خون سے اپنا ہاتھ رنگنے سے بڑی پرہیز کرتا ہے۔ وہ عورتوں اور بچوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ عصمت پر حملہ نہیں کرتا۔ اور جب کسی کو بطور یرغمال پکڑ کر لے جانا چاہتا ہے تو جوان کو بوڑھے پر ترجیح دیتا ہے۔ عورت کو صرف اسی صورت میں لے جائے گا جب اسے کسی ایسی ہی نوعیت کے واقعے کا انتقام لینا ہو۔ غرض، ڈاکہ زنی کے وقت اگر اس کا مقصد حاصل ہونے میں کوئی مزاحم نہ ہو تو وہ بھی کسی سے تعرض نہیں کرتا۔

(اقتباس)

افرادکی طرح اقوام اورممالک کاماضی بھی کسی نہ کسی طرح ان پراثرانداز ہوتارہتاہے اور اس کی تشکیل کرتاہے، افغانستان کے حوالے سے اس مسلسل عمل اور اس میں بنتی بگڑتی صورتوں کا اندازہ اس افسانے سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس کی مصنفہ کو، جو معروف افسانہ نگاراورصحافی ہیں، حال ہی میں سارک ادبی انعام ملا ہے۔ اس افسانے کے ساتھ ایک داستان اوربھی ہے۔ ایک موقر مقامی رسالے کے مدیر نے اسے یہ کہہ کر چھاپنے سے انکار کردیا تھا کہ ''تیز گرم'' ہے۔ ہندوستان کے ایک مدیر شائع کرنے پر تیار تھے مگر انہیں اندازہ ہوگیا کہ پھر ان کی ملازمت کی خیر نہیں۔ اب کی بار مصنفہ نے معذرت کرلی۔ یوں اردو کا یہ ہم عصر افسانہ ہندی میں ترجمہ ہوکر ماہنامہ ''ہنس'' (الہ آباد) میں مئی ۱۹۹۷ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ اور اس کے فوراً بعد اردو کے ممتاز جریدے ''شب خون'' میں۔ پاکستان میں اشاعت کی نوبت اس کے بعد آئی۔ افسانوی بیان میں تاریخی حوالے اور موجودہ صورت حال کے معاشرتی پس منظر کے بارے میں چبھتے ہوئے تجزیے کی وجہ سے یہ افسانہ ازسرنوپڑھے جانے کا تقاضا کرتاہے کہ ہم لمحۂ موجود کو دیکھنا چاہیں تو اس میں بھی پڑھ سکتے ہیں۔

زاہدہ حنا

رقصِ مقابر

انقلاب زمانہ کا سفاک ہاتھ ماہ وسال کے رتھ پر چابک برساتا ہے اور یکساں رفتار سے چلتا ہوا رتھ تیزی سے دوڑنے لگتا ہے۔ نسلوں، قوموں اور بستیوں کو اس کے پہیے روندتے چلے جاتے ہیں۔ ہر شے کو تہ و بالا کرتے ہوئے، ہر شہر کو وقفِ بلا کرتے ہوئے۔

میلوں میل کا دائرہ رکھنے والے پتھر کے پیالے میں وقت کا رتھ دوڑ رہا ہے۔ تیز، تیز تر۔ ہوسِ اقتدار کے چقماق سے چنگاریاں گر رہی ہیں اور آگ بھڑک رہی ہے۔ نسلیں جل رہی ہیں، چہرے پگھل رہے ہیں۔ پشتون، ازبک، تاجیک، ہزارہ، دھگان اور بنجارے اس آگ کا ایندھن۔

ایک ترک نوجوان، سبزہ خط آثار، ایرانی مینا طوروں میں نظر آنے والے لباس میں، سر پر پگڑی، بغل میں کتاب، کمر میں تلوار، اس پتھریلے پیالے کی نگر پر کھڑا ہے جو ہزاروں فٹ کی بلندی پر ہے۔ وہ گردن گھماتا ہے اور اس طرف دیکھتا ہے جہاں آریانا ایئر لائنز کا طیارہ فضا کو چیرتا اور گرجتا ہوا اس پتھریلے پیالے کی سنگلاخ نگر سے چند سو گز اوپر گزر کر اس کے اندر اترنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ پہیے کھل رہے ہیں اور طیارے کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے اعصاب کھنچ رہے ہیں۔ طیارہ اس ترک نوجوان سے چند سو گز کے فاصلے سے گزرتا ہے۔ ہم دونوں کی نگاہیں چار ہوتی ہیں۔ وہ مسکراتا ہے اور میں اخلاقاً مسکرانے کی کوشش کرتی ہوں۔ جہاں زندگی اور موت میں بال برابر کا فاصلہ ہو وہاں کیسی ہنسی اور کہاں کا اخلاق۔

میری گھبراہٹ دیکھ کر وہ مسکراتا ہے۔ بغل میں دبی ہوئی کتاب نکالتا ہے اور اسے میری نگاہوں کے سامنے لہراتا ہے۔

''یہ میرے لکھے ہوئے اوراقِ پریشاں ہیں۔ دن بھر دشمن کے تعاقب میں رہنے کے بعد جب میں پڑاؤ پر پہنچتا تو کبھی الاؤ اور کبھی مشعلوں کی روشنی میں انہیں لکھتا رہا۔'' وہ اس کی ورق گردانی کرنے لگتا ہے، پھر وہ اسے بند کر دیتا ہے۔

''تم اب آئی ہو، میں نے صدیوں پہلے اسی جگہ پر کھڑے ہو کر منہ اندھیرے طلوعِ ستارۂ سہیل دیکھا تھا، ایک عمدہ شگون اور پھر سورج طلوع ہوا تھا، ایک پُرجلال و پُرشکوہ وادی سونے کے رنگ میں رنگی گئی تھی۔''

''صدیوں پہلے۔'' مجھے ہنسی آجاتی ہے۔ ایک سے ایک بڑبولا پڑا ہے اس دنیا میں۔

طیارہ پہاڑوں سے گھری ہوئی وادی کے اندر آ گیا ہے پتھریلی نگر سے بہت نیچے۔ اور تب یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو جاتے ہیں کہ وہ کہانیوں کے ہندو سادھوؤں کی طرح ہوا میں تیرتا ہوا آتا ہے اور طیارے کے اس پنکھ پر بیٹھ جاتا ہے جو میری نشست سے کچھ ہی فاصلے پر ہے۔ مجھے رے بریڈبری کی ایک کہانی یاد آتی ہے۔ اس میں بھی ایک کردار طیارے کے پنکھ پر آن بیٹھا تھا۔ میں اپنی نشست کو مضبوطی سے تھام لیتی ہوں۔

''میں نے پہلی مرتبہ اس شہر کو دیکھا تو یہ وہ زمانہ تھا جب میں قندز، بدخشاں، ہرات اور دریائے آمو کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ میں نے پہاڑوں کے اس عظیم دائرے میں تپتی ہوئی سنگلاخ چٹانوں کے درمیان اس دریا کو بہتے دیکھا تھا۔'' وہ انگلی سے ایک طرف اشارہ کرتا ہے۔ میں نہ

چاہتے ہوئے بھی اس طرف دیکھتی ہوں۔ ”اس روز اس دریا کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے بہتی ہوئی چاندی کی ایک زنجیر ہے جو ان ہیبت ناک پہاڑوں کے پیروں میں پازیب بن گئی ہے اور چاندی کی اس زنجیر کے دونوں طرف سرسبز و شاداب مرغزاروں کے زمردیں ٹکڑے جڑے ہوئے ہیں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ آدم کے قاتل بیٹے قابیل کی سرزمین ہے اور اس کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ کسی کی حکومت تادیر برداشت نہیں کرتی۔“

میرے سامنے کی قطار میں بیٹھی ہوئی ایک لحیم شحیم عورت جو اپنی وضع قطع سے سر بسر پنجاب کی لگ رہی ہے، کھڑکی کی طرف جھک کر نیچے دیکھتی ہے اور پھر ”ہائے ربّا“ کہہ کر زور سے سینے پر دو ہتڑ مارتی ہے۔ اس کے برابر بیٹھا ہوا کیسری پگڑی والا سکھ نوجوان آہستہ سے اسے تسلی دیتا ہے۔

میں طیارے کے پنکھ پر بیٹھے ہوئے ترک نوجوان کو نظر انداز کرتے ہوئے نیچے کی طرف نظر کرتی ہوں۔ ہمارے طیارے سے چند سو فٹ نیچے شعلوں کی ایک چھتری سی تنی ہوئی ہے۔ میری ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ جاتی ہیں۔

ترک نوجوان ہاتھ لہرا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ میں جھنجھلا جاتی ہوں۔ یہاں جان پر بنی ہوئی ہے اور یہ ایران توران کی ہانک رہا ہے۔ میں جو دِلّی سے آرہی ہوں، میں نے منہ اندھیرے کسی طلوعِ ستارۂ سہیل کا نظارہ نہیں کیا کہ اسے نیک شگون جانوں۔ جہاد ملت اسلامیہ کے لیے دولت ریاستہائے متحدہ امریکا کا نادر روزگار تحفہ، اسٹنگر میزائل اور اسے ”ڈی ٹریک“ کرنے والے اینٹی اسٹنگر فلیئر۔ ان کی لپک دیکھ کر سب ہی کے اوسان خطا ہیں۔ ہوسِ اقتدار کی چقماق سے گرنے والی کوئی بھی چنگاری کسی بھی لمحے آریانا ایئر لائنز کے اس طیارے کو جلا کر خاکستر کر سکتی ہے۔ طیارے کی فضا میں لتا منگیشکر کی مدھر آواز شاید ہماری حالت کا مذاق اڑا رہی ہے......
گنگا میّا میں جب تک کہ پانی رہے، مورے سجنا تری زندگانی رہے ...... یہاں کیا سجنی اور کیا سجنا سب کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ ہماری یہ گائیکہ اس وقت بمبئی میں شاید ریاض کر رہی ہو یا کسی گانے کی ریکارڈنگ میں مصروف ہو، اسے بھلا کیا خبر کہ اگر سربلندیٔ ملتِ اسلامیہ کی خاطر گلبدین حکمت یار کے کسی ”مجاہد“ کا داغا ہوا کوئی طیارے کو آن لگے تو اس کی تو آواز سے بھرا ہوا صرف ایک کیسٹ جل جائے گا لیکن ہم سب چشم زدن میں خاکستر ...... یوں جیسے شمشان گھاٹ میں چتا پھونک دی گئی ہو۔ مانا کہ اس طیارے میں دِلّی سے سوار ہونے والے افغانی، ہندوؤں اور سکھوں کی اکثریت ہے لیکن الحمدللہ کہ دس پانچ ہم جیسے مسلمان بھی ہیں۔ اجی ہٹاؤ بھلا اس سے کیا فرق پڑتا

ہے کہ بعد از مرگ دفن ہوئے یا جلائے گئے۔ ابھی تو اندیشہ مرگ سے ہی دم لبوں پر ہے۔ سب کی سانسیں رکی ہوئی، وقت کی گردش تھمی ہوئی۔ طیارے کے پہیے کابل ایئرپورٹ کی زمین کو چھو لیتے ہیں اور سب جیسے کسی طلسم سے آزاد ہو کر جی اٹھتے ہیں۔

میں طیارے کے پنکھ کی طرف نظر کرتی ہوں۔ وہاں نہ کوئی ترک ہے نہ تاجیک۔ وہی رے بریڈبری کی کہانی والا قصہ..... موت کا خوف کیسے کیسے سوانگ رچاتا ہے۔

OOO

ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل کابل، باغ بالا کی چوٹی پر سر اٹھائے کھڑا ہے۔ کمرہ نمبر ۱۱۹۔ میں بیقراری سے اپنے بستر پر کروٹیں بدلتی ہوں اور پھر اٹھ کر شیشے کی اس دیوار تک جاتی ہوں جس سے کئی میل پرے نشیب میں کابل ایئرپورٹ کی فضائی پٹی نظر آرہی ہے۔ صبح کا ملگجا اجالا پھیل رہا ہے اور ان میں صنوبر اور بلوط کے اونچے اونچے پیڑ سبزے کی بکل مارے ساکت و صامت کھڑے ہیں۔ ہوا شاید ان کے شانوں پر سر رکھ کر سوگئی ہے۔ شیشے کی دیوار کے دائیں جانب چھدرا سا جنگل ہے۔

دل میں ٹیس سی اٹھتی ہے۔ ہم نے خطوں میں کتنی بہت سی آرزوئیں کی تھیں۔ کتنی بار مجھے کابل بلایا گیا تھا، کتنی ہی بار یہ پیام آیا تھا کہ ہمارے شہر آؤ تو مل کے سیر چمن کو چلیں گے۔ اس کے جنگلوں میں گھومنے کی، اس کی سڑکوں پر چلنے کی آرزو تھی۔ کابل یونیورسٹی کی روشوں پر ٹہلیں گے، خزاں جب پیڑوں کا لباس اتارے گی تو ان مناظر کو دیکھیں گے لیکن وقت اپنی چال چل گیا، اس

جنوبی ایشیا مغل عہد میں

افغانستان کی سرکاری ویب سائٹ سے

شہر کا وہ گھر جس میں کئی جوڑ آنکھیں میری منتظر تھیں، وہ گھر کہیں کھو گیا تھا۔ مکینوں نے مکان بدل لیا تھا۔ منتظر آنکھیں دنیا کے میلے میں کھو گئی تھیں۔ اپنا پتا اور نشان بھیجے بغیر۔ جرمنی، امریکا، انگلستان۔ ان محبوب ہاتھوں کی تحریریں صدیوں سے نہیں دیکھیں۔ لیکن آقائے عبدالحئ حبیبی تو کہیں نہیں گئے ہوں گے اور مادام حبیبی جنہیں ان کے بچوں کی طرح میں بھی ''بوجان'' کہتی تھی۔ وہ بھلا کہاں گئی ہوں گی۔ میں انہی سے مل لوں، ان کی قدم بوسی کرلوں۔

کابل ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد سے رات ہونے تک میں آقائے حبیبی کے بارے میں ایک ایک سے پوچھتی رہی ہوں لیکن سب ہی نے اتنے اصرار سے نفی میں سر ہلایا ہے کہ مجھے یقین آ گیا ہے کہ یہ لوگ آقائے حبیبی کے پتے سے واقف ہیں۔ اور نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی الہ آباد میں پنڈت رگھوپتی سہائے فراق گورکھ پوری کا پتہ پوچھے اور اس سے کہا جائے کہ ہم انہیں نہیں جانتے۔ میں نے اپنے کمرے میں ٹیلی فون ڈائریکٹری تلاش کی لیکن افغانستان میں اس نام کی کوئی چیز پائی نہیں جاتی۔ آپریٹر نے رئیس مجلس سنا (اسپیکر) محمود حبیبی کے گھر کا نمبر ملا دیا۔ محمود حبیبی اس خاندان کے بے حد قریبی رشتہ دار لیکن نام پہچاننے سے بھی انکاری۔ وہ مرغلرہ کو نہیں جانتے، انہوں نے حبیب اور میر ولیس کا نام نہیں سنا۔ جب میں انہیں آقائے عبدالحئ حبیبی سے ان کی رشتہ داری یاد دلاتی ہوں تو وہ غصے سے فون بند کر دیتے ہیں۔ کچھ تو ہے کہ جس کی پردہ داری ہے۔

ملک اور شہر جب دو مخالف اور متحارب کیمپوں میں بٹ جائیں، جب چچا، بھتیجے کے اور ماموں، بھانجے کے خلاف ہتھیار اٹھا رہا ہو، جب بھائی، بھائی کی مخبری کر رہا ہو تو رئیس مجلس سنا کو ایک پاکستانی ادیب اور اخبار نویس کے ساتھ یہی سلوک کرنا چاہیے۔ مانا کہ میں صدر افغانستان کی مہمان ہوں لیکن بہ خدا آئی ایس آئی کی ایجنٹ بھی ہوسکتی ہوں یا ایم آئی کی۔ اور جب براستہ دِلّی واپس کراچی پہنچوں گی تو یہود و ہنود کی ایجنٹ قرار پاؤں گی۔ ہیون سانگ اور فاہیان اور ابن بطوطہ ہمارے زمانے میں ہوتے تو دیکھتے کہ سی آئی اے یا کے جی بی کے ایجنٹ کیسے نہیں کہلاتے۔ ان دونوں کے لیے کام کرنے کے الزام سے بچ نکلتے تو انہیں ''را'' کا ایجنٹ ثابت کرنا تو بائیں ہاتھ کا کام تھا۔

کوئی ہولے سے کھنکارتا ہے۔ میں دہشت زدہ ہوکر پلٹتی ہوں۔ مقفل کمرے میں کوئی اندر کیسے آیا؟ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا ہے۔ وہ رائٹنگ ٹیبل کے ساتھ والی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا ہے

اور مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہا ہے۔ وہی ترک نوجوان ...... لیکن وہ تو واہمہ تھا، نظر کا فریب ......تو پھر یہ کون ہے اور پتھریلی دیواروں سے گزر کر مجھ تک کیسے آ پہنچا ہے؟ خیالوں کی یورش، اندیشوں کی دوا دوش۔

''دیواریں ......'' وہ ہنستا ہے...... ''میرا راستہ تو فصیلیں اور دریا اور گہری کھائیاں نہیں روک سکی تھیں، تو پھر اس دیوار کی کیا حقیقت ہے۔'' وہ اپنی انگلیوں کو دیوار پر بجاتا ہے، بغل میں دبی ہوئی کتاب رائٹنگ ٹیبل پر رکھ دیتا ہے اور اب کمر سے بندھی ہوئی تلوار کھول رہا ہے۔ شاید میری گردن اڑانے والا ہے۔ میری خطا؟ میرا قصور؟

''میں تمہیں بتاؤں، جنگ کے دامن سے جدائی بندھی چلی آتی ہے۔ میں نے وہ جدائیاں بہت جھیلی ہیں جن سے تم دل گرفتہ ہو، اور میری وجہ سے ہزاروں، لاکھوں جدائی کے عذاب سے گزرے۔'' اس کی آواز ملول ہوگئی ہے۔

میں غور سے اسے دیکھتی ہوں۔ ''تم عالم الغیب ہو؟''

وہ نفی میں سر ہلاتا ہے۔

''تو پھر یکے از رجال الغیب؟''

وہ مسکراتا ہے'' میرے بارے میں جو جی چاہے فرض کر لو لیکن بس یہ ہے کہ میں تھا، میں ہوں اور میں رہوں گا۔''

''یہ تو کچھ خدائی کی سی دعویداری کا معاملہ ہے۔'' میں ابرو اٹھا کر اسے دیکھتی ہوں۔

''میں روحِ زمانہ ہوں جو کبھی ایک اور کبھی دوسرے نام میں قیام کرتی ہے۔''

''تو اے روح زمانہ ان دنوں تم کس نام میں قائم ہو؟'' مجھے اب اس کی باتوں میں لطف آ رہا ہے۔

''تو تم کیا واقعی ابھی تک مجھے نہیں پہچانیں؟'' اس کی آواز میں حیرت ہے۔ ''کل میں روزانہ کی دھواں دھوں سے بیزار ہو کر ذرا سیر کو نکلا تھا کہ تمہارے ہوا پیا پر نظر پڑی۔ اس ہجوم میں بس تم ہی تھیں جو مجھے جانتی تھیں، اسی لیے تم سے کلام کیا۔''

میں اسے غور سے دیکھتی ہوں۔ کھنچی ہوئی غلافی آنکھیں، نکیلی ٹھوڑی۔ ''ہاں شاید تمہیں کہیں دیکھا تو ہے۔'' میں جھینپ جاتی ہوں۔

وہ ایک گہرا سانس لیتا ہے اور پھر میز پر رکھی ہوئی کتاب اٹھاتا ہے اور میرے سامنے لہراتا

ہے "تم نے تو اسے کئی بار پڑھا ہے۔"

لیجیے صاحب، اسے کہتے ہیں مان نہ مان میں تیرا مہمان، ابھی جناب کا دعویٰ روحِ زمانہ ہونے کا تھا، اب شکایت اس کی ہے کہ میں انہیں پہچان کیوں نہیں رہی اور اس پر بھی اصرار ہے کہ میں نے ان کی کتاب کئی بار پڑھی ہے۔ یہ تو اپنی پوشاک، پگڑی اور پاپوش سمیت آنکھوں میں گھسے آتے ہیں۔ مجھے ہنسی آجاتی ہے۔ جھوٹے کو گھر تک چھوڑ کر آنا چاہیے۔ میں ہاتھ آگے بڑھا کر وہ کتاب اٹھالیتی ہوں جس پر مراکشی چمڑے کی جلد ہے۔ میں اسے کھولتی ہوں، اس فارسی مخطوطے کا ہر صفحہ مطلا اور ہر صفحہ مذہب ہے۔ پہلی سطر پر میری نظر پڑتی ہے۔

"درسنہ ہشت صد و نو دونہ، در ولایت فرغانہ بہ سن دوازدہ سالگی پادشاہ شدم۔"

میری انگلیاں لرزنے لگتی ہیں۔ ناممکن۔ میں نگاہیں اٹھاتی ہوں۔ میرے سامنے اس وقت کا محمد ظہیر الدین بابر مسکرا رہا ہے جب اس نے "بادشاہ" کا لقب اختیار نہیں کیا تھا اور میرے ہاتھوں میں "بابر نامہ" ہے۔

"توزک میں نے ترکی میں لکھی تھی، یہ اس کا فارسی ترجمہ ہے جسے عبدالرحیم خان خانان نے برائے خوشنودی پادشاہ محمد جلال الدین اکبر نے بہ قلمِ خود نقل کیا۔" وہ میری حیرت سے لطف ہو رہا ہے، اسی لمحے دروازے پہ دستک ہوتی ہے۔ روح زمانہ پل چھن میں آنکھوں سے اوجھل۔ نہ شمشیر، نہ کتاب، میں غرق در حیرتِ آب۔

دستک دوبارہ ہوتی ہے۔ اب کہیں محمد جلال الدین اکبر یا محمد نور الدین جہانگیر نہ چلے آتے ہوں۔ میں جھجکتے ہوئے دروازہ کھولتی ہوں۔

سامنے کسی روحِ زمانہ یا رجال الغیب کی بجائے گوشت پوست کا بیل بوائے کھڑا ہے۔

"خانم۔ جاکت و دامن و لباسِ روز"

ہینگر پر میرے استری شدہ کپڑے۔

ایک ڈالر کے نوٹ کی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک منتقلی۔

"متشکرم۔ متشکرم۔"

OOO

ارگ ...... پریذیڈنشل پیلس۔ ایک پُرشکوہ پتھریلی عمارت۔ راہداریوں سے گزر کر کمرۂ ملاقات۔

شوروی جا چکے۔ جنیوا معاہدہ ہو چکا۔ اس معاہدے کی قیمت پاکستانی وزیراعظم جونیجو نے معزولی کی شکل میں ادا کی اور آمرِ مطلق جنرل ضیاء نے جان کی صورت۔

میں جنرل نجیب کی گہری اور پُرسکون آنکھوں میں جھانکتی ہوں۔ اس شخص سے کیسی کیسی کہانیاں وابستہ ہیں۔ ''خاد'' کا سربراہ، زندانِ پل چرخی کے عقوبت خانے میں اس کے حکم کے بغیر پتہ نہیں ہلتا تھا۔ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ؟ لیکن جس بات کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا وہ یہ ہے کہ اس شخص نے امریکیوں اور روسیوں، پاکستانیوں اور ہندوستانیوں سبھی کے اندازے الٹ کر رکھ دیے ہیں۔ دنیا میں روزانہ اس کی حکومت کے خاتمہ کا مژدہ سنایا جاتا ہے اور یہ ہے کہ اپنی کرسی پر جما بیٹھا ہے۔

میرے کانوں میں روحِ زمانہ کی آواز گونجتی ہے۔ ''یہ سرزمینِ قابیل ہے، آدم کے قاتل بیٹے کی بسائی ہوئی۔ شاید اسی لیے اس کی خاصیت ہو چکی ہے کہ تادیر کسی کی حکومت برداشت نہیں کرتی۔'' جنرل نجیب کو یہ زمین نہ جانے کب تک برداشت کرے۔

نجیب ترجمان کے ذریعے باتیں کرتے کرتے اچانک اردو بولنے لگتے ہیں۔ ان کی جوانی پشاور کے گلی کوچوں میں گزری ہے وہ اپنے کالج کے ساتھیوں کو، سیاسی دوستوں کو یاد کر رہے ہیں۔ پشاور کے بازار اور کراچی کی گلیاں نجیب کی آنکھوں میں جاگنے لگتی ہیں۔ فیض کے اشعار۔ میں اس شخص کو دیکھتی ہوں، یہی ہے جو اس گھر کا نام و نشان بتا سکتا ہے، جس کا راستہ مجھے کوئی نہیں بتاتا۔ شاید میرا سوال پروٹوکول کے اعتبار سے مناسب نہ ہو۔ شاید اس گھر نے ترہ کی، امین، ببرک کارمل اور نجیب کی سیاست سے اختلاف کیا ہو۔ شاید اس گھر کے کسی بیٹے کی چیخیں بھی زندان پل چرخی میں گونجی ہوں۔ خوف کا ایک لمحہ، ہچکچاہٹ کی ایک ساعت لیکن دل کے رشتے کسی زندان، کسی بندی خانے کو نہیں جانتے۔

میں اپنی فنجان پر ایک نظر ڈالتی ہوں جو خالی ہو چکی ہے اور جس کی تہہ میں چائے کی چند پتیاں رہ گئی ہیں۔ کسی پیالی کی تہ میں رہ جانے والی پتیوں سے کیا واقعی تقدیر پڑھی جا سکتی ہے؟

اور میں اس شخص کے بارے میں پوچھ بیٹھتی ہوں جو پشتو دانش و ادب کی آبرو تھا، جس کے نام کے بغیر پشتو ادب اور افغان دانش کا تذکرہ مکمل نہیں ہوتا، جس نے اپنی زندگی کے سنہرے سال جلاوطنی میں گزارے۔ دانش گاہ پنجاب کی مرتب کردہ دائرۃ المعارف اسلامیہ میں جس کی تحریریں شامل ہیں۔ جس کے گھر کا عشق آج بھی دل میں پہلے دن کی طرح راسخ ہے، ایک ایسا گھر جس کے کسی بھی فرد کو میں نے ۲۸ برس سے نہیں دیکھا۔

نجیب کی آنکھیں میری آنکھوں میں گڑی ہوئی ہیں "یہ سوال شاید آپ نے کسی اور سے بھی کیا تھا۔"

میری پیشانی پر ہلکی سی نمی پھیل جاتی ہے۔ جنرل نجیب کو اپنے مہمان کے سوالات کے بارے میں اطلاع مل چکی ہے۔ خاد ...... افغان سیکرٹ سروس۔ ...... زندانِ پل چرخی ...... وہ جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔ امریکی جاسوسی فلموں کے مناظر آنکھوں میں گھوم جاتے ہیں۔

اب جو ہو سو ہو۔ "جی ہاں میں افسر مہمانداری عباس کرگر سے اور کئی دوسروں سے بھی یہی سوال کر چکی ہوں۔"

ہم دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے کو تول رہی ہیں۔

ایک گہرا سانس اور پھر جھکی ہوئی نگاہوں کے ساتھ جنرل نجیب اپنے سامنے رکھی ہوئی پنسل سے کھیلنے لگتے ہیں "آقائے عبدالحیُ حبیبی کے خاندان میں سے اب کوئی بھی کابل میں نہیں۔"

مجھے صدر افغانستان کی بات پر اعتبار نہیں آتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ بوجان نے وہ شہر چھوڑ دیا ہو جس پر وہ ہزار جان سے عاشق تھیں، جس کا نام لیتے ہی ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی۔

اور یہ بات پانچ برس بعد کراچی میریٹ میں بیٹھے ہوئے ان کے سب سے چھوٹے بیٹے خوشحال حبیبی نے بتائی کہ میرا یقین درست تھا۔ جب میں کابل میں ان کے گھر کا راستہ ڈھونڈ رہی تھی اس وقت وہ کابل میں ہی موجود تھیں، آقائے عبدالحیُ حبیبی ختم ہو چکے تھے۔ چاروں بچّے افغانستان سے باہر تھے، پُرامن زمینوں میں۔ لیکن وہ کابل میں تھیں، تنہا ...... اکیلی۔ اور جب ان کے بیٹوں نے انہیں بہ اصرار اپنے پاس بلانا چاہا اور وہ کسی نہ کسی طور سرحد عبور کر کے پشاور میں اپنے ایک رشتہ دار کے پاس پہنچائی گئیں تو اسی رات ختم ہو گئیں اور اب پشاور کے کسی قبرستان میں سوتی ہیں۔ ان کے آخری لمحوں میں ان کی کوئی اولاد ان کے پاس نہ تھی اور انہوں نے دس برس سے کسی کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ خوشحال حبیبی آئی یو سی این کی کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے کراچی آیا تھا اور کسی نہ کسی طرح میرا فون نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

بوجان تم جو ستر پچھتر برس کی ایک فراق زدہ عورت تھیں، جس کی جوانی اپنی ماں، اپنے بھائیوں اور بہنوں سے اور کابل سے جدائی کے غم میں آنسو بہاتے بسر ہوئی، جس کا بڑھاپا اپنے بچوں کے فراق میں تڑپتے اور خون روتے گزرا ہوگا۔ تم سے اگر میں گھنٹہ گھڑی کے لیے مل لیتی تو

کون سی قیامت آ جاتی؟ لیکن بوجان، رموزِ مملکت خسرواں دانند اور خسرو اپنے پہلو میں دل نہیں رکھتے اور شاید دنیا کی بیشتر عورتوں کے دلوں کا اپنے پیاروں اور اپنے شہروں کی جدائی سے دولخت رہنا ہی ان کا مقدر ہے۔

OOO

افغانستان کی لتا منگیشکر، نغمہ منگل کی دلدوز آواز کابل انٹر کانٹی نینٹل میں ''پامیر کلب'' کے در و دیوار کے بوسے لے رہی ہے۔

''کابل تو تباہ نہیں ہوا

کابل میں تیرے فراق میں بیقرار

کابل تیری گلیوں کے سامنے ساری گلیاں ہیچ

کابل میں کہیں بھی رہوں، لوٹ کر تیری گلیوں میں آؤں گی۔''

نغمہ منگل کی آواز گلوگیر ہے اور سننے والے دل گرفتہ۔ فراق رشتوں سے، جدائی شہروں سے، وہ جنہیں جنگ اور سیاست اپنے گھروں سے نوچ کر اجنبی بستیوں کی طرف اچھال دے، وہ بھلا کب لوٹ کر سہرام اور دِلّی اور کابل کی گلیوں میں واپس آئے ہیں۔ آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں، اک مشت خاک لے کے صبا نے اڑا دیا۔

OOO

ٹیلی وژن اسکرین پر کابل کے ایک چوک میں کھمبے سے جھولتے ہوئے جنرل نجیب کا خون آلود چہرہ اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ پھریرے بن کے میرے تن بدن کی دھجیاں، شہر کے دیوار و در کو رنگ پہنانے لگیں، پھر نکل آئے ہوس ناکوں کے رقصاں طائفے، دردمند عشق پر ٹھٹھے لگانے کے لیے ...... وہ جس کے زمانے میں کابل خون میں نہیں نہایا تھا، اسی نے کابل میں اپنے لہو سے وضو کیا۔ وہ جس نے امریکیوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے تھے اسی کے منہ میں ڈالر ٹھونسے جا رہے ہیں۔ وحشی چہروں والے اس کے بے جان بدن کی بے حرمتی کر رہے ہیں، قہقہے لگا رہے ہیں۔ ''آدم کے قاتل بیٹے قابیل کی بسائی ہوئی بستی کسی کی حکومت تادیر برداشت نہیں کرتی۔'' روحِ زمانہ کی آواز کسی پُرشور موج کی طرح آتی ہے اور گزر جاتی ہے۔

میری نگاہوں میں کابل کے پریذیڈنشل پیلس کا وہ کمرہ گھوم جاتا ہے جس میں ہم نے باتیں کی تھیں، ہماری تصویریں کھنچی تھیں۔ تصویریں رہ جاتی ہیں۔ تصویروں والے دار پر کھینچ دیے جاتے

ہیں۔ خاک میں ملا دیے جاتے ہیں۔

تو اب یہ سرزمین نئے آنے والوں کو کتنے دنوں برداشت کرے گی، کتنے بے گناہوں کا لہو ابھی اس سرزمین کو اور سیراب کرے گا۔

کابل میں ہر طرف طالبان کے "امن" پرچم لہرا رہے ہیں۔ وہ سفید جھنڈے جن پر خون کے دھبوں کے درمیان اب کہیں کہیں سفیدی رہ گئی ہے۔

لوگ سولیوں پر لٹکائے جا رہے ہیں۔ عورتیں اور مرد سنگسار ہو رہے ہیں۔ بوڑھوں کو ان کی داڑھیوں سے پکڑ کر، لاٹھیوں اور چابکوں سے مسجدوں کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔

"۱۹۲۴ء میں جہنمی امیر امان اللہ خان نے عورتوں کو گھروں سے نکالا تھا۔ ہم نے اس ملعون کی اور اس کے بعد آنے والے تمام ملاحدہ کی شریعت منسوخ کی۔ عورتیں حجروں میں پیدا ہوں گی اور ان ہی میں زندگی گزار کر اپنے گھروں کے آنگنوں میں دفن کر دی جائیں گی۔ علم انہیں گمراہ کرتا ہے، بے باک و گستاخ کرتا ہے اور مردوں کے لیے بھی یہ ہم طے کریں گے کہ وہ کیا پڑھیں گے اور کیا نہیں۔ ہم خود علم کا خزینہ، علم کا دفینہ ہیں۔ یہ فرنگی اور شوروی ہمیں علم کیا سکھائیں گے؟"

جلا دو، جلا دو کتابوں کو جلا دو، گرا دو، گرا دو تہذیب افرنگ کی ہر نشانی گرا دو۔ کھرچ دو، کھرچ دو ہر تصویر کو، ہر تحریر کو کھرچ دو۔ کچل دو، کچل دو ہر ساز کو، ہر آواز کو کچل دو۔ موسیقی حرام ہے اور مصوری شرک، ٹیلی وژن شیطان کا چرخہ۔ گھر گھر بت کدے ہیں۔ اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں، مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ۔

"یا امیر المومنین ملا عمر۔ اسلحہ امریکی ہے اور گولہ بارود بھی افرنگی؟"

"ان گستاخوں کی زبان گدی سے کھینچ لی جائے۔ انہیں پل چرخی کے زندان میں بند کیا جائے۔ ہم کفار کو تہس نہس کرنے آئے ہیں اور ہمیں اسلحہ چاہیے خواہ وہ افرنگی ہو یا امریکی۔"

"یا امیر المومنین لیکن مولوی ربانی اور احمد شاہ مسعود بھی کلمہ گو ہیں۔"

"وہ دشمنانِ دین، دشمنانِ اسلام ہیں۔ ہم اسی کی جاں بخشی کریں گے جو ہماری سربراہی تسلیم کرے۔"

اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی؟ ایک اور موج خوں کابل کے سر سے گزر رہی ہے۔ دنیا بھر میں سوالوں کا ایک ہجوم ہے "یہ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کون ہے ان کے پیچھے؟"

"یہ میرے بچے ہیں ...... My Disciples ۔ ہمارے مدرسوں کے پالے ہوئے، ہماری تربیت گاہوں کے ڈھالے ہوئے۔ ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے۔ نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاکِ کاشغر۔ ہم نے طالبان کی شکل میں اللہ کی فوج بنائی ہے۔ اللہ کی فوج۔"

"لیکن جنرل صاحب خادمین حرمین شریفین نے تو خلیج کی جنگ میں امریکی اور افرنگی فوج بلائی تھی۔"

"کون ہے یہ غدار؟ یہود و ہنود کا ایجنٹ؟"

"حضور ہمارے یہاں حب وطن کا ٹینڈر کب تک صرف حاضر اور سابق جرنیل بھرتے رہیں گے؟"

"ارے کوئی ہے جو اس بدبخت کی زبان گدی سے کھینچ لے اور کراچی کے کسی عقوبت خانے میں رکھے۔"

سفاک چہرے والا ایک قابوچی چھڑی بغل میں دبائے ہوئے ٹہل رہا ہے۔ خاکی لباس، شانوں پر ستارے جھلملا رہے ہیں۔ آواز کہیں دور سے آتی ہے ...... ہم اپنے صف شکنوں کو سلام کرتے ہیں۔ ہم اپنے صف شکنوں کو سلام کرتے ہیں۔ سفاک چہرے پر ایک آسودہ مسکراہٹ۔ "شاعر ہمیں خراج دیتے ہیں۔ لفظوں کا خراج اور یہ ملعون، یہ بدبخت۔ گندی نالے کے یہ کیڑے۔ یہ اخبار نویس ہم سے سوال کرتے ہیں؟ ہم سے ......؟" پادشاہ ہندوستان محمد ظہیر الدین بابر کا ہم نام اپنے دانت پیستا ہے۔

"بابر ...... بابر ......!" کراچی کے کسی عقوبت خانے میں اذیتیں سہتا ہوا کوئی نوجوان چیختا ہے۔

ایسے میں اچانک وہ نمودار ہو جاتا ہے، وہ جو آریانا افغان کے طیارے کے پنکھ پر بیٹھا باتیں کر رہا تھا اور پھر کابل انٹر کانٹی نینٹل میں آن پہنچا تھا۔ کمر میں تلوار ہے اور ہاتھ میں توزک، عبا کا دامن ہوا سے لہرا رہا ہے۔

"کسی نے مجھے پکارا؟" ترچھی ترک آنکھیں مجھے غور سے دیکھتی ہیں۔

"نہیں ...... تمھیں نہیں، تمہارے کیری کچر کو ......" میں خاکی وردی والے کی طرف اشارہ کرتی ہوں جو ٹیلی وژن اسکرین پر کف در دہن چیخ رہا ہے۔ "طالبان، مسلم امہ کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ مسلم امہ کی جنگ۔"

"یہ......؟ ہشت...... میرے زمانے میں ہوتا تو اسے سپاہی بھی بھرتی نہ کرتا۔ تاریخ میں منادی کردی جائے...... ہاں تاریخ میں منادی کردی جائے کہ من کہ محمد ظہیر الدین بابر میں نے کبھی اس طرح اپنے لوگوں پر ستم نہیں توڑے۔ میں نے کبھی اپنے شہر نہیں اجاڑے، اپنے ہی لوگوں کے قاتلوں اور اپنے ہی شہروں کو اجاڑنے والے بابروں سے میرے خاندان کا کوئی علاقہ نہیں۔ ہمارے یہاں ممتاز محل تھی جس نے ایک بیٹا غلط جنا تھا اور اس کی قیمت سارے خاندان نے رائیگاں ہوکر اور بے نام ونشاں ہوکر ادا کی۔"

ٹیلی وژن اسکرین پر اب مس ورلڈ، ایشوریا رائے اپنا جلوہ دکھا رہی ہیں۔ ایسان دولت بیگم کا نواسہ اور نگار خانم مغل صدر بیگم کا بیٹا، بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست گنگناتا ہوا اس طرف متوجہ ہے۔

کہ عالم دوبارہ نیست...... کہ عالم دوبارہ نیست...... مس ورلڈ اپنی جھلک دکھا کر غروب ہوجاتی ہیں۔ پان پراگ کا اشتہار۔

بابر کی آنکھوں میں گزرے ہوئے دنوں کی دھند......" بہ خالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را...... اسے دیکھ کر مجھے اپنی عم زاد معصومہ سلطان کی یاد آئی۔ در شہوار، در آبدار تھی۔ میری منکوحہ، میری محبوبہ، ہرات میں دیکھا تھا اسے اور دل ہار بیٹھا تھا۔ زندگی نے اس سے وفا نہ کی۔" وہ ایک آہ بھرتا ہے۔

اشتہاروں کے بعد ٹیلی وژن پر "زی نیوز" کا سلسلہ پھر سے شروع ہوگیا ہے۔ اسکرین دراز داڑھیوں اور سفاک چہروں سے بھرا ہوا ہے۔ تسبیح کے دانے شمار کرنے والی انگلیاں گولے اور میزائل داغ رہی ہیں۔ توپوں کی نالیں شعلے اگل رہی ہیں۔ الجہاد...... الجہاد...... الجہاد...... الامان...... الامان...... الامان...... لوگ بھاگ رہے ہیں۔ گرتے پڑتے، ٹھوکریں کھاتے، گردنوں میں دربدری کے طوق لٹکے ہوئے، آنکھوں میں ویرانیوں اور وحشتوں کے الاؤ جلتے ہوئے، شہر اور دیہات، کھیت اور باغات، بارودی سرنگوں سے اٹے ہوئے، پٹے ہوئے۔ ہماری عظیم طاقتوں کی ایجادوں کی کہیں داد ہے نہ فریاد۔ بچے باپ سے محروم، ماؤں سے بچھڑے ہوئے۔ کسی کا ہاتھ ندارد۔ کسی کی ٹانگیں اڑی ہوئی۔ میری نگاہوں میں اندرا گاندھی انسٹی ٹیوٹ آف چائیلڈ ہیلتھ، کابل کے وہ وارڈ گھوم جاتے ہیں جہاں میں نے ان سینکڑوں معذور بچوں کو دیکھا تھا جو لینڈ مائنز اور بلائینڈ راکٹوں کا شکار ہوئے۔ سوراخ دار ہڈیاں، کھوپڑیاں چٹخی ہوئی، کسی کے دونوں ہاتھ، کسی

کے دونوں پیر کٹے ہوئے۔ یہ جوئے خوں ہے، یہ جوئے خوں ہے۔ چار برس سے ادھر اور ادھر دونوں طرف دعویٰ نفاذ اسلام کا۔ دونوں اپنے مقتولین کو شہید کہنے پر مصر۔ دونوں ایک دوسرے کے مقتولین کو جہنم واصل کرنے کی لذت سے سرشار۔ قاتل بھی کلمہ گو، مقتول بھی۔ دونوں کے صنم خاکی، دونوں کے صنم فانی...... اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی؟

ہم سے کہا گیا تھا ''سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا۔ لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا..... تو اب ہم ہی امام..... ہم ہی امیر المومنین۔ تم جب تک ہمیں تسلیم نہیں کرتے، ہماری تعظیم نہیں کرتے۔ جنگ جاری ہے۔ جنگ جاری رہے گی۔ کشتوں کے پشتے لگتے رہیں گے، شہر جلتے رہیں گے، انسان پگھلتے رہیں گے۔ الجہاد...... الجہاد۔''

''کیسا جہاد؟ کہاں کا جہاد؟ محض فریب نفس، خواہشِ اقتدار۔'' روحِ زمانہ، محمد ظہیر الدین بابر کے وجود میں بل کھاتی ہے۔ ''سعدی شیرازی نے کہا تھا: ''دہ درویش در گلیمے بہ خسپند و دو پادشاہ اقلیمے نہ گنجند'' سعدی کے کہنے کے مطابق دس درویش ایک کمبل پر سو سکتے ہیں لیکن دو بادشاہ ایک مملکت میں سانس نہیں لے سکتے۔ تو یہ کیسے درویش ہیں جنہیں اپنے سوا کوئی دوسرا گوارا نہیں؟''

روح زمانہ کف در دہن ہے اور کھلی ہوئی کھڑکیوں سے آتی ہوئی تیز سمندری ہوا میں توزک بابری کے ورق پھڑ پھڑا رہے ہیں۔

اسکرین پر سے تصویریں جو پل بھر کے لیے غائب ہوگئی تھیں پھر ابھر آئیں۔

منادی ہورہی ہے۔ گلی گلی گھر گھر۔ عورتیں گھروں میں رہیں گی۔ سڑک پر ان کا سایہ نظر نہ آئے۔ قدم باہر نکالنے والیوں کو شرعی سزائیں دی جائیں گی۔ عورتوں پر شیطان کا سایہ ہے سو انہیں گھروں میں رکھو۔ کسی اخبار میں ان کی تصویر نہ چھپے۔ کسی اسکول یا مدرسے کی طرف ان کے قدم نہ اٹھیں۔ ٹانگیں توڑ دی جائیں گی، پیر کاٹ دیے جائیں گے۔ بیواؤں کے گھروں میں فاقے ہوا کریں۔ بے باپ کے بچے لاچار ماؤں کی گودوں میں بھوکوں مریں۔ نفاذ شریعہ فاقے اور بھوک اور موت پر مقدم ہے۔''

محمد ظہیر الدین بابر جو ایک دیوان پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے، آہِ سرد بھرتا ہے ''ان سے اچھے تو ہم تھے جو سر بلندئ اسلام کے لیے نہیں اپنی امارت و بادشاہت کے لیے لڑتے تھے۔ میں نے جو ابراہیم لودھی سے ہندوستان کی سلطنت چھینی تو کون سی خدمتِ اسلام کی؟ ہاں جب کفار کے ملک فتح کرتے تو کچھ فائدہ دینِ مبین کا بھی ہوجاتا۔ ہم نمازیں ادا کرتے، مسجدیں بناتے، شراب

پیتے اور اپنے اردو میں اکثر اپنی ماؤں اور بیویوں کو ساتھ رکھتے تھے۔ میری شیر دل نانی ایسان دولت بیگم، میرے تن آسان باپ کے محل اور ملک کا سارا انتظام، میری منتظم ماں نگار خانم المعروف بہ مغل صدر بیگم اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی، لکھنا پڑھنا جانتی تھی اور شعراء کے کلام سے لطف اندوز ہوتی۔ میری بہن خانزادہ بیگم، میری سوتیلی نانی شاہ بیگم، میری سوتیلی خالہ مہر نگار چغتائی، میری افغان بی بی مبارکہ بیگم، ماہم خانم ...... سبحان اللہ کیا عورتیں تھیں۔ میدان میں ہوتیں تو گھوڑوں پر سواری کرتیں، قیامت کی تیر انداز، تلوار چلاتیں، جانوروں کو اور وقت پڑے تو دشمنوں کو شکار کرتیں۔ خیموں میں ہماری ناز برداری کرتیں، شعر خوانی میں حصہ لیتیں، داستان سرائی کرتیں، کتابیں لکھتیں، میری بیٹی گلبدن بیگم نے ''ہمایوں نامہ'' لکھا جس کی دھوم سارے جہان میں ہے، میری پوت بہو نور جہاں بانو بیگم نے سارے ہندوستان پر فرمانروائی کی۔ ٹکسال میں اس کے نام کا سکہ ضرب ہوا، میری سگڑ پوتی زیب النساء مخفی، صاحب دیوان ہوئی۔ یہ عورتیں جن کا خمیر سمرقند و بخارا سے، بلخ و بامیان سے اور کابل و قندھار سے اٹھا تھا اور جو صدیوں پہلے گزر گئیں کیسے کیسے کام کر گئیں اور یہ بد بخت جنھوں نے کابل پر یلغار کی، اس کی عورتوں کو زندہ درگور کیے دیتے ہیں۔''

کسی وومن ایکٹوسٹ کی نک سک سے درست تقریر۔

''میں جارہا ہوں۔'' وہ یکا یک کھڑا ہو جاتا ہے۔

''اب کہاں کا سفر درپیش ہے؟''

''میں ہندوستان کا بادشاہ، آگرے میں امانتاً دفن ہوا اور جب میرا فرزند اپنے دشمن شیر خاں سوری کے ہاتھوں دربدر تھا تب میری بیگم بی بی مبارکہ نے آگرہ آکر شیر خان سے مطالبہ کیا کہ وہ میری باقیات بہ حفاظت بہ راستہ درۂ خیبر کابل لے جانے کے انتظامات کرے۔ شیر خان نے اپنے دشمن کے باپ کی باقیات کو تکریم و احترام کے ساتھ ہندوستان سے روانہ کیا اور میں نے بالا حصار کی بلندیوں پر کابل کی خاک میں آرام کیا۔ میرے گھر کو ''رحلت گاہِ بابر'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ میں وہیں رہتا ہوں اور وہیں جارہا ہوں۔ وہ کابل جو شوروی افواج کی موجودگی میں محفوظ رہا تھا، نجیب کی عملداری میں جس کی سڑکیں اور بازار آباد تھے، زندہ تھے۔ وہی کابل ان کے ہاتھوں لوٹا گیا اور لٹ گیا جو ہاتھوں پر قرآن اٹھائے ہوئے اس میں داخل ہوئے تھے۔ میری ہڈیاں اس کی خاک میں آسودہ ہیں۔ یہ درست ہے کہ میری رحلت گاہ کے مرمریں ستون گولیوں سے چھلنی ہوئے اور لوحِ مزار چھل گئی لیکن وہ ہے تو میری آرام گاہ ...... میں وہاں نہیں تو اور کہاں جاؤں گا۔'' وہ ایک آہ

بھرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔

OOO

میلوں میل کا دائرہ رکھنے والے پہاڑوں کے پیالے میں ہوسِ اقتدار کے چقماق سے چنگاریاں گر رہی ہیں اور کابل جل رہا ہے۔ پشتون، ازبک اور تاجیک، ہزارہ دھگان اور بنجارے، عورتیں، بچے اور مرد اس آگ کا ایندھن۔

بامیان میں نصب بدھ کا بلند ترین بت لڑکھڑاتا ہوا اپنی جگہ سے اتر آیا ہے۔ ساٹھ گز اونچا یہ بت زمین پر جھکا ہوا اپنی آنکھیں ڈھونڈتا ہے۔ ساتویں اور آٹھویں صدی کے جوشیلے مجاہدین اپنے خنجروں سے اس کی آنکھیں نکال چکے، ان کے پیش قبض اس کا چہرہ کھرچ چکے۔

بامیان کا بدھ اپنے محبوب ترین چیلوں ساری پت اور موگلان کو آوازیں دے رہا ہے۔

''موگلان! یہ کیسا ہون ہے جس میں انسان جل رہے ہیں؟''

جواب نہیں آتا۔

''ساری پت! میں نے تو جانوروں کی بکیہ نہیں ہونے دی تھی۔ یہ کون ہیں جو اپنے بھائی بھتیجوں اور بیٹوں، اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی بکیہ کرتے ہیں۔''

اس بار بھی جواب نہیں آتا۔

ساری پت اور موگلان شاید پیدائش کے دائرے میں پھنسے ہوئے ہیں اور نروان نہیں پا سکے۔ تب ہی کوئی جواب نہیں آتا اور بدھ کی آواز پر اس مسجد کے موذن کی آواز غالب آجاتی ہے جس کے مینار امتِ مسلمہ کی سربلندی کے نام پر ہونے والی جنگ میں ڈھے چکے اور جس کی دیواروں کو مسلم امہ کے اتحاد کی خاطر بلائنڈ راکٹوں سے چھلنی کیا گیا۔ لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں، کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی۔

بدھ کی ڈوبتی ہوئی اور موذن کی ابھرتی ہوئی آواز کو ایک اسٹنگر میزائل کا دھماکہ ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ تمجید کرو تمجید کرو اس رب ذوالجلال کی جس نے توفیق دی ہمیں اپنوں سے لڑنے کی۔ تسبیح کرو...... تسبیح۔ اس خداوند کی جس نے صلیب کے فرزندوں کے دلوں کو موم کیا اور ہمارے جہاد کے لیے ان کے اسلحہ اور ڈالروں کی فراوانی کی۔

میلوں میل کا دائرہ رکھنے والے پہاڑوں کے پیالے میں انسان جل رہے ہیں، بستیاں پگھل رہی ہیں۔ نغمہ منگل کی آواز نوحہ کر رہی ہے۔ کابل تو تباہ نہیں ہوا۔ کابل میں کہیں بھی رہوں،

لوٹ کر تیری گلیوں میں آؤں گی۔

ببو جان تم پشاور کے کسی قبرستان کی گمنام قبر میں ہی دفن رہو گی۔ تمہارے لیے کوئی بی بی مبارکہ نہیں آئے گی جو تمہاری ہڈیاں کابل لے جائے اور اسے وہاں کی زمین میں دفن کرے۔ خاموش ہو جاؤ نغمہ منگل۔ تمہیں بھی معلوم ہے اور ہمیں بھی کہ کابل تباہ ہو گیا ہے اور اس کے لاکھوں عشاق اب کبھی لوٹ کر اس کی گلیوں کو نہ جا سکیں گے۔

OOO

شور سے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ گلی میں شاید بہت سے بچے آوازیں لگا رہے ہیں۔ ان کی آوازیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں سر کو جھٹکتی ہوں اور اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکتی ہوں۔ بچوں کا ایک ہجوم ہے جو گلی سے گزر رہا ہے۔ آوازیں لگاتا ہوا۔

''ہڈیاں لے لو اور نان دو...... نان دے دو اور ہڈیاں لے لو۔''

ان کے شانے بڑی بڑی بوریوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے ہیں۔

میں حیران و پریشان انہیں دیکھتی رہتی ہوں۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ کس سے کہہ رہے ہیں؟ نان کے عوض کیا بیچ رہے ہیں؟ اور پھر میری نگاہ اس پر پڑتی ہے۔ پہلی نظر میں وہ مجھ سے پہچانا نہیں جاتا۔ پگڑی کے پیچ کھلے ہوئے اور وہ گردن میں جھولتی ہوئی، چہرہ خاک سے اٹا ہوا...... کمر سے بندھی ہوئی تلوار کا نام و نشان نہیں، بغل میں دبی ہوئی کتاب بھی غائب...... اس کے کندھے پر بھی ایک بوری دھری ہے۔

میری آواز سن کر وہ رک جاتا ہے۔ کندھے سے بوری اتار کر زمین پر دھرتا ہے اور مجھے دیکھتا ہے۔

''میں تھک گیا...... ہندوستان کی بادشاہی اتنی مشکل نہ تھی۔'' اس کی آواز میں صدیوں کی تھکن ہے۔ ایک ٹوٹے ہوئے شخص کی آواز۔

''یہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو اور یہ بچے کہاں سے ساتھ لے آئے ہو؟'' میں ان بچوں کی طرف اشارہ کرتی ہوں، وہ بھی اس کے رکتے ہی ٹھہر گئے ہیں۔ حلقۂ چشم میں دھنسی ہوئی آنکھیں، پھٹے ہوئے لباس سے جھانکتے ہوئے لاغر بدن، چہروں پر بھوک کی اور بیماری کی تحریر۔

''یہ میرے بچے ہیں، کابل کے بچے۔ ان کے لیے میں نے پادشاہی ترک کی اور یاوندہ ہوا۔''

''معموں میں کیوں بات کرتے ہو۔''

''انہیں تم معمہ کہتی ہو؟ یہ تمہیں چیستاں نظر آتے ہیں؟'' غصے سے اس کی آواز کانپ رہی ہے۔'' ذرا اپنی دائیں جانب تو نظر کرو۔''

میں گردن گھما کر دیکھتی ہوں۔ دور دور تک کھلی ہوئی قبریں۔ ان میں اترتے ہوئے بچے۔ ہڈیاں چنتے ہوئے، یہ بازو کی ہڈی ہے اور یہ پنڈلی کی۔'' اور ہنسلی کی ہڈی کہاں گئی۔'' ایک دوسرے سے پوچھتا ہے۔ بچے قطار در قطار، سینکڑوں ہزاروں کھلی ہوئی قبریں۔

''یہ سب کیا ہے؟ کیا ہے یہ سب؟'' میری آواز لرز رہی ہے اور وجود کانپ رہا ہے۔ MACABRE۔ موت کا رقص۔ الفرڈ ہچکاک کی کسی فلم کا منظر۔

''یہ...... یہ رقصِ مقابر ...... لاطینی میں Danse Macabre ...... عربی میں فتح اول و کسر چہارم بہ معنی قبروں کا رقص اور عبرانی میں کسر اول و کسر چہارم پڑھا جائے تو قبر کھودنے والے کا رقص۔''

وہ قہقہہ لگاتا ہے۔ دیوانگی سے چھلکتا ہوا قہقہہ۔

''میرے شہر میں اناج عنقا، دوائیں ناپید، شہر یخ دان، گھر برف دان۔ باپ اور بھائی جہاد کا لقمہ، مائیں اور بہنیں گھروں میں جبراً و حکماً قید۔ یہ بچے کہاں جائیں؟ بھوک کیسے مٹائیں؟ پہلے جانوروں کی ہڈیاں بیچتے تھے۔ جانور کھالیے گئے، ان کی ہڈیاں بک چکیں۔ نئی ہڈیاں کہاں سے آئیں؟ بھوک نے انہیں قبرستان کا راستہ دکھایا جہاں ہڈیوں کے انبار۔ ہڈیاں جو سرحد پار خریدلی جاتی ہیں، تیل، صابن اور مرغیوں کا کھاجا بنانے میں کام آتی ہیں۔ قبرستانوں سے ہڈیاں چراؤ اور تاجرِ استخواں کے پاس لے آؤ۔ پنجرِ یک مردِ افغاں، پنجاہ (۵۰) سینٹ۔ ۱۷ پاکستانی روپے۔ ۲۰۰۰ر۷ افغانی، ۶ کلو آٹے کا تھیلا ۳۲۰۰ افغانی کا آتا ہے۔ سو ایک پنجر برابر ہوا ۱۳ کلو آٹے کے۔ تمہارے یہاں سے طالبان، سرزمین افغانستان کو برآمد کیے جاتے ہیں اور وہاں سے پنجرِ افغانان برآمد۔ نازی نسل پرست تھے، یہودیوں کی چربی سے صابن بناتے تھے اپنی غلاظتیں صاف کرنے کے لیے۔ تم مسلم امہ کے سرپرست و سرخیل، افغانیوں کے ملی بھائی، ان کی ہڈیاں باریک پیستے ہو اپنی مرغیوں کو کھلانے کے لیے۔ تمہارا اسداللہ خاں غالب اپنے اشعار میں انسانی ہڈیاں ہما کو کھلاتا تھا...... اللہ اللہ...... تم نے ہما کی خوراک اپنی مرغیوں کو کھلائی۔'' اس کی آواز کانپ رہی ہے، غم و غصے سے، درد و اندوہ سے۔

''افغان جہاد کی کھیتی تمہارے کئی جرنیلوں نے کاٹی اور اب وہ جنیوا میں ان کے بینک اکاؤنٹوں میں محفوظ ہے جبکہ ان کابلی بچوں کے حصے میں یہ قبریں آئیں ...... میں دنوں اور راتوں کو ان بچوں کے ساتھ مارا مارا پھرتا ہوں۔ قبرستانِ زیارتِ عاشقان و عارفان میں، گورستانِ شہدائے صالحین میں۔ ان کے ساتھ قبریں کریدتا ہوا۔ ان کا حوصلہ بڑھاتا ہوا۔ یہ بھی نازوں سے پالے گئے تھے، ان کی ماؤں نے بھی انہیں رات کو کبھی گھر کی دہلیز سے باہر قدم نہیں دھرنے دیا تھا۔ قبر سے کوئی بجّو نکل کر بھاگے تو یہ ڈر جاتے ہیں۔ سسکنے لگتے ہیں۔ اندھیروں میں ہڈیاں چمکیں تو خوف سے گھگیانے لگتے ہیں ...... لیکن پیٹ ...... لیکن بھوک ...... چناں قحط سالی شد اندر دمشق ...... کہ یاراں فراموش کردند عشق۔''

اپنی بوری سے وہ ایک کاسۂ سر نکالتا ہے اور میری طرف اچھال دیتا ہے ''پہچانو اسے۔ کس کا ہے یہ؟ عباس کرگر کہ عبداللہ شادان کا، باز محمد خان کہ میجر جنرل گل دوست کا، سلطان علی اور وزگانی کہ آقائے عبدالحیٔ حبیبی کا۔''

میں لرزہ براندام۔ آنسو کاسۂ سر پر لگی ہوئی خاک کو دھو رہے ہیں۔ میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا۔ خشک تار و خشک چوب و خشک پوست، از کجامی آید ایں آوازِ دوست۔ از کجامی آید ...... کابل میں دیکھے ہوئے کتنے ہی چہرے آنکھوں میں گڈمڈ ہو رہے ہیں۔ کون رہا اور کون رخصت ہوا۔

''خاموش ہو جاؤ ...... برائے خدا خاموش ہو جاؤ۔'' میں اپنے دونوں کان اپنی ہتھیلیوں سے ڈھانپ لیتی ہوں۔

روحِ زمانہ کی نگاہیں مجھے حقارت سے دیکھتی ہیں، اس کے ہاتھ بوری اٹھا کر شانے پر دھرتے ہیں۔ اس کے قدم آگے کی طرف اٹھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی سارے بچے چل پڑتے ہیں۔

''ہڈیاں لے لو۔ ہڈیاں لے لو۔ ازبک اور پشتون ہڈیاں، تاجیک اور ترکمان ہڈیاں، ہزارہ اور بنجارہ ہڈیاں۔ یکے پنجر افغان، پنجاہ سینٹ، پنجاہ سینٹ۔''

رقصِ مقابر ...... قبر کھودنے والوں کا رقص ......

کشور ناہید

''کابلی والا'' کو ڈھونڈ کر لاؤ

مجھے کئی دن سے فلم ''کابلی والا'' یاد آرہی ہے۔ ٹیگور کی کہانی پر مبنی یہ فلم، کابل سے آنے والے ایک مہربان، مشفق باپ کی کہانی ہے، جو ہر بچّی کو اپنی گمشدہ بچّی سمجھ کر پستہ بادام دیتا ہے۔ لوگ غلط مطلب سمجھتے ہیں اور یوں کہانی آگے بڑھتی ہے۔ یہ فلم میرے بچپن کی تھی۔ میرے ذہن میں وہی ''کابلی والا'' ۱۹۷۷ء تک چلتا رہا۔ ہم لوگ جب بھی کابل گئے، محبتیں ملیں۔ آزاد فضا میں سانس لیا۔ کیا مسلمان، کیا عیسائی، ہندو یا سکھ، ہر شخص، ہر زبان اور ہر آزادی محفوظ تھی۔

۱۹۷۹ء میں کابل جانا بند ہوگیا۔ وہاں لڑائی شروع ہوگئی۔ یہ میرا ہے، یہ میرا ہے، بندوقوں اور توپوں کے سائے میں یہ آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ اب ہمیں ایک نئی فضا کا سامنا تھا۔ ایک بڑے ملک نے ایک چھوٹے ملک پر قبضہ گیر ہونے کے لیے حملہ کیا تھا۔ کہا گیا تھا کہ موجودہ خانہ جنگی کو ختم کرانے کے لیے یہ انتہائی اقدام اٹھایا گیا ہے۔ حملہ چوں کہ روس نے کیا تھا، ہم نے امریکا کے حلیف بنتے ہوئے، امریکی اسلحہ اور تربیت کے لیے دروازے کھول دیے اور پہلی دفعہ ایک ترکیب سامنے یہ تھی ''مجاہدین'' ساتھ ہی بازار میں امداد میں آئے ہوئے کمبل، گھی اور ڈالر بکنے لگے، جگہ جگہ ڈبے رکھے جانے لگے ہر جگہ لشکر فلاں فلاں کے نام پر انجمنیں بننے لگیں جگہ بے جگہ بلا اجازت مسجدوں کی بنیادیں پڑنے لگیں۔ جگہ بہ جگہ سیر کو نکلنے والے یا گھر سے دفتر کو جانے والے بے گناہوں کا قتل ہونے لگا۔ ہتھوڑا گروپ آیا۔ پھر ایک اور لفظ باقاعدہ لغت میں سیاسی طور پر داخل ہوا اور یہ لفظ تھا دہشت گرد کا۔

اب دہشت گردی ہر اس کام کو کہا جانے لگا جہاں حکومت کی رضامندی نہیں تھی۔ سابرا شتیلہ کیمپوں میں بمباری ہوئی۔ دہشت گردی کہہ کر مذمت کی اور پھر دنیا بھر میں خاموشی، تامل ٹائیگر سے منسوب کیا گیا راجیو گاندھی کا قتل، مذمت کی گئی اور بات آئی گئی ہوگئی۔ آسام میں گزشتہ ۳۰ برس سے نکسالٹ تحریک چل رہی ہے۔ اس کو علاقائی مخاصمت کہہ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ آئر لینڈ میں آئی آر اے جو آئے دن کرتا ہے، اس کو علاقائی دہشت گردی کہہ کر ختم کر دیا جاتا

ہے۔ امریکا میں جو کچھ ہوا اس کی سند کے لیے مسلمانوں کو بلا تخصیص ملک و قوم بدنام کرنے کی جو تحریک ہے، اس کو دہشت گردی کا نام دے کر اقوام متحدہ نے بھی اس لفظ کو تسلیمیت دے دی ہے۔ اب جگہ جگہ سیمینار ہوں گے، ورکشاپس ہوں گی کہ دہشت گردی کیا ہوتی ہے اور اس کو ختم کیسے کیا جاسکتا ہے۔

دوسروں کا گریبان پھاڑنے سے پہلے اپنا گریبان بھی دیکھنا چاہیے۔ ڈپلومیسی کے نام پر جھوٹ بول دینا، اپنی جگہ دروغِ مصلحت آمیز ہے اور مناسب ہے مگر وہی اقوام متحدہ کیا کیا کرے گی۔

ہمارے ملکوں سے پیر، فقیر، مذہبی رہنما، ساری دنیا میں خطبے دینے کے نام پر باہر جاتے ہیں اور لاکھوں کروڑوں اسٹرلنگ، ہمارے ہی بہن بھائی، اسلام کی مدد کے نام پر ان کو دیتے ہیں۔ اس کا نہ کوئی حساب ہے نہ کوئی پوچھ گچھ۔ اس طرح ذرا شمالی علاقوں یا پہاڑی علاقوں کی جانب نکل جاؤ، ہر جگہ ہر موڑ پر مسجد کے لیے چندہ مانگنے والے نظر آئیں گے۔ کوئی اسکول بنانے یا ہیلتھ یونٹ کھولنے کے لیے چندہ نہیں مانگتا۔ سرکاری طور پر کچھ کیا جائے مگر یہ حقیقت ہے کہ صرف سرکاری بیت المال سے ۵۰ ہزار مدرسوں کو مالی معاونت ملتی ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری دینی مدارس کیا کام کرتے رہے ہیں، ان کے ان کاموں نے ہی ٹیگور کے کابلی والے کی شکل بدل دی ہے۔

وہ کابل جس کے خوب صورت بازار دیکھ کر اور آزادانہ ماحول دیکھ کر رشک آتا تھا اب اسی کابل کی ویرانی، دھول اور کچے ٹوٹے پھوٹے گھر دیکھ کر ویرانی سی ویرانی نظر میں گھوم جاتی ہے۔

وہی مزارشریف، قندھار اور جلال آباد کہ جہاں اشوک اور مغلوں کے زمانے کے آثار، سیاحوں کو اپنی جانب کھینچتے تھے، وہی سارے شہر کھنڈر سے بھی برے حالوں نظر آتے ہیں۔

امریکا کے تازہ منصوبے کو دیکھتے ہوئے اعتزاز احسن کا کہنا ہے کہ اکیسویں صدی کی یہ تیسری جنگ، ملکی سرحدوں سے ماورا لڑی جائے گی۔ بڑی طاقتوں نے کئی ایسی جنگیں لڑی ہیں جہاں بلا اعلان کیے اور بلا کسی اشتعال کے جنگ چھیڑ دی گئی۔ مثلاً ویت نام کی جنگ، ایران، عراق کویت کی جنگ، کروشیا اور سربیا کی جنگ، اب یہ افغانستان کا فیصلہ کرتے وقت، غریب عوام کی رائے کو نہ پہلے طالبان نے مانا تھا، نہ اب امریکا مان رہا ہے۔ وہ بادشاہ جس کے خلاف بغاوت ہونے کے بعد خانہ جنگی شروع ہوئی اور بادشاہ کو اٹلی جا کر رہنا پڑا، اب وراثتاً اس کے پوتے کے توسط سے بادشاہت بحال کرنے کا منصوبہ امریکیوں کو پسند آرہا ہے۔ عوام کی رائے معلوم کرنے کی

تو ضرورت ہی نہیں ہے۔ امریکا باقی ملکوں میں جمہوریت کی بات کرتا ہے اور وہ سارے اسلامی ممالک کہ جہاں بادشاہت ہے امریکا کی حمایت کرتے ہیں۔ ان کی بادشاہت کو قائم رکھنے کے لیے امریکا کو اپنی فوجیں بھیجنی پڑیں تو اس سے بھی گریز نہیں کرتا ہے۔

جب اقوام متحدہ دہشت گردی کے بارے میں مذمت کی قرارداد پاس کرتی ہے تو اقوام متحدہ کو یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ جو لوگ عوام کے حقوق غصب کرتے ہیں، یہ بھی دہشت گردی ہے۔ جو ملک بلا کسی تخصیص و ضرورت دوسرے ملکوں پر حملہ کرتے ہیں وہ بھی دہشت گردی ہے۔ اگر سوئٹزرلینڈ میں ہونے والی واردات کو دماغی خرابی سے تعبیر کیا جائے اور کشمیر اسمبلی پر حملے کو دہشت گردی، تو دنیا کی آنکھوں کو بندمت تصوّر کیا جائے۔ اس لیے امریکا اور نیویارک میں خود ۲۰ ہزار لوگ مل کر جنگ کے خلاف جلوس نکالتے ہیں۔

ضرورت تو یہ ہے کہ واپس اس کابلی والے کو لایا جائے جو محبت مانگتا ہوا پہاڑوں سے اتر کر آیا تھا۔

ایک افغان لڑکی کی اداسی، تصویر: جوڈتہ مان

برطانیہ کے صحافی رابرٹ فسک خاص طور پر مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں اپنے بے لاگ تجزیوں کے لیے معروف ہیں۔ ان کی دلچسپی کا ایک موضوع افغانستان بھی رہا ہے۔ گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے فوراً بعد لکھا جانے والا ان کا مضمون دنیازاد کی خصوصی اشاعت ''عاشق من الفلسطین'' میں شامل تھا۔ زیر نظر مضامین اسی سے سلسلہ وار ہیں۔

رابرٹ فسک

ترجمہ: آصف فرخی

زلزلے کے امکان سے کانپنے والی دھرتی پر جنگ

روئے زمین کی سب سے زیادہ طاقت ور فوجی قوت نے اب دنیا کی غریب ترین، تباہ حال مسلم قوم پر بم باری شروع کر دی ہے اور چاہے ہمارے بموں کے ساتھ کتنی ہی روٹیاں برسائی جائیں، کیا کوئی مسلمان ہے جو اس کی توثیق کرے گا؟

کیا یہ ممکن ہے، کیا یہ قرین قیاس ہے کہ ہم اتنے پیچیدہ اور اعلا میزائلز بھی ماریں اور افغانستان میں مجرموں کے ساتھ بے گناہوں کو ہلاک نہ کریں؟ ہم یہ کہتے رہیں کہ اسامہ بن لادن اور اس کے ساتھیوں کو سزا دے رہے ہیں۔ ہم چاہے اس پر خود اعتبار بھی کرلیں۔ مگر کیا اسلامی دنیا اس پر یقین کرلے گی؟

پچھلے چار ہفتے میں اشتراک کی بہت بات ہوئی ہے مگر یہ اتحاد ایسا نہیں ہے جس میں کوئی مسلمان حکومت بھی شامل ہو، سوائے اس کے کہ پاکستان، سعودی عرب اور ازبکستان کی ننھی منی آمریت کو بھی اس کے ساتھ ساتھ گھسیٹا جا رہا ہے۔

افغانستان کے آسمانِ شب میں اس وقت کوئی سعودی یا کویتی پائلٹ نہیں ہے۔ یہ اسلامی و مغربی اتحاد نہیں ہے۔ اس میں مغرب اپنے طور پر خود ہی موجود ہے، اور ایک ایسے اسلامی ملک پر بم باری کیے جا رہا ہے جس کا معیارِ زندگی قرونِ وسطیٰ کے قریب ہے۔

بم باری، میرے اندازے کے مطابق، پرائم ٹائم ٹیلی وژن کے وقت سے ہوتی ہے۔ مگر کیا

ہم سمجھتے ہیں کہ جناب بن لادن اوران کے سنگی ساتھی اس طرح پکڑے جائیں گے؟

صدر بش کارروائی کی بات کرتے ہیں۔ مگر یہ آئے گی کہاں سے؟

ہم میں سے جن لوگوں کو کوسوو کی جنگ کا آغاز یاد ہے اور بلکہ عراق کی فضائی بم باری کی ابتداء..... ان کو یاد ہوگا کہ ہمیں کس طرح تسلی دلائی گئی تھی کہ ہمارے مخالفین چند ہی دنوں میں امن کی دہائی دے اٹھیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوا اور اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ طالبان، جو ہمارے دو اتحادی ساتھیوں، پاکستان اور سعودی عرب کا تخلیق کردہ راکھشس ہے، ہتھیار پھینک دیں گے۔

ظاہر ہے کہ ہم جناب بن لادن کے تربیتی کیمپوں میں سے کم از کم بارہ پر میزائل ماریں گے اور بم گرائیں گے۔ اس میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ آخر کو ہم نے..... بلکہ سی آئی اے نے..... ان کو آج سے بیس برس پہلے جناب بن لادن اور ان کے ساتھیوں کے لیے ہی تو بنایا تھا۔

مزید کام کے بعد ہم گونتھ گانتھ کر ایک وسیع تر اتحاد قائم کر لیتے مگر اب ہم جو کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ جہادی ثقافت کے قلب میں اُترے چلے جا رہے ہیں۔

مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ہم نے کل رات کتنے بم گرائے یا آج کتنے گرائے بلکہ یہ کہ اگلے ۲۴ گھنٹے میں دراڑیں کہاں پڑ جائیں گی۔ اس لیے کہ سعودی عرب، پاکستان اور افغانستان دنیا میں سب سے زیادہ خطرناک سیاسی، ساختمانی ارضیات (tectonic plate) پر واقع ہیں۔

اگر اس سے پہلے نہیں تو بدھ کے دن ضرور ہمیں یہ جواب مل جائے گا جب قطر میں اسلامی سربراہ کانفرنس کا افتتاح ہوگا۔ مسلمان سربراہ آپس میں ملتے ہیں تو جو کچھ کہتے ہیں، ان باتوں کو سننا تعجب خیز بلکہ شاید ڈراؤنا بھی ہوگا۔

یہ سچ ہے کہ مسٹر بش نے بم باری اور مجرموں کی تلاش کے اس پیکیج میں انسانی بنیادوں پر امداد ٹھونسنے کی بھی کوشش کر ڈالی ہے۔

حسب معمول ہمیں بتایا گیا ہے کہ افغانی ہمارے دشمن نہیں ہیں۔ یہی ہم نے اس وقت کہا تھا جب ۱۹۹۱ء میں عراق پر بم باری کی تھی اور یہی ہم نے اس وقت کہا تھا جب ۱۹۸۵ء میں لیبیا پر بمباری کی تھی اور یہی امریکیوں نے اس وقت کہا تھا جب انہوں نے ۱۹۸۲ء میں لبنان پر گولہ باری کی تھی اور یہی فی الحقیقت ہم نے مصریوں سے کہا تھا جب ہم نے ۱۹۵۶ء میں نہر سویز کی وجہ سے ان پر بم باری کی تھی۔ مگر کیا اسلامی دنیا یہ مان لے گی؟

اور اکیسویں صدی کی تاریخ کے اس بے آسرا لمحے پر ایک حاشیے کے طور پر، کیا ہم کوئی عدالتی نظام یا عدالتیں یا قانون قائم کر رہے ہیں، اس امر کو یقینی بنانے کے لیے کہ بڑے لوگوں کو قانون کی طرف سے سزا مل سکے؟ یہی وہ واحد جواب ہے جو اگلے چند دن میں ہمارے رہنماؤں کی طرف سے نہیں ملنے والا۔
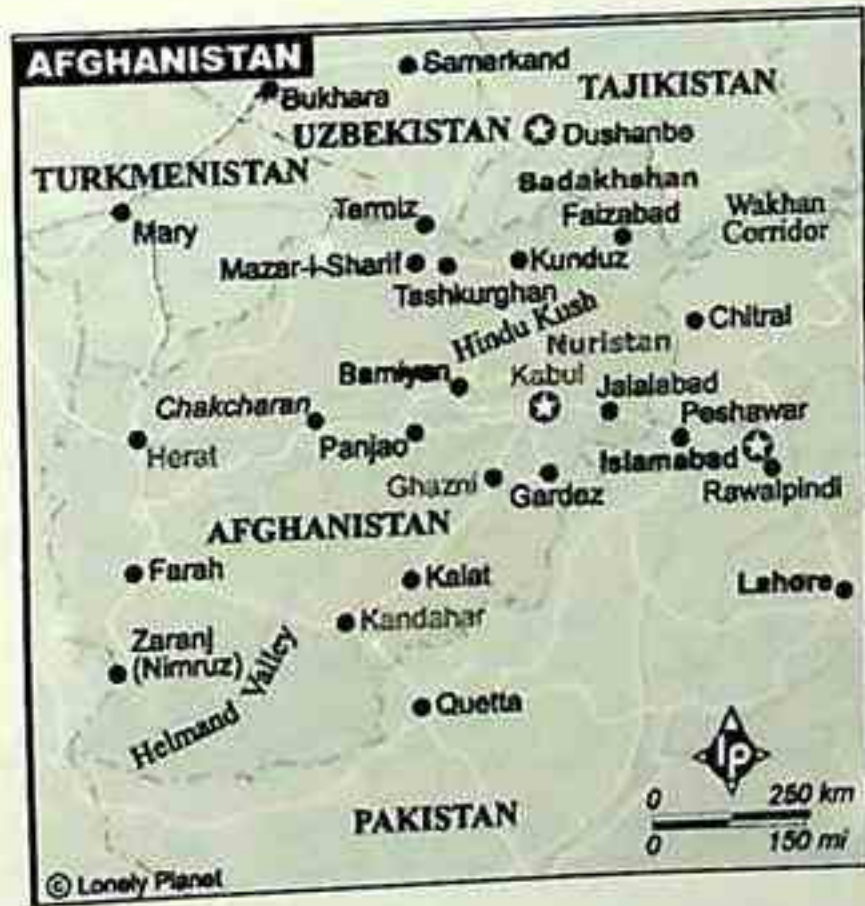
رابرٹ فِسک
ترجمہ: آصف فرخی

منافقت، نفرت اور دہشت گردی کے خلاف جنگ

''فضائی مہم''؟ ''اتحادی افواج''؟ ''دہشت گردی کے خلاف جنگ؟'' آخر ہم اس جھوٹ کو کب تک برداشت کرتے رہیں گے؟ یہاں کوئی ''مُہم'' نہیں ہے...... دُنیا کی سب سے زیادہ امیر اور شائستہ (Sophisticated) قوم کے ہاتھوں دنیا کی سب سے زیادہ غریب اور سب سے زیادہ شکستہ قوم پر فضائی بم باری ہے۔ کوئی مِگ طیارے آسمانوں میں نہیں اڑے کہ امریکی بی ۵۲ یا ایف ۱۸ طیاروں سے جنگ کریں۔ کابل کے اوپر فضا میں مار کرنے والا واحد اسلحہ ان روسی طیارہ شکن توپوں سے آتا ہے جو ۱۹۴۳ء میں بنائی گئی تھیں۔

''اتحاد؟'' ذرا ہاتھ اٹھائیں وہ لوگ جنھوں نے قندھار کے آسمان میں جرمنی کی لفت وافے کو دیکھا ہے یا اطالوی فضائیہ یا فرانسیسی فضائیہ کو ہرات کے اوپر دیکھا ہے۔ یا پاکستانی فضائیہ ہی کو دیکھا ہے۔ افغانستان پر بم باری امریکی کر رہے ہیں اور اس میں چند ایک برطانوی میزائل بھی ڈال دیے ہیں۔ خوب ''اتحادُ'' ہے۔

اور پھر ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' ہم جافنا کے جزیرہ نما پر بم باری کرنے کے لیے کب آگے بڑھ رہے ہیں؟ یا چیچنیا پر جس کو ہم نے پہلے ہی ولادیمیر پیوٹن کے خون آلود ہاتھوں میں دے دیا ہے۔ مجھے تو گاڑی میں رکھا ہوا بہت بڑا دہشت گرد بم بھی یاد آ رہا ہے جو بیروت میں ۱۹۸۵ء میں پھٹا تھا...... جس کا نشانہ سید حسن نصر اللہ تھے، آج کے حزب اللہ کے روحانی محرّک، جو اب واشنگٹن کے قتل نامے (''ہٹ لسٹ'') میں دوبارہ شامل ہو گئے ہیں...... اور جس بم سے نصر اللہ تو بچ گئے مگر ۸۵ بے گناہ لبنانی شہری موت کے گھاٹ اتر گئے۔ برسوں بعد کارل برن اسٹائن نے اپنی کتاب ''پردہ'' میں انکشاف کیا کہ اس بم کے پیچھے سی آئی اے کا ہاتھ تھا جب سعودی عرب نے اس کارگزاری کے لیے رقم فراہم کرنے پر حامی بھر لی تو کیا صدر بش اس میں ملوث ہونے والے سی آئی اے کے قاتلوں کو بھی ڈھونڈ کر پکڑیں گے؟ ہرگز بھی نہیں۔

تو پھر آخر سی این این اور اسکائی اور بی بی سی کے میرے سارے یار دوست خرگوشوں کی طرح ان ہی الفاظ کے سہارے کیوں پھدک رہے ہیں...... ''فضائی مہم''، ''اتحادی افواج'' اور ''دہشت گردی کے خلاف جنگ''۔ کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ناظرین اس سب بکواس پر یقین کرلیں گے؟

ظاہر ہے کہ مسلمان تو نہیں کریں گے۔ درحقیقت، اس احساس کے لیے آپ کو پاکستان میں زیادہ عرصہ گزارنے کی ضرورت نہیں کہ پاکستانی پریس اس ''جنگ'' کے بارے میں نیویارک ٹائمز کے مقابلے میں...... بے انتہا زیادہ حقیقی اور متوازن احوال شائع کرتا ہے...... مقامی دانش وروں، مورّخوں اور حزب اختلاف کے مصنفوں کے ساتھ ساتھ طالبان کے تبصرے اور حکومت نواز بیانات اور ان کے ساتھ ساتھ سنڈیکیٹڈ مغربی تجزیے۔ اور یاد رہے کہ یہ سب ایک فوجی آمریت کے ملک میں۔

آپ کو مشرقِ وسطیٰ اور برصغیر میں چند ہفتے ہی گزارنے کی ضرورت ہے کہ ''الجزیرہ'' اور ''لیری کنگ لائیو'' پر ٹونی بلیئر کے انٹرویوز مٹر کے دانوں کے پہاڑ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ بیروت کے روزنامہ ''السفیر'' نے بہت سراہا جانے والے ایک اداریہ شائع کیا جس میں یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ آخر ایسا کیوں ہے کہ ایک عرب جو کروڑوں دوسرے عربوں کے غصّے اور ذلت کا اظہار کرنا چاہتا ہے، ایک غیر عرب ملک کے غار سے ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ اس میں یہ بات مضمر تھی کہ...... گیارہ ستمبر کو انسانیت کے خلاف کیے جانے والے جرائم کے بجائے یہی سبب ہے کہ امریکا اسامہ بن لادن کو ٹھکانے لگا دینا چاہتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ موثر پاکستانی اخبار کا وہ سلسلہ مضامین ہے جو ستمبر کے نفرت انگیز سانحے کے بعد امریکا میں گرفتار کیے جانے والے مسلمانوں کے ساتھ شرم ناک برتاؤ کے بارے میں ہیں۔

ان میں سے ایک مضمون کافی ہے۔ لاہور کے ''دی نیوز'' میں ''نفرت کے شکار کا روزنامچہ'' کی سُرخی کے ساتھ شائع ہونے والے اس مضمون میں حسنین جاوید کی تکلیف کا بیان ہوا ہے جو ویزا ختم ہوجانے کے جرم میں ۱۹ ستمبر کو الباما میں گرفتار کیا گیا۔ کس سی پی کے جیل میں اسے ایک قیدی نے مارا پیٹا اور اس کا ایک دانت بھی توڑ دیا۔ پھر، خطرے کی گھنٹی بجا دینے کے بھی بہت دیر بعد، مزید آدمیوں نے اسے دیوار سے لگا کر ان الفاظ کے ساتھ مارا: ''اے بن لادن، یہ پہلا راؤنڈ ہے۔ اس طرح کے دس راؤنڈ اور ہوں گے۔'' پاکستانی اخبارات میں اس طرح دس مضامین ہیں اور

ان میں سے بیش تر سچ معلوم ہوتے ہیں۔

ایک بار پھر "اسلام" کے لیے مغرب کے نام نہاد "احترام" کی منافقت سے مسلمان بہت برافروختہ ہوئے ہیں۔ ہم نے ساری دنیا کو اطلاع دے دی ہے کہ رمضان کے مقدس مہینے کے دوران افغانستان میں فوجی کارروائی روک نہیں دیں گے۔ آخر کو ۸۸۔۱۹۸۰ء کا عراق ایران تصادم بھی رمضان میں چلتا رہا تھا اور عرب اسرائیلی تصادم بھی جاری رہتا ہے۔ بالکل سچ ہے۔ تو پھر ہم نے پچھلے مہینے کے پہلے جمعے کو اسلام کے "احترام" میں بم باری بند کرنے پر اس قدر تماشا کیوں کیا تھا؟ کیا اس وقت ہم آج کے مقابلے میں زیادہ احترام کے جذبات محسوس کر رہے تھے؟ یا پھر اس لیے کہ...... طالبان پائمال نہیں ہو سکے ہیں...... ہم نے اس سارے "احترام" کو بھول جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

"میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ بن لادن کو ہمارے مذہب سے الگ کر کے کیوں دیکھنا چاہ رہے ہیں" پشاور کے ایک صحافی نے چند دن پہلے مجھ سے کہا۔ "ظاہر ہے کہ آپ ہمیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ مذہبی جنگ نہیں ہے، مگر مسٹر رابرٹ، پلیز، پلیز، ہمیں یہ بتانا بند کر دیجیے کہ آپ اسلام کا کس قدر احترام کرتے ہیں۔"

ایک اور پریشان کن دلیل ہے جو میں پاکستان میں سُن رہا ہوں۔ اگر، جیسا کہ مسٹر بش دعویٰ کرتے ہیں، نیویارک اور واشنگٹن پر کیے جانے والے حملے "تہذیب" کے خلاف کیا جانے والا وار تھے تو پھر کیوں نہ مسلمان افغانستان پر حملے کو اسلام کے خلاف جنگ سمجھیں؟

پاکستانیوں نے بڑی سُرعت کے ساتھ آسٹریلیا کی منافقت کو بھانپ لیا۔ بن لادن کے خلاف جنگ میں کود پڑنے کے لیے بے چین ہونے کے باوجود آسٹریلیا نے مسلح افواج کو تعینات کیا ہے کہ بے آسرا افغان پناہ گزینوں کو اپنے علاقائی سمندر سے باہر نکال دیں۔ آسٹریلیا کے لوگ افغانستان پر بم مارنا چاہتے ہیں...... وہ افغانیوں کو بچانا نہیں چاہتے۔ یہاں یہ اضافہ کرنا چاہیے کہ پاکستان پچیس لاکھ افغان پناہ گزینوں کا میزبان ہے۔ یہ کہنا بے کار ہے کہ یہ تفاوت ہمارے سیٹلائٹ چینلز پر زیادہ توجہ کا موجب نہیں بنتا۔ بلکہ میں نے صحافیوں کے خلاف غم و غصے کا اتنا اظہار کبھی نہیں سنا جتنا کہ ان چند ہفتوں میں پاکستان میں سنا ہے اور نہ میں اس پر متعجب ہوں۔

تو پھر آخر ہم امریکا کے اس نام نہاد "لبرل" ٹیلی وژن صحافی جیرالڈو رویرا کو کیا سمجھیں جو مرڈاک کے ایک چینل، فاکس ٹی وی منتقل ہو گیا ہے؟ "میں اپنی زندگی کے کسی بھی دور سے زیادہ

حب الوطنی کے جذبات محسوس کر رہا ہوں، انصاف کے لیے بے چین ہوں، یا پھر شاید انتقام کے لیے،'' اس نے اس ہفتے اعلان کیا۔ ''اور میں جس تزکیہ نفس سے گزرا ہوں اس نے مجھے اپنی معاش کے وسیلے کے بارے میں دوبارہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔'' یہ واقعی سراسیمہ کر دینے والی بات ہے۔ یہاں ایک امریکی صحافی انکشاف کر رہا ہے کہ وہ شاید ''انتقام کے لیے بے چین ہے۔''

اس سے بے انتہا زیادہ شرم ناک اور غیر اخلاقی سی این این کے چیئرمین والٹر ایزاک سن کے سوقیانہ الفاظ تھے جو انہوں نے اپنے عملے کو مخاطب کر کے کہے تھے۔ افغانستان کی مصیبت کا حال دکھانا دشمن کے پروپیگنڈا کا خطرہ مول لینا ہے، انہوں نے کہا۔ ''افغانستان کی مشکلات یا ہلاکتوں پر زیادہ توجہ مرکوز کرنا شرانگیز معلوم ہوتا ہے...... ہمیں یہ بتانا چاہیے کہ طالبان کس طرح شہریوں کو ''انسانی ڈھال'' کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ اس کس طرح طالبان نے ان دہشت گردوں کو پناہ دی ہے جو پانچ ہزار کے لگ بھگ لوگوں کی موت کے ذمہ دار ہیں۔

مسٹر ایزاک سن ''ٹائم میگزین'' کے تخیل سے عاری سربراہ تھے مگر ان کے تازہ ترین الفاظ سی این این کی مفروضہ غیر جانب داری کو کہیں زیادہ نقصان پہنچائیں گے۔ شرانگیز؟ مگر شرانگیز کیوں؟ افغانیوں کی اموات مسٹر ایزاک سن کی ہم دردی کے جدول میں اس قدر نیچے کیوں ہیں؟ یا پھر مسٹر ایزاک محض ان احکامات پر عمل درآمد کر رہے ہیں جو چند دن پیش تر، وہائٹ ہاؤس کے ترجمان ایری فلیشر نے ان کے لیے طے کر دیے تھے، جنہوں نے بڑے طمطراق کے ساتھ واشنگٹن کے صحافیوں کے جمگھٹے کے سامنے اعلان کیا تھا کہ ایسے زمانے میں ''لوگوں کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور دیکھنا چاہیے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔''

یہ کہنا بے کار ہوگا کہ سی این این، امریکی حکومت کے اس مطالبے کے سامنے ڈھیر ہوگیا کہ بن لادن کے الفاظ پورے کے پورے نشر نہ کیے جائیں۔ مبادا ان میں مخفی علامتی پیغامات موجود ہوں۔ مگر یہ علامتی پیغامات ٹی وی پر ہر ایک گھنٹے کے بعد چل رہے ہیں۔ یہ ہیں ''فضائی حملہ''، ''اتحادی افواج'' اور ''دہشت گردی کے خلاف جنگ۔''
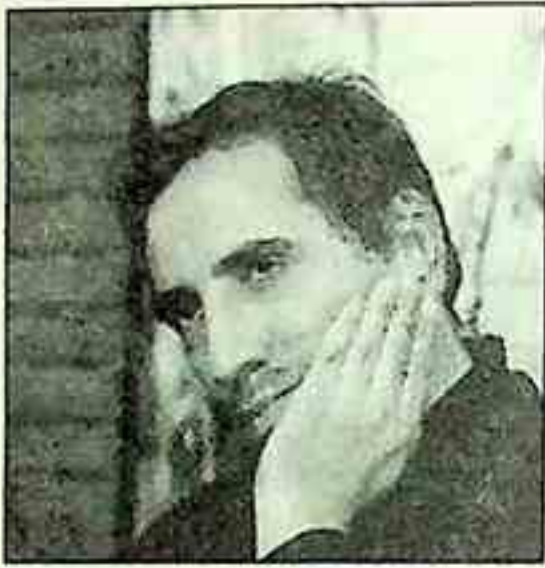
محسن مخمل باف معاصر ایران کے ممتاز ترین فلم ساز ہیں۔ شہنشاہی دور میں وہ قیدو بند جھیلتے رہے۔ انہوں نے حالیہ برسوں میں دو فلمیں افغانستان کے حوالے سے بنائی ہیں، جن میں سے "قندھار" کو خاص طور پر اہمیت حاصل ہے۔ مخمل باف نے افغانستان کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس کی روشنی میں اس ملک کے حالیہ واقعات کا جائزہ لیا ہے۔ ان کا مفصل مقالہ تہران کے جریدے "ایرانین" میں ۲۰، جون ۲۰۰۱ء کی اشاعت میں سامنے آیا۔ اس تفصیلی مقالے کے اہم حصوں کا ترجمہ ممتاز شاعرہ اور نثر نگار فہمیدہ ریاض نے کیا ہے۔

محسن مخمل باف
ترجمہ: فہمیدہ ریاض

لاوارث سرزمین — افغانستان

میں پیدل چلتا آیا تھا اور پیدل ہی لوٹ جاؤں گا۔
وہ اجنبی جس کے پاس پونجی کی صندوقچی نہ تھی۔
وہ چلا جائے گا
اور وہ بچہ جس کے پاس کوئی گڑیا نہ تھی، چلا جائے گا
میری جلاوطنی پر چھایا سحر آج رات ٹوٹ جائے گا
اور وہ میز جو خالی رہی تہہ کر کے رکھ دی جائے گی
دکھ جھیلتا میں افق پر آوارہ گردی کرتا رہا
تم سب نے جسے آوارہ گردی کرتے دیکھا وہ میں ہی تھا
میں وہ بھی چھوڑ جاؤں گا جو میرے پاس ہے ہی نہیں

میں پیدل چلتا آیا تھا اور پیدل ہی لوٹ جاؤں گا

(ہرات کا ایک شاعر جسے ایران کی سرحد سے واپس بھیج دیا گیا)

افغانستان باقی دنیا کے لیے منشیات پیدا کرنے والا ایک ملک ہے، جہاں وحشی مذہبی جنونی رہتے ہیں جو اپنی عورتوں کو ایسے دبیز پردوں میں ڈھانپے رہتے ہیں جن میں ایک باریک سی درز بھی نہیں ہوتی۔

مگر شاید سنانے کو ایک اور کہانی بھی ہے۔ میں نے افغانستان میں سفر کیا ہے اور وہاں کی زندگی کے حقائق سے واقف ہوا ہوں۔ تیرہ برس کے دوران میں نے افغانستان پر دو فیچر فلمیں بنائیں۔ ۱۹۸۹ء میں "سائیکل والا" اور ۲۰۰۱ء میں "قندھار"...... ان کے لیے میں نے کافی تحقیق کی، کتابوں اور دستاویزات کا مطالعہ کیا۔ اس لیے میرا افغانستان کچھ اور ہے۔ پیچیدہ، مختلف، الم ناک ..... مگر یہ تصویر زیادہ صاف اور واضح ہے۔ یہ غیر مبہم ہے۔ اس پر ناواقفیت کی دھند نہیں چھائی ہوئی۔ اس تصویر کو پوشیدہ رکھنے یا نظر انداز کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسے دنیا کی توجہ کی ضرورت ہے۔

اعداد و شمار کا المیہ

۱۹۹۲ء میں افغانستان کی آبادی دو کروڑ تھی۔ سوویت حملے کے بعد سے اب تک ۲۵ لاکھ افغان براہ راست یا بالواسطہ طور پر جنگ کا شکار ہو کر ہلاک ہو چکے ہیں۔ یہ لوگ یا میدانِ جنگ میں کام آئے یا فاقوں اور بروقت طبی امداد نہ ملنے کے باعث مر گئے۔ دوسرے الفاظ میں ہر سال ایک لاکھ پچیس ہزار افغان مرتے رہے۔ ہر گھنٹے چودہ افغان موت کا شکار ہوئے۔ اسی طرح ہر پانچ منٹ پر ایک افغان مر جاتا ہے یا مار دیا جاتا ہے۔ بین الاقوامی ذرائع ابلاغ نے روسی جوہری آبدوز کے غرق ہونے کی خبر لوگوں تک پل پل پہنچائی۔ بامیان میں بدھ کے مجسمے کی تباہی کی خبر لوگوں تک وسیع پیمانے پر پہنچی۔ مگر گزشتہ بیس برس میں ہر پانچ منٹ پر ایک افغان کی موت کی خبر کے لیے عالمی ذرائع ابلاغ کے پاس وقت نہیں تھا۔

اس سے بھی زیادہ الم ناک افغان پناہ گزینوں کا مسئلہ ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق ایران اور پاکستان میں چھتیس لاکھ افغان پناہ گزین موجود ہیں (حالیہ واقعات کے بعد ان کی تعداد کہیں زیادہ ہو چکی ہوگی۔ مُدیر) اگر وقت کے پیمانوں میں ان اعداد کو تقسیم کیا جائے تو بیس برس کے دوران ہر منٹ پر ایک افغان پناہ گزین بنتا رہا ہے۔ ان میں وہ افغان شامل نہیں جو خانہ جنگی

سے متاثر ہوکر اندرونِ ملک مسلسل شمال سے جنوب اور جنوب سے شمال کی سمت پناہ ڈھونڈنے کے لیے ہجرت کرتے رہے ہیں۔

میرے علم میں ایسی کوئی دوسری مثال نہیں ہے جب کہ ایک قوم کی آبادی، فطری اموات کے باعث دس فیصد اور ہجرت کے باعث تیس فیصد کم ہوگئی ہو اور اس ہولناک المیے کو دنیا نے اس طرح نظر انداز کردیا ہو۔

ایران افغانستان سرحد پر داغرون کے مقام پر ایک بورڈ آویزاں ہے، ''خبردار رہیے۔'' یہ بورڈ لوگوں کو بارودی سرنگوں سے خبردار کرنے کے لیے لگایا گیا ہے۔ اس پر لکھا ہے:

''ہر چوبیس گھنٹوں کے دوران افغانستان میں سات افراد بارودی سرنگوں پر اَن جانے میں قدم رکھ دیتے ہیں۔ خبردار رہیے کہ آج یا کل آپ کا شمار ان لوگوں میں نہ ہو۔''

ریڈ کراس کے ایک کیمپ میں مجھے مزید معلومات حاصل ہوئیں۔ ایک کینیڈین گروپ یہاں بارودی سرنگوں کو ناکارہ بنانے کے لیے آیا تھا لیکن جب اسے اس کام کے ناقابلِ تصور پیمانے کا اندازہ ہوا تو وہ مایوس ہوکر واپس چلا گیا۔ افغانستان کی زمین پر بارودی سرنگیں رگ و ریشے کی طرح پھیل چکی ہیں۔ اگر افغان انجانے میں ان پر قدم رکھتے رہیں تب آنے والے پچاس برسوں میں ان کا خاتمہ ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ بغیر کسی جنگی حکمت عملی کے منصوبے یا نقشے کے ہر جنگی گروہ نے ہر دوسرے گروہ کے خلاف بارودی سرنگیں بچھائی ہیں۔ جب زور کی بارش ہوتی ہے اور پانی زمین میں رستا ہے تو سرنگیں جگہ بدلتی جاتی ہیں اور دور دراز کے راستے جو پہلے محفوظ تھے وہ بھی ہلاکت خیز بن جاتے ہیں۔ اس طرح ایک پوری قوم نے بارودی سرنگوں کے ذریعے اپنے آپ کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالنے کا سامان کرلیا ہے۔ لیکن کیا اس میں ان طاقت ور ہمسایہ ملکوں کا بھی ہاتھ نہیں جو اس خطے میں اپنی سیاست کی خاطر کسی ایک یا دوسرے گروہ کی پشت پناہی کرتے رہے ہیں اور جنھوں نے مخالف گروہ کو ان علاقوں سے بھگا دینے کے بعد بھی بارودی سرنگوں کو ہٹا کر یہاں رہنے والوں کی زندگی کو کچھ کم ہلاکت خیز بنانے کی ذرا بھی ضرورت محسوس نہ کی۔

تو پھر افغان یہاں سے ہجرت کیوں نہ کرجائیں؟ اب یہاں تباہی اور موت کے مسلسل خوف کے سوا رہ ہی کیا گیا ہے؟ جس قوم کی تیس فیصد آبادی ہجرت کرچکی ہے اس کے پاس مستقبل کے لیے کیا ہو سکتی ہے اور کوئی غیر یہاں تعمیری کام کرنے کیوں آئے گا؟ منشیات فروشوں کے سوا دوسرے کاروباری اپنا سرمایہ اس سرزمین پر نہیں لگاتے اور سیاسی ماہرین افغانستان پر اپنے اجلاس مغربی دنیا کے

شان دار شہروں میں کرتے ہیں۔ ترقیاتی ماہرین محفوظ فاصلے سے اپنی قیمتی آراء بھیجتے رہتے ہیں۔ اس سرزمین کا ہولناک المیہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے کوئی مبصر یہاں نہیں آتا۔

ہرات کے پاس میں نے بیس ہزار مرد، عورتیں اور بچے دیکھے جو فاقہ زدگی سے قریب المرگ تھے۔ ان میں چلنے کی سکت باقی نہیں تھی اور وہ زمین پر ادھر اُدھر پڑے موت کے منتظر تھے۔ یہ حالیہ قحط کا نتیجہ تھا۔ اس دن اقوام متحدہ کی ہائی کمشنر برائے پناہ گزین سادا کو اوگا تا بھی وہاں آئیں تھیں اور انہوں نے ان لوگوں سے وعدہ کیا تھا کہ بین الاقوامی امداد ان تک پہنچے گی۔ میڈم اوگا تا نے فاقہ زدگی سے قریب المرگ افغانوں کی تعداد دس لاکھ بتائی تھی۔ اس لمحے مجھے محسوس ہوا تھا کہ بامیان میں بدھ کا مجسمہ شاید دھماکے سے ریزہ ریزہ نہیں کیا گیا۔ شاید گوتم بدھ انسانیت کی بے حسی پر شرم سے ٹوٹ کر بکھر گئے۔ ان کی عظمت بے سود ثابت ہوئی۔

تاجکستان میں، دوشنبے میں، میں نے ایک لاکھ افغانیوں کو شمال سے جنوب کی جانب پیدل بھاگتے ہوئے دیکھا۔ یہ روزِ محشر کا منظر تھا۔ دنیا بھر کے ٹیلی وژنوں اور سینما گھروں میں ایسے منظر کبھی نہیں دکھائے جاتے۔ جنگ کے باعث خستہ حال اور فاقہ کش بچے میلوں ننگے پیر بھاگتے رہے تھے۔ پناہ حاصل کرنے کے لیے دوڑتے اس ہجوم پر تاجکستان کی سرحد پر حملہ کیا گیا اور انہیں پناہ دینے سے انکار کر دیا گیا۔ تاجکستان اور افغانستان کی سرحد کے درمیان، اس علاقے میں جو کسی کا بھی نہیں تھا، ہزاروں افغانوں نے دم توڑ دیا اور نہ آپ کو خبر ہوئی نہ کسی اور کو پتہ چلا۔ ایک تاجک شاعر نے لکھا ہے ''یہ عجب نہیں کہ افغانستان کے عظیم المیے پر کوئی غم سے مرجائے۔ عجب تو یہ ہے کہ اس الم سے کوئی اب تک جاں بر کیوں کر رہا۔''

بے توجہی افغانستان کا مقسوم شاید اس لیے بنی کیوں کہ یہ ایک بے عکس و بے تصویر خطّہ ہے۔ افغان عورت بے چہرہ ہے، یعنی دو کروڑ آبادی میں سے ایک کروڑ نادیدہ ہے۔ جس قوم کا نصف نادیدہ ہو، اس کا کوئی عکس، کوئی تصویر نہیں بن پاتی۔ برسوں سے یہاں ٹیلی وژن براڈ کاسٹنگ بھی نہیں ہوئی ہے۔ صرف دو صفحوں پر مشتمل کچھ اخبارات شائع ہوتے ہیں، جیسے ''شریعت'' اور ایک دو اور بھی ہیں۔ ان میں صرف تحریر ہوتی ہے۔ تصویر کبھی نہیں ہوتی۔ افغانستان میں صحافت کا حاصل جمع بس یہ چیتھڑے ہیں۔ مذہب کے نام پر مصوری اور فوٹو گرافی کو ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ اب یہاں کوئی سنیما گھر نہیں رہا۔ افغانستان پر کوئی فلم نہیں بنائی گئی۔ ہاں امریکا نے افغان جنگ کے بارے میں ''ریمبو'' نامی فلم بنائی تھی۔ اس فلم میں ایک ہی منظر کی فوٹو گرافی مشرق میں

ہوئی ہے، جو پشاور میں ریمبو کی موجودگی کے بارے میں ہے۔ لیکن اداکار یہاں نہیں لائے گئے۔ اسے بیک پروجیکشن کے ذریعے تیار کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد بھی صرف اتنا تھا کہ ناظرین میں ذرا دلچسپی پیدا کی جائے۔ ایک ایسے ملک کے بارے میں جو فاقہ زدگی کے باعث موت سے ہم کنار ہے اور جنگ کے باعث اپنی تیس فیصد آبادی سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے، ہالی ووڈ بس اس درجے کی ہی فلم بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ افغانستان کی تاریخ اور جغرافیہ کے باوجود یہ ملک بے عکس اور بے نام ونشان ہے۔

بے عکس سرزمین کی تاریخ

دنیا کے نقشے پر افغانستان ایران سے علیحدہ ہونے پر نمودار ہوا۔ ڈھائی سو برس پہلے یہ ایران کے وسیع صوبے خراسان کا حصہ تھا۔ اس دور میں ہندوستان سے واپس لوٹتے ہوئے ایک رات گوچان میں نادر شاہ کا قتل ہوگیا۔ اس کی فوج کا ایک کمان دار احمد شاہ ابدالی چار ہزار سپاہ سمیت فرار ہوگیا اور اس نے خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ احمد شاہ ابدالی پشتون تھا اس لیے اس خطے کے دوسرے قبائل، تاجک، ہزارہ اور ازبکوں کے لیے اس کی مطلق العنان حکمرانی قابل قبول نہ ہوتی اسی لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہر قبیلے پر اس کے سردار کی ہی حکومت ہوگی۔ ان سب سرداروں کا ایک قبائلی وفاق بن گیا جسے لویہ جرگہ کہا جاتا ہے۔ تب سے آج تک یہاں کوئی بہتر یا زیادہ منصفانہ نظام حکومت نہیں بنا۔

اسی طرح افغانستان معاشی لحاظ سے زرعی دور سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا ہے۔ افغان قبائل کا مجموعہ رہے ہیں، قوم نہیں بن سکے ہیں۔ کسی افغان کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو اس کا قبیلہ ہے۔ یہاں کا بڑا سردار ہمیشہ پشتون رہا ہے۔ (صرف بچہ سقہ، یا حبیب اللہ گالیھکانی کے نو ماہ کے دورِ اقتدار یا تاجک برہان الدین ربانی کی دو سالہ حکومت کے دوران یہ اصول بدلا ہے۔)

افغانستان اور ایران کی سرحد پر، نیاتک کے پناہ گزینوں کے کیمپ میں، ہزارہ اور پشتون بچوں کو ایک ساتھ کھیل میں شامل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ ایک دوسرے کو مار پیٹ سکتے ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے کو "مخالف" سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے کی مسجد تک میں قدم نہیں رکھتے۔ کبھی کبھی فلم دکھانے کے لیے ان کے بچوں کو ایک قطار میں بٹھانا پڑتا تھا تو بڑی مشکل پیش آتی تھی۔

قبیلہ پرستی افغانستان میں اس لیے قائم و دائم ہے کیوں کہ یہاں کی معیشت صرف زراعت تک محدود رہی ہے۔ ہر قبیلہ اپنی وادی کی جغرافیائی حدود میں قید ہے اور کوہستانی معیشت سے پیدا ہونے والی رسوم و رواج کا غلام ہے۔ یہ قبائلیت ان وادیوں کی طرح گہری ہے جہاں یہ بستے

ہیں۔ ان میں ساٹھ لاکھ پشتون قبائل تعداد میں سب سے زیادہ ہیں۔ دوسرے نمبر پر تاجک ہیں جن کی تعداد چالیس لاکھ ہے۔ پھر ہزارہ اور ازبک ہیں جو دس اور بیس لاکھ کے قریب ہیں۔ دوسرے چھوٹے چھوٹے قبائل بھی ہیں جیسے جماغ، بلوچ، ترکمان، غمارس اور قزلباش۔ پشتونوں کا اجتماع جنوب میں ہے اور تاجک شمالی علاقوں میں آباد ہیں جب کہ ہزارہ وسطی حصوں میں رہتے ہیں۔ اس نسلی تقسیم کے باعث یا تو یہ خطہ علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں میں بٹ جائے گا اور یا قبائل لویا جرگہ کے ذریعے ایک وفاقی نظام چلاتے رہیں گے۔ کوئی تیسری صورت اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جبکہ یہاں کی معیشت زراعت کے سوا کوئی دوسری شکل بھی اختیار کرسکے۔ لیکن فی الحال دنیا کے بازار میں بیچنے کے لیے افغانوں کے پاس منشیات کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اسی لیے وہ خود میں سمٹ گئے ہیں اور دنیا بھر سے بھی کٹ گئے ہیں۔

افغان کسان کی دنیا اس کی وادی ہے اور جب قحط نہ پڑے تو اس کی کھیتی باڑی۔ اس کے سماجی مسائل قبائلی نظام حل کرتا ہے۔ عالمی معیشت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ منشیات کی تجارت کی بین الاقوامی مالیت اسّی بلین ڈالر ہے اور یہ اسی بنیاد پر قائم ہے کہ افغانستان کے حالات اور یہاں کی معیشت میں ذرا بھی تبدیلی نہ آئے۔ کیوں کہ حالات ذرا بھی بدلے تو اسّی بلین امریکی ڈالر فی الفور خطرے میں پڑجائیں گے۔ اس لیے اس ناجائز بیوپار سے بھی افغانستان کو زیادہ منافع کمانے نہیں دیا جاتا کیوں کہ دولت آنے سے یہاں تبدیلی بھی آسکتی ہے۔ منشیات کے کاروبار سے افغانوں کو پانچ کروڑ ڈالر کی سالانہ آمدنی ہوتی ہے۔ تین کروڑ ڈالر سالانہ شمالی علاقے کی گیس کی فروخت سے پیدا ہوتے ہیں۔ کل ملا کر سات کروڑ ڈالر بنتے ہیں۔ ۲ کروڑ لوگوں کی یہ کل سالانہ آمدنی ہے۔ اگر انہیں فی کس تقسیم کیا جائے تو ایک افغان کو دن بھر میں دس سینٹ ملیں گے۔

جغرافیے کے نتائج

افغانستان کا کل رقبہ سات لاکھ مربع کلومیٹر ہے۔ لوگ گہری وادیوں میں رہتے ہیں۔ جن کے چاروں طرف بلند و بالا پہاڑ ہیں۔ یہ پہاڑ قبائل کو بیرونی حملے سے محفوظ رکھتے ہیں لیکن بیرونی تہذیب اور کاروباری سرگرمیوں کو بھی علاقے سے باہر رکھتے ہیں۔ ملک کا ۷۵ فیصد علاقہ پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ اس وجہ سے ملک میں بڑی منڈیاں بنانا مشکل ہے اور زرعی پیداوار کو شہروں تک لے جانا بھی دشوار ہے۔ جدید ہتھیاروں کے باوجود جنگ کرنے میں بہت وقت لگتا ہے اور ختم کرنا ناممکن نظر آتا ہے۔ تعمیر نو اور بھی مہنگی ہوتی ہے۔ اگر افغانستان کی سرزمین اس قدر دشوار گزار نہ

ہوتی تو یقیناً یہاں کے لوگوں کا معاشی، سیاسی، فوجی اور تہذیبی مقسوم کچھ اور ہوتا۔

موجودہ حالات میں یہ زمین اپنے باسیوں کو کسی بھی معاشی ترقی کے بغیر صرف آدھا پیٹ کھانا مہیا کر سکتی ہے۔ افغانوں کی اوسط عمر اکتالیس برس ہوتی ہے۔ دو سال سے کم عمر کے بچوں کی شرح اموات ہر ہزار پر ۱۹۲ سے ۲۰۰ تک ہے۔ درحقیقت حالیہ برسوں میں افغانوں کی عمر کا اوسط مزید کم ہو گیا ہے۔ جب حالات یہ ہیں تو پھر آخر افغان اپنا پیٹ کیسے پالتے ہیں؟ وہ یا ایران میں مزدوری کرتے ہیں، یا سیاسی جنگوں میں لڑتے ہیں، اسمگلنگ کرتے ہیں اور یا پھر طالبان کے مدرسوں میں مذہبی تعلیم لینے کے لیے بھرتی ہو جاتے ہیں۔ ایران کی سرحد پر اقوام متحدہ ہر ایسے افغان کو بیس ڈالر دیتی ہے جو افغانستان واپس جانے پر راضی ہو، انہیں بس میں بٹھا کر افغانستان کے کسی قریبی شہر تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ لیکن افغانستان میں روزگار کی کوئی بھی امید نہیں ہونے کے باعث وہ فوراً واپس لوٹ آتا ہے اور بیس ڈالر حاصل کرنے کے لیے پھر سے قطار میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ بے روزگار افغان کسی بھی چیز کو باقاعدہ پیشے کے طور پر اپنا لیتا ہے۔ لیکن موت کی فصل پھر بھی جا بجا اگتی رہتی ہے۔ میں وہ راتیں کبھی فراموش نہیں کر سکا جب میں فلم ''قندھار'' بنا رہا تھا۔ رات کو ہماری ٹیم فلیش لائٹ ڈال کر مناسب لوکیشن ڈھونڈتی تھی۔ اس وقت ہمیں پناہ گزین بھیڑوں کے گلوں کی طرح قریب المرگ ریت پر پڑے نظر آتے تھے۔ ایک بار جب ہم ایسے کچھ لوگوں کو ہیضے کا شکار سمجھ کر زابل کے اسپتال لے گئے تو وہاں ہمیں بتایا گیا کہ وہ بیمار نہیں تھے۔ وہ صرف بھوک سے مر رہے تھے۔

زابل میں پناہ گزینوں کا کیمپ کوئی قید خانہ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ افغان جو قحط یا طالبان

پاکستان میں واقع مہاجر کیمپ سے، تصویر: جوڈتھ مان

کے حملوں کی وجہ سے اپنا وطن چھوڑ کر بھاگے تھے انہیں سیاسی پناہ دینے سے انکار کر دیا گیا تھا۔ بہ ظاہر تو یہ منطقی اور قانونی بات تھی۔ وہ لوگ جو غیر قانونی طور پر کسی دوسرے ملک میں داخل ہوتے ہیں انہیں واپس بھیج ہی دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ لوگ فاقہ زدگی سے قریب المرگ تھے۔ کیمپ اتنے زیادہ لوگوں کو خوراک مہیا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا تھا اور ان لوگوں نے ایک ہفتے سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ وہ صرف پانی پیتے رہے تھے۔ ہم نے انہیں کھانا دینے کی پیشکش کی۔ ہم چار سو افغانوں کے لیے کھانا لائے۔ ان میں ایک ماہ کے بچے سے لے کر ۸۰ برس کے بوڑھے تک شامل تھے۔ زیادہ تر چھوٹے چھوٹے بچّے تھے جو بھوک سے اپنی ماؤں کی گود میں بے ہوش ہو گئے تھے۔ ہم ایک گھنٹے تک روتے رہے اور ان کے درمیان روٹی اور پھل تقسیم کرتے رہے۔ کیمپ کی انتظامیہ افسوس کرتی رہی انہوں نے کہا کہ بجٹ پاس ہونے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ کہتے رہے کہ پناہ گزینوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ان کا انتظام کرنا کیمپ کے بس کی بات نہیں۔ یہ ہے کہانی ایک ایسے ملک کی جو اپنی فطرت، معیشت، سیاست اور پڑوسیوں کی سنگ دلی سے تاراج ہو چکا ہے۔

اگر افغانستان کویت ہوتا اور یہاں تیل کے ذخیرے ہوتے تو کہانی کچھ اور ہوتی۔ لیکن افغانستان میں تیل نہیں ہے اور اس کے ہم سایہ ممالک اس کے باسیوں سے کوڑیوں کے مول مزدوری کروا کر انہیں جبراً واپس بھیج دیتے ہیں۔ یہ فطری بات ہے کہ جب انہیں روزگار کا کوئی موقع میسّر نہیں ہے تو وہ طالبان سے جا ملتے ہیں، اسمگلنگ کرتے ہیں یا پھر ہرات، بامیان، کابل یا قندھار کے مضافات میں زمین پر گر کر دم توڑ دیتے ہیں کیوں کہ دنیا بے حس ہے۔

مذہبی تعلیم افغانوں کے لیے فاقہ کشی سے بچاؤ کی ایک صورت بن چکی ہے۔ یہاں طالبان کے ڈھائی ہزار مدرسے ہیں جن میں سے ہر ایک میں تین سو سے ایک ہزار تک فاقہ کش یتیم افغان بچوں کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ ان مدرسوں میں سب کو روٹی کا ٹکڑا اور شوربے کا پیالہ مل جاتا ہے۔ یہاں یہ قرآن پڑھتے ہیں، نماز کی سورتیں یاد کرتے ہیں، چند ایک منشیات بنانے اور فروخت کرنے لگتے ہیں لیکن عام تصوّر کے برعکس اس دھندے میں افغانوں کو منافع کا صرف تھوڑا سا ہی حصہ ملتا ہے۔ اقوام متحدہ کی ۲۰۰۰ء کی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا بھر کی منشیات کا پچاس فیصد حصہ افغانستان سے آتا ہے۔ اس سے افغانستان کو محض سالانہ پانچ کروڑ ڈالر کی آمدنی ہوتی ہے۔ جب کہ اس کاروبار سے حقیقی آمدنی اسی ارب ڈالر کی ہوتی ہے۔ گاہک کے ہاتھ تک پہنچتے پہنچتے منافع

کی شرح ۱۶۰ سے ۲۰۰ گنا تک بڑھتی ہے۔ ہیروئن تاجکستان میں جس دام پر داخل ہوتی ہے اس سے دوگنے دام پر باہر جاتی ہے۔ نیدرلینڈ کے گاہک تک پہنچتے پہنچتے قیمت دوسو گنا تک بڑھ سکتی ہے۔ یہ اضافی رقم ان مافیاؤں کے ہاتھ لگتی ہے جو منشیات کی شاہراہ پر پڑنے والے ممالک کی سیاست سے کھیلتے ہیں۔

اگر منشیات کا یہ بڑا منافع نہ ہوتا تو مثلاً ایران ہی پانچ کروڑ ڈالر کی مالیت کا گیہوں افغانستان کو دے دیتا تاکہ وہ پوست کی کاشت ختم کر دیں۔ لیکن وہ رقم جو اس دھندے میں افغانوں اور دوسرے مافیاؤں کے ہاتھ لگتی ہے، انہیں یہ کاروبار ختم نہیں کرنے دیتی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ افغان خود منشیات کا استعمال نہیں کرتے۔ منشیات کا استعمال ممنوع مگر کاشت قانونی ہے۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ یورپ اور امریکا میں اسلام کے دشمنوں کو یہ زہر بھیجنا جائز ہے۔

یہ بہت بڑا کاروبار ہے۔ چند ماہ پہلے جب میں افغانستان گیا تھا تو مجھے بتایا گیا تھا کہ ہر روز منشیات سے لدا ہوا ایک طیارہ افغانستان سے خلیج فارس کی امارات کو جاتا ہے۔ ۱۹۸۶ء میں اپنی فلم ''سائیکل والا'' بنانے کے لیے ریسرچ کرنے میں افغانستان گیا تو میں پاکستان میں مری جاواہ سے کوئٹہ اور پشاور بھی گیا تھا۔ یہ چند دنوں کا سفر تھا۔ مری جاواہ میں میرا ایک عجیب وغریب بس میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ یہ بڑی رنگین اور طرح دار بس تھی۔ جس میں عجیب وغریب لوگ بیٹھے تھے۔ ان کی پتلی پتلی لمبی داڑھیاں تھیں۔ انہوں نے لمبے لمبے چوغے پہن رکھتے تھے اور سر پر عمامے باندھے ہوئے تھے۔ شروع میں مجھے علم نہیں تھا کہ بس کی چھت اثاث منشیات سے بھری پڑی ہے۔ بس کچے میں سفر کرتی رہی جہاں کوئی راستہ بنا ہوا نہیں تھا۔ گاڑی کے پہیے نرم مٹی میں دھنسے جارہے تھے۔ آخر ہم ایک حیران کن گیٹ تک پہنچے۔ یہ ایسا سرریئل تھا جیسا سلوادور ڈالی کی تصویروں میں نظر آسکتا ہے۔ یہ گیٹ کسی بھی جگہ کو کسی دوسری جگہ سے نہیں ملاتا تھا۔ کھلے صحرا کے بیچوں بیچ یہ گیٹ کھڑا تھا۔ بس اس گیٹ پر رک گئی۔ موٹر سائیکل سواروں کا ایک گروہ نمودار ہوا جس نے بس کے ڈرائیور کو نیچے اتروالیا۔ انہوں نے کچھ باتیں کیں اور بوری بھر رقم نکالی جسے انہوں نے ڈرائیور کے ساتھ مل کر گنا، ڈرائیور اور اس کا مددگار رقم لے کر موٹر سائیکلوں پر غائب ہوگئے۔ دو موٹر سائیکل سوار بس میں داخل ہوئے اور اعلان کیا کہ اب یہ بس اور اس میں جو کچھ ہے وہ ان کی ملکیت ہے۔ بس اور اسباب کے ساتھ ہم مسافروں کو بھی فروخت کردیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہر چند گھنٹوں کے بعد یہی عمل دوہرایا گیا اور ہمیں کئی بار فروخت کیا گیا۔ اس راستے پر اسمگلروں کی کئی ٹکڑیوں کا قبضہ

تھا۔ قیمت ہر بار بڑھ رہی تھی۔ پہلے رقم کی ایک بوری آئی تھی مگر سفر ختم ہونے تک دو سے تین بوریاں لائی گئیں۔ راستے میں ہمیں اونٹوں کے کارواں ملے جن پر بھاری ''ڈشکا'' مشین گنیں لدی ہوئی تھیں۔ ہماری بس اور ان ہتھیاروں کو ہٹا دیں تو ہم اس وقت تاریخ کے کسی قدیم دور میں تھے۔ ہم ایسے مقامات پر پہنچے جہاں ہتھیار فروخت ہوتے تھے۔ گولیاں بوریوں میں چنے کے دانوں کی طرح بھری ہوئی فروخت ہو رہی تھیں۔ انہیں کیلو کے حساب سے تول کر بیچا جا رہا تھا۔

میں قندھار کے مضافات میں فلم کی لوکیشن تلاش کرنے گیا تھا۔ مغرب کے وقت تک سرحد کے قریب کے گاؤں خالی کرنے تھے۔ اسمگلروں کے ڈر سے تمام گاؤں والے بھاگ جاتے تھے۔ انہوں نے ہم سے بھی بھاگ جانے کو کہا۔ یہاں خوف و ہراس کا یہ عالم تھا کہ غروب آفتاب کے بعد اکا دکا گاڑی ہی راستے سے گزرتی تھی۔ رات کی تاریکی میں راستے اسمگلروں کے کاروانوں کے منتظر تھے۔ ان میں ۱۲ سے ۳۰ برس کی عمر تک کے پانچ سے سو افراد تک کے گروہ ہوتے تھے۔ ہر ایک کی پیٹھ پر منشیات کی بوری لدی ہوتی تھی اور چند ایک کے شانوں پر راکٹ لانچر اور کلاشنکوف ہوتے تھے تاکہ کارواں کی حفاظت کر سکیں۔

مہاجر کا مقسوم

افغان کے پاس انتخاب کرنے کے لیے زیادہ راستے نہیں۔ اگر قحط نہ پڑے تو وہ اپنی بھیڑ بکریوں سے روزی کما سکتا ہے۔ (۱۹۸۶ء سے ۱۹۸۹ء تک افغانستان میں دو کروڑ بیس لاکھ بھیڑ بکریاں تھیں۔ اس طرح ہر افغان کے پاس ایک بھیڑ یا بکری تھی۔ یہی افغانستان کا تاریخی سرمایہ ہے لیکن قحط نے اسے بھی چھین لیا ہے۔) افغان کسی گروہ یا فرقے کے لیے جنگ کر کے بھی پیٹ پال سکتے ہیں۔ اس طرح ایک افغان جنگجو بن جاتا ہے اور اگر یہ سب راستے مسدود ہو جائیں تو پھر وہ منشیات کا دھندا کرنے لگتا ہے۔ لیکن اس کاروبار میں داخل ہونے کے راستے محدود ہیں اور پوری قوم محض پوست کاشت کر کے پیٹ نہیں پال سکتی۔

ہجرت اور مذہبی تعلیم افغانوں کی المناک مجبوری ہے۔ کہیں چلے جانے کی مجبوری اتنی شدید ہے کہ افغان ایرانی اسمگلروں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ انسانی اسمگلنگ کرنے والے ایرانی مافیا کو دولت کمانے کا نیا ذریعہ مل گیا ہے۔ افغانستان سے ایران آنے والوں کو ایک طویل اور پُرصعوبت راستہ طے کرنا ہوتا ہے اور اس کے بعد زابل یا تہران وغیرہ میں انہیں گرفتار کر کے واپس بھیج دیا جاتا ہے۔ اس لیے وہ اپنی تقدیر پک اپ چلانے والے اسمگلروں کے حوالے کر دیتے ہیں جو اس

کام کے فی پناہ گزین دس لاکھ ریال طلب کرتے ہیں۔ ان خاندانوں کے پاس اتنی رقم زیادہ تر نہیں ہوتی۔ اس لیے ۱۴، ۱۵ برس کی لڑکیاں یرغمال رکھ لی جاتی ہیں اور خاندان کے دوسرے افراد کو تہران میں ادھراُدھر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اگر وہ ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں اور مطلوبہ رقم جمع کر کے لوٹا دیں تو یہ لڑکیاں واپس کر دی جاتی ہیں۔ لیکن اکثر رقم نہیں لوٹائی جاسکتی۔ تین مہینے کے بعد اس رقم پر سود بھی لگنا شروع ہوجاتا ہے۔ اس علاقے میں ایک سرکاری افسر کا کہنا تھا کہ سرحد کے کسی ایک شہر میں ہی ایسی یرغمالی لڑکیوں کی تعداد ۲۴ ہزار تک ہوتی ہے۔

ایران ہجرت کرنے والے افغان ہزارہ ہوتے ہیں جو فارسی بولتے ہیں۔ زبان اور شیعہ مسلک انہیں ایران لے آتا ہے مگر ان کا منگول ناک نقشہ ایرانیوں سے مختلف ہے اور وہ عام آبادی میں مدغم نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس جو پشتون پاکستان جاتے ہیں وہ پاکستانی پشتونوں میں بالکل گھل مل سکتے ہیں۔

سُنّی پشتون افغان ایک دوسرا راستہ طے کرتا ہے۔ ایک بھوکا پشتون جو کوئی مناسب ذریعہ معاش حاصل نہیں کر سکتا، مذہبی مدارس کا رخ کرتا ہے جہاں اسے دو وقت کی روٹی اور سر پر چھت میسر ہوسکتی ہے۔ پاکستان نے اپنی متعدد وجوہات کی بنا پر طالبان کو آگے بڑھایا ہے، ان کی تنظیم کی ہے اور ان کی حکومت قائم کروائی ہے۔ ان میں سے اولین وجہ ڈیورینڈ لائن ہے۔ آزادی سے پہلے افغانستان کی سرحد غیر منقسم ہندوستان سے ملتی تھیں اور ''پشتونستان'' کے علاقے پر گمبھیر تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ انگریزوں نے اسی خطے میں ڈیورینڈ لائن کا خط کھینچ کر اسے دو حصوں میں اس وعدے کے ساتھ تقسیم کر دیا تھا کہ سو برس بعد افغانستان کو دوبارہ برصغیر کے ''پشتونستان'' والے علاقے پر قبضہ حاصل ہوجائے گا۔ پاکستان کی تخلیق کے بعد ''پشتونستان'' کا وہ علاقہ جو برطانوی راج میں شامل تھا ، پاکستان کا حصّہ بن گیا۔ بین الاقوامی قانون کے مطابق کوئی چھ برس پہلے (یعنی یہ مدّت ختم ہونے پر) پاکستان پر لازم آتا تھا کہ یہ علاقہ افغانستان کے حوالے کر دے۔ لیکن پاکستان، جو ہنوز کشمیر پر دعویٰ رکھتا ہے، اس علاقے سے دستبردار ہونے پر کیوں کر رضا مند ہوسکتا تھا؟ ظاہر ہے کہ مسئلہ کا حل یہی تھا کہ بھوکے مجاہدین کی پرورش کی جائے اور افغانستان کو ان کے حوالے کر دیا جائے۔ پاکستان میں تربیت حاصل کرنے والے طالبان اپنے سرپرستوں سے اس علاقے کو خود حاصل کرنے کا ارادہ تک نہیں کریں گے۔ یہ بات غور طلب ہے کہ جوں ہی سو برس کی معیاد ختم ہونے کو آتی ہے طالبان نمودار ہوجاتے ہیں۔

فاصلے سے دیکھنے پر طالبان خطرناک حد تک بنیاد پرست اور سمجھ بوجھ سے بالکل عاری نظر آتے ہیں۔ لیکن قریب سے دیکھیے تو آپ کو وہ یتیم فاقہ کش بچے نظر آئیں گے جنھوں نے مذہبی تعلیم کو ایک ذریعہ معاش بنا کر اپنایا ہے۔ بھوک انہیں کشاں کشاں ان مدرسوں تک لے آئی ہے۔ اس منظرنامے پر آپ طالبان کے ابھرنے کا تجزیہ کریں تو آپ کو پاکستان کے سیاسی مفادات نظر آئیں گے۔ گاندھی کے جمہوری ہندوستان سے پاکستان کی علیحدگی اور خودمختاری کی وجہ مذہب[1] تھی تو یہی وجہ پاکستان کی بنا اور توسیع کے لیے استعمال کی گئی ہے اور اسی چکی میں افغانستان پس گیا ہے۔

طالبان کی جنونی مذہبیت پر اکثر نکتہ چینی کی جاتی ہے لیکن اس کے اسباب پر بہت کم غور کیا گیا ہے۔ وہ ایرانی شاعر جو پیدل ایران کی سرحد تک آیا تھا، یوں ہی واپس بھیج دیا گیا لیکن وہ یتیم بچہ جو پشاور (پاکستان) گیا تھا ٹویوٹا کی جیپوں میں بیٹھ کر افغانستان فتح کرنے کے لیے لوٹا اور اسے زندگی اور طاقت متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب کی دولت نے دی۔

حقیقت یہ ہے کہ سابق سوویت یونین کے انخلا کے بعد افغانستان طویل خانہ جنگی اور طوائف الملوکی کا شکار ہو گیا تھا۔ طالبان نے عوام سے ہتھیار لے لیے اور سخت سزاؤں کے ذریعے قانون کی پاس داری قائم کی۔

طالبان کون ہیں؟

عوام کسی بھی حکومت سے تحفظ کے طالب ہوتے ہیں۔ یہ ان کی اولین ضرورت ہوتی ہے۔ فلاح و بہبود، ترقی اور انسانی حقوق اس کے بعد آتے ہیں۔ سوویت یونین کے انخلا کے بعد افغانستان شدید خانہ جنگی کا شکار ہو گیا اور پورا ملک انتہائی عدم تحفظ سے دوچار ہوا۔ ہر گروہ نے یہ سمجھا کہ اس کے تحفظ کی ضمانت صرف اسی بات میں ہے کہ وہ مسلسل مصروفِ پیکار رہے۔ پوری قوم کو تحفظ کوئی بھی فراہم نہیں کر سکا۔ تلخ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اُس دور میں ہر جماعت نے اپنا تحفظ یقینی بنانے کی کوشش میں پورے ملک سے تحفظ غائب کر دیا۔

افغانستان کے عوام خانہ جنگی سے تھک چکے تھے۔ جب پاکستان نے سفید پرچم تھما کر، ہتھیار بندی ختم کرنے اور امن قائم کرنے کے موقف کے ساتھ طالبان کی فوج روانہ کی تو ان

---

[1] یہ نتیجہ اخذ کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ برصغیر کے دانش ور اس بات کو زیادہ تفصیل اور گہرائی سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں (مترجم)

کا خیر مقدم کیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں طالبان نے افغانستان کے زیادہ تر حصے پر قبضہ کرلیا۔ ان کی پاکستانی جڑیں اس کے بعد لوگوں کو نظر آئیں۔

عام لوگوں کو غیر مسلح کرنے کی اور امن قائم کرنے کی حکمتِ عملی کے باعث طالبان کو سرعت کے ساتھ عوامی مقبولیت حاصل ہوگئی۔ ہرات میں جہاں فارسی بولی جاتی ہے، جب میں نے پشتو بولنے والے طالبان کے بارے میں پوچھ گچھ کی تو دوکان داروں نے مجھے بتایا کہ طالبان سے قبل بھوکے ہتھیار بند لٹیرے روز ان کی دکانیں لوٹ لیا کرتے تھے۔ وہ لوگ بھی جو دیگر وجوہات کی بنا پر طالبان کے مخالف تھے ان کے دیئے ہوئے تحفظ سے خوش تھے۔

یہ تحفظ دو ذرائع سے حاصل ہوا تھا۔ اوّل تو یہ کہ عام لوگوں کو غیر مسلح کردیا گیا اور دوئم یہ کہ مجرموں کو چوری پر ہاتھ کاٹنے جیسی شدید سزائیں دی گئیں۔ یہ سزائیں اتنی سخت تھیں اور اتنی سفا کی سے دی جاتی تھیں کہ اگر ہرات میں بیس ہزار بھوکے افغانوں کو روٹی کا ایک ٹکڑا نظر آتا تھا تو کوئی اسے چھونے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔ افغانستان جانے پر لوگ قرب المرگ بھوکوں کے گروہ دیکھ سکتے تھے۔ ان میں لڑنے کی طاقت نہیں تھی اور اسلحہ بھی نہیں تھا۔ ان کے لیے اس کے سوا دوسرا راستہ نہیں تھا کہ راستے پر پڑے موت کا انتظار کریں اور دنیا کی سرد مہری کا تماشا دیکھتے رہیں۔

ان فاقہ کشی لوگوں کی فلم بنانے کے مقصد سے میں نے ڈاکٹر کمال حسین کو ٹیلی فون کیا۔ وہ بنگلہ دیشی ہیں اور اقوام متحدہ کے نمائندے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں شمالی افغانستان جانے کی اجازت حاصل کرنا چاہتا ہوں (اس وقت وہاں احمد شاہ مسعود کا قبضہ تھا)۔ میں قندھار بھی جانا چاہتا تھا جو طالبان کے زیرِ حکومت تھا۔ پہلے یہ فیصلہ کیا گیا کہ صرف چھوٹا سا گروپ جائے گا۔ آخر میں صرف مجھے اور میرے بیٹے کو ایک چھوٹے سے ویڈیو کیمرے کے ساتھ سفر کرنے کی اجازت ملی۔ ہمیں پاکستان میں اسلام آباد کا اجازت نامہ حاصل کرنا تھا جہاں سے اقوام متحدہ کا ایک ننھا سا ہوائی جہاز ہفتے میں ایک بار شمالی اور دوسرے ہفتے میں ایک بار جنوبی افغانستان جاتا ہے۔

مجھ سے یہ پوچھنے میں کہ ہم کب روانہ ہونا پسند کریں گے، اقوام متحدہ کے دفتر کو دو ہفتے لگے۔ ہم تو فوراً جانے کو تیار تھے مگر بتایا گیا کہ اس میں ایک مہینہ لگے گا۔ ''تب سردی بڑھ جائے گی اور زیادہ لوگ مر رہے ہوں گے۔ آپ کی فلم زیادہ دلچسپ ہوجائے گی۔'' انہوں نے کہا اور فروری میں جانے کا مشورہ دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''زیادہ دلچسپ!!'' اس پر انہوں نے کہا کہ اس طرح شاید دنیا کا خوابیدہ ضمیر بیدار ہوسکے۔ اس بات کا کوئی جواب مجھے بن نہیں پڑا۔ کچھ دیر ہم خاموش

رہے۔ پھر میں نے پوچھا کہ کیا میں شمالی اور جنوبی دونوں حصّوں میں جاسکوں گا۔ طالبان اس پر راضی نہیں ہوئے۔ وہ صحافیوں کو زیادہ پسند نہیں کرتے۔ میں نے وعدہ کیا کہ صرف بھوک سے مرنے والوں کی فلم بندی کروں گا۔ طالبان نے یہ بھی پسند نہیں کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ پاکستان میں پھر سے داخل ہونے کے لیے مجھے اقوام متحدہ کے دعوت نامے کی دوبارہ ضرورت پڑے گی۔ بعد میں مجھے فیکس کے ذریعے اطلاع دی گئی کہ ویزا حاصل کرنے کے لیے مجھے تہران میں پاکستانی سفارت خانے جانا ہوگا۔ اس پر میں خوش ہوا کیوں کہ اس سے پہلے مجھے اپنی فلم ''قندھار'' کے لیے کاسٹیوم حاصل کرنے کی خاطر اس سفارت خانے نے پشاور جانے کا ویزا دیا تھا۔

سفارت خانے میں شروع میں میرا استقبال سردمہری کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ کوئی معزز خاتون اور ایک صاحب مجھے ایک کمرے میں لے جاتے ہیں۔ پندرہ سے بیس منٹ تک اس کمرے میں وہ مجھ سے میری بیٹی سمیرہ اور اس کی فلموں کی بین الاقوامی کامیابی پر گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ وہ مطلب کی بات سے کتراتے ہیں اور بیچ میں پوچھتے ہیں کہ آخر میں نے ویزا کے لیے اقوام متحدہ کے ذریعے درخواست کیوں بھیجی۔ وہ مجھے بتاتے ہیں کہ اگر میں براہ راست ان سے رجوع کرتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ علاوہ ازیں وہ ایسی فلموں کے حق میں نہیں ہیں جو طالبان کی حکومت کی غلط تصویر پیش کرے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں غلط جگہ آ گیا ہوں۔ یہ پاکستان کا نہیں، طالبان کا سفارت خانہ ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا انہوں نے میری فلم ''سائیکل والا'' دیکھی ہے؟ میں ان سے کہتا ہوں کہ میری فلم کا موضوع بے روزگاری کا بحران اور بھوک ہیں۔ وہ کہتے ہیں'' ایران میں بیس لاکھ افغان پناہ گزین رہتے ہیں۔ آپ ان پر فلم کیوں نہیں بنا لیتے۔'' اب مزید بحث بے سود ہے۔ وہ میرا پاسپورٹ رکھ لیتے ہیں اور مہربانی سے مجھ سے چلے جانے کے لیے کہتے ہیں۔ کچھ دن بعد پاسپورٹ مجھے اس پیام کے ساتھ ملتا ہے کہ اگر میں سیاحی کے لیے پاکستان جانا چاہوں تو مجھے ویزا دیا جاسکتا ہے۔ واپس آتے ہوئے طالبان کے بارے میں میں نے جو کچھ پڑھا اور سنا ہے میری آنکھوں کے سامنے رقص کرتا رہتا ہے۔

مجھے پشاور میں طالبان کا وہ مدرسہ یاد آتا ہے جہاں یہ معلوم ہوتے ہی کہ میں ایرانی ہوں مجھے فی الفور باہر لے جایا گیا تھا اور پشاور میں وہ دن جب ''سائیکل والا'' کی فلم بندی کے دوران مجھے ہتھکڑیاں لگا کر گرفتار کرلیا گیا تھا۔ جانے میرے ساتھ یہ کیوں ہوتا ہے کہ جب بھی افغانستان پر فلم بنانا چاہتا ہوں خود کو پاکستان میں پاتا ہوں۔ سرحد پر ہمیشہ اغوا کیے جانے یا دہشت گردی کا خطرہ

منڈلاتا رہتا ہے۔ یہ مشہور ہے کہ زاہدان سے زابل کے راستے پر طالبان ناپسندیدہ افراد کو قتل کر دیتے ہیں۔ میں دہراتا رہتا ہوں کہ میرا موضوع سیاسی نہیں انسانی ہے۔ جب فلم بندی بالآخر ختم ہوئی تھی تو سرحد کے قریب مجھے ایک گروہ نے پکڑ لیا تھا۔ خدا جانے وہ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے یا اغوا کرنا چاہتے تھے! میں راستے پر چلا جا رہا تھا کہ یہ گروہ آ پہنچا اور مجھ سے مخملباف کے بارے میں پوچھنے لگا۔ ان دنوں میں نے لمبی پتلی سی داڑھی رکھ چھوڑی تھی اور اس وقت افغان لباس پہنے ہوئے تھا۔ سر پر ''مسعودی'' ٹوپی تھی۔ میں نے چادر سے نصف چہرہ بھی چھپا رکھا تھا۔ دیکھنے میں میں افغان ہی نظر آ رہا ہوں گا۔ میں نے انہیں دوسری سمت بھیج دیا اور خود وہاں سے فرار ہو گیا۔ نہ جانے انہیں کسی سیاسی گروہ نے بھیجا تھا یا وہ اسمگلروں کی جانب سے مجھ سے رقم وصول کرنے آئے تھے۔

مگر اب ہم دوبارہ تحفظ کے موضوع پر آتے ہیں۔ نظر یہی آتا ہے کہ طالبان نے تحفظ قائم کر دیا ہے۔ ''ریڈیو شریعت'' پر (یہ طالبان کی آواز ہے) روزانہ صرف دو گھنٹے کا پروگرام نشر ہوتا ہے۔ اگر کہیں جنگ بھی ہو رہی ہو تو ریڈیو پر اس کا اعلان نہیں کیا جاتا۔ مثال کے طور پر جب وہ یہ کہتے ہیں کہ تخار میں طالبان کا خیر مقدم کیا گیا تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ طالبان نے تخار پر حملہ کیا تھا اور اسے فتح کر لیا ہے۔ باقی کی خبریں جمعہ کی نماز، بامیان میں چوری پر کسی کے ہاتھ کاٹنے، قندھار میں زنا کے جرم پر کسی نوجوان کو سنگسار کرنے یا کسی ایسے حجام کو سزا دینے کے بارے میں ہوتی ہیں جس نے کچھ نوجوانوں کے بال مغربی کفار کی طرز پر کچھ زیادہ چھوٹے کاٹ دیے۔ جو بھی ہو ان تمام سخت سزاؤں اور پروپیگنڈا سمیت افغانستان میں قومی تحفظ کا احساس پھیلا ہوا ہے۔

لیکن طالبان نے جدید دور کے لیے افغانستان کا ہر دروازہ بھی سختی سے بند کر دیا۔ افغانستان میں جدید صرف ایک چیز ہے اور وہ ہیں ہتھیار۔ اب افغان اپنی جنگیں تلواروں اور خنجروں سے نہیں لڑتے۔ ہتھیار یہاں روزگار کا ذریعہ ہیں۔ افغانستان کی معیشت بدلنے سے قبل یہاں کے معاشرے سے ہتھیاروں کو نہیں نکالا جا سکتا۔ عورتوں کو طالبان نے خصوصاً مقید کر دیا ہے۔ جب میں افغانستان میں تھا تو میں نے برقعہ پوش عورتوں کو شاہراہوں پر بھیک مانگتے دیکھا۔ ایک منظر نے مجھے خصوصاً متاثر کیا۔ میں نے دیکھا کہ بعض برقعہ پوش خواتین پھیری لگانے والے بچوں کو بلا رہی تھیں۔ انہوں نے برقعے سے اپنے ہاتھ نکالے اور ان پھیری والے بچوں نے ان کے ناخنوں پر پالش لگائی۔ میں بہت دیر تک اس مخمصے میں رہا کہ آخر یہ خواتین نیل پالش خرید کر اپنے گھر پر خود کیوں نہیں لگاتیں؟ بالآخر مجھے پتہ چلا کہ نیل پالش لگوانے کا یہ سستا ترین طریقہ تھا۔ ابتدا

میں میں نے خود کو سمجھایا کہ یہ اچھا شگون ہے کہ برقعوں کے اندر عورتوں میں جینے کی خواہش موجود ہے اور غربت کے باوجود انہیں اپنے حسن کا خیال ہے۔ مگر بعد میں مجھے محسوس ہوا کہ معاشرتی لحاظ سے مقید خواتین کے سنگھار پر مطمئن نہیں ہوا جاسکتا۔ یہ کھیل ہی دوسرا ہے۔ یہ بناؤ سنگھار افغان عورت کو مقابلے کے لیے کرنا پڑتا ہے۔ نوجوان نسل میں بھی کئی شادیوں کا رواج عام ہے اور کئی افغان گھرانوں میں گویا حرم قائم ہیں۔ شادی کا مطلب یہ ہے کہ عروسہ کو خریدا جائے۔ میں نے کئی بوڑھوں کو دیکھا ہے جو دس سالہ بیٹی کسی دوسرے بوڑھے کے حوالے کر دیتے ہیں اور اسی رقم سے خود کسی دس سالہ لڑکی سے بیاہ رچا لیتے ہیں۔ کمیاب سرمایہ اس بازار میں ایک تنگ دائرے میں گردش کرتا ہے اور کم سن لڑکیاں ایک گھر سے دوسرے گھر منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ میں نے خود سے بارہا پوچھا ہے۔ کیا برقعہ طالبان نے نافذ کیا ہے؟ یا برقعے نے طالبان کی تخلیق کی ہے؟ کیا سیاست تہذیب اور تمدّن کو تبدیل کرتی ہے؟ یا تہذیب اور تمدن خود ایک خاص سیاست کو جنم دیتے ہیں؟

امید و بیم

کہتے ہیں کہ افغانستان میں ۱۸۰ تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ وہ بھی میرے غیر سیاسی سوالوں کا جواب دینے سے کتراتی رہیں۔ مجھے جلد ہی علم ہو جاتا ہے کہ انہوں نے بہت بڑے کام کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ان میں سے ایک فاقہ کشوں میں روٹی تقسیم کرنے کا کام ہے۔ دوسرا کام ہے کہ شمالی اور جنوبی علاقوں کے قیدیوں کا تبادلہ کیا جائے۔ تیسرا کام ان افغانوں میں مصنوعی اعضا کی تقسیم ہے جن کے اعضا بارودی سرنگوں نے اڑا دیے ہیں۔

میں ان لوگوں سے مسحور ہو جاتا ہوں جو ریڈ کراس کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔ میری ملاقات ایک انیس سالہ برطانوی لڑکی سے ہوئی جس نے مجھے بتایا کہ وہ یہاں ''کارآمد'' بننے کے لیے آئی ہے۔ صرف افغانستان میں وہ لوگوں کے لیے ہر روز اتنے زیادہ مصنوعی بازو اور ٹانگیں بنا سکتی ہے۔ انگلینڈ میں اسے اپنے پیشے میں ملازمت ہی نہیں ملتی۔ جب سے وہ آئی ہے چند سو افراد اس کے بنائے ہوئے اعضا کی مدد سے چلنے پھرنے لگے ہیں۔ لیکن کیا یہ سب کوششیں اس قوم کے گہرے اور اتنے بڑے زخم بھرنے کے لیے کافی ہیں؟

اقوام متحدہ کے بنگلہ دیشی کارکن ڈاکٹر کمال حسین اب مجھے ٹیلی فون نہیں کرتے۔ ان کا تقرر افغانستان میں برسوں سے ہے۔ مجھے ان کے الفاظ یاد آتے ہیں۔ ایک بار جب وہ ہمارے آفس آئے تھے تو انہوں نے کہا تھا کہ انہیں محسوس ہوتا ہے یہاں ان کی خدمات قطعی لاحاصل ہیں اور

اب جب کہ میری فلم "قندھار" مکمل ہوگئی ہے۔ مجھے اپنا پیشہ بے معنی محسوس ہونے لگا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ کسی رپورٹ یا فلم سے روشن ہونے والا معلومات کا ننھا سا شعلہ لوگوں کی لاعلمی کی اس گرانبار دیوار میں کوئی چھوٹی سی دراڑ بھی ڈال پائے گا۔ اور مجھے بالکل یقین نہیں ہے کہ آئندہ پچاس برسوں میں بارودی سرنگوں کی بھینٹ چڑھنے والے افغانوں کی قسمت اس انیس سالہ انگریز لڑکی کے ہاتھوں بدل جائے گی۔ وہ افغانستان کیوں آئی ہے؟ ڈاکٹر کمال حسین مایوس ہیں لیکن پھر بھی اپنا کام کیوں کر رہے ہیں؟ میں نے اپنی فلم کیوں بنائی اور اب یہ مضمون کیوں لکھ رہا ہوں؟ مجھے معلوم نہیں۔ پاسکل نے کہا تھا،" دل کی وجوہات اپنی ہی ہوتی ہیں جن کا دماغ کو علم نہیں ہوتا۔"

سرحد پار کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایرانی فوجوں کی بندوقوں کا رخ افغانستان کی طرف ہے۔ سرحد کے پار افغان فوجیں ایران کا نشانہ باندھے کھڑی رہتی ہیں۔ افغانستان کے سرحدی علاقے میں میں نے یہ حکایت سنی کہ افغان ملٹری کمانڈر نے ایک ایرانی سفارتی افسر کو بلا کر کہا تھا،" ہمارے گھر تو مٹی کے بنے ہیں۔ ایرانی بندوقیں کس نشانے کی شست باندھ رہی ہیں؟" اس نے کہا تھا۔" تم زیادہ سے زیادہ ہمارے گھروں پر بم برسا سکتے ہو۔ اس سے یہ گھر ٹوٹ جائیں گے۔ جب بارش ہوگی تو گیلی مٹی سے ہم پھر اپنے گھر بنالیں گے۔ لیکن اگر ہماری بندوقوں نے تمہارے خوب صورت گھروں کو نقصان پہنچایا تو بہت بُری بات ہوگی۔ گیلی مٹی سے شیشہ اور لوہا نہیں بنایا جاسکتا۔ اس کے بجائے تم ہمارے لیے ہرات کی سڑک کیوں تعمیر نہیں کردیتے؟"

دوغران سے ہرات تک کا راستہ ایران کی کسی پیچیدہ ترین راستے سے کہیں بڑھ کر دشوار گزار ہے۔ ٹیڑھی میڑھی سرزمین پر پھاوڑے اٹھائے مرد اور لڑکے کھڑے رہتے ہیں۔ جہاں تک آنکھ دیکھ سکتی ہے صرف پھاوڑے لہراتے نظر آتے ہیں۔ جوں ہی ہماری کار نزدیک آتی ہے، یہ لوگ راستے کے گڑھوں میں مٹی بھرنا شروع کردیتے ہیں۔ ہم بے قدر و قیمت افغان کرنسی کے نوٹ ان کی طرف پھینک دیتے ہیں اور انہیں گرد و غبار میں گم ہوتے دیکھتے ہیں جیسے کسی زمانے کی فلموں میں خشک پتوں کا رقص دکھایا جاتا تھا۔ یہ پھاوڑے لہراتے انسانوں کا منظر ہے جو غبار میں روپوش ہوجاتے ہیں اور جنہوں نے کسی نابود سے اپنے لیے روزگار کا ذریعہ تخلیق کیا ہے۔

میں ڈرائیور سے پوچھتا ہوں،" ہر روز اس راستے سے کتنی گاڑیاں گزرتی ہوں گی؟" وہ کہتا ہے" کوئی تیس......" میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ سب لوگ صرف تیس گاڑیوں کے لیے دن بھر کھڑے رہتے ہیں۔ لیکن اب ڈرائیور کا دھیان کہیں اور ہے۔ وہ جواب دینے کے موڈ میں نہیں ہے۔ میں

نے برسوں سے نہ ریڈیو سنا ہے اور نہ ٹی وی دیکھا ہے اور مہینوں سے کوئی اخبار یا رسالہ نہیں پڑھا۔ میں ریڈیو لگاتا ہوں۔ دو بجے کی ایرانی نشریات میں خبریں ہو رہی ہیں۔ یہ سن کر میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں کہ آج بیس لاکھ ایرانی بچے اسکول گئے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ ان بچوں کے لیے خوشی کے آنسو ہیں جو اسکول جا سکے یا ان افغان بچوں کے لیے غم کے آنسو جو یہاں افغانستان میں اسکول نہیں جاتے۔ میں راستے کی طرف دیکھتا ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں کوئی فلم دیکھ رہا ہوں۔ ڈرائیور مجھے بتاتا ہے کہ یہاں چند گھروں میں لڑکیوں کے خفیہ اسکول قائم کیے گئے ہیں اور کچھ لڑکیاں اپنے گھروں میں بھی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ میں سوچنے لگتا ہوں کہ اس موضوع پر فلم بنی چاہیے۔

میں ہرات پہنچتا ہوں اور عورتوں کو برقعے سے ہاتھ نکال کر نیل پالش لگواتے دیکھتا ہوں۔ سوچتا ہوں یہ فلم کا ایک اور موضوع ہوسکتا ہے۔ میں انیس سالہ انگریز لڑکی سے ملتا ہوں جو پُر خطر افغانستان میں کارآمد بننے کے لیے آئی ہے۔ میں اس پر بھی فلم بنا سکتا ہوں۔ مجھے اَن گنت لوگ نظر آتے ہیں جن کے بازو اور ٹانگیں بارودی سرنگوں کی نذر ہوگئی ہیں۔ ان میں سے ایک نے مصنوعی ٹانگ کی جگہ جسم کے ساتھ ایک پھاوڑا باندھ لیا ہے اور اس پر پھدک پھدک کر چل رہا ہے۔ یہ بھی فلم کا موضوع ہوسکتا ہے۔ میں ہرات پہنچتا ہوں اور فاقہ کشی کے مارے لوگوں کو دم توڑ کر پٹ پٹ زمین پر گرتے دیکھتا ہوں۔ زمین پر لاشوں کا قالین بچھا ہے۔ نہیں، یہ فلم کا موضوع نہیں ہوسکتا۔ میں فلم بنانا ترک کر دینا چاہتا ہوں۔ میں کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ افغانستان کے مسئلے کا ایک ہی حل ہے۔ اس کے اصل مسائل کی سختی سے نشاندہی کی جائے۔ اس کا اصل عکس پیش کیا جائے۔ اس کی اصل تصویر بنائی جائے جسے نہ غیروں اور نہ افغانوں نے دیکھا ہے۔

اس دن سے جب میں نے ایک بارہ سالہ افغان لڑکی کو اپنے بازوؤں میں بھوک سے پھڑکتے دیکھا تھا، بارہ سالہ لڑکی...... جو میری اپنی بیٹی حنا کی عمر کی تھی...... تب سے میں افغانستان میں بھوک کے المیے کو پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر میں ہر بار اعداد و شمار دوہرانے لگتا ہوں۔ میں افغانستان کی طرح بے بس ہو چکا ہوں۔ میں اسی پرانی نظم کی طرف لوٹ جانا چاہتا ہوں، اس درماندگی کی سمت اور ہراتی شاعر کی طرح کہیں گم ہو جانا چاہتا ہوں یا پھر بدھ کے مجسمے کی طرح شرمندگی سے ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑوں۔

"میں پیدل چلتا آیا تھا...... پیدل چلتا لوٹ رہا ہوں۔"

میڈیا پر پیش کی جانے والی اطلاعات کے مقابلے میں "برسرزمین حقائق" کیا ہیں، اس امر کا اندازہ اس مضمون سے لگایا جاسکتا ہے۔ رچرڈ لائڈ پیری برطانوی صحافی ہیں۔ انہوں نے امریکی بم باری کے دوران افغانستان میں رپورٹنگ کی۔ ان کا یہ مراسلہ جس پر ۴/ دسمبر ۲۰۰۱ء کی تاریخ درج ہے، برطانیہ کے انڈی پنڈینٹ نیوز پر جاری کیا گیا۔

رچرڈ لائڈ پیری
ترجمہ: آصف فرخی

ایک گاؤں تباہ ہوگیا اور امریکا کہتا ہے کچھ نہیں ہوا

وہ گاؤں جہاں کچھ نہیں ہوا، ایک دشوار گزار چڑھائی کے بعد واقع ہے جہاں تک پہنچنے کے لیے ایک پتھریلی سڑک پر تین گھنٹے کی کھڑکھڑاتی ہوئی مسافت طے کرنا پڑتی ہے۔ جب تک وہاں کچھ نہیں ہوا تھا، سوموار کے دن صبح سویرے اور اس سے اگلے دن، یہ ایک بڑا سا گاؤں تھا جس کے ساتھ ایک چھوٹا قبرستان واقع تھا مگر اب یہ ترتیب اُلٹ گئی ہے۔ پہاڑی پر واقع قبرستان میں چالیس تازہ قبریں ہیں، جو یکساں ہیں اور بغیر کسی بھی نشانی کے۔ اور "کامادو" گاؤں کا وجود ختم ہوگیا۔

یہاں واقع گھروں میں سے زیادہ تر اب زمین کے اندر مخروطی گڑھے ہیں۔ باقی ٹوٹ کر بکھر چکے ہیں، کچل کے دبا دیے جانے والے گتّے کے ڈبوں کی طرح پھٹ کر کھل گئے ہیں۔ عین اس لمحے جب کچھ نہیں ہوا، کامادو گاؤں کے لوگ کھانا کھا رہے تھے کہ سورج نکلنے سے پہلے رمضان کے روزے کا آغاز کرسکیں۔ اور وہاں ملبے میں پھٹے ٹوٹے اور کچلے پچکے آثار موجود ہیں کہ ان کی سادہ سی زندگی کیسی تھی۔

ایک ٹیڑھی میڑھی ٹین کی کیتلی، جسے دھماکے نے اس طرح دبا دیا ہے کہ اندر کا حصہ باہر نکل آیا ہے۔ جل کر کوئلہ بن جانے والے برتنوں کا ڈھیر اور پاؤں سے چلائی جانے والی پرانے انداز کی

سلائی مشین کے بکھرے ہوئے پُرزے۔ پھٹ کر کھل جانے والے صندوق میں سستی رنگین نائلون سے بنے ہوئے بچوں کے کپڑوں کی دھجیاں بھری ہوئی ہیں۔

اگلے کمرے میں یہاں کے لوگوں کی سب سے بڑی دولت کا ڈھیر ہے، چھ مُردہ گائیں جو اوندھی سیدھی گری ہوئی ہیں اور جن کی لاشیں سڑ کر پھولنے لگی ہیں۔ اور یہ سب عجیب اس لیے ہے کہ سوموار کی صبح ...... جب امریکی بی ۵۲ طیاروں نے درجنوں بم برسائے جن سے ۱۱۵ مرد، عورتیں اور بچے ہلاک ہوگئے ...... کچھ نہیں ہوا۔

ہمیں یہ اس لیے معلوم ہے کہ امریکی محکمۂ دفاع نے یہ بات بتائی ہے۔ اس شام پنٹاگون کے ترجمان سے مشرقی افغانستان میں بم باری کے دوران شہریوں کی ہلاکت کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے واضح کیا کہ یہ حقیقت نہیں ہے اس لیے کہ امریکا بڑی احتیاط اور دقتِ نظر کے ساتھ چن چن کر صرف ان ہی فوجی نشانوں پر حملہ کرتا ہے جو اسامہ بن لادن کے القاعدہ سے وابستہ ہیں۔ اس موضوع پر پنٹاگون کے اگلے بیانات کسی قدر لڑکھڑائے تو ہیں مگر اس ابتدائی فیصلہ کن بیان سے پیچھے نہیں ہٹے کہ ''وہاں کچھ نہیں ہوا۔''

سو خدا جانے کہ وہ کس قسم کا طلسمی آئینہ تھا جس کے پار میں کل اُتر گیا جب میں جلال آباد کے شہر سے باہر نکل کر کوما ادو کے صحرائی راستے پر چلا۔ میں جس وقت بیدار ہوا تب سے میں وہاں کی بربادی اور بلند بیاں، ہائی ٹیک (hi-tech) ہزار پاؤنڈ کے 'کچھ نہیں' کا شکار بن جانے والے لوگوں کا سامنا کر رہا ہوں۔

میرا دن شروع ہوا حاجی زمان غم شریک کے گھر میں جو مغرب دوست اور طالبان مخالف دھڑے کے مجاہدین کے کمانڈر ہیں۔ جن کو امریکی حکومت چپکے چپکے رسد اور مالی امداد دے رہی ہے۔ گزشتہ دن میں ان کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا جلال آباد کے مُردہ گھر میں گھومتا رہا جہاں سات مسخ شدہ لاشیں رکھی ہوئی ہیں ...... یہ کمانڈر زمان کے مجاہدین ہیں جو اس وقت ہلاک ہوگئے جب امریکی بموں نے اس سرکاری عمارت کو تباہ کر دیا جہاں وہ سو رہے تھے اور اب یہ دوسری بار ہوا ہے۔

تین پک اپ ٹرکوں کے پچھلے حصے میں لدی ہوئی تھیں ...... سات مزید مجاہدین کی سات مزید لاشیں۔ یہ اس وقت ہلاک ہوئے جب لنڈی خیل کے گاؤں پر کل صبح ساڑھے چھ بجے صبح حملہ ہوا۔

کمانڈر زمان سرکشیدہ شخص ہے جو سوویت یونین کے خلاف برسوں تک پہاڑیوں میں لڑتا رہا ہے مگر میں نے اس کو کبھی اس قدر ہزیمت خوردہ نہیں پایا تھا۔ ''میں نے خود ہی ان کو بلوایا تھا'' وہ

بس اسی قدر کہہ سکا۔ ''میں نے ان کو حفاظت کے لیے بلوایا تھا۔''

اس کے باوجود اس نے مجاہدین میں سے محافظ ہمارے ساتھ کر دیے اور ہم لنڈی خیل کے راستے پر چل پڑے۔ ہمیں اس دفتر کا تباہ شدہ ڈھانچا مل گیا جہاں سپاہیوں کا پہلا دستہ ہلاک ہوا تھا اور وہ مہمان خانہ بھی جہاں گزری ہوئی صبح میں باقی سپاہی مارے گئے تھے اور وہاں، اس خاندانی مکان میں کچھ نہ ہونے کا بچا ہوا ٹکڑا بھی تھا۔ یہ کمپیکٹ بم کا پچھلا حصہ تھا۔ اس پر الفاظ درج تھے: ''سرفیس اٹیک گائیڈڈ میزائل اے جی ایم ۱۱۴'' اور سلسلہ وار نمبر ۲۳۲۶۸۷۔ یہ اس مکان کی پھونس کی چھت کے بچے کھچے حصے میں دبا ہوا تھا جہاں تین آدمی مارے گئے تھے: فضل کریم، اس کا بھائی محمود گلاب اور اس کا بھتیجا حفیظ اللہ۔ ''یہ ایک خاندان تھا، بالکل عام لوگ'' حاجی محمد نذیر نے بتایا جو مقامی بزرگ ہیں اور ہمارے ساتھ چل رہے تھے۔ یہ دہشت گرد نہیں تھے...... دہشت گرد پہاڑوں میں ہیں، وہاں پر۔''

سو ہم کوہِ سفید کی سمت چل پڑے جہاں القاعدہ کے ہزاروں ارکان اور شاید خود اسامہ بن لادن بھی تورا بورا کے غاروں میں چھپا ہوا ہے۔ ایک بی ۵۲ بم بار طیارہ آسمان میں اونچا اڑ رہا تھا۔ کالے کالے دھوئیں کا گہرا بادل نیچے وادی میں پھیل رہا تھا۔ وہاں یقیناً کچھ نہ کچھ ہو رہا تھا اور پھر ہم کوما ادو کے کھنڈروں تک جا پہنچے۔ ان افسوسناک کھنڈروں میں مجھے ایک ہی چیز ایسی ملی جو خطرناک ہوسکتی تھی...... چمڑے کی ایک پرانی بندوق اور کارتوس کی پیٹی۔ یہ ممکن ہے کہ القاعدہ کے مٹھی بھر ارکان وہاں رات گزار رہے ہوں اور امریکی نشانہ بازوں کو ان کی موجودگی کا پتہ چل گیا ہو۔

مگر جنگ کے بائیس مسلسل سال کے بعد تقریباً ہر افغانی گھر میں کوئی نہ کوئی فوجی نشانی موجود ہے اور گاؤں والے قسم کھا رہے تھے کہ انہوں نے گزشتہ دو ہفتوں سے عرب یا طالبان سپاہیوں کو نہیں دیکھا۔ یقیناً وہاں اتنے دہشت گرد نہیں تھے کہ چالیس تازہ قبروں کو بھر دیتے۔ ایک آدمی نے مجھے بتایا کہ ان میں سے بعض گڑھوں میں پوری کی پوری لاشیں نہیں بلکہ محض کٹے پھٹے اعضاء دفن کیے گئے تھے۔

ہمیں خبردار کیا گیا تھا کہ سفید فام چہروں کا اس گاؤں میں برہمی کے ساتھ سواگت کیا جائے گا جہاں کچھ نہیں ہوا تھا، مگر ہمارا سامنا مایوسی اور پریشانی سے ہوا۔ ایک لمحے کے لیے مجھ پر واقعی خوف طاری ہوا، وہ اس وقت جب ایک امریکی بی ۵۲ طیارہ ہمارے سر پر سے گزرا۔ ہم نے گاڑیوں کا قافلہ روک لیا، گاڑیوں سے باہر نکلے اور دونوں طرف موجود کھیتوں میں جا گھسے۔ جہاز

نے آہستگی سے گول چکر کاٹا۔ مجھے احساس ہوا کہ برقی آنکھیں ہم کو اوپر سے دیکھ رہی ہیں کہ اس سڑک پر بس ہماری ہی گاڑیوں کی حرکت تھی۔ پھر بم بار طیارہ وہاں سے دور نکل گیا اور سب نے چین کا سانس لیا۔

ہم شہر سے نکلنے والے تھے تو جلال آباد میں ہمارے ایک امریکی رفیق کار نے پنٹاگون کو فون کر کے ہمارے منصوبے کی اطلاع دی کہ ہم اس گاؤں جانے کا ارادہ کر رہے ہیں جہاں کچھ نہیں ہوا۔ میں اس آئینہ آسا زمانے میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر یہ ٹیلی فون کال نہ کی گئی ہوتی تو اس بی ۵۲ نے ہمارے قافلے کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوتا۔ شاید میرے ساتھ بھی کچھ نہیں ہوا ہوتا۔

حملے کی زد میں

بشکریہ: بی بی سی نیوز

پورے ملک اور قوم کی بربادی کے سامنے افراد کے مصائب معمولی نظر آتے ہیں مگر بعض مرتبہ ایسے واقعات میں پوری قوم کی مشکلات اور درد سمٹ آتا ہے۔ کٹے ہوئے ہاتھ کا یہ واقعہ بھی شاید ایسا ہی ہے۔ برطانوی صحافی انتھونی لائیڈ نے افغانستان کے شہر گل بہار سے یہ رپورٹ ارسال کی جو برطانیہ کے ممتاز اخبار ''دی ٹائمز'' میں یکم نومبر ۲۰۰۱ء کو شائع ہوئی۔

انتھونی لائیڈ
ترجمہ: آصف فرخی

''میں بس یہی خواب دیکھتا ہوں کہ میرا ہاتھ مجھے پھر سے مل جائے''

کریم اللہ ایک افغان ہے جو اپنی جنگ بیتی سنانا نہیں چاہتا۔ ایک ایسے ملک میں جہاں ہر ایک اپنی روداد سنانے پر تُلا ہوا ہے، اس کی خاموشی اس کو منفرد بنا دیتی ہے۔

اسپتال کے صحن میں دوپہر کے سائے میں وہ اکیلا کھڑا تھا جس وقت کل میں نے اسے دیکھا، وہ چمک دار غیظ و غضب اور تیرہ و تار مایوسی کا عجیب مرکّب تھا۔ ہفتے کے دن وہ گل بہار میں واقع ریڈ کراس کے 'ہڈی اسپتال' میں لنگڑاتا اور گھسٹتا ہوا وارد ہوا۔

کٹے ہوئے اعضا والے دوسرے مریضوں کے درمیان بھی اس کے زخم نمایاں تھے۔ بارودی سرنگیں دونوں ٹانگیں یا دونوں ہاتھ اُڑا سکتی ہیں، یا پھر ایک طرف کے ہاتھ اور پاؤں یا پھر زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ ایک پاؤں یا ایک ہاتھ۔ مگر کریم اللہ کے زخموں کا سبب اور تھا۔ جب اس نے بہت تذبذب کے بعد اپنے اُلٹے پاؤں اور سیدھے ہاتھ کے ضائع ہونے کا احوال سنانا ختم کیا تو ہمارے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا کہ اسے اس کے حال پر سنگین نظروں سے خلا میں تکتے ہوئے چھوڑ دیں۔

وہ تاجک والدین کی اولاد تھا اور اب اس کی عمر ۲۶ سال کی تھی۔ ۱۹۹۶ء میں طالبان کے آنے کے بعد وہ کابل سے فرار ہوگیا تھا۔ اپنی بیوی اور دو بچوں کی ساتھ وہ شمال کے ایک گاؤں پہنچ گیا جس پر شمالی اتحاد کا قبضہ تھا اور انگوروں کے ایک باغ میں اسے ملازمت بھی مل گئی۔ ۱۹۹۸ء میں طالبان کی پیش قدمی کے بعد اس کا گھر اور نوکری دونوں چھن گئے۔ وہ مجاہدین کے ساتھ شامل ہوگیا۔

۱۹۹۹ء میں سالمی کی چوکی میں، جہاں وہ موجود تھا، ایک گولہ آ کر پھٹا۔ اس کے چار ساتھی موقع پر ہلاک ہوگئے۔ کریم اللہ بھاگ کر ایک پشتون گاؤں پہنچا جہاں کے باشندوں نے اس کو طالبان کے حوالے کر دیا۔ کابل میں ایک ''فوجی ٹریبونل'' نے اس پر مقدمہ چلایا اور شمالی اتحاد کے ساتھ شامل ہونے کے جرم میں اسے اذیت رسانی کے بعد کابل کے پل چرخی کے جیل میں بند کر دیا گیا۔

''مجھے وہاں بارہ ہفتے ہوگئے تھے جب تین طالبان میری کوٹھری میں آئے،'' اس نے بتایا۔ ''انہوں نے میرا نام پکارا اور کہا کہ مجھے رہائی مل رہی ہے۔'' کچھ حیران پریشان مگر مطمئن کریم اللہ کو ایک ڈاٹسن پک اپ میں بٹھا دیا گیا۔

''وہ مجھے غازی اسٹیڈیم کی طرف لے جانے لگے،'' کریم اللہ نے کہا۔ ''میں شروع میں تو خاموش رہا مگر جب اس کے نزدیک پہنچنے لگے تو میں نے پوچھا، یہ کیا ہو رہا ہے؟ میری رہائی کا کیا ہوا؟ انہوں نے مجھ سے کہا، صبر کرو۔ تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔''

ڈاٹسن اسٹیڈیم کے مرکز میں پہنچ گئی۔ کریم اللہ کو یاد ہے کہ نشستوں پر سے ہزاروں چہرے خاموشی کے ساتھ اس کو تک رہے تھے اور اسٹیڈیم کے وسط میں دس سے لے کر چودہ مُلا کرسیوں پر ایک قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے ٹرک سے کھینچ کر نکالا گیا اور حکم دیا گیا کہ گھاس پر چت لیٹ جائے۔

''مُلاؤں نے نہ میرا نام پوچھا نہ مجھ سے کوئی بات کی۔ سات ڈاکٹر میری طرف بڑھے۔ انہوں نے سرمئی وردیاں پہن رکھی تھیں اور جراحی والے نقاب اور دستانے چڑھائے ہوئے تھے۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ ان میں سے ایک کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے ایک انجکشن لگایا۔ پانچ منٹ کے بعد میرا پورا بدن سُن ہوگیا حالاں کہ میں ہوش میں تھا۔ پھر انہوں نے میرے ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کو باندھ دیا اور خاص طرح کی آری سے انہیں کاٹنے لگے۔ مجھے درد

نہیں ہوا مگر مجھے نظر آ رہا تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔''

میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کی نظریں کٹتے ہوئے پیر پر گڑ کر رہ گئی تھیں۔

''جب انہوں نے کام ختم کرلیا تو مجمعے کے سانس لینے کی اور دبی دبی آوازیں سنائی دیں۔ انہیں اس کام میں پانچ منٹ لگے۔ طالبان محافظوں نے مجھے اٹھا کر پک اپ کے پچھلے حصے میں ڈال دیا۔ ان میں سے بھی ایک رو رہا تھا۔ کسی نے ایک لفظ نہیں کہا۔ مجھے اب بھی نہیں معلوم کہ اس سزا کے لیے مجھے کیوں چنا گیا تھا۔

اسے کابل کے وزیر اکبر خان اسپتال لے جایا گیا۔ ایک ہفتے کے بعد اس کے سابق جیل کے محافظ اس سے ملنے آئے۔ وہ اس کے لیے سیب اور ۶۰۰،۰۰۰ افغانی (تقریباً دس برطانوی پاؤنڈ کے مساوی) لے کر آئے۔

''انہوں نے معذرت چاہی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ان کو معلوم نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ میں نے سیب اور پیسے ان کے منہ پر مار دیے۔ میں چیخنے لگا کہ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ رہائی ملنے والی ہے اور اس کے بجائے میرے ہاتھ اور پاؤں چھین لیے۔ وہ واپس چلے گئے۔''

دسویں دن اسے چھٹی مل گئی۔ ایک ٹیکسی نے اسے اس کے والدین کے گھر پہنچا دیا۔ اس کے والدین کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوگیا ہے۔

ٹیکسی والے نے دروازے پر دستک دی تو کریم اللہ کی آٹھ سالہ بہن رضیہ نے دروازہ کھولا۔ اس نے اپنے بھائی کو ٹیکسی کے پچھلے حصے پر ڈھیر دیکھا تو وہ رو پڑی۔ اس کے بعد جو پیش آیا، وہ اس سے بھی زیادہ خراب تھا۔ ''میری ماں بہت دن سے بیمار تھی اس لیے کم زور ہوگئی تھی۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو وہ نڈھال ہوگئی۔ کئی گھنٹے کے بعد اسے ہوش آیا، پھر اسے دل کا دورہ پڑا اور وہ مرگئی۔

''میں سمجھتا تھا کہ میری زندگی کا بدترین دن اسٹیڈیم والا دن تھا۔ مگر گھر واپسی اس سے بھی زیادہ خراب تھی۔ میری ماں کی عمر ۴۲ برس تھی۔''

وہ بھکاری بن گیا، کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں سزا کی وہ نشانی بن گئی جو چوروں کے لیے روا رکھی جاتی ہے۔

پھر چند ہفتے پہلے اس کا ایک رشتہ دار جو مجاہدین کے ایک دستے کا کمانڈر تھا، اس نے مدد

کرنے کے لیے رابطہ کیا۔ بارودی سرنگ کا شکار ہو جانے والے ایک شخص سے مصنوعی ٹانگ عاریتاً لے کر، کریم اللہ لنگڑا لنگڑا کر کئی دن تک شمال کی جانب سفر کرتا ہوا، دوسرے پناہ گزینوں کے ساتھ محاذ جنگ کو عبور کرتا ہوا آگے پہنچا۔ ریڈ کراس اس کے لیے مصنوعی ٹانگ تیار کرنے میں مدد دے رہا ہے مگر بعض زخم ایسے ہیں جو بھر نہیں سکتے۔

''میں ختم ہو چکا۔ میرا کوئی مستقبل نہیں ہے'' کریم اللہ نے کہا۔ ''مجھ سے ہر چیز چھین لی ہے طالبان نے۔ جب وہ کابل آئے تو میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا، تعلیم یافتہ تھا اور میرے سامنے بہت سے مواقع تھے۔

کسی نے مجھے بتایا کہ ایک دولت مند پختون نے کوئی جرم کیا تھا اور اس نے بدعنوان مُلّاؤں کو رشوت دی کہ اس کے بجائے کسی جنگی قیدی کے ہاتھ پاؤں برسرعام کاٹ دیے جائیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ سچ بھی ہے یا نہیں۔ مجھے ان سے نفرت ہے۔

''میں بس یہی خواب دیکھتا ہوں کہ میرا ہاتھ مجھے پھر سے مل جائے تاکہ میں بندوق اٹھاؤں اور محاذ جنگ پر جا کر خوب قتل و غارت کروں۔ میں ان سب کو مار ڈالوں گا، طالبان اور مولویوں میں سے ایک ایک کو چن چن کر مار ڈالوں گا۔''

''یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک...''

تصویر: جوڈتھ مان

اخبار کے مختلف صحافیوں کے مراسلوں پر مبنی یہ رپورٹ برطانیہ کے جریدے ''گارجیئن'' میں شائع ہوئی۔

ترجمہ: آصف فرخی

ہلاکت خیز غلطیاں

جدید زمانے کی ہر جنگ کے دوران کوئی ایک ہولناک اور بربریت بھری واردات ایک ایسا لمحہ فراہم کرتی ہے جو اس جنگ کی شناخت بن جاتا ہے۔ امریکا کو اب تک ان مطالبوں کا سامنا ہے کہ ۱۹۶۸ء میں ویت نام کی جنگ کے دوران مائی لائی کے قتل عام پر معافی مانگے۔ اسی طرح کویت کے بیرونِ، متلا کی چٹان پر جلا دیے جانے والے عراقی سپاہیوں کی باقیات، خلیجی جنگ کے دوران وار کرنے کی مغلوب کن امریکی صلاحیت کی ایسی نشانیاں ہیں کہ جن کو دیکھنے سے تن بدن میں سنسناہٹ سی ہونے لگتی ہے۔

یہ سوال ابھی سے اٹھایا جانے لگا ہے کہ مزارشریف کے مضافات میں ۱۹ویں صدی کے تعمیر شدہ قلعہ جنگی کا محاصرہ جو اس ہفتے اپنے خوں آلود انجام کو پہنچا ہے، کیا افغانستان کی اس جنگ کے لیے ایسا ہی لمحہ شناخت فراہم کرے گا۔ لاشوں کے انبار میں سے راستہ بنانے والے امدادی کارکن اور سینکڑوں طالبان قیدی، جو امریکی بم باری اور شمالی اتحاد کی افواج کی درندگی کے امتزاج سے مارے گئے، ان کی تصویروں سے ساری دُنیا میں خوف اور کراہیت کی لہر دوڑ گئی ہے۔

برطانیہ اور امریکا پر زور ڈالا جا رہا ہے کہ ان ہلاکتوں کی آزادانہ تفتیش کروائیں، '' گارجیئن'' اخبار نے ان واقعات کا لمحہ بہ لمحہ احوال جمع کیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شروع ہی سے، جب قندوز کے سقوط کے بعد طالبان سپاہی، شمالی اتحاد کے ہتھے چڑھے، اسی وقت سے تباہ کن غلطیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

امیر جان ایک پختون کمانڈر ہیں جو اس سال کے شروع میں منحرف ہو کر طالبان دشمن حزب اختلاف سے جا ملے، ان کا کہنا ہے کہ قندوز میں لڑنے والے طبقہ اولیٰ سے تعلق رکھنے والے غیر ملکی

سپاہیوں کو افغانستان کے شمالی شہر، مزار شریف میں سرے سے بھیجنا ہی نہیں چاہیے تھا۔

یہ غیر ملکی، جن میں عرب، پاکستانی، چیچن اور ازبک شامل ہیں، ان کو ارگانک میں ہتھیار ڈالنے تھے جو قندوز سے ۲۰ کلومیٹر دور پہاڑی علاقے میں صف آرائی کا مقام (''فرنٹ لائن پوزیشن'') ہے۔ اس کے بجائے وہ راتوں رات صحرا میں سفر کرتے ہوئے، ریگ زار اور ٹیلی فون کے کھمبوں کے اس ویرانے سے گزرتے ہوئے پچھلے سوموار کو صبح کے تین بجے کے قریب مزار شریف کے مضافات میں آن پہنچے۔

قندوز میں طالبان کے کمانڈر ملا فاضل نے ان غیر ملکی طالبان کو ہدایات دی تھیں کہ ہتھیار چھوڑ دیں...... مگر ان کو یہ بتانے میں ناکام رہا کہ اس کے بعد انہیں حراست میں لے لیا جائے گا۔
''ان غیر ملکیوں کا خیال تھا کہ شمالی اتحاد کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بعد وہ آزاد ہو جائیں گے'' جان نے کہا۔ ''انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ان کو قید کر دیا جائے گا۔''

صحرائی وردیوں میں ملبوس امریکی سپاہی مواصلاتی رابطے قائم کرتے رہے اور اس دوران جنرل رشید دوستم کے وفادار سپاہی حملے کی پوزیشن سنبھالنے لگے۔ تین سے لے کر چار گھنٹے کے مذاکرات کے بعد طالبان سپاہیوں نے ایک بار پھر ہتھیار ڈالنے پر رضامندی ظاہر کر دی...... مگر صرف امیر جان کے سامنے، کیوں کہ وہ پشتون نسل اور طالبان سے تعلق کی تاریخ کی وجہ سے ان پر اعتبار کرتے تھے۔ دوستم کے فوجی دستوں ''ملیشیا'' نے طالبان سپاہیوں کے ہتھیار جمع کرنے اور سبز رنگ کی ایک لاری پر ڈھیر کرنے شروع کر دیے۔

دوستم نے پھر یہ انتظام کیا کہ ان سپاہیوں کو مزار شریف کے ہوائی اڈّے تک لے جائے گا، جسے سوویت افواج نے مرکز شہر سے دور تعمیر کیا تھا۔ مگر امریکی خصوصی افواج نے اس منصوبے سے ویٹو کر دیا اور یہ کہا کہ فوجی کارروائی کے لیے اس حملے کی ضرورت پڑ سکتی ہے، امیر جان نے انکشاف کیا۔

اس کے بجائے دوستم ان سپاہیوں کو مزار شریف کے مضافات میں اپنے ذاتی قلعے، قلعۂ جنگی میں لے جائے گا۔ پچھلے دو ہفتے کے دوران کئی امریکی افسروں نے اس قلعے میں خاصا وقت گزارا تھا۔ ان کو یہ معلوم تھا کہ قلعے میں ہتھیاروں کی بھرمار ہے۔

اس کے باوجود وہ دوستم کے ہنگامی منصوبے پر رضامند ہو گئے۔ سوموار کے دن دوپہر تک ان قیدیوں کو پانچ ٹرکوں میں بٹھا دیا گیا۔ سید کمال نے جو دوستم کی افواج میں حفاظتی امور کے نگراں

ہیں، انتظام کیا کہ پہلے تین ٹرکوں میں بٹھائے جانے والے سپاہیوں کی جسمانی تلاشی لی جائے۔ شام ہونے لگی تھی، اس لیے آخری دو ٹرکوں کی تلاشی لیے بغیر یہ کارواں روانہ ہوگیا۔ یہ غلطی تباہ کن ثابت ہوئی۔

دوستم اپنی فوج کے قلب کے ساتھ قندوز روانہ ہوگیا اور یہ کارواں دوسری سمت قلعۂ جنگی کی طرف چل پڑا جہاں نسبتاً کم تعداد میں سپاہی حفاظت پر مامور تھے۔ دوستم کی پولیس کے سربراہ نادر علی نے ایک کوشش اور کی کہ شام پڑے وہاں پہنچنے پر قیدیوں کی تلاشی لیں۔ تلاشی سے پہلے ہی ایک طالبان جنگجو نے دستی بم مارا جس سے اس کے اپنے علاوہ نادر اور دوستم کا ایک مشیر ہلاک ہوگئے۔

جب نادر علی کی لاش کو وہاں سے لے جایا جارہا تھا تو سپاہیوں نے طالبان جنگجوؤں کو احاطے کے قریب اصطبل کے علاقے میں جمع کردیا۔ تلاشی لینے کا کام ملتوی کردیا گیا۔

اس رات اسامہ بن لادن کے آٹھ جنگجوؤں نے قیدیوں کے احاطے کے ایک کمرے میں بم کے ذریعے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا، جان نے بتایا۔ یہ بات عیاں ہوگئی کہ طالبان کی ایک خاصی بڑی اقلیت ابھی تک دستی بموں سے لیس تھی۔ ''اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ یہ دُرشت خیالات کے حامل ہیں اور خطرناک ہیں،'' جان نے کہا۔ ''ہم میں اتفاق رائے ہوگیا کہ ان کے ہاتھ باندھ دیے جائیں اور انہیں تہہ خانے میں رکھا جائے۔''

اگلی صبح (اتوار) محافظوں نے نئے احکام پر عمل درآمد شروع کیا۔ اسی دوران شمالی افغانستان میں صلیب احمر کی بین الاقوامی کمیٹی کے نگراں سائمن بروکس، صلیب احمر کی سفید گاڑی میں وہاں پہنچے۔ وہ کمال سے یہ تحفظ حاصل کرنے آئے تھے کہ قیدیوں کے ساتھ نرم روّیہ اختیار کیا جائے گا۔ صلیب احمر قیدیوں کے ناموں کا اندراج بھی کرنا چاہتی تھی اور اس بات کی اجازت بھی حاصل کرنا چاہتی تھی کہ وہ اپنے خاندانوں کو پیغام بھجوا سکیں گے۔ بروکس وہ واحد شخص نہیں تھا کہ جسے ان عرب، پاکستانی اور چیچن قیدیوں سے دل چسپی ہو۔

سی آئی اے کے دو ایجنٹ، جانی ''مائک'' اسپان اور ''ڈیو'' بھی یہ ہدایت حاصل کرچکے تھے کہ القاعدہ سے روابط کے لیے طالبان کے ان سپاہیوں کی چھان پھٹک (اسکریننگ) کی جائے۔ دور سے دیکھا جائے تو ''ڈیو'' خود بھی افغان لگتا تھا۔ وہ ازبک بھی بولتا تھا جو دوستم کے سپاہیوں کی زبان تھی اور لمبے چغے کے نیچے شلوار قمیص پہنتا تھا۔ مگر خاص انداز سے ترشے ہوئے چھوٹے چھوٹے بالوں سے پتہ چل جاتا تھا کہ وہ امریکی ہے۔

ٹیلی وژن کے عملے کے دو افراد...... ایک رائٹرز کا اور دوسرا، جرمن اسٹیشن اے آر ڈی کا......
اس قلعے تک پہنچ گئے تھے۔ وہ قیدیوں کے احاطے میں تھے جہاں ڈیو اور مائک مشتبہ افراد کے انٹرویوز لینے لگے تھے۔

صبح کے ۱۱ بج کر ۲۵ منٹ پر طالبان سپاہیوں کو اس قلعے کے گھاس بھرے مرکزی احاطے میں لے جایا گیا۔ محافظوں نے پہلے آٹھ قیدیوں کو باندھ دیا، جان نے کہا، ''قیدیوں کو شک ہوگیا کہ انہیں گولی ماری جانے والی ہے۔ انہوں نے ایک محافظ پر حملہ کر دیا اور اس کی بندوق چھین لی'' اس نے بتایا۔ غیر ملکی سپاہیوں کو شک ہوگیا کہ ٹیلی وژن کے عملے کے یہ افراد بھی امریکی سپاہی ہیں جو ان کی موت کی فلم بندی کرنے کے لیے آئے ہیں۔

ایک قیدی نے مائک کو پکڑلیا اور دستی بم چلا دیا، جس سے اس کے چیتھڑے اڑ گئے۔ یہ شہادت، سی آئی اے کے اس بیان سے مختلف ہے جس کے مطابق مائک کو گولی ماردی گئی۔

اس کے بعد حشر کا منظر برپا ہوگیا۔ قیدیوں نے پانچ محافظوں کو گولی ماردی اور ان کے ہتھیار چھین لیے جب کہ ٹیلی وژن کا عملہ اپنی جان بچا کر بھاگا۔ ڈیو بھی یوں فرار ہوسکا کہ اس نے اپنی پستول سے طالبان کے کم از کم ایک قیدی کو ہلاک کر ڈالا۔ یہ قیدی اب ایک خاص قلعہ بند علاقے پر قابض تھے۔ ان کی جھڑپ سپاہیوں کے ایک دستے سے ہوگئی جو کوئی ۳۰۰ میٹر دور دوستم کے صدر دفتر میں درختوں کی قطار کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

''لڑائی چھڑنے کے کوئی پندرہ منٹ بعد ڈیو، دوستم کے صدر دفتر کی چھت پر پہنچ گیا۔'' بروکس نے بتایا۔ ''طالبان کے ایک سپاہی نے، جو یقیناً آتشیں اسلحے سے لیس تھا، اس امریکی کو پکڑلیا اور (سپاہی کے جسم سے بندھا) بم پھٹ گیا۔''

''مجھے ڈیو اس عمارت کے اندر ملا۔ وہ پوری طرح سے صدمے کی حالت میں تھا اور بری طرح سہا ہوا تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ کس لیے: اس نے اپنے دوست کو بم سے پھٹتے ہوئے (blow-up) دیکھا تھا۔ وہ گولیاں چلاتا ہوا نکلا اور عمارت سے کوئی ۱۵۰ میٹر دور پہنچ گیا۔''

اس کے بعد گولہ باری کھلم کھلا جنگ میں تبدیل ہوگئی جب طالبان قیدیوں نے احاطے میں موجود اسلحے کے ذخیرے پر قبضہ کرلیا اور مورٹر، راکٹ لانچرز سنبھالنے لگے۔ چھت پر سے ڈیو نے جرمن ٹی وی کے عملے سے سیٹلائٹ فون مستعار لیا اور ازبکستان میں امریکی سفارت خانے سے رابطہ کیا۔ ''صورتِ حال ہمارے قابو سے باہر نکل چکی ہے۔ ہیلی کاپٹر اور فوجی دستے بھیجو،'' اس نے

کہا۔

اس کی بات کا اثر ہوا۔ صلیب احمر کی گاڑی شعلوں میں جلتی رہی اور بروکس قلعے کی کچی دیواروں سے پھسل کر جان بچانے لگا، اس دوران پینٹا گون نے مزید ہوائی افواج بھیجنے کی تیاری کی۔ وہ آٹھ قیدی جن کو لڑائی کے شروع میں باندھ دیا گیا تھا، ان میں سے زیادہ تر کو فوراً ہی گولی ماردی گئی جب کہ باقی اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوگئے۔ چار دن کے بعد جب دوستم کے سپاہی دوبارہ اس احاطے میں داخل ہونے میں کامیاب ہوئے تو ان کی لاشیں وہیں موجود تھیں۔

سہ پہر تین بجے، پینٹا گون کے بھیجے ہوئے طیاروں نے طالبان کی پوزیشنز پر نو یا دس میزائل پھینکے۔ یہ سب اپنے نشانے پر گرے...... سوائے آخری میزائل کے جو تقریباً ایک کلومیٹر دور ایک کھیت میں گر گیا۔

اس گڑ بڑ کے دوران کم از کم دس قیدی بھاگنے میں کامیاب ہوگئے۔

اگلے دن باقی ماندہ طالبان، جن میں سے چند راکٹ لانچر سے لیس تھے، وہاں ڈٹے رہنے میں کامیاب رہے جب کہ بی ۵۲ بمبار طیارے ان کے سروں پر منڈلاتے رہے۔ طالبان کی اس ثابت قدمی پر تشویش میں مبتلا ہو کر امریکا کی مزید خصوصی افواج کو منگل کے روز روانہ کیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے شمالی اتحاد کو مشورہ دیا کہ باقی ماندہ طالبان کو باہر نکلنے پر مجبور کرنے کے لیے تہہ خانے میں تیل انڈیلا جائے اور اس کو آگ لگا دی جائے۔

ایک ٹینک اور بم باری کی شدت میں اضافے نے باقی ماندہ طالبان کو ختم کر دیا۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ راستہ صاف ہوگیا ہے، اتحادیوں نے بدھ کے دن قلعے کا انتظام سنبھال لیا۔ جمعرات کے دن معلوم ہوا کہ قلعے کے تہہ خانے میں طالبان کا ایک اکیلا سپاہی اب بھی موجود ہے جو گھوڑے کا گوشت کھا کر گزارہ کر رہا ہے۔

اس اکیلے زندہ بچ رہنے والے سے فاصلے پر، دوستم کا بھاری بھرکم اور پر رعب جثہ قلعے کا معائنہ کر رہا تھا جہاں اس ہولناک منظر کی تمام جزئیات نمایاں تھیں۔ ایک فوٹوگرافر نے ۵۰ طالبان کی لاشیں دیکھیں جن کے ہاتھ رومالوں سے بندھے ہوئے تھے اور جن کو قلعے کے جنوبی حصے میں ترتیب سے لٹا دیا گیا تھا۔ فوٹوگرافر کی نظروں کے سامنے اتحادی سپاہیوں نے لاشوں کے ہاتھ پر بندھے رومال کھولنے شروع کر دیے اور ان میں سے ایک سپاہی لاشوں کے دانتوں میں سے سونے کیبھرائی (''فلنگ'') اتار رہا تھا۔

جس دوران واشنگٹن اس پورے معاملے سے یہ کہہ کر بری الذمہ ہونے کی کوشش کر رہا تھا کہ اتحادی سپاہی قیدیوں کی دیکھ بھال کے ذمے دار تھے، انسانی حقوق کے وکلا انتباہ کر رہے تھے کہ دو اسباب کی بناء پر جنیوا کنونشن کی خلاف ورزی ہوئی ہے۔ طالبان سپاہیوں کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کی بناء پر جب ان کے ہاتھ باندھ دیے گئے اور دوسرے، امریکی جنگی طیاروں کی گولہ باری کی بناء پر جس نے ان کا نشانہ بنالیا۔

جنیوا کنونشن کے آرٹیکل ۱۳ کے مطابق، جنگی قیدیوں کے ساتھ بدسلوکی کی ممانعت کی گئی ہے۔ مزید برآں، یہ کنونشن، قیدیوں کے ساتھ تشدد کی اجازت دیتا ہے۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ یہ متناسب ہو۔

لندن اسکول آف اکنامکس کے پروفیسر اور انٹرنیشنل لاء رپورٹز کے شریک مدیر کرسٹوفر گرین وڈ کا کہنا ہے کہ پشت پر ہاتھ بندھے ہوئے قیدیوں کی ہلاکت بھی خلافِ قانون ہے۔ ''اگر یہ ضرورت سے زیادہ شدید ردِعمل ہے تب بھی یہ غیر قانونی ہے۔''

امریکا اور اس کے اتحادیوں کے ردِعمل کی قانونی حیثیت پر اشتباہ کے دوران، سی آئی اے کے دونوں افسران کے عمل پر بھی سوال کیے گئے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں بین الاقوامی تعلقات کے پروفیسر اور جنگی قوانین کے ماہر، پروفیسر ایڈم رابرٹ نے ان کے عمل کو ''ناقابل یقین حد تک احمقانہ اور اپنے پیشے سے مطابقت نہ رکھنے والا'' قرار دیا ہے۔

اب لاشیں اٹھائی جارہی ہیں اور اس دوران یہ تصادم امریکا اور برطانیہ منتقل ہوگیا ہے جہاں ایمنسٹی انٹرنیشنل کے اس اعلامیے کو دونوں ممالک نے مسترد کر دیا ہے کہ اس واقعے کی تفتیش کرائی جائے۔ ایمنسٹی نے اس کا جواب یہ کہہ کر دیا کہ اس طرح قانون کی عمل داری سے ان دونوں ممالک کی مکمل وابستگی پر شبہ ہوتا ہے۔

اس بات کا کم امکان ہے کہ اس معاملے پر دونوں ممالک میں دباؤ بڑھتا جائے۔ ایوانِ نمائندگان میں اپنی ہفتہ وار آمد کے وقت برطانیہ کے وزیر اعظم ٹونی بلیئر کو افغانستان کے بارے میں ایک ہی سوال کا سامنا کرنا پڑا اور وہ سوال کابل چڑیا گھر کے یک چشم بیمار شیر مرجان کے بارے میں تھا (جس کی حالت زار کے بارے میں ایک اخباری اطلاع شائع ہوئی تھی۔)

آزاد قلم اور آزاد منش، اسلم خواجہ معروف صحافی ہیں جن کی تحریریں سندھی کے کم و بیش سبھی اہم جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ وہ ایک مدت سے ایدھی فاؤنڈیشن کے ساتھ سماجی کاموں میں منسلک رہے ہیں اور اسی حوالے سے وہ ایدھی فاؤنڈیشن کی امدادی مہم میں شامل رہے۔ یوں وہ ان معدودے چند پاکستانیوں میں سے ہیں جن کو امریکی بم باری کے دوران افغانستان میں‌سفر کرنے کا موقع ملا۔ اپنے اس سفر کا کچھ احوال انہوں نے سندھی روزنامے ''کاوش'' کے لیے تحریر کیا۔ اپنی روداد انہوں نے ''دنیازاد'' کے لیے بطور خاص لکھی ہے۔ اسلم خواجہ نے حال ہی میں نوم چومسکی کی ایک کتاب کا ترجمہ کیا ہے اور آج کل عبدالستار ایدھی کی سوانح کا اُردو ترجمہ کررہے ہیں۔

اسلم خواجہ

قندھاری مہم

گیارہ ستمبر کو نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور واشنگٹن کے پنٹاگون پر ہونے والی دہشت گردی کے فوراً بعد جب اس بات کے امکانات بڑھ گئے کہ اسامہ بن لادن کے القاعدہ گروپ کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے امریکا افغانستان پر حملہ کرے گا، تو دیگر اداروں اور تنظیموں کی طرح ایدھی فاؤنڈیشن نے بھی اپنی تیاریاں شروع کر دیں۔ سات اکتوبر کو امریکی حملہ ہوتے ہی افغانستان سے ملحقہ پاکستانی سرحدی چوکی طورخم پر ایدھی فاؤنڈیشن کی سرگرمیاں شروع ہوگئیں جب کہ چمن شہر سے امدادی سرگرمیاں شروع کرنے کے لیے فاؤنڈیشن کی ٹیم دس اکتوبر کو کراچی سے روانہ ہوئی۔ میں بھی اس ٹیم میں شامل تھا۔ آر سی ڈی ہائی وے کے ذریعے کوئٹہ جاتے ہوئے میرے مشاہدے میں پہلی عجیب بات یہ آئی کہ ہم افغانستان کے جتنا قریب ہو رہے تھے، عام لوگوں اور نچلے اور درمیانی سطح کے انتظامی اہلکاروں میں طالبان حکومت سے ہمدردی کم ہوتی جارہی تھی۔ اس کی بھرپور مثال چمن میں نظر آئی جہاں عام لوگ اور سرکاری اہلکاروں کی اکثریت سرحد کے آس پاس وہی زبان بولنے والی پشتون آبادی کے زخموں، اموات اور مصائب پر غصے اور دکھ کا شکار تو تھی لیکن

وہاں طالبان کے لیے عوامی حمایت نظر نہیں آئی۔

اس دوران چمن میں ضلعی انتظامیہ کے (اگرچہ چمن شہر ضلع قلعہ عبداللہ میں شامل ہے۔ تاہم ضلعی دفاتر وغیرہ چمن میں ہونے کی وجہ سے چمن عملی طور پر ضلعی ہیڈکوارٹر ہے) تعاون سے افغانستان کے سرحدی ضلع ''اسپن بولدک'' کی انتظامیہ اور وہاں افغان وزارتِ خارجہ کے نمائندوں سے ایدھی فاؤنڈیشن کا رابطہ قائم ہوا۔ اس ضمن میں افغان حکومت کی جانب سے رابطہ کار ان کی وزارت خارجہ کا ایک معاون (جو کابل سے تعلق رکھتا تھا اور پشاور کے ایک مدرسے کا فارغ التحصیل تھا) اور ایدھی فاؤنڈیشن کی جانب سے میں تھا۔ میرا طالبان انتظامیہ سے یہ پہلا براہ راست رابطہ تھا۔ بنیادی طور پر مذہبی خاندان سے تعلق نہ رکھنے کے باوجود میں یہ جانتا تھا کہ طالبان کے اسلامی مسلک میں تصویر جائز نہیں لیکن جب ایدھی فاؤنڈیشن کی جانب سے امدادی سامان کا پہلا ٹرک وصول کرتے ہوئے افغان وزارت خارجہ کے اس طالب کی اخباری فوٹوگرافروں نے تصویریں کھینچیں اور ٹی وی والوں نے فلم بنائی تو اس یار نے نہ صرف کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ کیمرہ کے سامنے رُخ کر کے مسکرانے لگا۔ امدادی سامان کے اس پہلے ٹرک کی وصولی تک طالبان انتظامیہ نے ہمیں افغانستان کے اندر سرگرمیوں کی اجازت تو درکنار پہلے تجارتی شہر ویش بازار اور اس سے آگے اسپن بولدک تک جانے کی بھی اجازت نہیں دی تھی۔ واضح رہے کہ اسپن بولدک افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کا مرکز اور پورے ملک میں واحد ضلع تھا جس پر ایک بھی امریکی بم نہیں پھینکا گیا تھا۔

سامان کی پہلی کھیپ وصول کرنے کے بعد طالبان انتظامیہ کا رویّہ ایدھی فاؤنڈیشن کی جانب بہتر ہوتا ہوا محسوس ہوا اور جلد ہی انہوں نے اسپن بولدک میں فاؤنڈیشن کو ایک اسپتال دینے کی پیشکش کی جو فاؤنڈیشن نے لینے سے معذرت ظاہر کر دی۔ اس دوران افغان انتظامیہ نے ایدھی فاؤنڈیشن کو امدادی سامان کے لیے گودام قائم کرنے اور افغانستان کے مختلف علاقوں سے آنے والے زخمیوں کو چمن اور کوئٹہ کے اسپتالوں تک منتقل کرنے کے لیے چلنے والی ایمبولنسوں کے لیے اسپن بولدک میں جگہ بھی دی۔ یہ جگہ ایک ہوٹل تھی جس کا مالک طالبان انتظامیہ سے تعلقات ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے ملک چھوڑ کر بھاگ چکا تھا یا مارا جا چکا تھا۔

تیرہ اکتوبر کو جب میں پہلی مرتبہ چمن پہنچا تھا تو اُس وقت تک سرحد کے دونوں اطراف اور ''نومینز لینڈ'' میں پناہ گزینوں کی تعداد بہ مشکل ڈیڑھ دو ہزار تھی لیکن بیس بائیس اکتوبر تک یہ تعداد دس ہزار سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اس دوران پاکستان کی حدود میں اقوام متحدہ کے ادارہ برائے پناہ

گزین (UNHCR) اور افغانستان کی حدود میں اسپین بولدک کے آس پاس ایدھی فاؤنڈیشن، الرشید ٹرسٹ، اسلامک ریلیف آرگنائزیشن اور رابطہ العالم اسلامی کے کیمپ لگ چکے تھے جن کا انتظام تو طالبان انتظامیہ کے پاس تھا البتہ ان کیمپس میں رہنے والوں کی ضروریات پوری کرنا ان اداروں کی ذمہ داری تھی۔

اس دوران میں ایک دو مرتبہ طالبان انتظامیہ کی جانب سے رابطہ کار اہل کار کو قندھار جانے کی اجازت کے لیے کہہ چکا تھا (یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ سندھ میں ہم سندھی اور اردو دونوں زبانوں میں قندھار ''ق'' قلم سے لکھتے ہیں جب کہ افغانستان اور چمن میں قندھار ''ق'' قلم کے بجائے کہتے والے ''ک'' سے لکھا جاتا ہے) افغان اہل کار پہلے تو قندھار جانے کا اجازت نامہ نہ ملنے کی بات کرتا رہا لیکن ایک دن کہنے لگا کہ اُس کا تعلق کابل کے قریب کسی علاقے سے ہے اور وہاں اُس کے قبیلے کی حالت انتہائی خراب ہے، سُو اگر ایدھی فاؤنڈیشن اُس کی نقد امداد کرے تو وہ اپنے قبیلے والوں کی کچھ مدد کر سکے گا۔ اس کی طلب کردہ رقم تو ایدھی فاؤنڈیشن نے نہیں دی تاہم جب اس رقم کا انتہائی مختصر حصّہ میں نے اپنی طرف سے اُسے دیا تو وہ دو دن کے اندر قندھار جانے کے لیے ''راہ داری'' حاصل کر کے لے آیا۔ قندھار روانہ ہونے سے قبل اُس نے میرے دریافت کرنے پر بتایا کہ خارجیوں (غیر ملکی) کے لیے داڑھی لازمی شرط نہیں۔ قندھار چمن سے کوئی سو، سوا سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ چمن سے قندھار تک راستہ ابتدائی بیس، پچیس کلومیٹر تو اتنا شان دار ہے کہ سندھ کی تمام شاہراہوں کے ایسا ہونے کی تمنا کی جا سکتی ہے۔ البتہ تختہ پل نامی جگہ کے بعد راستہ خراب ہونا شروع ہوتا ہے جب کہ آخری پچیس، تیس کلومیٹر راستہ تو ایسا ہے کہ گاڑی کے بجائے پیدل سفر کرنا کم تکلیف دہ ہوگا۔ قندھار شہر میں داخل ہوتے ہی راستہ ایک مرتبہ پھر بہتر ہو جاتا ہے جس کے لیے معلوم ہوا کہ روسیوں سے لے کر طالبان تک ہر ایک نے قندھار شہر کو اپنے وسائل کے حوالے سے بنانے کی کوشش کی ہے۔

اسپین بولدک سے قندھار جاتے ہوئے میرے ساتھ مسلح طالب اور وزارت خارجہ کا ایک کم اہم اہل کار تھے۔ کرائے کی ٹیکسی کو تختہ پل تک تو کسی چیک پوسٹ وغیرہ پر نہیں روکا گیا البتہ اس کے آگے دو تین مرتبہ چیکنگ کے لیے گاڑی کو روکا گیا۔ ہماری ٹیکسی کے رکنے پر مسلح طالب غیر ملکی (میں) دیکھ کر کاغذات مانگنے لگتا۔ جب میرا ہم سفر اُسے راہ داری دکھاتا تو وہ یہ کاغذ چوکی پر لے جاتا جہاں ''سانولے رنگ کا ایک چھوٹے قد کا شخص'' کاغذات چیک کرتا۔ یہ سانولا شخص کسی بھی

صورت میں افغان نہیں بلکہ عرب لگتا تھا۔ ہر چوکی پر تقریباً یہی کچھ ہوتا رہا۔ جہاں راہ داری کے درست ہونے پر آگے جانے کی اجازت دیتے ہوئے افغان تو ''خدا حافظ'' اور ''فی امان اللہ'' کہتے لیکن چھوٹے قد والے سانولے لوگ ایک لفظ بھی نہیں بولتے۔ یہ وہ دن تھے جب امریکی فضائی حملے تو جاری تھے تاہم مزار شریف بھی تا حال ''شمالی اتحاد'' کے قبضے میں نہیں تھا۔ ہم جتنا قندھار کے قریب ہوتے جارہے تھے عربوں کا اثر اور کنٹرول بڑھتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

قندھار شہر عمومی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک سویلین علاقہ دوسرا کنٹونمنٹ/سول لائن علاقہ۔ قندھار میں طالبان کا انتظامی سیکریٹریٹ سویلین علاقے میں ہے اور چار صوبوں کے مرکزی صوبہ ہونے کی وجہ سے وہاں کافی چہل پہل تھی۔ امریکی بم باری سے متعلق پاکستانی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ کی رپورٹنگ کے نتیجے میں میرے ذہن میں یہ تاثر تھا کہ قندھار کا شہر بم باری کے نتیجے میں مکمل طور پر تباہ ہو چکا ہوگا تاہم وہاں پہنچنے کے بعد کسی حد تک اس امریکی دعویٰ کی تصدیق نظر آئی کہ یہ حملے Targeted ہیں اور سویلین آبادی کو جان بوجھ کر نشانہ نہیں بنایا جارہا ہے۔ اسی شام قندھار کے مقامی طالبان نے مجھے ایک مسجد دکھائی جس پر ان کے بقول، ہفتے کے دن امریکی بم باری ہوئی تھی۔ بعدازاں کچھ طالبان نے یہ اعتراف کیا کہ اس تباہ شدہ مسجد میں جمعہ کے دن ملا عمر نے خطبہ دیا تھا۔

کراچی جیسے شہر میں رات کو دیر تک جاگنے کی عادت کی وجہ سے میں ابھی بستر پر کروٹیں ہی بدل رہا تھا کہ جہازوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ہفتہ دس دن چمن میں رہنے کے دوران ایسی آوازیں سنتے رہنے کی وجہ سے میں نے پہلے تو اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی لیکن جب دھماکوں کی آوازیں سنائی دیں تو میں نے بستر سے چھلانگ مار کر کھڑکی سے باہر دیکھا تو ایک ڈیڑھ کلومیٹر دور آسمان سے زمین کی طرف آتے ہوئے شعلے دکھائی دیے۔ گھر سے نکل کر کچھ آگے جانے پر محسوس ہوا کہ کچھ لوگ ایک گول دائرے میں ان حملہ آور جہازوں کی جانب میزائل لانچر فائر کر رہے تھے۔ یہ عرب تھے جو متحرک لانچر پیڈ سے راکٹ لانچر فائر کرتے ہوئے جہازوں کی جانب اپنے بازو بلند کرتے ہوئے عربی یا اس سے ملتی جلتی کسی زبان میں نعرے وغیرہ بلند کر رہے تھے۔ یہ منظر خاصہ دلچسپ تھا کیوں کہ زمین پر موجود یہ لوگ لانچر فائر کر کے کچھ دور بھاگ جاتے تھے تو جہاز ان کے فائر کرنے والی جگہ کے قریب بم پھینک رہے تھے۔ اگرچہ ان کے لانچر جہازوں تک پہنچ نہیں پا رہے تھے لیکن انہوں نے اپنے دشمن کے کئی ایک بم ضرور ضائع کیے۔

دوسرے دن صبح سویلین علاقے میں موجود طالبان انتظامیہ کی وزارتِ صحت کے کچھ اہل کاروں سے ملاقات ہوئی۔ ان کے پاس بھی ایمان اور معجزوں کے ذکر کی مقدار زیادہ تھی البتہ عملی صورت حال میں حکمت عملی ناپید تھی۔ وزارتِ صحت کے اہلکاروں کا کہنا تھا کہ قندھار میں دو بڑی اسپتالیں تھیں جن میں سے ایک تو امریکی بم باری کی وجہ سے تباہ ہو چکی ہے البتہ چین کی مدد سے بننے والے اور ''چینی اسپتال'' کے نام سے مشہور ہونے والے اسپتال میں کام چل رہا تھا لیکن وہاں بھی عام لوگوں کے لیے سہولیات دن بدن کم ہوتی جا رہی تھیں۔ اس اسپتال میں لوگوں کے بقول صبح آٹھ بجے سے دس بجے تک ہی عام لوگوں کا علاج معالجہ ہوتا تھا جب کہ باقی وقت فوجیوں کا علاج ہوتا تھا۔ اُسی دن مجھے افغان ہلال احمر سوسائٹی کے لیٹر پیڈ پر مطلوبہ اشیا کی ایک فہرست دی گئی جس کا بہ مشکل بیس فیصد حصہ عام بیماریوں وغیرہ میں استعمال ہونے والی ادویات وغیرہ کا تھا جب کہ باقی تمام اشیا ہنگامی استعمال کی تھیں۔ اس فہرست کے ساتھ ساتھ افغان وزارتِ دفاع کے لیٹر پیڈ پر مختلف طاقت کے تین جنریٹرز بھی طلب کیے گئے تھے۔ ان جنریٹرز کے لیے بھی کہا گیا کہ اسپتالوں میں ان کی ضرورت ہے۔ وزارتِ دفاع کے لیٹر پیڈ پر ہونے کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ یہ جنریٹرز فوجی اسپتالوں کے لیے مانگے جا رہے ہوں۔ پاکستان پہنچنے پر میں نے یہ فہرست ایدھی فاؤنڈیشن کے حوالے کیں۔ کراچی ہیڈ آفس سے اس فہرست کے مطابق کچھ ادویات وغیرہ افغان ہلال احمر کے حوالے کر دی گئیں۔

قندھار میں فقط چوبیس گھنٹے رہنے کے باعث میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ میں قندھار کے حالات سے مکمل طور پر آگاہ ہوں تاہم وہاں مجھے لوگوں کے چہروں پر مجموعی طور پر مایوسی کی کیفیت نظر آئی۔ کچھ طالبان کے چہروں پر سنجیدگی تھی البتہ طالبان کی اکثریت چہروں اور رویے سے خوش حال اور کسی حد تک ''شغل'' والی نظر آئی۔ عام لوگ اگرچہ طالبان مخالفت کا اظہار تو نہیں کر رہے تھے لیکن وہ طالبان کی حمایت کا اظہار کرتے ہوئے بھی نظر نہیں آئے۔ اُس دن دوپہر کے بعد میں قندھار سے چمن روانہ ہوا۔

چمن میں اُس وقت تک مختلف ملکی اور غیر ملکی سماجی اداروں کی موجودگی خاصے حد تک بڑھ چکی تھی، خاص طور پر یو این ایچ سی آر کے پناہ گزین کیمپ کی وجہ سے ایسے اداروں کی موجودگی نظر آ رہی تھی۔

افغانستان پر امریکی حملے کے پندرہ دن کے اندر چمن کے اردگرد نہ صرف پناہ گزینوں کی

تعداد بیس پچیس ہزار تک جا پہنچی بلکہ پانچ صوبوں قندھار، ہلمند، فرح، ارزگان اور ہرات سے زخمی بھی چمن تک پہنچنے لگے۔ یہ زخمی کم از کم دو تین دن پرانے زخم ہونے کی وجہ سے بھی گھبراہٹ کا شکار نہیں تھے دوسرے یہ کہ عام افغانی گزشتہ بیس سال سے مختلف فوجوں کے حملوں کا شکار رہا ہے سو ان کے لیے یہ صورت حال انہونی نہیں تھی۔ ان میں سے اکثر کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اب ان پر حملہ کون کر رہا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ چمن میں ایک افغان خاتون چیخ چیخ کر مسلسل یہ کہہ رہی تھی کہ روسی بم پھینک رہے ہیں۔

اس دوران شمالی اتحاد کے لشکر نے مزار شریف سے جو قبضہ کرنا شروع کیا تو کابل سمیت کئی ایک شہر اور صوبے فتح کر کے قندھار کے قریب آ پہنچے۔ دوستوں کی اس بات کو کہ ملک کے بڑے حصے پر شمالی اتحاد کے قبضے کے بعد طالبان کے آخری اہم مورچے ''قندھار'' جانا اب خطرے سے خالی نہیں ہوگا، سُنی ان سُنی کر کے میں ایک بار پھر قندھار روانہ ہوا۔ اس مرتبہ اپنی شناخت ظاہر نہ کرتے ہوئے کچھ صحافی بھی میرے ساتھ تھے۔ ہمارے گروپ کو راہ داری تو چار افراد کی ملی ہوئی تھی لیکن ہم سات افراد قندھار روانہ ہوئے۔ سو شمالی اتحاد اور امریکی حملے کے ساتھ ساتھ طالبان کی امکانی ناراضگی کا خطرہ مول کر ہم سفر پر روانہ ہوئے۔ اس مرتبہ راستے میں مختلف چوکیوں پر تعینات عرب کسی حد تک بات چیت پر راضی اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور عربی میں نیا حال احوال معلوم کرنے کے لیے بے چین نظر آئے۔ اس مرتبہ پاکستان یا کم از کم اسپن بولدک کی جانب بھاگنے والے عام افغانیوں کی تعداد بھی زیادہ نظر آ رہی تھی۔ یہ قندھار اور اس کے اردگرد کے علاقوں سے تعلق رکھتے تھے جہاں یا تو ابھی تک جنگ چل رہی تھی یا سخت مزاحمت کے امکانات تھے۔ عربوں کی طرح اس مرتبہ عام افغانی بھی بات چیت کرنے پر آمادہ نظر آ رہے تھے۔ شاید انہیں احساس ہوگیا تھا کہ طالبان کا باب ختم ہونا شروع ہوگیا ہے۔ ان لوگوں میں سے کچھ طالبان کے خلاف بولتے ہوئے اُن پر رشوت کے عوض عام افغانیوں کو پُرامن علاقے کی جانب جانے کی اجازت دینے کا الزام بھی عائد کر رہے تھے۔

اس مرتبہ قندھار کی جانب جاتے ہوئے سیکورٹی کے انتظامات سخت نظر آئے اور راستے پر چیکنگ بھی زیادہ تھی۔ اس مرتبہ قندھار شہر میں داخل ہونے پر محسوس ہو رہا تھا کہ یہ شہر حالتِ جنگ میں ہے ورنہ پچھلی مرتبہ یہ شہر معمولی شورش یا مشکلات کا شکار ہونے کا عندیہ دے رہا تھا۔

اس مرتبہ ہمارے پاس افغان وزارتِ داخلہ کے قندھار دفتر کے ایک اہلکار کے لیے سفارشی

خط بھی تھا جو کوئٹہ کے ایک طالبان مخالف پشتون قوم پرست/ترقی پسند رہنما نے دیا تھا۔ یہ قندھاری اہل کار تیس پینتیس برس کی عمر کا تھا اور ڈاکٹر نجیب اللہ کی حکومت کے دوران گریجویشن کر کے سرکاری ملازم ہوا تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی ملاقات کے بعد وہ ہمیں یہ بتانے سے نہیں ہچکچایا کہ وہ پرچم پارٹی کا حمایتی ہے اور طالبان انتظامیہ میں بھی حکومتی معاملات چلانے والوں کی اکثریت سابقہ کمیونسٹوں/ترقی پسندوں کی یا ان کے ادوار میں فارغ التحصیل اور تربیت یافتہ لوگوں کی ہے۔ یہ افسر قندھار پر بھی طالبان مخالف قبائل کے قبضے سے متعلق خاصہ پرُامید تھا۔ جب ہم نے اُس سے مذاقاً کہا کہ اُس کی تو داڑھی ہے اور وہ طالبان حکومت میں ملازمت کرتا رہا ہے تو اُس نے بتایا کہ امریکی جہازوں سے پھینکے گئے سامان میں شیونگ ریزر بھی شامل ہیں اور اُس نے اُن میں سے ایک سنبھال کر رکھا ہے کہ طالبان کے بھاگتے ہی اپنی داڑھی صاف کر دے۔ اس یار نے ایک مرحلے پر جذباتی ہو کر کہا کہ ہم اُس کے ہاں مہمان ہیں لیکن وہ ہمیں کوئی تحفہ نہیں دے سکتا کیوں کہ پچھلے چھ ماہ سے اُسے تنخواہ نہیں ملی، البتہ کچھ دیر کے بعد وہ ایک بریف کیس کھول کر اُس میں سے کچھ نکالنے لگا۔ اُس نے بریف کیس سے اداکارہ مدھوبالا کی دو تصویریں نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا کہ اس کے علاوہ وہ کوئی تحفہ نہیں دے سکتا۔

امریکی جہازوں سے گرائے جانے والے امدادی سامان سے متعلق مختلف لوگ مختلف تفاصیل بتا رہے تھے۔ آٹے، چاول، گیہوں، چائے اور چینی پر تو تمام لوگ متفق تھے البتہ باقی اشیا میں ریڈیو سیٹ، شیونگ ریزر، سگریٹ اور عورتوں کے سینٹری پیڈز کا ذکر مختلف لوگ کرتے رہے۔ وزارت داخلہ کے اہلکار کے پاس شیونگ ریزر دیکھنے کے علاوہ میں نے قندھار میں ایک شخص سے امریکی سگریٹ ونسٹن بھی خریدے جو اس کے بقول جہاز سے پھینکے گئے تھے۔ قندھار کے اس دوسرے دورے کے دوران ہی لوگوں نے اس بات کی بھی تصدیق کی کہ ایک مرتبہ امریکی جہازوں نے کسی خاص فریکوئنسی پر پشتو نغمے سنوائے تھے جو مختلف ریڈیو اسٹیشنوں بالخصوص بی بی سی کی پشتو نشریات سننے والوں نے سنے تھے۔ وزارتِ داخلہ کا افسر ہمیں اپنے گھر لے گیا جہاں ٹی وی سیٹ بھی نظر آیا جو انہوں نے اُس اُمید کے ساتھ سنبھال کر رکھا تھا کہ طالبان حکومت کے ختم ہونے کے بعد انہیں ٹی وی دیکھنا ضرور نصیب ہوگا۔

اس اہلکار کی ۲۴ سالہ بہن نے بتایا کہ طالبان حکومت قائم ہونے کے وقت وہ نویں جماعت میں پڑھتی تھی اور سرکاری طور پر گزشتہ پانچ سال کے دوران عورتوں/لڑکیوں پر تعلیمی

اداروں کے دروازے بند ہونے کی وجہ سے وہ مزید پڑھ نہیں سکی ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ طالبان حکومت کے دوران وہ محرم کے علاوہ چھ مرتبہ گھر سے باہر نکلی ہے اور اس میں سے چار مرتبہ طالبان کی مار پیٹ کا نشانہ بنی ہے۔ اُسے مار پیٹ کے بعد اس لیے چھوڑ دیا گیا کہ وہ ایک اعلیٰ حکومتی اہلکار کی بہن ہے ورنہ اُس کی کئی ایک واقف خواتین تو اس جرم میں ماری جا چکی ہیں۔ اس لڑکی نے یہ اعتراف ضرور کیا کہ ذاتی طور پر کسی طالب کے کسی خاتون سے جنسی زیادتی اس کے علم میں نہیں کی تاہم وہ خواتین کو سزا دینے میں انتہائی وحشی ثابت ہوئے ہیں۔ وزارت داخلہ کے اہلکار نے ہمیں قندھار کے کچھ اور خاندانوں سے ملوانے پر رضامندی ظاہر کی تو اس کی بہن، گھر سے باہر نکلنے سے قبل کراچی اور حیدرآباد کی خواتین کی طرح میک اپ کے طور پر گھر میں بنائی گئی لپ اسٹک لگانے لگی۔ اگرچہ یہ لپ اسٹک ہونٹوں پر جمنے سے زیادہ پانی کی طرح ٹھوڑی تک بہنے لگی تھی لیکن اس دوران اس لڑکی کے چہرے پر جبری ضابطہ توڑنے پر فخر کے تاثرات ظاہر تھے۔ طالبان حکومت کے دوران بارہ سال کی عمر سے لڑکیوں کو شٹل کاک برقعہ پہننا لازمی تھا اور انہیں بالغ محرم کے بغیر گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ گھر سے باہر اپنے کسی نابالغ محرم کے ساتھ بھی نہیں نکل سکتی تھیں اور کم از کم پانچ خواتین کسی مرد کے ساتھ کے علاوہ گھر سے باہر جاسکتی تھیں لیکن ان خواتین میں کم از کم ایک کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہونا لازمی تھی۔

گھر سے نکل کر گلی میں چلنے کے بعد ایک جگہ طالبان کی چوکی سے گزرتے ہوئے اس لڑکی نے اُن پر ایک جملہ کہا جو پشتو میں ہونے کی وجہ سے میں سمجھ تو نہیں سکا البتہ اس میں طنز اور غصہ واضح تھا۔ ایک جگہ اس لڑکی نے اپنے چہرے سے برقعہ ہٹا دیا تو ہم نے اُسے طالبان کی یاد دلائی تو اس نے ایک عجیب و غریب بات کہی کہ یہ علاقہ عربوں کا ہے اور وہ برقعے نہ پہننے والی خواتین کو سزا نہیں دیتے۔ بعد میں پتہ لگا کہ اگر کسی عرب کو کوئی خاتون پسند آ گئی تو پہلے تو اُسے پیسوں پر حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس میں ناکامی پر اثر و رسوخ استعمال ہوتا ہے لیکن اگر خاتون کا خاندان اس دباؤ میں نہ آیا اور عرب بھی اپنی ضد پر قائم رہا تو پھر ایسی خواتین کا اغوا معمول ہے۔ ان میں سے کئی خواتین تو زیادتی کے بعد قتل کر دی جاتی ہیں جب کہ کئی ایک عربوں کے حرم کا حصہ بن چکی ہیں۔

قندھار کے جن دو تین خاندانوں سے ہم مل سکے وہ طالبان حکومت سے خوش نہیں تھے اور ان میں سے ہر ایک کے پاس طالبان کی زیادتی کی اپنی اپنی مثالیں موجود تھیں۔

اس مرتبہ جن چار پانچ عربوں سے بات چیت کا موقع ملا وہ پاکستان اور عرب دنیا میں

افغانستان کے خلاف امریکی کارروائی پر ردِعمل جاننے کے ساتھ ساتھ کسی حد تک افغان طالبان پر ناراض تھے۔ ان میں سے کچھ نے تو افغان طالبان پر الزام عائد کیا کہ وہ مزارشریف، کابل اور دیگر شہروں سے اپنے عرب اور دیگر غیر ملکی ساتھیوں کو پیشگی اطلاع دیے بغیر بھاگ نکلے ہیں۔ دو عربوں نے غصّے میں یہ بھی کہا کہ "They got Money"۔ افغانوں کے پیسوں پر فیصلہ کرنے کے رجحان کی تصدیق چمن اور کوئٹہ کے پشتون بھی کرتے ہیں۔

قندھار میں اس مرتبہ کچھ پاکستانی شکلیں بھی نظر آئیں، جو خود ان کے بقول جہاد کرنے افغانستان آئے تھے۔ اس ضمن میں میرے مشاہدے میں یہ بات آئی کہ پاکستانی جہادیوں کی اکثریت سرائیکیوں اور بروہیوں کی تھی۔ اب اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کہیں ان کی افغان جہاد میں شرکت کا تعلق ان دونوں برادریوں کے معاشی اور سماجی طور پر پسماندہ ہونے سے تو نہیں کیوں کہ افغانستان میں پرانے جہادی پاکستانیوں کو کپڑے، مضبوط فوجی جوتے، جیکٹ اور کم از کم کلاشنکوف کے ساتھ ہلکا پھلکا مال غنیمت ضرور مل رہا تھا۔ بہرحال ان پاکستانیوں کے چہروں پر مایوسی واضح تھی کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ افغان تو مقامی ہونے کی وجہ سے چہرے پر کوئی تبدیلی لاکر بچ سکتے ہیں اور عرب وسائل ہونے کی وجہ سے نسبتاً کچھ زیادہ عرصہ نہ صرف لڑ سکتے ہیں بلکہ خوراک وغیرہ بھی خرید سکتے ہیں لیکن ان یاروں کے پاس فقط ایمان کی دولت ہی تھی۔

قندھار سے ہم زابل صوبے کے ایک ایسے قصبے کے لیے روانہ ہوئے جہاں حامد کرزئی کے حمایتی طالبان مخالف باغیوں کا قبضہ تھا۔ قندھار شہر کے باہر چوکیوں پر تعینات عرب اور افغان سپاہیوں کا روّیہ انتہائی غیر دوستانہ تھا۔ ان چوکیوں پر ہم پاکستان سے تعلق رکھنے والوں سے رویہ شاید اس لیے بھی خراب تھا کہ سپاہیوں بالخصوص عربوں کا خیال تھا کہ شمالی افغانستان میں ان کی شکست میں پاکستان کا اہم کردار ہے اور پاکستان نے ان کے متعلق اہم خفیہ معلومات امریکا کے حوالے کی ہے۔ بہرحال عربوں سے تین چار گھنٹے بحث مباحثہ کرنے کے بعد ہم باغیوں کے زیر تسلط شہر روانہ ہوئے۔ اس شہر کی بیرونی چوکی پر کاغذات اور کوئٹہ سے ملنے والا ایک سفارشی خط دکھانے کے بعد ہم شہر کے اندر داخل ہوئے تو وہاں معاملہ گمبھیر ہونے کے ساتھ ساتھ کسی حد تک نجات والا نظر آیا۔ انتظامی معاملات چلانے والے افراد تو دنیا جہان کے گناہ طالبان کے ذمّے لگا رہے تھے لیکن عام لوگ بھی مستقبل میں غیر طالبان انتظامیہ سے کسی حد تک سہمے ہوئے ہونے کے باوجود، طالبان کا جبر ختم ہونے پر خوش نظر آرہے تھے۔ اس شہر کے کمانڈر اور سپاہی ہم غیر ملکیوں

بے سکون سے بات چیت کرنے سے ہچکچا نہیں رہے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ قندھار سمیت طالبان کے زیر اثر باقی علاقے بھی جلد ہی پشتون باغیوں کے کنٹرول میں آ جائیں گے اور افغانستان کی آئندہ حکومت میں جنوبی افغانستان کے، جہاں پشتو بولنے والوں کی اکثریت ہے، تمام معاملات پشتونوں کے پاس ہی ہوں گے۔ ان ہی کمانڈروں کا خیال تھا کہ افغان طالبان اور ان کے حمایتی تو سرینڈر ہونا شروع ہو گئے ہیں اور جلد ہی ان میں سے نوے فیصد ہتھیار ڈال دیں گے جب کہ باقی بچنے والے افغان طالب، زندہ بچ جانے والے عرب اور پاکستانی حکومت اور سیاسی اور مذہبی جماعتوں کی بات چیت کے نتیجے میں آزاد ہونے کے بعد بچ جانے والے پاکستانی (جن میں سے اکثریت کسی مضبوط رابطے کے بغیر، جہاد کے شوق میں افغانستان آئی تھی) گوریلا جنگ شروع کر سکتے ہیں لیکن یہ جنگ بھی زیادہ عرصہ نہیں چل سکتی کیوں کہ سوویت یونین کے خلاف جنگ کے برعکس اس مرتبہ گوریلوں کے پاس کوئی ظاہری مرکز (پاکستان جیسا) نہیں ہوگا اور ان کے پاس سپلائی لائن بھی نہیں ہوگی۔ اگرچہ عربوں کے پاس پیسے کی کمی نہیں ہے اور وہ اپنی رقم سے راشن تو یقیناً خرید سکیں گے لیکن اسلحہ لینا شاید اب اتنا آسان نہیں ہوگا۔

اسی شہر میں ہماری ملاقات پاکستان سے تعلق رکھنے والے قیدیوں سے کرائی گئی۔ یہ جہادی طالبان کے ساتھ امریکا سے لڑنے آئے تھے۔ میری جن دو قیدیوں سے ملاقات ہوئی اُن میں سے ایک پنجاب کے ضلع جھنگ کے شہر شورکوٹ کا سرائیکی اور دوسرا لاڑکانہ سے تعلق رکھنے والا ایک بروہی تھا۔ اگرچہ ان دونوں قیدیوں نے گرفتاری کے وقت اپنی تھوڑی بہت ''خاطر تواضع'' کی تو بات کی لیکن انہیں صدمہ اپنے افغان جہادی ساتھیوں کے رویے کا تھا، جو بقول لاڑکانہ کے جہادی کے، اپنے غیر ملکی ساتھیوں کو بتائے بغیر نہ جانے کس وقت بھاگ نکلے تھے۔ لاڑکانہ کے اس جہادی نے شمالی سندھ کے لہجے میں افغان طالبان کو جو گالیاں دیں وہ شاید اُس کی اپنی پشیمانی کا اظہار تھا۔

افغانستان کے طالبان اور طالبان مخالف کنٹرول والے ان شہروں میں مجھے سیاسی حوالے سے جس چیز نے سب سے زیادہ حیرت زدہ کیا وہ مثبت اور منفی دونوں حوالوں سے پاکستانیوں کو ''پاکستانی'' کے بجائے ''پنجابی'' کہہ کر مخاطب کرنا تھا۔ ابتدا میں تو سمجھتا رہا کہ وہ مجھے پاکستان کے صوبے پنجاب کا باشندہ سمجھ کر پنجابی کہہ رہے ہیں لیکن بعد میں پتہ یہ لگا کہ بنگالیوں کی طرح افغانیوں کے ہاں بھی پاکستانی کا مطلب صرف پنجابی ہے۔ طالبان مخالف باغیوں کے زیر کنٹرول شہر میں دو دن رہنے کے بعد میرے دیگر ساتھی کابل کی طرف روانہ ہوئے جب کہ میں قندھار کے

راستے واپس چمن لوٹ آیا۔

افغان متاثرین کے لیے چمن اور اسپن بولدک میں کام کرنے والے سماجی اور ریلیف اداروں میں سے بعض تنظیمیں اور ادارے انفرادی طور پر کام کر رہے تھے۔ بعض نے امدادی سامان فراہم کیا اور بعض نے کلینک چلائے۔

مگر کچھ تنظیمیں چمن تک بھی نہیں آئیں بلکہ کوئٹہ کی مختلف ایئر کنڈیشنر ہوٹلوں کے کمروں میں ہی مستقبل کو منصوبہ بندیاں اور Brain Stroming Sessing ہی کرتی رہیں۔

افغانستان میں فلاحی کاموں کا اصل سرچشمہ مقامی لوگوں کے وہ غیر رسمی گروہ ہیں جو اپنے معمولی وسائل میں سے کچھ نہ کچھ نکال کر ''لنگر خانے'' چلاتے ہیں۔ اگرچہ میرے نوٹس پر پانچ یا چھ اس قسم کے لنگر آئے تاہم مواصلاتی رابطوں سے محروم افغانستان کے مختلف علاقوں میں قائم ان لنگر خانوں کی تعداد بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ ان لنگر خانوں کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ مقامی طور پر انہیں ''ضیافت'' کہا جاتا ہے، جو ہر روز ایک نئے گھر رخاندان میں منعقد ہوتی ہے اور اس میں میزبان سمیت پورا علاقہ ربرادری مل کر ایک جیسا کھانا کھاتے ہیں۔ چوں کہ یہ لنگر خانے کسی ادارے کے پاس رجسٹرڈ نہیں ہیں نہ کسی غیر ملکی ادارے کی امداد سے ملتے ہیں چناں چہ ان کی ذرائع ابلاغ میں کوئی تشہیر نہیں، تاہم یہ لنگر خانے میرے خیال میں افغان معاشرے میں انتہائی مثبت مقام رکھتے ہیں۔

ذرائع ابلاغ سے تعلق رکھنے والے افراد کو افغان صورتحال کے حوالے سے تین حصوں میں تقسیم کی جاسکتا ہے۔ ایک تو کوئٹہ اور چمن سے تعلق رکھنے والے مقامی صحافی، جن کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جارہی تھی۔ ایک تو ان بچاروں کی انگریزی خاصی کم زور تھی جس کی وجہ سے وہ غیر ملکی صحافیوں اور دیگر کارکنوں سے رابطہ نہیں کر پارہے تھے دوسرے یہ لوگ اس بات پر بھی ناراض تھے کہ جنگ تو اُن کے علاقے میں ہو رہی تھی لیکن اس کی کوریج کے لیے صحافی باہر سے آئے ہوئے تھے، اس لیے کوئٹہ اور چمن سے تعلق رکھنے والے صحافی بیرونِ شہر اور بیرونِ ملک سے آنے والے صحافیوں سے لاتعلق رہے یا انہیں اکثر غلط معلومات دیتے رہے۔ جنگ کی کوریج کرنے والا دوسرا گروہ پاکستانی یا غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے اُن پاکستانی نژاد صحافیوں کا تھا جن کی اکثریت کراچی اور اسلامی آباد سے آئی ہوئی تھی۔ ان لوگوں کو چمن میں رہنے کی بھی اجازت تھی (جس سے غیر ملکی صحافی محروم تھے) ان کے مقامی آبادی اور مقامی صحافیوں سے بھی بہتر تعلقات تھے تاہم غیر ملکی

صحافی انہیں بھی گھاس نہیں ڈال رہے تھے جب کہ سب سے زیادہ اور پر خطر کام یہی لوگ کر رہے تھے جس میں غیر قانونی طور پر طالبان کے افغانستان جانا بھی شامل تھا۔ کراچی اور اسلام آباد سے تعلق رکھنے والے صحافی کسی حد تک مقامی ثقافت کے متعلق جاننے اور طالبان اور پشتون مذہبی اور لبرل لوگوں کی بے رحم طاقت کا اندازہ رکھنے کی بناء پر کسی اشتعال کا سبب نہیں بن رہے تھے۔ البتہ صحافیوں کی تیسری جنس یعنی غیر ملکی صحافی تو مخلوق ہی کچھ اور تھے۔ فقط ایک مقامی لفظ ''السلام علیکم'' رٹنے اور اپنے Fixers کی بریفنگ کے بعد وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ پاکستان اور افغانستان کے ماہر بن گئے ہیں۔

ان بے چاروں کی حالت اس لیے بھی بری تھی کہ کوئٹہ میں حکومت بلوچستان روزانہ دس پندرہ صحافیوں کے ایک گروپ کو تین گھنٹے کے لیے پولیس کے پہرے میں چمن آنے کی اجازت دیتی تھی۔ اب ان تین گھنٹوں میں انہیں اپنے کم انگریزی جاننے والے مقامی گائیڈز کے مدد سے افغانوں اور پاکستانیوں سے گفتگو کرنی ہوتی تھی، تصویریں اور فلمیں بنانی ہوتی تھیں اور انہیں چمن کے سرحدی مقام پر اکثر غیر دوستانہ رویے کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا۔

ان غیر ملکی صحافیوں میں سے ایک، آسٹریلین براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کی ٹی وی ٹیم کا کوئٹہ میں موجود سربراہ ایدھی فاؤنڈیشن فون کر کے ہمیشہ ایک ہی سوال کرتا کہ مزید زخمیوں کی آمد کب متوقع ہے۔

اس دوران کچھ غیر ملکی صحافیوں نے یہ صفائی دکھائی کہ حکومتِ بلوچستان کو درخواست دی کہ وہ ایدھی فاؤنڈیشن کے زخمیوں کو افغانستان/ پاکستان کی سرحد سے سول اسپتال کوئٹہ تک پہنچانے کی سرگرمی پر فیچر لکھنا یا دستاویزی فلم بنانا چاہتے ہیں، سو ان کی خصوصی اجازت مل جاتی تھی اور وہ ایدھی فاؤنڈیشن پر لکھنے یا فلم بنانے کے ساتھ ساتھ اپنا کام بھی نکال لیتے تھے۔

اس دوران چمن اور کوئٹہ میں میری جن غیر ملکی صحافیوں سے بات چیت رہی وہ ایک تو یہاں کے ماحول کے متعلق بالکل بے خبر تھے اور دوسرا ان کا خیال تھا کہ سو فیصد مذہبی انتہا پسندوں کے اس ملک میں تمام کام پیسوں کے بل بوتے پر ہو سکتے ہیں۔ یہ صحافی بے دھڑک پیسہ خرچ کرتے تھے جس کا مقامی ہوٹلوں، کرائے پر چلنے والی گاڑی والوں اور مقامی گائیڈز نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ذاتی طور پر مجھے بھی کئی ایک غیر ملکی صحافیوں نے ایدھی فاؤنڈیشن کے علاوہ معلومات دینے یا انہیں ایدھی ایمبولنس کے ذریعے افغانستان لے جانے کے عوض بھاری رقم کی پیشکش کی۔

میرے چمن میں رہنے کے دوران ہفت روزہ ٹائم کی ایک ٹیم ایدھی فاؤنڈیشن کی سرگرمیوں کے حوالے سے بات چیت کرنے آئی۔ اس ٹیم کا سربراہ ٹائم رسالے کا براعظم ایشیا میں کلیدی حیثیت کا حامل تھا لیکن ایک مرحلے پر جب اُس نے مجھ سے دریافت کیا کہ پاکستان میں افغانستان کی خاصی بڑی حمایت کا سبب اسلام نہیں تو میں نے جب اس سے کہا کہ میں Non Believer ہونے کے باوجود سمجھتا ہوں کہ اگرچہ طالبان تو کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں ہوسکتے لیکن عام افغانوں کے ساتھ حقیقتاً ضرورت سے زیادہ زیادتی ہورہی ہے اور ان کے ساتھ انسانی بنیادوں پر بھی ہمدردی ہونی چاہیے تو اُسے Non-believer والی بات پر انتہائی حیرت ہوئی اور وہ مجھے دیدے پھاڑ کر ایسے دیکھنے لگا جیسے میرے سینگ نکل آئے تھے۔ میرے یہ بتانے پر کہ عقائد کے حوالے سے میرے جیسے کئی لوگ اس ملک میں ہیں تو اُسے یہ بات مستقبل میں اپنے رسالے کے لیے کور اسٹوری جتنی اہم نظر آرہی تھی۔

بہرحال افغان جنگ کا کوئٹہ، چمن اور جنوبی افغانستان سے مشاہدہ کرنے کے بعد ایک بات یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ جنگ اسلحے سے زیادہ میڈیا کے بل بوتے پر لڑی گئی اور اس دوران جو جتنا تیز طرار تھا اُس نے اُتنا زیادہ فائدہ اُٹھایا۔

گلابوں کے باغ میں آدھی رات — بشکریہ: نیویورکر

نجیب محفوظ
ترجمہ انور احسن صدیقی

شیخ الجبل

ایک ہسپانوی اخبار نویس نے جس سے میری حال ہی میں ملاقات ہوئی تھی، مجھ سے یہ پوچھا کہ ان پُر آشوب دنوں میں امن کے امکانات کے بارے میں میری کیا رائے ہے، میں نے سادگی کے ساتھ اور طنز کے بغیر، اس امر پر زور دیتے ہوئے کہا کہ امن، محبت، باضمیری اور انصاف میں مضمر ہے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ محض الفاظ ہیں، عالم بیداری کے خواب ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے واشنگٹن اور نیویورک پر ہونے والے حملوں کی ان حملوں کے ہونے سے محض چند ہفتے پہلے پیش گوئی کی ہوتی، تو اس پر بھی الفاظ سے کھیلنے اور عالم بیداری میں خواب دیکھنے کا الزام لگایا جاتا۔ تاہم، اگر اس قسم کے بھیانک خواب حقیقت کی شکل اختیار کرسکتے ہیں تو اخلاقی نوعیت کے حامل خواب حقیقت میں کیوں نہیں بدل سکتے؟ میں یہ کہوں گا کہ ان کو بھی حقیقت کی شکل دی جاسکتی ہے۔

جہاں تک بن لادن کی شخصیت کا تعلق ہے اس بارے میں میں جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ مجھے تاریخِ عرب کے ایک بدنام کردار شیخ الجبل (امیر کوہسار) کی یاد دلاتا ہے جو ان قاتلوں کے سرغنوں میں سے ایک ہے جن کی تاریخ میں دستاویزی شہادتیں موجود ہیں۔ یہ لوگ الگ تھلگ پہاڑیوں میں رہتے تھے اور ساری اسلامی دنیا میں دہشت پھیلاتے تھے۔ اور میرے خیال میں، افغانستان میں پہاڑیوں میں الگ تھلگ رہنے والا اور دہشت گردی کی کارروائیوں کے منصوبے بنانے والا سعودی منحرف یہی کچھ کررہا ہے اور کرتا رہے گا۔

وہ ہمارے عہد کا شیخ الجبل (امیر کوہسار) ہے۔

(محمد سلماوی کے ذریعے کیے جانے والے ایک انٹرویو پر مبنی)

نجیب محفوظ
ترجمہ: انور احسن صدیقی

واقعی تعجب کی بات

لوگوں کو اس بات پر تعجب تھا کہ افغانستان میں طالبان امریکی فوجوں کے سامنے کس قدر تیزی کے ساتھ پسپا ہوگئے، لیکن میرے خیال میں زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ وہ ایک ماہ سے زیادہ عرصے تک امریکی حملوں کا مقابلہ کس طرح کرتے رہے۔

ہتھیاروں اور فوجی تربیت کے اعتبار سے طالبان کی قوتیں بالکل فرسودہ ہیں اور انہیں تاریخ کی مضبوط ترین فوجی قوت کا سامنا ہے۔ امریکی قوت کے سامنے دنیا کے سب سے زیادہ طاقت ور ممالک کے بھی پاؤں اکھڑ گئے ہیں تو پھر افغانستان میں یہ جنگ اتنے دنوں تک کس طرح چلتی رہی؟ ایسا کیوں نہیں ہوا کہ بہت سی ان دوسری جنگوں کی طرح جو ہم نے عصر حاضر میں دیکھی ہیں، یہ جنگ بھی چند گھنٹوں کے اندر اندر ختم ہوجاتی؟

میرے خیال میں طالبان کی اچانک پسپائی کی دو ممکنہ وجوہات ہیں: یا تو وہ مسلسل حملوں کے باعث تباہ ہوگئے، یا پھر ان کی اصل فوجیں وہ ہوں گی جو پہاڑوں میں چھپی ہوئی ہیں اور امریکی فوجوں کو گوریلا جنگ میں گھسیٹ لانے کی منتظر ہیں جس میں جدید ہتھیار بے کار ثابت ہوں گے۔ موخرالذکر صورت کا طلب یہ ہے کہ ہم ایک خوفناک اور طویل جنگ کے خطرے سے دوچار ہوسکتے ہیں۔

اس صورتِ حال میں اسلامی دنیا پر ایک خصوصی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیوں کہ بدقسمتی سے اس جنگ کے شکار مسلمان ہیں۔ لیکن ہمیں لازماً اس امر کو بھی محسوس کرنا چاہیے کہ سب سے بڑا شکار تو خود اسلام ہے۔ طالبان نے اسلام کو ہائی جیک کیا اور اس کی شکل مسخ کر دی۔ انہوں نے اسلام کے نام پر انتہائی وحشیانہ کارروائیاں کیں۔ بے گناہ افغانوں کی ہلاکت پر احتجاج کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں طالبان کے تصورِ اسلام کی بھی لازماً مخالفت کرنی چاہیے۔

زہرا نگاہ

قصہ گل بادشاہ کا

نام میرا ہے گل بادشاہ
عمر میری ہے تیرہ برس
اور کہانی
میری عمر کی طرح سے مختصر

میری بے نام بے چہرہ ماں
بے دوا مر گئی
باپ نے اس کو برقعے میں دفنا دیا
اس کو ڈر تھا کہ منکر نکیر
اس کا چہرہ نہ دیکھیں

باپ کا نام زرتاج گل
عمر بتیس برس
وہ مجاہد شہادت کا طالب راہ حق کا مسافر ہوا
اور جام شہادت بھی اس نے
اپنے بھائی کے ہاتھوں پیا
جو شمالی مجاہد تھا
اور پنج وقتہ نمازی بھی تھا
مسئلہ اس شہادت کا پیچیدہ ہے
اس کو بہتر یہی ہے یہیں چھوڑ دیں
اب بہر حال بابا تو جنت میں ہے
اس کے ہاتھوں میں جام طہور
اس کی بانہوں میں حور و قصور
میری تقدیر میں بم دھما کے دھواں
پگھلتی ہوئی یہ زمین

بکھرتا ہوا آسماں
بعد از مرگ وہ زندہ ہے
زندگی مجھ سے شرمندہ ہے

کل سرِ شام دشمن نے آتے ہوئے
بم کے ہمراہ برسا دیے
مجھ پہ کچھ پیلے تھیلے
جن سے مجھ کو ملے
گول روٹی کے ٹکڑے
ایک مکھن کی ٹکیا
ایک شربت کی بوتل
مربے کا ڈبا

اس کے بدلے میں وہ لے گئے
میرے بھائی کا دستِ مشقت
جس میں منّت کا ڈورا بندھا تھا
میری چھوٹی بہن کا وہ پاؤں
جس سے رنگِ حنا پھوٹتا تھا

لوگ کہتے ہیں یہ امن کی جنگ ہے
امن کی جنگ میں حملہ آور
صرف بچوں کو بے دست و پا چھوڑتے ہیں
ان کو بھوکا نہیں چھوڑتے
آخر انسانیت بھی کوئی چیز ہے

میں دہکتے پہاڑوں میں تنہا
اپنے ترکے کی بندوق تھامے کھڑا ہوں
تماشائے اہلِ کرم دیکھتا ہوں۔

سماجی ترقی، صحت اور ماحولیات

آئندہ کتابیں

عورت: زندگی کا زنداں

زاہدہ حنا

سندھ کی عورت: گھر سے قبرستان تک

عطیہ داؤد

عورتوں کی صحت

عطیہ داؤد

بچے اور اُن کی صحت

ڈاکٹر مبینہ آگبوٹ والا

خیال افروز اور دیدہ زیب کتابیں

ادبی نقّاد اور فلسطین کے تجزیہ نگار ایڈ ورڈ سعید کا یہ مضمون "دی نیشن" میں شائع ہوا۔ اس کا ترجمہ معروف شاعر اور صحافی حسن عابدی نے کیا ہے۔ حسن عابدی نے ایڈورڈ سعید کے بعض اور مضامین کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ شہر زاد کی طرف سے ایڈورڈ سعید کے منتخب مضامین کتابی صورت میں شائع ہو رہے ہیں۔

ایڈورڈ سعید

ترجمہ: حسن عابدی

جہل کے مابین تصادم

سیموئل ہنٹنگ ٹن کا مقالہ "The Clash of Civilizations?" (تہذیبوں کا تصادم) گرما ۱۹۹۳ء میں "فارن افیئرز" کے شمارہ میں شائع ہوا۔ اسے فوری طور پر جس قدر توجہ ملی اور جو ردِعمل دیکھنے میں آیا، وہ حیران کن تھا۔ چوں کہ مقالے کی اشاعت کا مقصد، سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکیوں کو عالمی سیاست کے "ایک نئے دور" کی اصل غایت سے روشناس کرانا تھا۔ ہنٹنگ ٹن کے دلائل نہایت محکم، جرات مندانہ اور بصیرت افروز نظر آتے تھے۔ پالیسی سازوں کی صفوں میں اپنے حریفوں پر اس کی گہری نظر تھی، جن میں مثال کے طور پر فرانسس فیوکویاما، "تاریخ کے خاتمے" کے بارے میں اپنے خیالات کے ساتھ شامل تھا اور وہ فاتحین بھی جنھوں نے عالمگیریت اور قبائلیت کے تسلط اور ریاست کی پامالی کا جشن منایا تھا۔ لیکن اس نے اتنی رعایت دے دی کہ ان لوگوں نے اس نئے عہد کے محض چند پہلوؤں کو سمجھا ہے۔ "آنے والے برسوں میں ممکنہ طور پر کرۂ ارض کی سیاست کیسی ہوگی" اور اس کا "نہایت گمبھیر بلکہ مرکزی پہلو کیا ہوگا" اس کے بارے میں وہ اعلان کرنے ہی والا تھا، تاہم بے تامل اس نے یہ دعویٰ کر دیا کہ:

"میرے مفروضے کی رُو سے اس نئے دنیا میں تنازعہ کا بنیادی سبب اصلاً نظریاتی یا معاشی نہیں ہوگا تمام انسانوں کے درمیان مہیب تفرقے اور تصادم کا بڑا سبب ثقافتی ہوگا۔ عالمی امور میں

قومی حکومتیں نہایت طاقت سے اپنا کردار ادا کریں گی، لیکن عالمی سیاست میں بنیادی تنازعے قوموں اور مختلف تہذیبوں کے درمیان ہوں گے۔ تہذیبوں کے درمیان تقسیم کے خطوط پر ہی آئندہ جنگوں کی صف بندی ہوگی۔'' اس کے بعد کے اوراق میں جو بیش تر دلائل پیش کیے گئے ان کی بنیاد ایسے مبہم تصورات پر تھی، جسے ہنٹنگ ٹن نے ''تہذیبی شناخت'' قرار دیا اور ''سات یا آٹھ بڑی تہذیبوں کے درمیان تعامل'' کہا اور جس میں زیادہ تر توجہ اسلام اور مغرب کے مابین تنازعے پر تھی اس نوع کے معاندانہ خیالات میں اس کا انحصار بہت بڑی حد تک ۱۹۹۱ء کے ایک مضمون پر ہے جسے کھوسال مستشرق برنارڈ لیوس نے تحریر کیا۔ مضمون کے عنوان ہی سے اس کے نظریاتی رنگ کا پتہ چل جاتا ہے:

''مسلمانوں کے غیض وغضب کی بنیادیں'' (The roots of Muslim rage)

ان دونوں مضامین میں وسیع الجثہ وحدتوں کو "The West" (مغرب) اور اسلام کے نام دے کر انہیں بے مہابہ استعمال کیا ہے۔ گویا تشخص اور کلچر جیسے انتہائی پیچیدہ معاملات کسی کارٹونی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں، جہاں پوپائی (Popeye) اور بلوٹو جیسے کردار ایک دوسرے پر بے دردی سے مکّے برسا رہے ہوں، ان میں سے مکّے باز ہمیشہ نیک گو ہوگا اور اپنے حریف پر بالادستی اس کی ہوگی۔ یقیناً نہ تو ہنٹنگ ٹن اور نہ لیوس کے پاس اتنا وقت ہوتا ہوگا کہ وہ ہر تہذیب کی داخلی حرکی توانائی اور اس کی وسیع معنویت کو سمجھیں یا اس حقیقت کا انہیں ادراک ہو کہ بیش ترین جدید ترین تہذیبوں کے مابین اصل مقابلہ ہر تہذیب کی تعریف یا اس کی تفسیر کے تعلق سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی فرد کسی پورے علاقے یا کسی تمدّن کے بارے میں یہ فرض کرے کہ وہ اس پر گفتگو کرے گا تو امکان یہی ہے کہ اس کی ساری گفتگو میں خاصی لفاظی اور یکسر لاعلمی شامل ہوگی۔ جی نہیں، مغرب مغرب ہے اور مشرق، مشرق۔ ہنٹنگ ٹن کے بقول مغرب کے پالیسی سازوں کو اصل چیلنج یہ درپیش ہے کہ انہیں ایک یقین چاہیے، جس کے ہوتے ہوئے وہ دیگر تمام مذاہب کا بہ شمول اسلام مقابلہ کر سکتے ہیں۔ زیادہ تشویش ناک ہنٹنگ ٹن کا یہ مفروضہ ہے کہ وہ تمام معمولی روابط اور ان کے اندر چھپی ہوئی وفاداریوں کا جائزہ ہیجان پر بیٹھے بیٹھے لے لیں گے اور یہ کہ انہیں ہر بات کا جواب مل گیا ہے، باقی لوگ ٹاک ٹوئیاں مارتے رہ جائیں گے۔ دراصل ہنٹنگ ٹن ایک نظریہ ساز ہیں، یعنی اپنی ذات میں ایک ایسی ہستی جو ''تہذیبوں'' کو اور ''منفرد اکائیوں کو ایسا ہی بنالینا چاہتی ہیں جو وہ فی الواقع نہیں ہیں اور ایسی شناختوں سے سند لیتا ہے، جو اندر سے مہر بند ہیں اور جن میں توانائی کی وہ لہریں اور باہم متصادم لہریں پیدا کرنے کی سکت نہیں رہی جو انسانی تاریخ میں تموج پیدا کرنے کے لیے

ضروری ہیں اور جن کی بدولت نہ صرف یہ کہ مذہبی جنگ و جدال اور توسیع مملکت کے عزائم کو رد کے رکھنا تاریخ کے لیے ممکن ہوا بلکہ تہذیبوں کے مابین باہمی لین دین، شراکت اور نشوو ارتقا کا عمل جاری رہا ہو اور مضحکہ خیز طور پر آپس میں جڑی ہوئی اور محدود نوعیت کی لڑائیوں کو ''تہذیبوں کا تصادم'' قرار دیتے ہوئے اس کو عین حقیقت بتایا گیا ہے اور اس کو نمایاں کرنے کی عجلت میں بدیہی تاریخ کو نظرانداز کر دیا گیا ہے، جو بہت کم نظر آتی ہے۔

ہنٹنگ ٹن نے اپنی تصنیف اس عنوان سے جب ۱۹۹۶ء میں شائع کی تو انہوں نے اپنے استدلال کو قدرے نفاست سے حواشی در حواشی کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی تھی، لیکن ہوا یہ کہ وہ ذہنی خلفشار کا شکار ہو گئے اور یہ دکھا دیا کہ وہ کتنے پھوہڑ مصنف اور ناشائستہ مفکر ہیں۔

مغرب بہ مقابلہ دیگر (اقوام) کی بنیادی فکر کو (جیسے سرد جنگ میں حزب اختلاف نے ازسرِنو وضع کیا تھا) سرے سے ہاتھ نہیں لگایا گیا اور ۱۱ر ستمبر کے ہولناک سانحے کے بعد اب تک وہی بات کبھی چالاکی کے ساتھ، کبھی بالواسطہ انداز سے بحث و مباحثے میں دہرائی جا رہی ہے۔ مٹھی بھر دہشت گردوں کے ایک چھوٹے سے گروہ نے خودکش حملے اور بے اندازہ قتل عام کا جو منصوبہ نہایت ہوشیاری سے بنایا تھا، اسی کو استدلال کے طور پر ہنٹنگ ٹن کے نظریے کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔

''بڑے'' خیالات کے مالک اکابر (میں اس لفظ کو غیر حقیقی طور پر استعمال کر رہا ہوں) پاکستان کی سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو سے لے کر اطالوی وزیراعظم سلویو برسکونی تک سب ہی نے اس واقعے کو اسلام کی محرومیوں پر محمول کیا۔ اور اس کی تائید میں ہنٹنگ ٹن کے خیالات استعمال کیے اور آخر الذکر نے تو پکارنا شروع کر دیا ہے کہ مغرب کی برتری مسلم ہے، کہ ''ہمارے پاس'' تو موزارٹ ہے اور مائیکل انجیلو ہے، اور ''ان'' کے پاس کچھ نہیں۔ (برسکونی نے ''اسلام'' کی توہین کرنے پر نیم دلی کے ساتھ معذرت کر لی ہے۔)

لیکن آپ متوازی خطوط پر کیوں نظر نہیں ڈالتے، البتہ یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اس میں وہ شدید تباہ کن کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ مثلاً اسامہ بن لادن اور اس کے مقلدوں کے مقابلے میں اس مسلک کے برانچ ڈیویڈینز (Branch Davidians) ہیں، یا گیانا میں جم جونز کے چیلے چانٹے ہیں یا جاپان کے اوم شرنکیو ہیں۔ تو یہ ہے کہ برطانوی ہفت روزہ اکنامسٹ، جو بالعموم ایک سنجیدہ اخبار مانا جاتا ہے اپنے ۲۲ تا ۲۸ ستمبر کے شمارے میں عمومی روّیہ اختیار کرنے سے باز نہیں رہا، چناں چہ

اس نے ہنٹنگ ٹن کو شان دار طور پر سراہا، کیوں کہ اس کے نتائج فکر اسلام کے بارے میں "سفاکانہ اور عمومی لیکن گہری فکر کے حامل" ہیں۔ یہ ہفت روزہ نہایت سنجیدگی سے لکھتا ہے کہ ہنٹنگ ٹن کے بیان کے بموجب "دنیا کے کم و بیش دس ارب مسلمان" اپنی تہذیب کی برتری کے قائل اور اپنی کم تر طاقت کے شدید احساس میں مبتلا ہیں۔" کیا ایسا کرتے ہوئے اس نے اپنے تجزیے میں انڈونیشیا کے دو سو، مراکش کے سو، مصر کے پانچ سو اور بوسنیا کے پچاس باشندے شامل کیے تھے؟ اور اگر ایسا کیا تو کس طرح کے نمونے شامل کیے تھے؟

امریکہ اور یورپ کے ہر قابلِ ذکر اخبار اور جریدے میں لاتعداد اداریے شائع ہوتے ہیں جن میں بڑے گھن گرج کے ساتھ اور پیش بینی کے انداز میں مذکورہ بیان میں اضافہ کیا جاتا ہے اور قاری کے ذہن میں یہ بات بٹھائی جاتی ہے بلکہ "مغرب" کے ایک باشندے کی حیثیت سے اس کے اندر نفرت کے جذبات کو بھڑکایا جاتا ہے کہ ہمیں اب کیا کرنا چاہیے۔ مغرب بالخصوص امریکا کے یہ خودساختہ چال باز اپنے خلاف نفرت کرنے والوں، لٹیروں اور غارت گروں سے جنگ میں ناروا طور پر چرچل کی چرب زبانی کا انداز اختیار کرتے ہیں اور تاریخوں کے پیچیدہ عمل میں ان کی سرے سے نظر نہیں جاتی جو اس طرح کے محدودات کے تابع نہیں اور ایک سے دوسرے علاقے میں سفر کرتی ہے اور اُن سرحدوں کو پار کر جاتی ہے جو ہمیں ایک دوسرے سے الگ رکھنے کے لیے بنائی گئی ہیں اور جنھوں نے ہمیں مسلح فریقوں میں بانٹ رکھا ہے۔

اسلام اور مغرب کی شناختوں کو سمجھنے میں یہی دشواری پیش آتی ہے۔ یہ علامتیں گم راہ کرتی ہیں اور ذہن کو الجھاتی ہیں جو ایک بکھری ہوئی حقیقت سے تفہیم اخذ کرنا چاہتا ہے اور اسے الگ الگ خانوں میں بانٹنے اور آسانی سے تقسیم کر دینے پر آمادہ نہیں ہونا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے ۱۹۹۴ء میں ویسٹ بینک یونیورسٹی کے ایک لیکچر کے بعد اس شخص کو ٹوک دیا تھا جو سامعین کے درمیان سے اٹھا اور جس نے میرے خیالات پر یہ کہہ کر حملہ کر دیا کہ یہ "مغربی" ہیں اور اس کے مسلک کے مطابق صحیح اسلامی فکر کے منافی ہیں۔ پہلا جوابی ردِعمل میرے ذہن میں یہ آیا کہ "تم نے یہ سوٹ اور ٹائی کیوں پہن رکھی ہے؟ یہ بھی تو مغربی ہیں" اس کے چہرے پر ایک کھسیانی سی مسکراہٹ آئی اور وہ بیٹھ گیا، لیکن یہ واقعہ مجھے اس وقت یاد آیا، جب ۱۱ر ستمبر کے دہشت گردی کے واقعہ کی خبریں آنے لگیں کہ ان دہشت گردوں نے ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پینٹا گون پر خودکش حملے کے لیے طیارے اغوا کیے اور جس طیارے میں وہ سوار تھے اس کو ہنرمندی سے استعمال کرنے کے لیے

مطلوبہ فنی تفصیلات پر کسی طرح قدرت حاصل کر لی تھی۔ ادھر ''مغرب'' کی ٹیکنالوجی ہے اور ادھر برسکونی کا یہ اعلان کہ اسلام جدیدت میں شامل ہونے سے معذور ہے۔ ان دونوں کے درمیان تقسیم کرے لائن کہاں کھینچی جائے؟

یقیناً ایسا کرنا آسانی سے ممکن نہیں۔ اپنی انتہا میں یہ ساری الگ الگ شناختیں، یہ عمومیت اور تہذیبی برتری کے دعوے کتنے ناکافی ثابت ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک خاص سطح پر ابتدائی جبلتیں اور نہایت باریک ہنرمندی اس طرح مل جاتے ہیں کہ نہ صرف ''مغرب'' اور ''اسلام'' کے درمیان بلکہ ماضی اور حال کے درمیان الگ الگ حد بندی مہمل ثابت ہوتی ہے اور جداگانہ شناخت اور قومیت کے بارے میں تو کچھ کہنا ہی نہیں جس پر مسلسل مباحثے اور کبھی نہ ختم ہونے والے اختلافات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یک طرفہ طریقے سے ریت پر لکیریں کھینچنا، صلیبی جنگیں لڑنا، اپنے سچ کے ساتھ دوسرے کے فساد کی مخالفت کرنا، دہشت گردی کا قلع قمع کرنا اور پال ولفز (Paul Wolfowitz) کی مرگ آسا اصطلاح میں قوموں کے وجود کو ہی سرے سے ختم کر دینا، مفروضہ وحدتوں کی الگ الگ شناخت کے عمل کو آسان نہیں بنا دیتا۔ اس سے تو محض یہی ظاہر ہوتا ہے کہ غور وفکر، تجزیے اور اپنے موضوع کی حقیقت کو سمجھنے اور لاتعداد انسانی جانوں کے درمیان ہمارے اور دوسروں کے باہمی رشتوں کو جاننے کے مقابلے میں اجتماعی جذبات کو بھڑکانا اور اس غرض سے متنازعہ بیانات جاری کرنا کتنا آسان ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اقبال احمد مرحوم نے جنوری تا مارچ ۱۹۹۹ء کے نہایت باوقار روزنامے ''ڈان'' میں تین سلسلہ وار مضامین جو انتہائی شان دار تھے، شائع کیے، ان کے ناظرین مسلمان تھے۔ مصنف نے اُن کے بقول دائیں بازو کی مذہبیت کے اسباب کا تجزیہ کیا اور ان انتہا پسندوں اور جنونی ظالموں کا سخت محاسبہ کیا جو اسلام کو مسخ کر رہے ہیں اور اس خبط میں مبتلا ہیں کہ نجی طور طریقوں کو اسلامی ضابطے کے تابع کیا جائے ''ایک ایسا اسلامی ضابطہ جو ضابطہ تعزیرات ہو اور جس سے اس کی انسان دوستی، جمالیات، فکری تجسس اور روحانی جذبہ خارج کر دیے جائیں'' اور ''اس میں مذہب کا صرف ایک متن قطعی طور پر نافذ ہو جس کی عمومی تعریف نہیں کی جا سکی ہے اور دوسرے متن کو سرے سے نظر انداز کر دیا جائے۔ اس صورت حال میں مذہب مسخ ہو جاتا ہے۔ روایات کی تذلیل ہوتی ہے اور جب سیاسی عمل ظاہر ہو تو اس میں کج روی آ جاتی ہے۔ اس تحریف کی فوری مثال پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر اقبال احمد سب سے پہلے لفظ ''جہاد'' کی وضاحت کرتے ہیں جو نہایت بلیغ، پیچیدہ اور

وسیع المعنی لفظ ہے، اس کے بعد وہ یہ بتاتے ہیں کہ فی زمانہ اس لفظ کو جس طرح مفروضہ دشمنوں کے خلاف اور کسی تخصیص کے بغیر جنگ کے لیے محدود کر دیا گیا۔ اس کے بعد یہ غیر ممکن ہو گیا ہے کہ ''صدیوں کے دوران میں مسلمانوں نے جو طرزِ حیات برتا اور جن تجربوں سے گزرے، اس کے اسلامی یعنی مذہب، معاشرہ، ثقافت، تاریخ اور سیاست کے حوالے سے طرزِ حیات کو سمجھا جا سکے۔ ڈاکٹر احمد کہتے ہیں کہ جدید اسلام پسند کی ''ساری دلچسپی'' طاقت سے ہے، روح سے نہیں، سیاسی مقاصد کے لیے عام لوگوں کو متحرک کرنے سے ہے۔ ان کے مصائب میں شریک ہونے اور مصائب کو رفع کرنے سے نہیں اور نہ اُن کی امنگوں سے ہم آہنگ ہونے سے ہے۔'' ان کا ایجنڈا محدود نوعیت کا اور وقتی ضرورت کے تابع ہے۔'' اس طرح معاملات کچھ اور زیادہ خراب ہوتے آئے ہیں کہ بالکل ایسی ہی تحریف اور جنونی کیفیت ''یہودی'' اور ''مسیحی'' دنیاؤں میں رونما ہونے لگی ہے۔

انیسویں صدی کے ختم ہونے تک کونریڈ جیسے بالغ نظر مصنف کا کوئی قاری یہ قیاس بھی نہیں کر سکا ہوگا کہ تہذیب یافتہ تمدّن اور ''عین اندھیرے'' کے درمیان امتیازات انتہائی صورتِ حال میں نہایت تیزی سے ختم بھی ہو جاتے ہیں کہ یہ بات وہی سمجھتا تھا اور یہ کہ یورپی تہذیب کی رفعتیں کسی پیشگی تیاری یا عبوری عرصے کے بغیر بالکل اچانک زمین بوس ہو سکتی ہیں اور نہایت وحشیانہ طور طریقے ان کی جگہ لے سکتے ہیں اور یہ کونریڈ ہی تھا۔ جس نے اپنی تصنیف ''دی اسکرٹ ایجنٹ'' مطبوعہ ۱۹۰۷ء میں لکھا تھا کہ دہشت گردی تخیلاتی ذہن سے بہت قریب ہوتی ہے، بالکل ''خالص سائنس'' کی طرح (اور اسے وسعت دیں تو ''اسلام'' یا ''مغرب'' کی طرح) اور اس میں دہشت گردی کی اخلاقی گراوٹ بھی لازمی طور پر شامل ہوتی ہے۔

ہم میں سے بہتوں کو یقین نہیں آئے گا کہ بہ ظاہر جنگ جو تہذیبوں کے درمیان گہری وابستگی ہوتی ہے اور فرائیڈ اور نٹشے دونوں نے ثابت کیا ہے کہ مقررّہ سرحدوں کے درمیان سخت پہرہ داری کے باوجود تصوّرات کی آمد و رفت حیران کن سہولت کے ساتھ جاری رہتی ہے۔ لیکن ہمارے خیالات کے حوالے سے یہی سیال تصورات جن میں ذومعنویت اور تشکیک شامل ہوتی ہے، ایسی صورتِ حال میں جو فی الوقت ہمیں درپیش ہے، کوئی عملی رہنمائی مہیا نہیں کرتے۔ چناں چہ جنگ کی صف بندی، صریح اور یقینی نتیجے کیلئے کی جاتی ہے (ایک صلیبی جنگ، خیر اور شر کے درمیان، خوف سے آزادی کی خاطر وغیرہ وغیرہ) یہ صف آرائی ہنٹنگ ٹن کے بقول اسلام اور مغرب کے مبیّنہ

اختلاف کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ چناں چہ ۱۱ ستمبر کے حملوں کے بعد ابتدائی چند دنوں کے اندر سرکاری بیانات میں جو الفاظ استعمال ہوئے، وہ یہیں سے اخذ کیے گئے تھے۔ اس نوع کے بیانات میں کچھ تخفیف ہوئی جو نظر آتی ہے، لیکن جس قدر نفرت انگیز تقریریں کی گئیں اور عملی کارروائیاں ہوئیں اور یہ خبریں آئیں کہ قانون کے نفاذ کا رُخ پورے ملک میں عربوں، مسلمانوں اور ہندوستانیوں کی طرف موڑ دیا گیا، ان سے اصل صورتِ حال تو برقرار رہتی ہے۔

اس کیفیت کے برقرار رہنے کی ایک اور وجہ سارے یورپ اور امریکا میں مسلمانوں کی روزافزوں موجودگی ہے۔ ذرا فرانس، اٹلی، جرمنی، اسپین، برطانیہ، امریکا یہاں تک کہ سویڈن کی آبادیوں کا اندازہ کیجیے۔ اس کے بعد آپ کو ماننا ہی پڑے گا کہ اسلام مغرب کے کنارے نہیں بلکہ عین وسط میں ہے۔ لیکن اس کی موجودگی سے خوف کھانے کی وجہ کیا ہے؟ عرب اسلامی فتوحات کا آغاز ساتویں صدی میں ہوا، اس کی یادیں اجتماعی کلچر کے حافظے میں دبی ہوئی ہیں، اور جیسا کہ بلجیئم کے مشہور مورّخ ہنری پیرین (Henry Pirenne) نے اپنی یادگار تصنیف ''محمدؐ اور شالیمان'' Mohammad and Charle magne مطبوعہ ۱۹۳۹ء میں لکھا کہ ان فتوحات نے روم کی قدیمی وحدت کو ہمیشہ کے لیے پارہ پارہ کردیا، مسیحیوں اور رومیوں کی باہمی یگانگت کو تباہ کردیا اور ایک نئی تہذیب کو فروغ دیا، جس پر شمالی طاقتوں کی بالادستی تھی (جرمن اور کورولنگیئن فرانس) مصنف یہ کہتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ ''مغرب'' کو اپنے تاریخی اور تہذیبی دشمنوں کے مقابلے میں مدافعت شروع کردینی چاہیے۔ لیکن افسوس ہے کہ پیرین یہ بات بھول گیا کہ یہ نئی دفاعی لکیر کھینچتے وقت مغرب نے اسلام کی دی ہوئی انسانی دوستی، سائنس، فلسفے، سماجیات اور تاریخ کے فن سے ہی مدد لی تھی۔ جو جدید دنیا اور کلاسیکی قدامت کے درمیان در آیا تھا۔ اسلام تو ابتدا سے ہی اس کے وجود کا حصہ ہے، یہاں تک کہ دانتے نے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا دشمن تھا، اپنی تصنیف ''جہنم'' کے عین وسط میں پیغمبر اسلامؐ کو رکھا تھا۔

اور پھر جیسا کہ لوئی ماسے نیوں نے بجا طور پر کہا، وحدانیت کا ایک مستقل ورثہ موجود ہے۔ یہودیت اور مسیحیت سے شروع ہو کر ہر مذہب، پہلے مذہب کا جانشین اور ان کی یادوں کا امین ہے۔ مسلمانوں کے یہاں اسلام پر رسالت کا سلسلہ آ کر ختم ہوجاتا ہے۔ اس کے باوجود ان تینوں مذاہب کے ماننے والوں کے یہاں کوئی صحیح تاریخ موجود نہیں اور نہ یہ ہوا کہ ہمہ جہتی مناقشوں میں پائے جانے والے واہمے دور کیے جاتے۔ البتہ اس متحدہ وحدانی مذاہب میں ایک وحدانیت سے

وابستہ نہیں۔ باقی سب خدا کے نزدیک سب سے زیادہ برگزیدہ ہیں۔ اس کے باوجود فلسطین کے سوال پر اس جدید زمانے میں سب کا خون یک جا ہوکر بہنا اس امر کا متقاضی ہے کہ ایک سودمند سیکولر رویہ اختیار کیا جاتا اور جو المناک مسئلہ لاینحل نظر آتا ہے، وہ حل ہوتا۔ یہ کوئی حیران کن بات نہیں کہ مسلمان اور عیسائی نہایت طرّاری سے صلیبی جنگ اور جہاد کی باتیں کرنے لگتے ہیں اور صیہونیت کی موجودگی سے اکثر والہانہ طور پر لاتعلق ہوجاتے ہیں۔ اقبال احمد کہتے ہیں کہ ''اس طرح کا ایجنڈا ان مردوں اور عورتوں کے لیے نہایت یقین افروز ہے۔ جو پایاب پانی کے درمیان کھڑے ہیں اور دونوں طرف روایت اور جدّت کا گہرا پانی موجیں مار رہا ہے۔''

لیکن ہم سب مغرب والے اور مسلمان ان ہی جیسے دوسرے لوگ ان ہی پانیوں میں تیر رہے ہیں اور پانی چوں کہ تاریخ کے سمندر کا حصہ ہے، لہٰذا اس میں ہل چلانے یا رکاوٹیں کھڑی کرکے اسے تقسیم کرنے کی کوشش لاحاصل ہوگی۔ یہ شدید ہیجانی دور ہے، لیکن بہتر ہوگا کہ اب طاقت ور اور بے بضاعت انسانی برادریوں کے حوالے سے سوچا جائے، منطق اور لاعلمی کی سیکولر سیاست کے بارے میں اور انصاف اور بے انصافیوں کے عالمگیر اصولوں کے بارے میں غور کیا جائے بجائے، اس کے کہ تفاوت اور تفرقے تلاش کیے جائیں، جن سے ذرا دیر کو تسکین تو حاصل ہوجاتی ہے لیکن اپنے عمل میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا یا بصیرت پر مبنی تجزیہ نہیں ہوتا۔ تہذیبوں کا تصادم بالکل ویسی ہی کرتب بازی ہے، جیسی ''دنیاؤں کے درمیان جنگ'' (The war of worlds) مشترکہ انحصاریت پر مبنی ہمارے زمانے کی حیرت ناک صورتِ حال کو سنجیدگی سے سمجھنے کی بجائے، اس سے اپنی انانیت کو کچھ توانائی میسر آجاتی ہے۔

''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کو بعض تجزیہ نگار ''تہذیبوں کا تصادم'' ثابت کرنے پر تلے بیٹھے ہیں مگر قرین قیاس یہ ہے کہ یہ بڑی حد تک ''تجارتوں کا تصادم ہے'' اور یوں یہ پورا سلسلہ، نو آبادیاں حاصل کرنے کی اس پوری تگ و دو کا حقیقی وارث ہے جو اٹھارویں اور انیسویں صدی کے یورپ میں ایک کل وقتی مشغلہ بن گیا تھا اور ''تہذیب یافتہ بنانے کے مشن'' کے اعلان سے اپنے کام کو مقدس ثابت کرتا تھا۔

کرسٹوفر بولن کا یہ مضمون ''امریکی فری پریس'' نے شائع کیا اس کے مترجم شجاعت علی، افسانہ نگار اور صحافی ہیں۔

کرسٹوفر بولن

ترجمہ: شجاعت علی

دہشت گردی کے خلاف یا منافع کے حصول کی جنگ

ایک مرتبہ پھر بش خاندان سے تعلق رکھنے والے صدر نے امریکی قوم کو تیل کی دولت سے مالا مال مشرق وسطیٰ میں ''جمہوریت اور آزادی کے دشمنوں'' کے خلاف جنگ میں دھکیل دیا ہے۔ امریکی صدر جارج بش نے، جن کا خاندان تیل کی کمپنیوں سے قریبی مراسم رکھتا ہے، اسلامی دہشت گردوں کے خلاف بین الاقوامی جنگ کا اعلان کیا ہے۔ صدر بش کے مطابق یہ دہشت گرد امریکیوں سے صرف اس لیے نفرت کرتے ہیں کیوں کہ امریکا دنیا میں جمہوریت اور آزادی کا سب سے بڑا علم بردار ہے۔

مذہبی بنیاد پر دہشت گردی کے تصور کو فروغ دینے کا مقصد وسط ایشیائی ریاستوں کے تنازعے کے اہم پہلوؤں کو چھپانا ہے۔ انصاف اور جمہوریت کی خاطر جنگ کے صدر بش کے بلند بانگ دعوے درحقیقت بحیرۂ اخزر کے طاس (Caspian Basin) پر پھیلے ہوئے ۵ ٹریلین ڈالر مالیت کے تیل اور گیس کے ذخائر پر امریکی اختیار کو مستحکم کرنا ہے۔

۱۹۹۱ء میں بش سینئر کے ''آپریشن ڈیزرٹ اسٹارم'' کا مقصد جنوبی عراق میں واقع رومیلا

میں تیل کے ذخائر تک رسائی حاصل کرنا تھا اور جنگ کے خاتمے کے بعد اس ذخیرے کو کویت کے علاقے میں شامل کرلیا گیا۔ اس کی مدد سے کویت میں قائم امریکی اور برطانوی تیل کمپنیوں کو تیل کی دگنی پیداوار حاصل ہونے لگی۔

کوسوو میں ٹریپکا کانوں کا سلسلہ، یورپ کی ان کانوں میں سے ہے جو قدرتی وسائل سے مالا مال ہیں، پچھلے سال اس پر جارج سوروس اور برنارڈر کچز کی کمپنیوں نے قبضہ کرلیا۔ یہ دونوں نئے عالمی نظام (نیو ورلڈ آرڈر) کے وہ دو ارکان ہیں جنھوں نے سربیا کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔

اسی طرح افغانستان کے خلاف جارحیت بھی بحیرۂ اخزر (کیسپین) میں یہودی تاجروں کے قیمتی معدنی وسائل کو تحفظ دینے کے لیے کی گئی ہے۔ افغانستان ایک وسط ایشیائی ریاست ہے جس کی جغرافیائی حدود مشرق وسطیٰ، دوسری وسط ایشیائی ریاستوں اور برصغیر پاک و ہند سے ملتی ہیں۔

وسط ایشیا میں تیل کے وسیع ذخائر موجود ہیں جنھیں اب تک دریافت کیا جانا باقی ہے۔ ان میں ۶.۶ ٹریلین کیوبک میٹر قدرتی گیس کے ذخائر بھی ہیں جن پر تاجروں کی نظریں جمی ہوئی ہیں۔
وسط ایشیا میں ازبکستان اور ترکمانستان بڑی مقدار میں گیس کی پیداوار کرتے ہیں اور اس کی برآمد کا واحد راستہ اس وقت روس سے گزرتا ہے۔

اس علاقے میں تیل اور گیس کے تاجر ایشیا کی تیزی سے بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ترکی اور یورپ سے متبادل پائپ لائن بنانا چاہتے ہیں۔ ایران، روس اور اسرائیل، بھارت کے ذریعے جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا کو تیل اور گیس کی فراہمی کے ایک منصوبے پر کام کر رہے ہیں مگر افغانستان میں عدم استحکام کے باعث اس منصوبے کی تکمیل میں رکاوٹیں درپیش ہیں۔
افغانستان، بھارت، چین اور جاپان کی مارکیٹ اور ترکمانستان میں دنیا کے تیسرے سب سے بڑے گیس کے ذخیرے کے درمیان واقع ہے۔ ترکمانستان سے براستہ افغانستان، پاکستان تک ۹۰۰ کلومیٹر قدرتی گیس کی پائپ لائن بچھانے کے لیے ایک مفاہمتی دستاویز پر دستخط بھی ہو چکے ہیں مگر افغانستان میں جاری خانہ جنگی اور مستحکم حکومت کی عدم موجودگی کے باعث یہ منصوبہ التواء کا شکار ہوگیا۔

انیسویں صدی میں برطانیہ اور روس کے درمیان ہندوستان پر اثر انداز ہونے کے لیے جو

چپقلش ہوئی تھی، افغانستان اس ''مہا کھیل'' "Great Game" کا مرکز تھا۔ آج تیل اور گیس کی پائپ لائن کے اہم ترین راستے کے باعث توانائی کے شعبے کے سرمایہ کاروں کے لیے افغانستان بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اسی کے ذریعے سے ان قیمتی ذخائر پر کنٹرول رکھ سکیں۔

ٹیکساس سے تعلق رکھنے والی تیل اور گیس کمپنی ایزون (Enron) دوسری کمپنیوں، اموکو، برٹش پیٹرولیم، چیورون ایکسون، موبل اور یونوکل کے ساتھ مل کر سوویت روس کی تین نو آزاد ریاستوں آذر بائیجان، قازقستان اور ترکمانستان میں تیل وگیس کے وسیع ذخائر دریافت کرنے کے لیے اربوں کھربوں ڈالرز کی اس مجنونانہ کاوش میں ملوث ہیں۔ ایک منصوبے پر کام کر رہے ہیں۔ ان تیل کمپنیوں کی طرف سے سابق بش انتظامیہ کے سینئر ارکان سوویت روس کی سابق جمہوریاؤں کی حکومتوں سے مذاکرات کر رہے ہیں۔ مذاکرات کاروں میں جیمز بیکر، برنیٹ اسکروکرافٹ، جون سنونو اور امریکی نائب صدر ڈک چینی شامل ہیں۔

ترکمانستان اور آذربائیجان کے اسرائیلی تاجروں اور ملٹری انٹیلی جنس سے گہرے روابط ہیں۔ ترکمانستان میں ایک اسرائیلی خفیہ ایجنسی کا سابق ایجنٹ اور اسرائیل کے مرہاو گروپ کا صدر یوسف اے میمان، ترکمانستان میں توانائی کے وسائل کی ترقی وتوسیع کا ذمہ دار اور سرکاری مذاکرات کار بھی ہے۔

یوسف میمان نے وسط ایشیائی ریاستوں میں امریکا اور اسرائیل کے مفادات کے متعلق وال اسٹریٹ جرنل سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ ایک بار پھر مہا کھیل ہے۔ ہم وہ کچھ کر رہے ہیں جسے اسرائیل اور امریکا کی پالیسی حاصل کرنے میں ناکام رہی، یعنی مواصلات کے راستے پر قبضے کا مطلب ہی اپنی مصنوعات کو صحیح معنوں میں تحفظ دینا ہے۔''

توانائی کے شعبے کے ایک ماہر جیمز ڈوریان نے دس ستمبر کو کہا کہ ''مستقبل میں وسط ایشیا کے تیل کے راستوں پر جس کا کنٹرول ہوگا، وہی نئی پیداوار سے حاصل ہونے والی آمدنی کی تقسیم اور تیل اور گیس کی پیداوار کی سمت کا تعین کرے گا۔

''مشرق وسطیٰ کے امور پر واشنگٹن رپورٹ'' (WRMEA) میں کہا گیا ہے کہ ترکمانستان میں غیرملکی کاروبار پر یوسف میمان کا مرہاو گروپ چھایا ہوا ہے۔ یوسف میمان کو ترکمانستان کے صدر کے حکم سے یہاں کی شہریت دی گئی اور وہ ترکمانستان کے تیل اور گیس کے امور کا سرکاری مذاکرات کار، خصوصی سفیر اور مطلق العنان صدر اتایونیازوف کا دایاں ہاتھ سمجھا جاتا ہے۔ صدر

نیازوف سوویت یونین کی سابق پولٹ بیورو کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔

اسرائیل کا مرہاو گروپ ترکمانستان حکومت کی نمائندگی کرتا ہے اور وہ حکومت کی طرف سے کئی ارب ڈالر کے منصوبوں کا سودا کر چکا ہے۔ مرہاو گروپ کو ترکمانستان کے تیل اور گیس کے ذخائر کے انفراسٹرکچر کو جدید بنانے کے ایک منصوبے کی ذمہ داری دی گئی اور وہ ترکمان بیشی کے شہر میں تیل کی نئی ریفائنری بھی قائم کرے گا۔ مرہاو گروپ نے سرمایہ کاری کے ذرائع کا نام بتانے سے انکار کر دیا ہے۔

اسرائیل کے سیاسی مفادات کے تحفظ کی خاطر یوسف میمان روس اور ایران کو چھوڑ کر گیس کی پائپ لائن کو دیگر ممالک تک پہنچانے کا خواہش مند ہے۔ میمان نے کھلے بندوں یہ کہا ہے کہ اسرائیل کی پالیسی ہمیں اس کی اجازت دیتی ہے اس لیے ایران سے معاملہ کرنے میں ہمیں کوئی دشواری نہیں ہے۔ ایران نے امریکا پر الزام عائد کیا تھا کہ وہ علاقائی پائپ لائنز کو ایران سے گزارنے سے روکنا چاہتا ہے جس کا مقصد ایران کے علاقائی اثر و رسوخ کو کم کرنا ہے۔ کلنٹن انتظامیہ نے بھی ایران کے متعلق ایسی پالیسیاں وضع کیں تاکہ بحیرۂ اخزر پر ایرانی اثر رسوخ میں کمی کی جاسکے۔

مرہاو گروپ کے نائب صدر ڈاکٹر نمرود نووک نے کہا کہ ''اس علاقے میں اسرائیل اور امریکا کے مشترکہ مفادات ہیں۔ ہمارا اہم ترین مفاد ایران پر ترکی کے انحصار کو کم کرنا ہے اس لیے اسرائیل اور ترکی کے باہمی روابط مضبوط تر بن رہے ہیں۔''

ترکی کی گیس کی منڈی پر قبضے کے لیے روس اور ترکمانستان میں بھرپور مقابلہ ہے اور جو کم قیمت میں گیس فروخت کرے گا، اسے ہی کامیابی حاصل ہوگی۔

''یہ بڑی سخت دوڑ ہے'' میمان نے کہا۔ ''جو پہلے ترکی کو سنبھال لے گا، وہ جیت جائے گا۔ جو دوسرے نمبر پر آئے گا اسے مشکل وقت کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

افغانستان کے خلاف مہم میں امریکا کو روسی مدد کی ضرورت ہے مگر جب اے ایف پی نے کیسپیئن انویسٹرز کے ایلکس کورین سے سوال کیا کہ اس علاقے میں کام کرنے والی اسرائیلی/ مغربی اور روس کی توانائی کی کمپنیوں میں تعلقات کی نوعیت کیسی ہے تو کورین نے کہا کہ ''دونوں ایک دوسرے سے دشمنوں جیسا سلوک کرتے ہیں۔''

میمان کے گیس پائپ لائن کے ایک منصوبے میں ترکمانستان کے تیل و گیس کو آذربائیجان

اور جارجیا کے راستے ترکی تک پہنچایا جائے گا۔ مرہاو گروپ دس کروڑ ڈالر مالیت کے ایک ایسے منصوبے پر بھی کام کر رہا ہے جس کی تکمیل کے بعد عراق کے دریائے دجلہ اور فرات کے پانی کا رخ جنوب مشرقی ترکی کی طرف موڑ دیا جائے گا۔

اسرائیلی حکام آذربائیجان سے اچھے تعلقات کا دعویٰ کرتے ہیں اور دارالحکومت باکو میں ایک اسرائیلی کمپنی ماگال سیکورٹی سسٹمز، باکو ایئرپورٹ کی حفاظت کا کونٹریکٹ حاصل ہے۔ ماگال کمپنی ان چند کمپنیوں میں سے ایک ہے جو بحیرۂ اخزر سے ترکی کی بحیرۂ روم پر واقع بندرگاہ ''سیہان'' تک تیل پہنچانے والی ۱۲۰۰ میل لمبی پائپ لائن کی نگرانی کا کام بھی انجام دے گی اور اس طرح آذربائیجان اور اسرائیل کے روابط مزید مضبوط ہو جائیں گے۔

۲۰۰۰ء کے انتخابات میں صدر بش کی انتخابی مہم میں سب سے زیادہ چندہ دینے والی کمپنی ایزون نے ۲۵ ارب ڈالر مالیت کی ماورائے اخزر (Trans-Caspian) گیس پائپ لائن کی فیزی بلٹی رپورٹ تیار کر لی ہے۔ اس گیس پائپ لائن کی تعمیر کے معاہدے پر ترکمانستان اور دو امریکی کمپنیوں، بیچل اور جنرل الیکٹرک کیپٹل سروسز نے ۱۹۹۹ء میں دستخط کیے تھے۔

یوسف میمان نے ترکمانی حکومت اور امریکی کمپنیوں کے درمیان ثالث کا کردار ادا کیا تھا مگر اس نے اس بات سے آگاہ نہیں کیا کہ اس معاہدے میں اس کا حصہ کتنا ہوگا۔ مرہاو گروپ نے واشنگٹن کی لابی کرنے والی ایک فرم کی خدمات حاصل کی ہیں اور امریکی حکام کو ماورائے اخزر گیس پائپ لائن کے منصوبے پر رضامند کرنے کے لیے لاکھوں ڈالر خرچ کر چکا ہے۔

کلنٹن انتظامیہ کے سیکریٹری توانائی بل رچرڈسن اور صدر کے خصوصی مشیر رچرڈ مارننگ اسٹار نے یہ کہتے ہوئے باکو، سیہان پائپ لائن کی حمایت کی کہ ترکمانستان کی معاشی بقاء کی خاطر یہ پائپ لائن ضروری ہے۔

امریکا اسرائیل اور ترکی کے درمیان اچھے تعلقات بھی اس پائپ لائن کی منظوری کا باعث بنے ہیں کیوں کہ اس کی مدد سے توانائی کی قلت کے شکار اسرائیل کو بھی براہ راست تیل کی فراہمی ممکن ہوگی۔ تاہم توانائی کے شعبے کے ماہرین نے اس کی ضرورت اور لاگت کے متعلق تشویش کا اظہار کیا ہے۔ اس ضمن میں امریکا اور اسرائیل کمپنیوں پر سرمایہ کاری کے لیے دباؤ ڈال رہے ہیں اگرچہ زیادہ تر کمپنیاں ایران کے راستے سے کم لاگت کی پائپ لائن بچھانے کی خواہش مند ہیں۔

امریکی کمپنی یونوکل ترکمانستان کے قدرتی گیس کے وسیع ذخائر کو افغانستان کے راستے سے

پاکستان اور بھارت تک پہنچانا چاہتی تھی مگر ۱۹۹۸ء میں افغانستان پر حملے کے بعد اس کو یہ منصوبہ ترک کرنا پڑا۔ یہ پائپ لائن دنیا کی بڑی آئل فیلڈز میں سے ایک، ترکمان دولت آباد فیلڈز سے پاکستان کے شہر ملتان تک گیس فراہم کرے گی اور یہاں سے بھارت تک اس کی توسیع کی جائے گی۔ دولت آباد سے نکلنے والی پائپ لائن ۳۰ سال تک سالانہ ۱۵ ارب کیوبک فٹ گیس پاکستان اور بھارت کو فراہم کرے گی۔ جب تک افغانستان میں صورت حال بہتر نہیں ہوجاتی اس وقت تک یہ منصوبہ التوا کا شکار رہے گا۔

یونوکل کمپنی ۱۰۳۰ کلومیٹر طویل تیل کی پائپ لائن کے ایک منصوبے پر بھی کام کر رہی ہے جو ترکمانستان سے روس کی سائبیرین آئل فیلڈ کو بحیرہ عرب کے ساحل تک پاکستان سے منسلک کر

دے گی۔ یہ پائپ لائن سابق سوویت یونین کے مختلف علاقوں سے روزانہ دس لاکھ بیرل تیل منتقل کرنے کی صلاحیت کی حامل ہوگی۔ یہ بھی گیس لائن کے روٹ کے متوازی تعمیر کی جائے گی اور افغانستان سے پاکستان اور بحیرہ ہند میں ٹرمینل راس مالان تک جائے گی۔

گیارہ ستمبر کو دہشت گردوں کے حملوں میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے دونوں ٹاورز کے انہدام کا الزام امریکا نے سعودی عسکریت پسند اسامہ بن لادن اور اسے تحفظ فراہم کرنے والی افغانستان کی طالبان حکومت پر عائد کیا۔ امریکا نے اب تک اسامہ کے خلاف کوئی ثبوت پیش نہیں کیا ہے۔ امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے ۲۳ ستمبر ۲۰۰۱ء کو کہا تھا کہ ہم مستقبل قریب میں ایسی دستاویزات پیش کریں گے جن میں اس کا ثبوت واضح طور پر موجود ہوگا کہ اسامہ بن لادن ہی حملوں میں ملوث ہے۔

جب یہ اطلاعات موصول ہوئیں کہ طالبان اسامہ کو امریکا کے حوالے کرنے پر غور کر رہے ہیں تو بش انتظامیہ نے کہا کہ بن لادن کو حوالے کرنے کے باوجود بھی ہم افغانستان پر حملہ کریں گے۔

افغانستان سے بنیاد پرست اسلامی حکومت کے خاتمے کے مسئلے پر کئی ماہ سے بین الاقوامی سفارتی بات چیت جاری ہے اور بھارت نے جولائی ۲۰۰۱ء میں اٹلی کے شہر جنوا میں ہونے والی 'جی ۸' چوٹی کانفرنس میں بھی اس مسئلے کو اٹھایا تھا۔ بھارتی پریس نے جون میں کہا تھا کہ "بھارت اور ایران طالبان کے خلاف فوجی کارروائی کے لیے امریکی اور روسی طیاروں کو ہر ممکن سہولتیں فراہم کریں گے اور اگر حالیہ سخت پابندیاں بھی طالبان کے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں لاتیں تو ہم امریکا کی بھرپور مدد کریں گے۔"

بھارتی حکومت نے جون میں افغانستان پر حملوں کے لیے جو سہولتیں دینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا اب اکتوبر میں کم و بیش صورت حال ویسی ہی ہوگئی ہے۔ تاجکستان اور ازبکستان، امریکی فوجی تعاون سے افغانستان پر زبردست حملہ کریں گے اور طالبان کی اہم تنصیبات اور فوجی اثاثوں کو نشانہ بنایا جائے گا۔

طالبان کے خلاف بین الاقوامی اتحاد کے حملوں کی اقتصادی وجوہات یہ ہیں:

"ازبکستان، تاجکستان، ترکمانستان اور قازقستان کو طالبان سے خطرہ ہے کہ طالبان ان ملکوں میں اسلامی انتہا پسندوں کو برسر اقتدار لا کر ان کے تیل و گیس اور دیگر وسیع قدرتی وسائل پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔"

اس حصے کا خاتمہ اس تازہ اور جامع تحریر سے ہوتا ہے جو ایک طرف عالمی تناظر میں امریکی پالیسی اور دوسری طرف اکیسویں صدی کے آغاز کی صورتِ حال کو پیش کرتی ہے کہ ہم اس عہد میں داخل ہو رہے ہیں تو کس انداز سے۔ موجودہ بحران نے امریکی معاشرے کے تضادات کو کچھ زیادہ ہی اجاگر کر دیا ہے اور اس مضمون میں بڑے دو ٹوک انداز میں ان پر نکتہ چینی کی گئی ہے۔ مگر اس بحران نے ہمارے معاشرے کے اندرونی تضادات کو بھی بڑے کرب ناک طریقے سے اور واضح کر دیا ہے۔ کیا ہم ان تضادات کا اس وضاحت کے ساتھ تجزیہ کرنے کی سکت رکھتے ہیں؟ شاید نہیں،یقینا نہیں۔ اس مضمون کے مصنّف راہل مہاجن آسٹن، امریکا میں واقع یونیورسٹی آف ٹیکساس میں طبیعات کے گریجویٹ اسٹوڈنٹ ہیں اور جنگ مخالف تحریک کے رضاکار۔ وہ ''امن کے لیے عمل'' اور بعض دوسرے اداروں کی مجلس کے رکن بھی ہیں۔ عالم گیریت اورامریکی خارجہ پالیسی پر ان کے مضمون چھوٹے بڑے اخباروں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ یہ مضمون راہل مہاجن کی نئی کتاب کے لیے لکھاگیا ہے جو اسی نام سے مارچ ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی ہے۔ یہ مضمون پہلی بار ممتاز جریدے منتھلی ریویو کے فروری ۲۰۰۲ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

راہل مہاجن
آصف فرخی

نئی صلیبی جنگ:
دہشت گردی کے خلاف امریکا کی جنگ

گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کو دنیا بدل گئی۔ یہ محض میڈیا کا زور بیان (Hype) نہیں ہے۔ جس طرح بعض مورخ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۹۱ء کا حوالہ ''مختصر بیسویں صدی'' کے طور پر دیتے ہیں، اسی طرح بہت سے لوگ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو اکیسویں صدی کا اصل آغاز قرار دے رہے ہیں۔ ابھی یہ کہنا تو قبل

از وقت ہے کہ یہ تجزیہ دُرست ثابت ہوگا مگر اسے مسترد بھی نہیں کیا جا سکتا۔

گیارہ ستمبر کے حملوں نے یہ تصور ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکا کسی نہ کسی طرح باقی ساری دنیا کے اوپر ہی اوپر تیرتا رہے گا، جیسے کہ وہ بیک وقت اس کا حصہ ہے بھی اور نہیں بھی۔ امریکی اب اس فریب میں مبتلا نہیں رہ سکتے کہ باقی ساری دُنیا کے ساتھ جو پیش آتا ہے، وہ ان پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ پہلے سے زیادہ اہم ہوگیا ہے کہ یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ ہم کس طرح کی دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں، اور دُنیا جیسی ہے اس کو ویسا بنانے میں امریکا نے کیا کردار ادا کیا ہے۔

صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ یہ حملے انسانیت کے خلاف جرم تھے، حالاں کہ یہ تھے تو سہی، اور یہ کہ اس طرح کی دہشت گردی کو روک دیا جانا چاہیے، حالاں کہ یہ ہونا چاہیے۔ اسی طرح یہ کہہ دینا بھی کافی نہیں کہ حملہ آور مذہبی انتہا پسند تھے، حالاں کہ یہ بھی تھے تو سہی۔ یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ امریکا نے مذہبی انتہا پسندی کے فروغ میں کیا کردار ادا کیا ہے، براہِ راست جیسے کہ افغان جہاد میں، یا بالواسطہ طور پر، بائیں بازو پر اپنے نامختتم حملوں کے ذریعے سے اور ایسی پالیسیوں پر عمل درآمد کے ذریعے سے جو غصے اور برہمی کا سبب بنتی ہیں، اور یوں تمام مترادف راہیں غارت کر ڈالنے سے۔

اس کی تازہ ترین پالیسیوں، اس نام نہاد ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کو سمجھا جائے۔ اس تک رسائی حاصل کرنے کے کئی راستوں میں سے سب سے زیادہ سیدھا راستہ شاید یہ ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے بارے میں اس سرکاری رویّے کا جائزہ لیا جائے جو نمودار ہوا ہے اور عوام الناس پر مسلّط کیا جا رہا ہے، اور پھر نکتہ بانکتہ اس کی تردید کی جائے۔ اس جنگ کے بارے میں بعض مرکزی اساطیر (Myths) یوں ہیں:

یہ حملہ پرل ہاربر کی طرح تھا لہٰذا جس طرح دوسری جنگ عظیم میں ہوا تھا، ہمیں یا تو اعلانِ جنگ کرنا تھا یا تباہی کا خطرہ مول لینا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ پرل ہاربر ایک ایسی طاقت ور اور توسیع پسند مملکت کی طرف سے حملہ تھا جو تمام تر مشرقی ایشیا کو محکوم بنانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ گیارہ ستمبر کے حملے اُنیس افراد سے سرزد ہوئے، جو نیٹ ورکس کے ایسے سلسلے کا حصہ ہیں جس میں چند ہزار کٹر متحارب افراد ہیں اور جن کی محدود مالی وسائل تک رسائی ہے۔ چوں کہ یہ کوئی فوری اور کُلّی خطرہ بمشکل ہی بن سکتے تھے، اس لیے جنگ کے علاوہ دوسرے امکانات میں سے کوئی راستہ منتخب کرنا چاہیے تھا۔

یہ آزادی پر حملہ تھا۔

اسامہ بن لادن اور ان کے نیٹ ورک کے افراد کے ذہن میں جو بھی جواز موجود ہوں، ان کے حالیہ نشر شدہ بیانات میں امریکی جمہوریت، آزادی یا خواتین کے کردار پر کسی بھی برہمی کا کوئی ذکر نہیں۔ وہ مشرقِ وسطیٰ میں امریکی پالیسی کے خلاف واضح، مخصوص شکایتوں کا ذکر کرتے ہیں: عراق کے خلاف پابندیاں، جن کو بڑی حد تک امریکا ہی نے برقرار رکھا ہے، جن کی وجہ سے دس لاکھ (ایک ملین) شہری ہلاک ہوئے ہیں؛ فلسطین پر اسرائیلی مسلح فوجی قبضے اور امریکی ہتھیاروں کے ذریعے سے تقریباً نہتے فلسطینی شہریوں کے خلاف مسلسل فوجی حملوں کے لیے مادّی اور سیاسی حمایت ہے؛ خلیج پر امریکی قبضہ اور ان بدعنوان حکومتوں کی تائید جو اپنے عوام کے بجائے امریکی کارپوریشنز کے مقاصد کو فوقیت دیتی ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کی ریاستوں کے بارے میں دہشت گردوں کا مطمحِ نظر، اگر اسے تصور کیا جا سکے، موجودہ حقیقت سے بھی زیادہ ہول ناک ہے اور یقینی طور پر آزادی پر اس سے بھی زیادہ پابندیاں عائد کرنے پر عمل پیرا ہوگا جو اس وقت موجود ہیں۔ مگر اس کے باوجود، لوگوں کو ان میں شمولیت کی ترغیب دینے والی باتیں (recruiting points)، وہ مسائل جو ان کو سیاسی قوّت کے طور پر اہم بناتے ہیں، ان سب کا تعلق اس خطّے پر امریکی بالادستی سے ہے، امریکی معاشرے کی اندرونی ساخت سے نہیں۔

تم ہمارے ساتھ ہو یا پھر تم دہشت گردوں کے ساتھ ہو۔

دو گروہوں کے درمیان یہ تقسیم، جو دُنیا پر اس لیے مسلط کی گئی کہ امریکی لائحہ عمل سے منحرف ہونے کا ارادہ کرنے والوں کو ڈرایا دھمکایا جا سکے، جبر کی منطق ہے بلکہ شاید تباہ کاری اور نیستی (Extermination) کی بھی۔ جنگ کے مخالف مظاہرین جو گیارہ ستمبر کے دہشت گرد حملوں کی مذمّت کرتے ہیں اور اس کے ساتھ افغانستان میں امریکا کی مجرمانہ کارروائی کی بھی، اور وہ ممالک بھی جو ایسا کرتے ہیں، اس منصوبے میں ٹھیک نہیں بیٹھتے اور یقیناً اس بات کے مستحق نہیں ہیں کہ ان پر اسی برش سے سیاہی پھیر دی جائے جس سے دہشت گردوں پر نشان لگائے گئے ہیں۔

افغانستان کی جنگ اپنے دفاع میں کی گئی تھی

درحقیقت، حملے کے وقت افغانستان کے لوگوں کے پاس امریکا کو اتنی دور سے زک پہنچانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اس لیے کہ ان کے پاس بین البراعظمی مار کے میزائل ہیں نہ دور مار طیارے۔ افغانستان میں بیٹھ کر امریکا پر حملے کا ارادہ کرنے والے کسی شخص کو پہلے وہاں جانا پڑے گا۔ اگر خطرہ

ناگزیر تھا تو وہ امریکا اور یورپ میں پہلے سے موجود دہشت گردوں سے تھا۔ لہٰذا تنی مہلت مل سکتی تھی کہ سلامتی کونسل کی توثیق حاصل کرلی جائے جو لازمی ہے، سوائے اس صورت کے کہ آپ لامحالہ حملے کے ماخذ کے خلاف کارروائی کررہے ہوں۔ اس کے برخلاف، امریکا نے عمداً ایسا کرنے سے گریز کیا۔ (نیویورک پر) حملے اور جنگ کے درمیان چار ہفتے بغیر کسی واقعے کے گزر گئے، اس بات کا ثبوت ہیں کہ فوجی کارروائی کی کوئی فوری اور بے حد ضروری وجہ نہیں تھی جو اپنے دفاع میں عمل کرنے کے کسی بھی دعوے کے لیے بھی لازمی ہے۔

بش انتظامیہ میں جو یک رُخی (Unilateralism) نمودار ہو رہی تھی (کیوٹو کے پروٹوکول سے علیحدگی، روس کے ساتھ اے بی ایم معاہدے کا سبوتاژ) اس سے ہٹ کر ایک نئی کثیر سمتی (Multi-Lateralism) حاصل ہوئی۔

اس کے پیچھے یہ مفروضہ ہے کہ کثیر سمتی کے معنی یہ ہیں کہ اپنا ایجنڈا پہلے سے طے کرلیا جائے، پھر کوشش کی جائے کہ دوسرے ملک دھونس یا زبردستی سے رضامندی یا اطاعت پر تیار ہوجائیں۔ حقیقی کثیر سمتی کا مطلب ہوگا کہ ایسے بین الاقوامی ڈھانچے مہیا کیے جائیں جو جمہوری ہوں، شفاف ہوں، دُنیا کے لوگوں، اداروں اور حکومتوں کے سامنے جواب دہ ہوں اور ان اتھارٹیز (authoritics) کے فیصلے کوتسلیم کریں، یہ فیصلے چاہے مخالفانہ ہوں یا موافقانہ۔ امریکا نے ہمیشہ ایسے کسی راستے سے اجتناب کیا ہے۔ موجودہ معاملے میں امریکا نے مناسب ترین ادارے، یعنی سلامتی کونسل کی منظوری حاصل کرنے سے بھی انکار کردیا۔ حالاں کہ دھونس اور رشوت کے اپنے آزمودہ طریقوں پر عمل کرکے اسے اپنی اطاعت حاصل کرنے میں دشواری نہ ہوتی۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ امریکا بڑی سختی کے ساتھ اور بالکل عمداً، یک طرفہ جارحیت کا حق حاصل کرنا چاہتا ہے۔

یہ چار ہفتے ضبط اور ٹھہراؤ کے تھے کہ اس دوران بش انتظامیہ اس مسئلے کے لیے سفارتی حل تلاش کر رہی تھی۔

اس ''ضبط'' کا بڑا حصہ محض فوجوں کی نقل وحرکت کے لیے مہلت حاصل کرنے کے لیے تھا اور پس وپیش کرنے والے متذبذب ملکوں پر دھونس جمانے کے لیے، مثلاً پاکستان، ازبکستان اور تاجکستان، کہ فضائی حدود میں سے پرواز کا حق اور عمل درآمد کے لیے علاقے (Staging areas) فراہم کردیں۔ اس کے علاوہ، اسلامی دنیا میں اپنے حلیف ممالک کی حکومتوں کے ڈانواں ڈول

ہونے کا حقیقی خطرہ بھی تھا۔ سفارتی حل تلاش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی، انتظامیہ کی لائن مستقل طور پر یہی تھی کہ ''کسی قسم کے مذاکرات نہیں''۔ انہوں نے ایسے مطالبات پیش کیے جو کوئی خود مختار ملک قبول نہیں کر سکتا تھا...... حساس مقامات پر امریکی فوج کی رسائی اور اس کے علاوہ یہ فوری مطالبہ کرنے کا حق کہ کوئی بھی گروہ، جس کی وضاحت نہیں کی گئی، ان کے ''حوالے'' کر دیا جائے۔ انہوں نے طالبان کو ثبوت فراہم کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ اس سب کے باوجود، طالبان کسی تیسرے اور غیر جانب دار فریق کو سُپردگی کے بارے میں مذاکرات کے لیے تیار تھے۔ درحقیقت، یہ طے کر لیا گیا تھا کہ بن لادن پر پاکستان میں ایک ٹریبونل مقدمہ چلائے جو اس بات کا فیصلہ کرے کہ اس کو امریکا کے حوالے کیا جائے کہ نہیں۔ امریکا کو یہ بھی منظور نہیں تھا۔ اس کی ''سفارت کاری'' کو جان بوجھ کر اس طرح تیار کیا گیا تھا کہ جنگ کی طرف لے جائے۔

جنگ کا اصل محرّک انتقام تھا

حالاں کہ سے بہت لوگ انتقام کی جذباتی خواہش رکھتے تھے، مگر جنگ کی دو بنیادی وجوہات کو اس طرح بیان نہیں کیا جا سکتا۔ پہلی وجہ سامراجی اعتبار (Imperial Credibility) کا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ سامراج (Empire) ہے، رومن یا برطانوی شہنشاہیت سے مختلف نوعیت کی، مگر پھر بھی ایسی سلطنت ہے جو معاشی اور فوجی غلبے کے ذریعے دنیا کے بڑے رقبے پر بالادستی رکھتی ہے۔ اپنی قوت کو مستحکم رکھنے کے لیے سامراج پر لازم ہے کہ کسی طرح کی کمزوری ظاہر نہ ہونے دے، اس کے اقتدار کے خلاف جو بھی خطرہ سامنے آئے، سختی سے اس کا سر کچل دے۔ ویت نام کی جنگ میں جب امریکی حکومت کو اندازہ ہوا کہ اس میں سیاسی فتح تو حاصل نہیں ہوگی، تو اس جنگ کا نصف آخر صرف اس بھرم کو قائم رکھنے کے لیے لڑا گیا کہ دوسرے ملکوں کو سبق پڑھایا جائے کہ سرکشی کی سزا کیا ہے۔ سامراجی طاقت کے قلب میں ہونے والے موجودہ حملے کے بعد یہ ضرورت اور بھی زیادہ ہوگئی۔ دوسری وجہ وسطی ایشیا میں تیل اور قدرتی گیس کے ذخائر پر اختیار ہے۔ افغانستان وہ واحد ملک ہے جس پر امریکا قابو پا سکتا ہے اور جس میں سے پائپ لائن ان ذخائر سے لے کر بحرِ ہند تک گزاری جا سکتی ہے کہ تیزی سے بڑھتی ہوئی ایشیائی منڈی کے لیے استعمال ممکن ہو جائے۔ جنگ اس کے لیے موقع فراہم کر دے گی اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ممکن بنا دے گی کہ اس خطے میں سابق سوویت جمہوریتوں میں فوجی اڈّے قائم ہو جائیں۔

یہ جنگ انسانیت دوست مداخلت Humanitarian tervention تھی اور اس کے ساتھ دہشت گردوں کو جا پکڑنے کی کوشش بھی۔

غذا کی رسد (Drops) محض فوجی پروپیگنڈا تھا...... اگر صحیح طرح سے تقسیم ہوتا، جو کہ ہوا بھی نہیں، تو بس دن بھر میں ۳۷،۵۰۰ افراد کے لیے غذا...... اور یہ بھی اس بم باری کے ساتھ ساتھ چلتا رہا جس نے لاکھوں افراد کو خوراک فراہم کرنے کے امدادی منصوبے میں گڑبڑ پیدا کر دی۔ انسانیت پر مبنی مقاصد کی کمی بعد میں اس وقت ظاہر ہوگئی جب امریکی حکومت نے امدادی اداروں اور اقوام متحدہ کے حکام کی اس درخواست کو ٹھکرا دیا کہ بمباری میں اتنا وقفہ کر دیا جائے کہ کافی خوراک ٹرکوں کے ذریعے افغانستان میں پہنچا دی جائے۔ یونی سیف نے تخمینہ لگایا کہ بم باری کی وجہ سے اور اس سے پہلے بم باری کے خطرے کی وجہ سے امدادی کاموں میں رکاوٹ سے موسم سرما میں ایک لاکھ سے زیادہ بچے مرجائیں گے۔ طالبان کی پسپائی کے بعد جب سارا ملک انتشار اور طوائف الملکوکی کا شکار ہوگیا اور ڈاکوؤں نے امدادی سامان کے گوداموں کو لوٹنا شروع کر دیا تو امریکا نے تقریباً ایک مہینے تک امن فوج کی تجویز کو روکے رکھا اور شمالی اتحاد پر دباؤ بھی نہیں ڈالا کہ امن بحال کریں اور امدادی سامان کی فراہم میں تعاون کریں اور امدادی کارکن کم از کم دس لاکھ (ایک ملین) افراد تک پہنچنے میں ناکام رہے جن کی ضروریات اشد تھیں۔

جنگ سرجیکل اسٹرائکز (Surgical Strikes) کے ذریعے جاری رکھی گئی تاکہ کولیٹرل ڈیمیج (Collateral Damage) کم سے کم ہو۔

سرجیکل اسٹرائک (سرجن کے جیسے وار یا عمل جراحی کے مقصد سے کی جانے والی کارروائی) نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ سب سے زیادہ واضح نشانے والے ہتھیار بھی ۲۰ سے لے کر ۳۰ فیصد مرتبہ نشانے سے چوک جاتے ہیں اور افغانستان پر پھینکے جانے والے گولہ بارود میں سے محض ۶۰ فیصد واضح نشانے پر مُرتکز (Precision guided) تھا۔ امریکا نے کلسٹر بم اور ڈیزی کٹر جیسے تباہ کن ہتھیار بھی استعمال کیے جو اپنی بناوت کے اعتبار سے ایسے ہیں کہ (نشانوں میں) تفریق نہیں کرسکتے، اس لیے ''کولیٹرول ڈیمیج'' کو روکا نہیں جا سکتا اور پھر امریکی بم باری مہم بالعموم جان بوجھ کر شہری انفراسٹرکچر کو نشانہ بناتے ہیں۔ اس مرتبہ یہ اطلاعات ملی ہیں کہ بجلی گھر، ٹیلی فون ایکسچینج بلکہ ایک بڑے ڈیم کو بھی تباہ کیا گیا جس کے امکانی طور پر آفت رساں اثرات ہیں۔ ان تمام رپورٹوں کو جوڑ کر، جن میں غیر ملکی پریس کی رپورٹیں بھی شامل ہیں، یونیورسٹی آف نیو ہیمشائر کے پروفیسر مارک

ہیرلڈ (Marc Herold) نے ۶ دسمبر ۲۰۰۱ء تک بموں اور گولیوں کا نشانہ بن کر ہلاک ہونے والے شہریوں کا تخمینہ لگایا ہے کہ ان کی تعداد ۳،۷۶۷ تھی جو ان کے اندازے میں (اصل تعداد سے) کم ہے۔ پھر بھی یہ تعداد ان معصوم لوگوں کی تعداد سے زیادہ ہے جو گیارہ ستمبر کے حملے میں ہلاک ہوئے اور اس میں وہ بڑی تعداد شامل نہیں ہے جو بالواسطہ اسباب کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔

یہ بربریت کے خلاف تہذیب کی جنگ تھی۔

اگر یہ کافی نہیں تھا تو قندوز کے محاصرے میں، جہاں افغان طالبان جنگجوؤں کے ساتھ بہت سے غیر ملکی جنگ جو بھی پھنس کر رہ گئے تھے، سیکریٹری دفاع ڈونلڈ رمزفیلڈ نے غیر ملکیوں کے قتل کی علی الاعلان درخواست کے سوا سب کچھ کیا۔ اس کے بعد غیر ملکیوں کا ایک گروہ جو ایک قلعے میں قید تھا اور جو یہ باور کر بیٹھا تھا کہ انہیں مار دیا جانے والا ہے، شورش پر اُتر آئے۔ اس قلعے پر امریکی بم بار طیاروں نے حملہ کیا اور بعد میں آنے والی رپورٹوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ سینکڑوں قیدیوں کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے...... یہ یقینی طور پر جنگی جرم ہے۔ اس دوران سرکاری حکام اور میڈیا کے کرتا دھرتا مطالبہ کرنے لگے کہ اسامہ بن لادن ہتھیار ڈال دے تب بھی اس کی جان لے لی جائے۔

یہ دہشت گردی کے خلاف جنگ تھی۔

شمالی اتحاد، جسے امریکا نے افغانستان کے بیشتر علاقے پر اقتدار سونپ دیا، دہشت گردوں کا ٹولہ ہے جو اذیت رسانی، شہریوں کے قتل اور عورتوں کی عصمت دری کی شہرت رکھتا ہے۔ امریکا خود کئی دہشت گردوں کا ٹھکانا ہے، جیسے جزائر غرب الہند میں ہیٹی کا عمانوئیل کونسٹنٹ، کیوبا کے کئی باشندے اور ہنری کسنجر۔ وہ دہشت گردوں کے لیے تربیتی کیمپ بھی چلا رہا ہے، جس کا نام ہے دی اسکول آف امیریکاز/ویسٹرن ہیمسفیر انسٹیٹیوٹ فار سیکورٹی کوآپریشن۔ اپنے سیاسی مقاصد کے لیے شہریوں کو خطرے میں مبتلا کر کے ریاستی دہشت گردی کا مرتکب ہو رہا ہے۔

انتظامیہ کا بنیادی محرک یہ رہا ہے کہ امریکیوں کی حفاظت کو یقینی بناسکیں۔

اس جنگ نے امریکیوں کے خلاف خطروں کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ مسلم دُنیا میں غصے کا ایک بے پناہ سیل پیدا کر کے بن لادن کے لیے حامیوں کا آخری اور انتہائی ذخیرہ (Ultimate Recruiting Velnicle) بنا دیا ہے اور اسے بہت سے لوگ ہیرو سمجھنے لگے ہیں جب کہ اس سے پہلے اسے نظر انداز کیا جاتا تھا۔ یہ بن لادن کو پکڑنے کا کوئی اچھا طریقہ بھی نہیں تھا، جیسا کہ اوپر

اشارہ کیا گیا۔ دوسرے اقدامات بھی حفاظت کو کم کرتے ہیں۔ سی آئی اے کے دائرہ عمل کو بڑھانے اور اس کو مجرموں اور دہشت گردوں کے ساتھ ملوث کرنے کے مطالبے اس حقیقت کو بھلا دیتے ہیں کہ یہ سی آئی اے کی دخل اندازی ہی تھی جس نے بین الاقوامی، اسلامی انتہا پسندی کو جنم لینے میں مدد دی۔ انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرنے والی حکومتوں کو ہتھیار فروخت کرنے کے لیے بش انتظامیہ کی خواہش، دُنیا میں عدم استحکام پیدا کرتی ہے اور میزائل ڈیفنس، جو اس قسم کے حملے کی صورت میں ذرا بھی مدد نہیں کرسکتا تھا، ہتھیاروں کی نئی دوڑ کا خطرہ بڑھا دیتا ہے۔ گھریلو محاذ پر، کارپوریٹ منافع اور آزاد تجارت (فری انٹر پرائز) کے نظریات، انتظامیہ کے لیے کہیں زیادہ اہم تھے بانسبت اس کے کہ ہوائی اڈوں میں حفاظت بڑھانے کے لیے افرادی قوت کو تومیا لیا جائے۔ حالاں کہ یہ بات کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ بعض کارپوریشنز سزا یافتہ مجرموں کو ملازم رکھے ہوئے ہیں اور کم از کم اجرت ہی دے رہی ہیں، اس طرح نا اہلی اور کام کرنے کے جذبے میں کمی کو یقینی بنا رہی ہیں۔ اینتھریکس کے علاج میں استعمال ہونے والی دوا سپرو کی بنانے والی کمپنی بیئر (Bayer) کا منافع زیادہ اہم تھا، بانسبت اس کے کہ معقول قیمت پر سپرو کی فراہمی کو عوام کے لیے یقینی بنایا جائے جن کو اینتھریکس کے بڑے حملے کا خطرہ ہوسکتا ہے۔

گیارہ ستمبر کے حملوں نے ہمیں ایک اعلیٰ تر مہم (Enterprise) میں متحد کر دیا۔

گو کہ بہت سے لوگ ایک ساتھ ہوئے، مگر بش انتظامیہ نے اتحاد کے اس تصور کو جمہوریت کی بیخ کنی کے لیے استعمال کرنا چاہا، حد تو یہ ہے کہ کانگریس سے مطالبہ کیا کہ صدر کو تجارت کے فروغ کا اختیار دے دیں (وہ حق جس کے تحت تجارتی معاہدوں کو "جیسا ہے" کی بنیاد پر پیش کیا جاسکتا ہے اور کانگریس صرف قبول یا مسترد کرسکتی ہے) کہ یہ بھی "دہشت گردی کے خلاف جنگ کا حصہ ہے۔ انجام کار کوئی اتحاد نہ رہا۔ فضائی کمپنیوں کو مشکل وقت میں سنبھال لیا گیا جب کہ برطرف شدہ ملازموں کو کچھ نہ ملا۔ ری پبلکنز نے معاشرتی تحریک کے پیکیج Economic Stimulus Package میں ٹیکس سے بہت بڑی سہولت دینے کی کوشش کی جب کہ بڑھتی ہوئی بے روزگاری سے نمٹنے کے لیے کوئی سہولت نہیں رکھی گئی۔ (امریکی دارالحکومت کے دفاتر) کیپٹل ہل پر قانونی مشیروں کو اینتھریکس کے خطرے کے دوران کہیں بہتر علاج معالجہ میسّر ہوا بانسبت ڈاک خانے کے ملازمین کے۔

اس پوری مہم (Enterprise) نے کچھ مزید پرانی اساطیر پر بھی روشنی ڈالی ہے جو ہم اپنے بارے میں قائم کیے ہوئے ہیں:

معاشرے کے تمام حصے، شہری آزادی اور قانون کی عمل داری سے برابر کی وابستگی رکھتے ہیں۔

امریکا کا Patriot Act قانون نافذ کرنے والوں کو پہلے سے کہیں زیادہ اختیارات دے دیتا ہے، جس میں اجازت (نوٹی فکیشن) کے بغیر آپ کے گھر کی تلاشی بھی شامل ہے۔ یہ غیر شہریوں کو قانونِ لزومِ تحقیقات جیسے بنیادی حقوق سے محروم کرسکتا ہے۔ بعض معاملوں میں وکیل اور اس کے کلائنٹ کے حقوق (Privilige) کی خلاف ورزی بھی کی گئی ہے۔ جاری تفتیش کے غرض سے کئی لوگوں کو مہینوں تک کسی سے بھی رابطہ کیے بغیر بند رکھا گیا ہے۔ بش نے فوجی ٹریبونل کی اجازت بھی دے دی ہے جو خفیہ ثبوت استعمال کرسکتے ہیں، بہت معمولی ثبوت پر سزا سنا سکتے ہیں اور ملزم کو اپنی پسند کا وکیل چننے کے حق سے محروم کرسکتے ہیں۔ ایف بی آئی نے اس امکان کا جائزہ بھی لیا ہے قیدیوں کو اذیت رسانی کے لیے دوسرے ملکوں میں بھیجا جائے۔ شہری آزادی اور قانونی عمل داری (Due Process) کے لیے ان خطروں کو خاص مخالفت کا سامنا ہے مگر یہ مخالفت قدرے محدود ہے۔

ہم نے نسل پرستی کے معاملے میں بہت ترقی کی ہے۔

امریکی عوام کی اکثریت اب نسل کی نشان دہی (Racial profiling) کو دُرست سمجھتے ہیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد ''نفرت کے جرائم'' میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا اور بہت سے لوگوں نے کھلم کھلا ایسے جذبات کا اظہار کیا جو نسل پرستانہ بلکہ نسل کش خیالات کے حامل تھے۔ پورے پورے ملکوں کو ایٹم بم سے برباد کرڈالنے (Nuke) کرنے کے مطالبے کیے گئے۔ گو کہ اب ایک چھوٹا سا گروہ ہے (جس میں زیادہ تر نوجوان ہیں) جو نسل پرستی کے جذبات سے آزاد ہیں مگر اکثریت نے ترقی کی ہے تو اس بات میں کہ اپنی نسل پرستی کو کیسے چھپایا جائے۔

ہم اختلافِ رائے اور آزادیِ اظہار کے حق کا احترام کرتے ہیں۔

پبلک ڈسکورس کی ایک خاصیت یہ تھی کہ جن مٹھی بھر لوگوں نے جنگ کے خلاف بات کی، اس پر شدید اور حد سے بڑھا ہوا ردِعمل ہوا۔ کئی صحافیوں کو نوکری سے نکالا گیا اور بعض لوگوں کو موت کی دھمکی دی گئی اور دوسرے طریقوں سے تنگ کیا گیا۔ دائیں بازو کی ایک فاؤنڈیشن نے ایک رپورٹ شائع کی ہے جس میں تدریسی شعبے (Academia) پر تنقید کی ہے کہ پرچم تلے اکٹھا نہیں

ہوئے حالاں کہ اس شعبے میں اختلاف رائے رکھنے والے بہت کم اور دور دراز تھے۔ اعلیٰ اداروں میں بھی اختلاف رائے کو بھوت بنا کر رکھ دینے (Demonization) اور اختلاف رائے کا اظہار کرنے والوں کی باتوں کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کے مستقل سلسلے کی وجہ سے اس بات میں کوئی حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ بیش تر عوام الناس نے بھی یہی راہ اختیار کی ہے...... سی بی ایس/ نیویورک ٹائمز کی ایک حالیہ رائے شماری کے مطابق ۳۸ فیصد نے یہ کہا کہ جنگ کے خلاف مظاہروں کی اجازت نہیں ہونا چاہیے۔

دنیا میں سب سے زیادہ آزاد اور خودمختار میڈیا ہمارا ہے۔

شروع کی چند گھڑیوں سے ہی ہمارے میڈیا نے خون کے مطالبوں میں معاشرے کے کسی بھی دوسرے شعبے کو پیچھے چھوڑ دیا۔ جس طرح عموماً وہ جنگ کے دنوں میں کیا کرتے ہیں، انہوں نے حکومت کی بے پناہ فرماں برداری کا مظاہرہ کیا، اور اختلافی نقطہ ہائے نظر کی گنجائش بھی برائے نام۔ جب انہوں نے سرکاری حکام پر تنقید بھی کی تو کافی بم باری نہ کرنے پر۔ سب سے زیادہ سنجیدہ بات یہ ہے کہ حد سے زیادہ سنسر شپ خود اپنے اوپر عائد کر رکھی تھی (Self-Censorship)۔ متعدد اہم مسائل پر بمشکل توجہ دی گئی: یہ حقیقت کہ بن لادن کو ملک بدر کرنے کے معاہدے کی تفصیلات طے ہو چکی تھیں: یہ حقیقت کہ ان حملوں سے پہلے ہی امریکا نے افغانستان کے خلاف جنگ کی منصوبہ بندی کر لی تھی، اس جنگ کا تیل سے تعلق اور ان کے علاوہ مزید باتیں۔ بدترین بات، شہریوں کی ہلاکت پر مستقل بے توجہی تھی۔ محض چند واقعات کی رپورٹ دی گئی اور ان کو بھی پینٹاگون کے ان دعوؤں کے بار بار دہرائے جانے سے کہ یہ ''پروپیگنڈا'' ہیں، مسترد کر دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ محض مٹھی بھر افراد مارے گئے جب کہ سچ تو یہ ہے کہ ہزاروں مارے گئے۔ حکومت اس اطاعت گزاری سے بھی مطمئن نہ ہوئی اور ایسی پابندیاں لگا دیں جن کی کوئی اور مثال نہیں ملتی، نومبر کے آخر تک ''پریس پول'' کی اجازت نہیں دی، محاذ پر لڑنے والے سپاہیوں سے انٹرویوز نہیں ہونے دیے اور پریس کو تصدیق شدہ اطلاعات کی رپورٹ دینے سے بھی روکا۔ غیر ملکی پریس کے بعض حصوں سے جن کی رپورٹنگ پر اختیار نہیں تھا، سختی سے نمٹا گیا۔ امریکی حکومت نے قطر سے کہا کہ ''الجزیرہ'' کو سنسر کریں اور بعد میں، کابل میں اس کے دفتر پر بم باری بھی کی گئی، اس کے ساتھ ساتھ افغان شہری ریڈیو پر بھی متواتر بم باری کی گئی جو جنگی جرم ہے۔ امریکی پریس نے جنگ کے خلاف تحریک کا مضحکہ اڑایا اور اس کو توڑ مروڑ کر پیش کیا، یہ الزام

لگایا کہ اس کے پاس نعرے تھے، تجزیہ نہیں، یہ کہ ان لوگوں نے دہشت گرد حملوں کی مذمت نہیں کی اور بدترین بات یہ کہ ان لوگوں کا پیش کردہ حل یہ ہے کہ "کچھ نہ کرو۔"

درحقیقت یہ اس پوری مہم کا غالباً سب سے بڑا اسطورہ (متھ) تھا...... یہ کہ کوئی مترادف راستہ نہیں تھا اس لیے یا تو ہمیں افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دینی چاہیے یا کچھ نہ کریں۔ جنگ کی مخالف نے بار بار کوشش کی کہ ایک حقیقی حل کی بنیادوں کی نشان دہی کرے...... ایسا حل جس میں حقیقت بین الاقوامی تفتیش شامل ہو جو محض حکومتوں کے نہیں بلکہ عوام کے درمیان باہمی تعاون پر مبنی ہو، مشرقِ وسطیٰ میں امریکی پالیسی میں ڈرامائی تبدیلی پر مبنی ہو تاکہ وہاں کے لوگوں کے "دل و دماغ" جیتے جا سکیں...... مگر یہ کوششیں بے کار گئیں۔

ان اساطیر سے بڑا فرق پڑا۔ گو کہ امریکیوں کی اکثریت نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کی حمایت کی ہے، ان کی حمایت اس بارے میں غلط فہمی پر مبنی ہے کہ جنگ کس طرح لڑی گئی ہے، کس قدر کولیٹرل ڈیمیج ہوئی اور کیا مترادف عمل ممکن تھے۔

بین الاقوامی دہشت گردی کے مسئلے سے نمٹنے کے کسی بھی امکان کے لیے، ہمیں ریاست ہائے متحدہ امریکا کا عالمی کردار تبدیل کرنا ہوگا۔ "جنگ لوٹ آئی ہے" نامی مضمون میں، جو حملوں کے اگلے ہی دن ویب پر جاری ہوا تھا، میں نے لکھا تھا: "جو حملے دانستہ طور پر شہریوں کو نشانہ بناتے ہیں یا نشانے میں اتنی بھی تفریق نہیں کرتے، ان حملوں کا بنیادی طور پر عمل کار (Practitioner)، مشرقِ وسطیٰ کا کوئی پرچھائیوں جیسا دہشت گرد نہیں ہے بلکہ ہماری اپنی حکومت ہے۔" ان حملوں کا دائرہ براہ راست بم باری سے لے کر، جیسی کہ امریکا نے عراق پر کی (اور متعدد مواقع پر کی)، سربیا، سوڈان، افغانستان اور دوسرے ممالک پر صرف پچھلے دس سال میں کیے، لوگوں کو بنیادی ضروریات سے محروم رکھنا شامل ہے۔ عراق پر پابندیوں سے لے کر، جن کی وجہ سے لاکھوں افراد کو بنیادی صحت کی سہولیات حاصل کرنے سے روکا گیا ہے، جنوبی افریقا کو اپنے شہریوں کے لیے ایڈز کی سستی دوائیں فراہم کرنے سے روکنے کی کوششوں تک، ریاست ہائے متحدہ نے ان گنت شہریوں کی جان لی ہے۔

کوئی نہ کوئی جواز ہمیشہ موجود ہوتا ہے، جیسے کہ کہیں بھی لوگوں کے مارے جانے کے لیے ہوتا ہے۔ عراق پر پابندیوں کے لیے، جواز یہ ہے کہ یہ سب عراق کے پڑوسیوں کی حفاظت کے لیے ہے، ایڈز کی دوا سے محروم رکھنے کے بارے میں یہ جواز ہے کہ یہ کارپوریٹ منافع کی شرح برقرار رکھنے کے لیے ہے۔ جن دہشت گردوں نے گیارہ ستمبر کو حملہ کیا، ان کے نزدیک جواز تھا

امریکی موافقت سے ان کے علاقوں میں ہوئے والے قتل اور استحصال کی مخالفت کی ضرورت۔ اگر دہشت گردی کی بے تعصب تعریف وضع کی جاتی ہے تو اس تعریف میں یہ بھی شامل ہونا چاہیے کہ سیاسی مقاصد کے لیے غیر متحارب لوگوں کو مار ڈالنا بھی دہشت گردی ہے، چاہے یہ کوئی بھی کرے اور اس کے لیے کتنے ہی عظیم مقاصد کا اعلان کیوں نہ کرے۔

جب اس وقت کی سیکریٹری داخلہ میڈلین البرائٹ ۱۲ مئی ۱۹۹۶ء کو (ٹی وی پروگرام) ''ساٹھ منٹ'' میں آئیں تو لیزلی اسٹال نے عراق کے خلاف پابندیوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ''ہم نے سنا ہے کہ پانچ لاکھ بچے (نصف ملین) مر چکے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ یہ ہیروشیما میں مرنے والے بچوں سے زیادہ تعداد ہے اور آپ جانیے کہ یہ قیمت زیادہ تو نہیں تھی "Is the price worth it?"۔ البرائٹ نے اس تعداد پر اعتراض نہیں کیا اور جواب دیا کہ ''میرے خیال میں یہ انتخاب بہت مشکل ہے، مگر یہ قیمت...... ہم سمجھتے ہیں کہ یہ قیمت زیادہ نہیں تھی۔'' یہ دہشت گردی کا فلسفہ ہے۔ جن لوگوں نے ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے ٹکرا کر طیارے تباہ کر دیے، انہوں نے تقریباً چار ہزار لوگوں کو مار ڈالا اس لیے کہ وہ مشرقِ وسطیٰ میں امریکی بالادستی پر برہم ہیں۔ امریکی حکومت نے عراق میں پانچ لاکھ بچوں کے مارے جانے میں مدد دی کہ یہی بالادستی قائم رہ سکے۔

یہ عام بات ہے کہ اس طرح کے موازنوں کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا جاتا ہے کہ یہ ''اخلاقی مساوات'' کے دعوے ہیں۔ درحقیقت یہ تصور ہی بے موقع ہے۔ امریکی حکومت ''اخلاقی طور پر دہشت گردوں سے مساوی'' ہے یا نہیں ہے، اس بات کا مطلب چاہے جو بھی ہو، اصل نکتہ یہ ہے کہ امریکی شہریوں پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ (اپنی حکومت) جرائم کی مخالفت کریں، اس سے پہلے کہ وہ دوسرے لوگوں کے ان جرائم کی مخالفت کریں جن پر ان کو بہت کم اختیار ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسامہ بن لادن کے مزاج کے دہشت گردوں کو روکنے کی کوششیں ختم کر دی جائیں۔ اس کا مطلب محض یہ ہے کہ ان کو روکنے کے لیے دہشت گردی کی کوشش نہ کی جائے۔ افغانستان کی جنگ نے صورت حال کو مزید خراب کر دیا ہے...... اپنے طریق کار میں دہشت گرد اور بنیادی طور پر امریکا کی سامراجی طاقت کی حفاظت کے لیے ڈھالی جانے والی، نہ کہ دہشت گردوں کی روک تھام کے لیے۔

اگر البرائٹ دوبارہ ''ساٹھ منٹ'' پر آئیں تو اس مرتبہ ان سے پوچھا جائے کہ کیا وہ سمجھتی ہیں کہ مشرقِ وسطیٰ میں امریکی پالیسی کے اہداف کی قیمت ہزاروں امریکیوں کی موت سے ادا ہوگئی۔

موشے بینا روچ
ترجمہ: آصف فرخی

گھوڑے

اور
بھاگتے ہوئے آئیں گے
سرپٹ دوڑتے ہوئے
سرمئی سیاہ نیلے گھوڑے
گم گشتہ گھوڑے
تمام صدیوں کے گھوڑے
آئیں گے
ہر اس چیز کو کچل ڈالنے کے لیے
جس پر ان کی نظر پڑے......
عورتیں مرد اور بچے
اور گدھے اور لومڑیاں اور کتے اور بلیاں۔
آئیں گے، وہ آئیں گے
گھوڑے، اور پھر مزید گھوڑے
اور کوئی ان کو روک نہیں سکے گا
نہ ایٹم بم
نہ گیس نہ کیمیائی مادّے نہ وائرس
وہ سب سے زیادہ طاقت ور گھوڑے ہوں گے
جو اب تک وجود میں آئے
گھوڑے جن سے یاد آئیں
اب تک ہونے والی ساری ناانصافیاں

اور آگے ہونے والی ہیں......
اور آدمی پھر پوچھے گا
میرے دور میں کیوں
میرے گھر میں کیوں
میرا ہی خاندان کیوں اور میرے بچے کس لیے
اور کوئی جواب نہیں دے سکے گا
نیلے گھوڑے، آسمانی گھوڑے
سب سے بدتر ہوں گے
تباہ کردیں گے ۴۰۰ منزل کی عمارتیں
تباہ کردیں گے ٹینک اور طیارے
ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اڑا دیں گے
اور صدر مملکت تسلی دیں گے
اور ماہرین تبصرے کریں گے
اور ٹیلی وژن بول اٹھیں گے
مگر کسی چیز سے مدد نہیں ملے گی
اور مزید اور گھوڑے آتے چلے جائیں گے
نامعلوم کہاں سے
اچانک گھوڑے نمودار ہو جائیں گے
سڑکوں پر چلتے پھرتے لوگوں کے سامنے
اور تم، بستر میں لیٹے لیٹے
میری طرف دیکھو گے......
مایوسی کے عالم میں، بچائے جانے کے انتظار میں
میں بھی تمہاری طرف دیکھوں گا اور اچانک
میں بھی بن جاؤں گا
ایک سرخ گھوڑ

امریکا کے ہم عصر شاعروں میں منفرد اہمیت کے حامل چارلز سِمِک (Simic) ۱۹۳۸ء میں یوگوسلاویہ میں پیدا ہوئے۔ مشرقی یورپ کی جدید شاعری سے ایک گونا مماثلت ان کے ہاں واضح نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری کے درجن بھر سے زیادہ مجموعے شائع ہوچکے ہیں اور ۱۹۹۰ء میں ''دنیا ختم نہیں ہوتی'' پر شاعری کا سالانہ پلٹزر انعام بھی ملا۔ یہ نظمیں ۱۹۹۴ء کے مجموعے ''دوزخ میں ایک شادی'' سے لی گئی ہیں۔ ان کا محرک بوسنیا کے حالات رہے ہوں گے مگر تازہ واقعات نے ان نظموں کو ایک بار پھر لائق توجہ بنا دیا ہے۔

چارلز سِمک
ترجمہ: آصف فرخی

آسیب زدہ دماغ

آنے والی خوں خواری،
شہر جن میں ابھی سے موت کی بو بس گئی ہے،
تم کس بُت کی پوجا کرو گے،
کس کے سرد مہر دل کی؟

ایک سرد جمعرات کی شب
محلے کے ایک سستے ہوٹل میں
میں نے جنگ کے درندے کو
ٹی وی پر اپنی شرم گاہ چاٹتے ہوئے دیکھا

اس وقت تین اور گاہک بھی تھے:

میری بوڑھے جو کی گود میں بیٹھی ہوئی تھی
اس کا پاگل لڑکا کونے میں
پن بال مشین پر دونوں بازو پھیلائے ہوئے۔

پیراڈائز موٹل

لاکھوں مر چکے تھے، ہر ایک معصوم تھا
میں اپنے کمرے ہی میں رہا۔ صدر مملکت
جنگ کے بارے میں یوں بات کر رہے تھے جیسے وہ محبت کی جادو بھری دوا ہو۔
میری آنکھیں حیرت کے عالم میں کھلی تھیں۔
ایک آئینے میں مجھے اپنا چہرہ یوں معلوم ہوا
جیسے دوبار منسوخ ہونے والا ڈاک کا ٹکٹ۔

میں خوب اچھی طرح جیا، مگر زندگی خراب تھی۔
اس دن بہت زیادہ سپاہی تھے
اتنے بہت سے پناہ گزین سڑکوں پر بھرے ہوئے
قدرتی بات ہے کہ وہ سب
ان کے ہاتھ کی ایک جنبش سے غائب ہو گئے۔
تاریخ نے اپنی خون آلود بانچھیں چاٹ لیں۔

ٹی وی کے نقد ادائیگی والے چینل پر ایک مرد اور عورت
بھوکے بوسوں کی تجارت کر رہے تھے اور ایک دوسرے کے کپڑے
نوچ پھینک رہے تھے جب کہ میں دیکھ رہا تھا
آواز بند اور کمرہ اندھیرا کر کے
سوائے اسکرین کے جس کے رنگ میں

سرخ بہت زیادہ تھا، گلابی بہت زیادہ۔

ڈاکومینٹری

آج میں نے ایک شہر جلتا دیکھا ٹی وی پر
دور دراز اور آسیب آسا کوئی
ملبے میں سے چل رہا تھا
پھر کیمرے نے گھماؤ کے ساتھ
تندخو آسماں اور بادلوں کو سمیٹ لیا۔

اکیلا، احتیاط سے قدم دھرتے ہوئے،
سر اس قدر جھکا ہوا...... اس کا سر ہی نہیں تھا......
کوئی ایسی چیز تلاش کرتے ہوئے
جس میں کیمرے کو کوئی دل چسپی نہ تھی
کہ وہ چاہتا تھا ہم آسمان کی تحسین کریں
جس میں سیاہ دھوئیں کے مینار تھے۔

اور اس کے ساتھ رواں تبصرہ
''ہمارے الم ناک عہد'' کے بارے میں الفاظ
جو میں سن نہ سکا...... اسے دیکھتے ہوئے
کہ وہ رُکا اور جھک گیا
اور اسی وقت منظر سے غائب ہوگیا۔

پتلی تماشا

اس میں جو مکھی ہے، وہ واحد زندہ مخلوق ہے۔ پُتلے اس کے پیچھے بھاگتے ہیں، اس کے لیے مختلف طرح کے جال اور پھندے بناتے ہیں اور آخر میں اسے پکڑ لیتے ہیں۔ وہ اس کے پر نوچ لیتے ہیں اور ایک ایک کر کے اس کی ٹانگیں اکھاڑ لیتے ہیں۔ ایک لڑکی اس لرزتے کانپتے کیڑے کو جلتی ہوئی تیلی دکھاتی ہے۔ ''اے مکھی، کیا تجھے معلوم نہیں کہ اکیلے کسی دیوار کی درز میں مرجانا کتنا برا ہے!'' وہ لہک کے کہتی ہے۔

کیا مزہ ہے! چشمہ لگائے ایک لڑکا اسٹیج پر دوڑا آتا ہے، وحشت کے عالم میں اشارے کرتا ہوا۔ وہ دنیا کی سب سے چھوٹی اپاہج گاڑی مکھی کے لیے لے کر آیا ہے۔ وہاں تو ایک امریکی جھنڈا بھی ہے، ٹین کا پیالہ اور ایک بگل جو بدقسمتی سے اتنا بڑا ہے کہ اس کے منھ میں سا نہیں سکتا۔

اخبار سے کاٹی گئی کاغذی پُتلیاں

ان میں سے چار ایک خاندان کی طرح ہاتھ تھامے ہوئے
آج صبح ایک جنگ جاری ہے
اور آسمانی قہوے کا اشتہار
ایک قاتل کی تصویر کے برابر۔

انہیں اٹھا کر دکھاؤ، ننھی روزی۔
ذرا دیر اٹھائے رکھو۔
انہیں ناچتے ہوئے دیکھو، انہیں جلتے جلتے دیکھو
ہمیں ہنساتے ہوئے دیکھو۔

قہوہ کھول رہا ہے، اس کا دھواں
اٹھ رہا ہے۔ چھاپے خانے کی سیاہی
تمہاری انگلیوں پر، تمہارے چہرے پر
چھوٹنے لگتی ہے
جب تم آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتی ہو، روزی۔

بشکریہ: دی لٹل میگزین، نئی دہلی

مصطفیٰ ارباب

آپ کس قسم کی موت چاہتے ہیں

آپ کس قسم کی موت چاہتے ہیں
ہماری دکان پر
ہر قسم کی موت مل جائے گی۔
آپ صرف پسند کریں
ہمارے پاس
ہر طرح کا انتظام ہے۔
آپ سستی موت چاہتے ہیں یا مہنگی
فیصلہ جلدی کیجیے۔
سب سے سستی موت گولی والی ہے
اور مہنگی ہاتھوں سے گلا گھونٹنے والی۔
دیکھیے
اس سے مارنے والے کی قوت ضائع ہوتی ہے۔
رسّی کے پھندے کا بھی انتظام ہے
اور دریا کا بھی
جس میں چھلانگ لگائی جا سکے۔
آپ چاہیں تو
ہمارے پاس ''کارپٹ بم باری''
اور شان دار میدانِ جنگ کا
انتظام بھی ہے۔
اس کیٹلاگ میں

ہر قسم کی موت اور اس کے دام درج ہیں
آپ اسے لے جایئے اور فون کر دیجیے گا۔
لیکن لگتا ہے
آپ کی قوت فیصلہ کم زور ہے۔
کاؤنٹر سے ہٹ جایئے
رش بڑھتا جا رہا ہے۔

لینڈ اسکیپ

آسودگی میں
لپٹی ہوئی لاشیں بے پروا ہو چکی ہیں۔
بارود کی مہک
ہر خوش بو پر حاوی ہو گئی ہے۔
گولیوں کی تڑتڑاہٹ
اور بموں کے دھماکے
موسیقی کا متبادل بن گئے ہیں۔
کالا دھواں
ہر طرف پھیلتا جا رہا ہے۔
سوچیں
بدن کی بھٹی میں
تپ کر ٹھنڈی ہو چکی ہیں
جہاز گدھوں کی مانند
آبادیوں پر منڈلا رہے ہیں،
امن کے لیے
ایک جنگ ہو رہی ہے۔

اگر چند روز......

اخبار مت پھاڑنا
بلکہ ہو سکے تو
ایک دو اور لگوا لو۔
ریڈیو کی زبان
اور اپنی سماعت پر
اعتبار کرنا سیکھ لو۔
اپنی آنکھ کو
کیمرے کی آنکھ سے
باہم کر کے
ٹی وی دیکھتے رہو۔
ممکن ہو تو
چپس چباتے ہوئے
معدے کو بھی
اسکرین کے مناظر میں
شریک کر سکتے ہو۔
اگر چند روز
اسی طرح کرتے رہے
تو تم بھی
موت کے گھیرے میں
زندگی گزارنا سیکھ جاؤ گے۔

ذی شان ساحل

دہشت گردوں سے اپیل

اگلی بار اگر دل چاہے
کوئی گلی، کوئی کوچہ
کوئی سڑک، کوئی دوراہا
ہوٹل، مسجد یا دفتر،
کلینک، پارک، سینما گھر
منصوبے میں شامل رکھنا
اور ہمیں بھی بتلا دینا
اپنا کام مکمل کر کے
جب تم رخصت ہو جاؤ گے
ہم اپنا بوجھل دل لے کر
پھول اٹھائے آجائیں گے
یا آنکھوں میں آنسو بھر کے
دیے جلانے آجائیں گے
لیکن پیارے دہشت گردو!
اگر تمہیں امریکا ہی میں
آسمان چھولینے والے
کسی اور ٹریڈ ٹاور سے
کچھ طیارے ٹکرانے ہوں
تو ان میں سے اپنی خاطر
ایک طیارہ واپس لاکے
میرے دل سے ٹکرا دینا
یا جو لوگ بغیر ٹکٹ کے
جنت میں جانا نہیں چاہتے
ان کو نیچے ٹھہرا دینا
یا جنت میں پہرا دینا

فاطمہ حسن

دیوی

دیوی اپنی لمبی عمر کی خاطر
خون کی بھینٹ طلب کرتی ہے۔

راج سنگھاسن پر بیٹھی یہ دیوی
اپنی شکتی کو میرے بچوں کے معصوم
اُبلتے خون سے زندہ رکھتی ہے

دیوی ماں کی کوکھ اجڑنے کی تلخی کو
لمبی عمر کے ذائقے میں حل کر دیتی ہے اور
پی جاتی ہے

مائیں بچوں کو حسرت سے تکتی ہیں
ان کے خون کی قیمت کیا ہے
(خون کی قیمت خون)

دیوی ہم کو اپنا بچہ دے دے
ہم وہ تیری بھینٹ چڑھائیں
تیری لمبی عمر کی خاطر۔

احفاظ الرحمٰن

نئی الف لیلہ

کس کہانی کا ہے یہ آغاز اے شہرِ فسوں
کون سے موسم میں ٹھہرے گا ترا جوشِ جنوں
حلقۂ زنجیر میں کب دل کو آئے گا قرار
کون سی منزل پہ آئے گا پیامِ جاں فزا
کیا ترے صحرا کی قسمت میں گلِ خنداں نہیں
کیا ترے لوگوں میں خود جوئی کا کچھ ارماں نہیں
کس کہانی کا ہے یہ انجام بنتِ شہرزاد
کربلا میں کب تلک بہتا رہے گا یہ لہو
کب تلک مقتل میں سازش کا علم لہرائے گا
بے بصر کب تک ہلاکو سے مرادیں پائے گا
آئینے میں سارے چہرے بے گماں اپنے ہی ہیں
دستِ قاتل میں ہیں جتنے تیر
سب اپنے ہی ہیں
کارواں در کارواں تصویرِ حیرت دفن ہے
گم شدہ اوراق میں
صدیوں کی عبرت دفن ہے
کس کہانی کا ہے یہ انجام بنتِ شہرزاد
کس کہانی کا ہے یہ آغاز بنت شہرزاد
یہ سلاطینِ عرب، یہ تاج دارانِ ریال
ڈالروں کی سرزمین سے عہد و پیماں کے غلام

موت کے سوداگروں کی حیلہ جوئی کے شکار
خاندانی حکم رانی کی روایت کے نشاں
اک کہانی، اک حکایت ان کے بھی انجام کی
موت کے سودے میں حاصل آخری انعام کی

بنتِ شہر زاد
وقت کے ماتھے پر کندہ یہ کہانی بھی سنا!

ایک پیغام، زُبوں حال زمیں زاد کے نام

نطق خاموش، جنوں خوابیدہ
شوخیِ لوح وقلم خوابیدہ
جامِ پندار گرفتہ کا فسوں خوابیدہ
زور آور کی غضب ناک صدا گونجتی ہے
(اک پیغام، زُبوں حال زمیں زاد کے نام)
آسمانوں سے تری خاک پہ لمحہ لمحہ
غیظ کی آتشِ خوں خوار کی بارش ہوگی
طاعت و عجز کی دولت ہی تری مونس ہے
آب رُو چاک گریباں کی سرِ رسوائی
دانہ ودام کی چاہت میں چمن آشفتہ
مصلحت کوش زمانے کی ہوا دست دراز
صید افگن کی کماں چُست، قضا پا بہ رکاب
دست بستہ مرا ساقی، مری مینا، مرا جام۔

حسن عابدی

دوسری موت

رات اندھیری تھی اور راستہ تنگ تھا
پھر جو دیکھا، وہی راستہ بند تھا
سامنے لاش تھی
ہم سفر اس اندھیرے میں کوئی نہ تھا
سانس لیتی ہوا
خوف سے جھرجھری لے کے رخصت ہوئی
سیاہی کی سفاک سرگوشیاں تھیں
چٹانوں کی سنگین رازداری کی شاکی
کانٹوں بھری جھاڑیاں تھیں

میں نے لرزیدہ قدموں سے خود کو سنبھالا
کانپتے بازوؤں سے
لاش کو اپنے کاندھے پہ ڈالا
اس کے چھلنی بدن کا لہو
میرے دامن کو، سینے کو، سارے بدن کو
لہو میں بھگوتا رہا
میں اندھیرے کی ٹھوکر سے بچتا
لاش کی کس مپرسی پہ روتا رہا
اور چلتا رہا
پھر اُجالا ہوا، لوگ آتے گئے اور آنسو بہاتے گئے
لاش اجلے کفن میں لحد کے کنارے لگا دی گئی

(۲)

اب جو دیکھا تو اور کوئی نہ تھا
وہ تو میں تھا،
منجمد خون کی دھاریوں سے چِٹختا ہوا
میرا چہرہ شکن در شکن، میرا چھلنی بدن
وہ تو میں تھا

میں پسینے میں بھیگا ہوا، چونک کر جاگ اٹھا
ہاتھ پھیرا تو چہرہ پسینے میں تر تھا
میں نے اپنے بدن کو ٹٹولا اور دل کو سنبھالا
کپکپاتے ہوئے دست و بازو نے تصدیق کر دی
وہ کوئی اور تھا، میں نہ تھا
خشک ہونٹوں نے الحمد اللہ کہا
یہ مری دوسری موت تھی۔

فہمیدہ ریاض

مغلوب الغضب

وہ مغلوب الغضب ہیں
اُن کی بانچھیں پھڑ پھڑاتی ہیں
کوئی شے ہے کہ ان کو روز و شب بے چین رکھتی ہے
کہ وہ بیٹھے ہوئے پہلو بدلتے ہیں
بہت وحشی نگاہیں ڈالتے ہیں چار سو
ہر دم
نہایت کرب سے جامے کے بل
وہ پیش و پس کرتے ہوئے
حیران ہوتے ہیں
کہ تھی جو ساعت موعود
ان کی فتح و نصرت کی
بھلا کیوں کر نہیں آئی؟

انہیں جب دیکھتی ہوں،
میرے دل میں بھی
عجب اک درد کا طوفان اٹھتا ہے
مری بانچھیں پھڑکتی ہیں
مرا دل چاہتا ہے
میں، بہت منت سماجت سے
انہیں صحرا میں اک چاہِ ندا تک

لے کے جاؤں
اور کہوں
سن لو
صدائے غیب آتی ہے
کسی بربط کے لرزاں تار کی مانند
حل ہوتی فضاؤں میں
ایہا الناس! دم بھر کے لیے اس کو سنو
یہ تم سے کہتی ہے
''چلو جانے بھی دو،
چھوڑو!
یہی سو مشکلوں کا ایک حل ہے
اسمِ اعظم ہے
چلو...... جانے بھی...... دو
چھوڑو......''

اور یہ نظم

یہ اندھیرے براعظم
جن پہ برساتی گھنے جنگل اُگے ہیں
یا سلگتے ریگزار
ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں
ہیں یہیں مسکن سیہ پرچھائیوں کے
اس صدی میں

اب جہاں
صاف نیلے آسماں پر
اک ہلاکت خیز طیارہ ہے آویزاں
بہت پر تمکنت اور مطمئن
موت کا جیسے فرشتہ
غور کرتا ہے کدھر کا رُخ کرے
کس سمت جائے

لرزہ براندام ہیں سہمی ہوئی پرچھائیاں
خوف سے بجتے ہیں تن میں استخواں
ان کے چہروں کے اندھیرے میں ہے رقصاں
ان کے دیدوں کی سفیدی
نیم سجدے میں زمیں کو تک رہے ہیں
جس کے اوپر رینگتی ہیں بے بضاعت چیونٹیاں
کیچوے،
کیڑے مکوڑے
اور یہ نظم۔

حسن منصور نے کم ہی افسانے لکھے ہیں مگر موضوعات اور اندازِ بیان کی وجہ سے وہ جدید سندھی افسانہ نگاروں میں اپنی علیحدہ اور واضح شناخت کے حامل ہیں۔ حسن منصور ایک انگریزی روزنامے سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے یہ افسانہ ان دنوں لکھا تھا جب کراچی دہشت گردی کی لپیٹ میں آکر جرائم اور فسادات کی آماج گاہ بن گیا تھا۔

حسن منصور
ترجمہ: اسلم خواجہ

میں اور وہ

اس کی رفتار تیز ہوتے ہی میں نے بھی اپنے قدم تیز کر دیے۔ رات کا ڈیڑھ بجا تھا اور یہ شہر کا انتہائی ویران علاقہ تھا۔ اگر علاقہ بارونق بھی ہوتا تو بھی آکاش پر پھیلا رات کا کالا دیو اُس وقت وہاں فقط ویرانی کا رقص دیکھنا پسند کرتا۔ لیکن یہ ویران علاقہ کالے دیو کی پسند اور ناپسند سے بالکل لاتعلق تھا یا شاید اس کی خواہشات کا مظہر تھا۔

وہ وہاں سے نہ گزرتا تو اس وقت وہاں کوئی بھی نہیں ہوتا۔ میں بھی نہیں! وہ وہاں سے گزر رہا تھا اس لیے میں بھی وہیں تھا اور اس کے تعاقب میں تھا۔

اُس نے اپنی رفتار تیز کرتے ہوئے خوف سے میری جانب دیکھا، میں مسکرایا اور خوف کی ریکھائیں اس کے چہرے پر گہری ہوگئیں۔ مجھے لگا کہ اس کا چہرہ کہیں گم ہوگیا تھا اور صرف ان گنت سہمی اور کانپتی ہوئی ریکھائیں میری جانب دیکھ رہی تھیں۔

وہ کم و بیش دوڑنے لگا تھا، اس دوران وہ کئی مرتبہ راستے میں پھیلے ہوئے پتھروں سے الجھ کر لڑکھڑا بھی چکا تھا۔ وہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا اور ہاتھ میں بریف کیس تھا، جس پر اس کی گرفت سخت ہوگئی تھی۔ یقیناً اس میں کوئی قیمتی چیز تھی۔

سڑک کا ایک کھمبا جو عام طور پر صرف دن میں جلتا نظر آتا تھا، نہ جانے کیوں خلافِ معمول اس وقت جل رہا تھا، شاید بجلی کا محکمہ کسی فنی خرابی کا شکار تھا۔ لیمپ پوسٹ کے قریب سے گزرتے

ہوئے وہ اچانک ایک لمحے کو، فقط ایک لمحے کو اپنی جگہ پر ساکت ہوگیا اور میری جانب دیکھنے لگا۔ میرے لیے اس کا یہ قدم غیر متوقع تھا۔ اس لیے میں رکتے رکتے بھی چند قدم آگے نکل گیا۔ ہم دونوں کے درمیان فاصلہ کچھ کم ہوگیا۔ میں نے فقط اس لمحے میں اس کا مکمل جائزہ لیا۔ مختصر لیکن روشن آنکھوں کے اس مالک کی عمر چالیس سال کے قریب ہوگی۔ وہ کچھ سال قبل تک یقیناً خوب صورت رہا ہوگا لیکن اب وقت سے پہلے اس کا چہرا کسی مرجھائے ہوئے پھول کی طرح اور کسی خوب صورت عمارت کی باقیات جیسا لگ رہا تھا۔ بکھرے بالوں، بڑھی ہوئی داڑھی اور مونچھوں میں سفیدی اتری ہوئی تھی۔ قد مناسب تھا لیکن بدن کی لوچ اس پر تیزی سے چھانے والے بڑھاپے کی یلغار کو واضح طور پر بیان کررہی تھی۔ پسینے میں نہائے ہوئے چہرے پر ثبت خوف کی ریکھائیں اور زیادہ گہری ہوگئی تھیں اور یہ اس پر میری مہربانی تھی۔

میں دوبارہ مسکرا دیا۔ یہ دیکھ کر اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور وہ پہلے سے زیادہ تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ مجھے اس فاصلے کے ساتھ اس کے تعاقب میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ میں مضبوط نوجوان تھا اور روزانہ تین میل دوڑنا میری عادت تھی۔

مجھے یقین تھا کہ وہ اب ہانپنے لگا ہوگا۔ میں نے فاصلہ کم کرنے کے لیے اپنی رفتار بڑھائی۔ مزید قریب ہونے پر اس کی سانس کی آواز بھی سننے لگا۔ ویرانی اور خاموشی میں تو کاغذ کو بھی اپنا وجود محسوس ہوتا ہے، میرے قریب پہنچنے پر اس نے بھی میرے قدموں کو محسوس کرلیا اور باقاعدہ دوڑنے لگا۔ بریف کیس پر اس کی گرفت مزید سخت ہوگئی اور اسے لگ رہا تھا کہ اس کی کھردری لیکن کم زور انگلیاں کسی نہ کسی طور بریف کیس کے ریگزین میں پیوست ہوجائیں گی۔

اب ہم جس جگہ پہنچے تھے اس سے کچھ فاصلے پر پولیس چوکی تھی لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ اس وقت تو کتے بھی سو چکے تھے اس لیے سپاہیوں کے جاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر اخبارات کے دفتر تھے جہاں رات گئے تک کام کرنے والے اخباری کارکنوں کی تھوڑی بہت آمدورفت جاری رہتی تھی۔ اگر وہ یوں ہی دوڑتا رہتا تو اس علاقے میں پہنچنے میں دس منٹ ضرور لگ جاتے۔ اس کے لیے اسٹمنا کی ضرورت تھی۔ مجھ میں اس کی کمی نہیں تھی اور میں نے سنا تھا کہ خوف بھی کم زور سے کم زور شخص میں ایسا ہی غیر معمولی اسٹمنا پیدا کردیتا ہے۔ وہ بھی خوف کا شکار ایک کم زور شخص تھا اور ہانپنے کے باوجود لمحہ بہ لمحہ مزید تیز دوڑ رہا تھا۔ وقت میرے لیے کم ہورہا تھا، اس لیے مجھے جلد ہی کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔

پولیس چوکی کے گیٹ پر پہنچ کر وہ تقریباً رک گیا اور بے یقینی سے تاریکی میں ڈوبے تھانے کو دیکھنے لگا۔ اُسے یقیناً مایوسی ہوئی ہوگی۔ رات کو تھانے بھی قبرستان بن جاتے ہیں۔ جہاں صرف بے گناہ لوگوں کے جسموں پر تڑپتے زخم اور نشتر ہی جاگتے ہیں۔ لیکن اگر دن بھی ہوتا تو اُسے کیا حاصل ہوتا۔ شریف اور کم زور لوگوں کا پولیس والوں اور سیاست دانوں سے کیا سروکار!

کچھ دیر کے لیے وہ نہ جانے کس سوچ میں گم ہوگیا۔ پھر اچانک چونک کر میری جانب دیکھنے لگا تو میں نے بھی اپنی رفتار کم کر دی اور اُس کے مزید قریب پہنچ گیا تھا۔ میرے چہرے پر جو مسکراہٹ اُسے پریشان ہی کر رہی تھی۔ اُس نے میری جانب دیکھتے ہوئے، میری طرف آنے کا ارادہ کیا۔ شاید وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مجھے یہ بات پسند نہیں تھی اس لیے میں زیادہ دیر اپنی مسکراہٹ برقرار نہیں رکھ سکا، اس نے بھی جلدی اپنا ارادہ تبدیل کر کے مسلسل بھاگنے کو ترجیح دی۔ اُس کے ارادے میں تبدیلی میرے لیے کافی تھی۔ میرے چہرے پر دوبارہ مسکراہٹ لوٹ آئی اور دوڑ دوبارہ شروع ہوگئی۔

لیکن کچھ ہی دیر میں وہ لڑکھڑانے لگا اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کوئی شرابی برداشت سے زیادہ پینے کی وجہ سے ہوش گنوا رہا ہو، اُس کی رفتار اب کم ہونے لگی تھی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح تیز ہوگئی تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ بڑبڑانے اور رونے بھی لگا تھا۔ میرے جگر میں جیسے کچھ چبھ سا گیا۔ مجھ میں یہی کم زوری تھی۔ لیکن اس پر قابو پا کر میں نے کھیل جاری رکھا۔ مجھے مزا بھی آنے لگا تھا۔ کچھ دور پہنچ کر وہ زور سے لڑکھڑایا اور تارکول کی تازہ بنی ہوئی سڑک پر چاروں شانے چت ہوگیا۔ میں نے اپنی رفتار کم کر دی اور دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھنے لگا۔ مجھ میں گڑی اُس کی آنکھیں خوف کے مارے پھیل کر ساکت ہوگئیں۔ بریف کیس اب بھی اُس کے دونوں ہاتھوں میں تھا اور وہ اب بھی اس سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ جب ہمارے درمیان چار پانچ قدموں کا فاصلہ رہ گیا تو خوف کے ساتھ رحم کی التجا والے عکس بھی اس کی آنکھوں میں اُمڈ آئے تھے۔ اُس کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتا تھا یا شاید اُس نے جو کہا وہ میں نے سنا نہیں۔ اس کا پورا بدن کانپنے لگا تھا اور پسینہ دھارے بنا کر تارکول میں جذب ہونے کی ناکام کوشش کرنے لگا تھا۔

میں نے یہ فاصلہ بھی ختم کیا اور سیدھا جا کر اُس کے سر پر کھڑا ہوا۔ میرے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ تھی، جو یقیناً سفاک اور بے رحم ہوگی، اچانک اُس کا جسم پلٹا اور وہ اُلٹا ہو کر زمین سے

چٹ گیا۔ بریف کیس اُس کے نیچے تھا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ اُس کا جسم غیر متحرک تھا۔ اُس کی نبض دیکھی تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کا جسم شانت ہوگیا تھا لیکن چہرے پر خوف و ہراس کی میری بخشی ہوئی ریکھائیں مستقل ہوگئی تھیں۔ آنکھیں دو سوالیہ نشان بن گئیں تھیں، جس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

میں نے اُس کے نیچے دبے ہوئے بریف کیس کو کھینچ کر باہر نکالا اور تیزی سے سڑک کی دوسری جانب بڑھنے لگا۔ میرا دل اُن سینکڑوں دہشت گردوں کے لیے تعظیم سے بھرا ہوا تھا، جنھوں نے شہر کے لوگوں کو مستقل خوف کی سوغات دی ہے۔ یہ سوغات میرے لیے ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے میں ہر رات خالی ہاتھوں سے کوئی نہ کوئی شکار کرتا ہوں اور پولیس اور دوسرے بھائی بندوں کو حصہ دیے بغیر اپنی روزی روٹی کماتا ہوں۔ دعا گو ہوں کہ خوف اور دہشت کی یہ لہر لمبی عمر پائے۔

بشکریہ: دی لٹل میگزین، نئی دہلی

ڈاکٹر مصطفی کریم کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ وہ ایک عرصے سے برطانیہ میں مقیم ہیں اور اب خرابی صحت کی بناء پر سرجری کی پریکٹس چھوڑ چکے ہیں۔ ان کا ایک ناول اور افسانوں کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ مضامین کا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ افسانہ فلسطینی کرداروں سے ڈھالا ہے۔ مگر اس کو دہشت گردوں کے بارے میں خالد سہیل کے مضمون کے ساتھ ملاکر پڑھیے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ کہانی، کسی بھی جگہ کی ہوسکتی ہے۔ لیکن کسی اور وقت کی نہیں۔

مصطفیٰ کریم

تاریخ کا سبق

کاؤنٹر کے پیچھے ٹکٹ فروخت کرنے والی جوان لڑکی کو کبیر نے آج پہلی بار دیکھا۔ گزشتہ پانچ دنوں سے وہ مسلسل تھیٹر آتا رہا تھا۔ لیکن یہ لڑکی کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ نہ ہال کے دروازوں پر نہ بکنگ آفس میں۔ اسے دیکھ کر وہ ہکا بکا تھا۔

''عائشہ، عائشہ'' بے اختیار کبیر کے منھ سے سرگوشیوں میں نکلا۔

اس لڑکی اور کبیر کی بہن عائشہ میں بلا کی مشابہت تھی۔ ویسے ہی سنہرے گھنگھریالے بال، متجسس آنکھیں اور شگفتہ لب۔ جیسے ہنسنا چاہتے ہوں۔ لیکن عائشہ کہاں سے آتی۔ وہ تو اسرائیلی حراست میں خودکشی کر چکی تھی۔

ہفتہ پہلے اس کی موت کی خبر نے کبیر پر پڑی تہذیب، تحمل اور عقلی جواز کی رداؤں کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ اس کے اندر وہ قدیم انسان جاگ پڑا تھا جو ان چادروں کو اوڑھے سو رہا تھا۔ کبیر دیوانہ سا ہوگیا۔ نہ کپڑے بدلنے کا خیال اور نہ داڑھی بنانے کا ہوش۔ یونی ورسٹی کی تعلیم کو اس نے الوداع کہا اور شب و روز سڑکوں پر ایک شہر سے دوسرے شہر میں چکر لگانے لگا۔ لندن، برمنگھم، مانچسٹر، لیڈز۔ اپنی خاموش دیوانگی کو سینے سے لگائے وہ کہاں نہیں گیا۔ ایک دن وہ قدیم انسان جو اب اس کا رفیق تھا اس نے بدلہ لینے کے لیے کہا۔ دشمن کہاں نہیں ہیں۔ انہیں پہچاننے کے لیے نگاہ

چاہیے۔ قدیم انسان نے کبیر کو بتایا اس مختصر سے؟ وہ گذشتہ پانچ دنوں سے تھیٹر آ تا رہا تھا۔ اسے اسرائیل کے رہنے والے کزیا سائمن کی جان لینی تھی جو تھیٹر میں ریذیڈنٹ ڈائریکٹر بن کر حال میں آیا تھا۔

عائشہ ڈراما نگار تھی۔ آزاد فلسطین میں وہ ڈرامے اسٹیج کرنا چاہتی تھی۔ جو فلسطین ملا وہ بھی ٹوٹا پھوٹا اور محکوم۔ جس کے سینے پر نو آباد یہودیوں کے محلوں کا سرطان تھا۔ فلسطین کی آزادی کا منظر نامہ نامکمل رہا۔ اس کی تکمیل کے لیے عائشہ نے جان کی بازی لگادی اور اپنی جان ہار دی۔

ٹکٹ خریدنے والوں کی قطار میں کبیر آہستہ آہستہ بڑھتا رہا۔ عائشہ کی یادوں کے تیر اس کے دل پر برس رہے تھے۔ اپنی اذیت وہ کس سے کہتا۔ بہ مشکل اس نے اپنے آنسو ضبط کیے۔ جب وہ کاؤنٹر کے قریب پہنچا تو اس کے پیچھے بیٹھی لڑکی حیرت زدہ ہوگئی۔

سانولی رنگت، سوٹ ٹائی اور اس پر اوور کوٹ، ہاتھ میں چھتری۔ اتنی تیاری کر کے تو لڑکی کے ہم وطن بھی اب کم آتے تھے۔ لیکن اسے کیا معلوم کہ آج کبیر کا معرکہ تھا۔ سپاہی میدانِ جنگ میں اپنی وردی سجا کر نکلتے ہیں۔ جب کبیر اپنی جیب سے بٹوہ نکالنے لگا تو اس کی انگلیاں لرزنے لگیں۔ دس پاؤنڈ کا نوٹ نکال کر اس نے لڑکی کی جانب بڑھایا۔

''کون سی قطار میں؟ سامنے چھ قطاریں بھر چکی ہیں۔'' لڑکی پاس رکھے کمپیوٹر کے نیلے پردے کو تکتی ہوئی بولی۔ پردے پر وسط میں اسٹیج اور اس کے گرد نشستوں کی تعداد کا نقشہ تھا۔

''سب سے پچھلی قطار میں،'' کبیر اپنے اضطراب پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ اسے پتا تھا کہ کزیا وہیں آکر بیٹھتا ہے۔

لڑکی نے سامنے میز پر رکھی ٹکٹ کی گڈی سے ٹکٹ پھاڑا اور اسے ریزگاری کے ساتھ واپس کردیا۔ وہ تھینکس کہتا ہوا کاؤنٹر سے ہٹا لیکن کوئی مقناطیسی طاقت اسے ادھر کھینچتی رہی تھی۔ وہ تھیٹر کی جگ مگ کرتی دکان میں خود کو کھینچ کر لے گیا۔ وہاں انگلستان کے مشہور ڈراما نگاروں کی کتابوں کے علاوہ پوسٹر، شیشے کے شمع دان، جام و مینا اور دیگر زیبائش کی اشیا فروخت ہورہی تھیں۔ جلد ہی پریشان سا وہاں سے نکل کر فوئر میں آ گیا۔ ایک چرمی صوفے پر تین بزرگ خواتین بیٹھی نیچی آواز میں گفتگو کررہی تھیں۔ ان کے پیچھے دیوار پر آج کے میوزیکل ڈرامے کے مناظر کی تصویریں ٹنگی تھیں۔ کبیر بہ ظاہر انہیں دیکھنے میں محو تھا۔ لیکن وہ اس طرح کھڑا تھا کہ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی لڑکی کو بہ خوبی دیکھ سکتا تھا۔ گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ شو کے شروع ہونے میں دس منٹ باقی رہ گئے تھے۔

کبیر ہال کے اندر چلا گیا۔ سیاہ چھت سے تیز روشنیاں دائرے کی شکل میں اسٹیج پر گر رہی تھیں جس کے چاروں طرف لمبی سیڑھیوں پر گدے دار کرسیاں تھیں۔ دیوار اور فرش کے درمیان لگے برقی قمقموں سے نکلتی دھیمی روشنی میں تماش بین اپنی نشست کو تلاش کر رہے تھے یا ان پر بیٹھ رہے تھے۔ کبیر کے ٹکٹ پر جو نمبر تھا اس نمبر کی کرسی اس نے ڈھونڈی، اس کی پشت پر اس نے اوور کوٹ ڈالا پھر کرسی پر بیٹھ کر وہ اس نشست کو دیکھنے لگا جس پر کزیا بیٹھتا تھا۔ وہ کرسی ابھی خالی تھی۔ ان دنوں ہر روز نئے ڈرامے ہو رہے تھے اس لیے کزیا کا موجود ہونا ضروری تھا۔ یہ سوچ کر کبیر کو اطمینان ہو گیا۔

کبیر کے اردگرد تماش بین آ کر بیٹھ گئے۔ اسے سامنے بیٹھی عورت کے ملبوس سے دھیمی خوشبو آتی محسوس ہوئی۔ آخری گھنٹی بجی۔ سوائے اسٹیج کے ہر سُو اندھیرا چھا گیا۔ ڈراما شروع ہوا۔ کرداروں نے اسٹیج پر آ کر گانا شروع کر دیا۔ کبیر کو اس میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی۔ نہ ان کی ایکٹنگ اور نہ ان کے گانے میں۔ اس کی دزدیدہ نگاہیں اب بھی خالی کرسی پر جا رہی تھیں۔ گزشتہ پانچ دنوں سے تھیٹر میں ڈرامے دیکھنے کے بہانے وہ کزیا سائمن کی حرکات و سکنات کو بغور دیکھتا رہا تھا۔ جب وہ اپنے نئے عہدے پر آیا تو اس کی تصویر مقامی اخبار میں چھپی تھی۔ اس کی مدد سے کبیر نے کزیا کو پہچانا تھا۔ کبیر کو معلوم تھا کہ شو کے دوران کزیا ڈرامے کو دیکھتا ہے۔ پھر بعد میں ہال اور ریستوران کے درمیانی کمرے میں ڈرامے کے شیدائیوں سے تبادلہ خیال کرتا ہے۔ وہ جن راستوں سے ٹہلتا ہوا اپنے فلیٹ جاتا تھا ان کا علم بھی کبیر کو تھا۔

کچھ دیر بعد کزیا دبے پاؤں آ کر بیٹھ گیا۔ سر کے بال بکھرے ہوئے۔ چہرہ موٹر کے ٹائر کی طرح گول۔ جسم پر سیاہ پل اوور۔ اس کی عمر چالیس پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ کزیا کی نگاہیں کرداروں کی حرکات کے ساتھ گردش کر رہی تھیں۔ کبھی اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ جاتی اور کبھی اس کا سر نغمگی میں ہلتا۔ ذرا آگے جھک کر اور سر کو کچھ خم دے کر کبیر کبھی کبھی اسے دیکھ لیتا۔ گر فلسطین آزاد ہوتا تو شاید کزیا کی جگہ عائشہ ہوتی۔ اس کی نرم آنکھیں بھی اسی طرح گردش کرتیں۔ اور لہراتے بالوں سے بھرا سر اسی طرح ہلتا۔

کبیر کو اپنا جسم اکڑتا محسوس ہوا۔ ہاتھوں میں سختی آ گئی اور چھتری پر گرفت مضبوط ہو گئی۔ وقت گزرتا گیا۔ ہال میں موسیقی اور گانے کی لے ابھرتی اور ڈوبتی رہی۔ تماش بینوں کے قہقہے، مزاح کے موقعوں پر بلند ہوتے رہے۔ لیکن کبیر خاموش رہا۔ چہرہ پتھر اور آنکھیں نیزے کی طرح تھیں۔

انٹرویل ہونے سے کچھ پہلے کزیا اٹھ کر چلا گیا۔ کہیں وہ اپنے گھر نہیں چلا جائے؟ یہ سوال کبیر کے ذہن میں رائفل کی گولی کی طرح داغا۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ شو کے بعد کزیا شوقین تماش بینوں سے ضرور ملتا تھا۔

انٹرویل کے ساتھ ہال میں بجلی کی روشنی پھیل گئی۔ کبیر اپنی نشست کو پیچھے سرکا کر کھڑا ہو گیا۔ تماش بین مرد و عورت Excuse Me کہتے ہوئے اس کے پاس سے گزر گئے۔ چند نے اسے ظاہری پُر اخلاق مسکراہٹ سے دیکھا۔ ان کے ملبوس کی سرسراہٹ، ان کے قدموں کی دبی دبی چاپ اور نیچی آواز میں گفتگو کبیر کے کانوں سے ٹکرائی اور ان کے ساتھ چلی گئی۔ سامنے دروازوں کے پاس نوجوان لڑکے اور لڑکیاں آئس کریم اور آج کے شو کے بروشرز بیچ رہے تھے۔ کبیر بھی باہر آ گیا۔ اس کی نگاہیں کاؤنٹر کی جانب گئیں۔ لیکن ٹکٹ فروخت کرنے والی نوجوان لڑکی وہاں نہیں تھی۔ کبیر جس کے چہرے پر عائشہ کو دیکھنا چاہتا تھا وہ جا چکی تھی۔ کمپیوٹر بجھا ہوا تھا۔ کاؤنٹر پر آنے والے ڈراموں کے اشتہارات بے کار کاغذوں کی طرح پڑے تھے۔ کبیر آگے پیچھے مضطرب پھرتا رہا۔

گھنٹی کے بجنے کے ساتھ شو کے دوبارہ آغاز ہونے کی اطلاع لوگوں کو ملی۔ بار میں جو لوگ مختلف مشروبات پی رہے تھے انہوں نے جلدی جلدی اپنے گلاس خالی کیے، انہیں بار کے کاؤنٹر پر رکھا اور ہال کے اندر چلے گئے۔ کبیر اپنی نشست پر آ کر بیٹھ گیا۔ لیکن کزیا نہیں آیا۔ کبیر کا باقی وقت بے چینی سے پہلو بدلتے گزرا۔ آج نہیں تو کل، نہیں تو پرسوں، وار تو مجھے اس پر کرنا ہے۔ وہ سوچتا رہا۔

شو ختم ہوا۔ کبیر باہر نکل آیا۔ ریستوران میں لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ بار میں بوتلیں چمک رہی تھیں، گلاسوں میں وہسکی، جن اور سوڈا ڈالے جا رہے تھے۔ چند پینے والے وہاں کھڑے خوش گپی کر رہے تھے۔ ریستوران اور ہال کے درمیان کمرے میں کزیا کھڑا تھا۔ پست قد اور ذرا جھکا ہوا۔ وہ تماش بین جو ڈرامے کے فنی رموز پر تبادلۂ خیال کرنا چاہتے تھے وہ اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ ہاتھوں میں مشروبات کے گلاس، چہروں پر بے باکی اور تجسس۔ سب ہی مسرور تھے۔ کزیا کو دیکھ کر کبیر کو اطمینان ہوا۔ وہ سبھوں کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

''کامیاب ڈراما وہی ہے جس میں حزن، خوشی اور لطیف طنز کی آمیزش اور توازن ہو،'' کزیا کسی کی بات کا جواب دے رہا تھا۔ بولتے وقت اس کے منھ سے سیٹیوں کی خفیف آواز نکل رہی تھی۔

''میں ابسن کو بہت پسند کرتی ہوں۔ عورتوں کو اتنی آزادی مل جانے کے بعد آج بھی اس کا لکھا ہوا ڈرامہ ''گڑیا کا گھر'' (Doll's House) بہت موزوں ہے۔'' ایک ادھیڑ عمر عورت اپنی پیشانی پر سے سرخی مائل بالوں کی لٹ کو ہٹاتے ہوئے بولی۔ ''اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔''

شراب کی چسکی لے کر گزیا نے جواب دیا۔ ''بڑے فن کی یہی نشانی ہے کہ ہر دور میں وہ آج کی زندگی کا آئینہ محسوس ہوتا ہے۔ ابسن کا ڈراما ''بدروح'' (Ghost) جس کا مرکزی کردار اس آتشک میں مبتلا ہے جو اسے اپنے باپ سے ملا ہے۔ وہ ڈراما آج کے ایڈس کی وبا کا بھی فنی آئینہ ہے،'' ایک نوجوان جوش سے بولا۔ اس کی نیلی قمیص کا کالر کھلا تھا اور گردن سے مفلر لٹک رہا تھا۔

سبھوں نے تائیداً سر ہلا دیا۔

''گزیا۔ آج جس ڈرامے کو پیش کیا گیا اسے وڈہاؤس نے لکھا تھا۔ وڈہاؤس کی ہمدردیاں نازیوں کے ساتھ تھیں۔ آپ کا اس کے ڈرامے میں دلچسپی لینا عجیب بات ہے۔ چوں کہ نازیوں نے یہودیوں پر......''

''بدترین مظالم کیے۔'' گزیا نے بولنے والے کی بات کاٹی اور اپنی گفتگو جاری رکھی۔ ''وڈہاؤس کی ہمدردیاں اس کا ذاتی مسئلہ تھا۔ آندرے ژید اور نٹ ہیمسن کی ہمدردیاں واضح طور سے فسطائیوں کے ساتھ تھیں۔ کیا ہم انہیں یورپ کی ادبی تاریخ سے خارج کر سکتے ہیں؟''

''نہیں کرتے ہیں۔ اس لیے نازیوں جیسا ظلم اب بھی روا ہے۔ ہیگل نے سچ کہا ہے کہ انسان تاریخ سے صرف ایک سبق سیکھتا ہے کہ وہ کچھ نہیں سیکھتا،'' کبیر نفرت اور غصے سے بولا۔ قبل اس کے کہ پاس کھڑے ہوئے لوگ اس کا جائزہ لیتے وہ سیڑھیوں پر تیز اترتا ہوا تھیٹر کے باہر آ گیا۔ وہ دیر تک ہنوور اسٹریٹ پر ٹہلتا رہا۔ یہ ویران سڑک تھیٹر کے پیچھے تھی۔ گزیا کام ختم کرنے کے بعد اسی سڑک پر گزرتا تھا۔ کبیر کی نگاہیں بار بار کھڑکی پر گئیں۔ کئی بار وہ رکا اور چھتری کو ہوا میں بلند کر کے اس نے اس کے دستے پر بٹن کو دبایا۔ دستے کی نوک سے سوئی نکل آئی۔ وہ بٹن کو ذرا اور دباتا تو سوئی سے پوٹاشیم سائنائیڈ کی دھار نکل آتی۔ اسی سوئی کو گزیا کے جسم میں اسے چبھونا تھا۔ گزیا کے منہ سے نہ آہ نکلتی نہ فریاد۔ منٹوں میں پوٹاشیم سائنائیڈ اس کا خاتمہ کر دیتی۔ کبیر میکانیکل انجینئرنگ کا طالب علم تھا، اس انوکھے ہتھیار کو بنانے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔

نومبر کی سرد رات تھی اور ہوا بھی خنک۔ آسمان پر بادلوں کا سایہ تھا۔ ساڑھے گیارہ بج چکے

تھے۔ کبیر کی نگاہیں فش اینڈ چپس کی دکان پر گئیں۔ وہ بند تھی۔ اس کے سامنے بند ریستوران پر برائے فروخت کا اشتہار لگا تھا۔ سوئی ہوئی سڑک پر چند موٹریں کھڑی سو رہی تھیں۔ ہنوور اسٹریٹ پر بیمار روشنی میں ایک بلی کسی جانب سے نکلی اور دوڑ کر سامنے مکان کے احاطے میں کود گئی۔ کبیر نے بے قراری سے اس سمت دیکھا جدھر سے کزیبا کو آنا تھا۔ وہ سمت سونی تھی۔ ''اب انتظار بے سود ہے،'' کبیر نے خود سے کہا اور اپنے فلیٹ جانے کے لیے مڑا جہاں پر ہنوور اسٹریٹ دوسری سڑک سے ملتی تھی۔ وہاں اچانک کزیبا نظر آیا۔ پست قد اور جھک کر چلنے کی وجہ سے اسے پہچاننا مشکل نہیں تھا۔ کبیر اس کی جانب لپکا۔ کزیبا سے جڑی ایک لڑکی بھی چل رہی تھی۔ جس کا ہاتھ کزیبا کے کمر کی گرد تھا۔ کبھی وہ اپنا سر کزیبا کے شانے سے رگڑتی اور کبھی اس کی بانہہ سے۔ لڑکی کی والہانہ ہنسی گونجی پھر وہ شوخی سے کزیبا کی پشت پر مکیاں مارنے لگی۔

کبیر نے اپنے قدموں کو تیز کر دیا۔ اس نے چھتری کی نوک کو ہوا میں ذرا سا بلند کر لیا۔ سڑک پر دو تین راہ گیر اور بھی تھے۔ لیکن رات کے وقت چھتری کی سوئی کسی کو نظر آنا مشکل تھی۔ کبیر ان سب سے بے پرواہ اپنے شکار کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اسے کزیبا کے اندر یک کے دامن کے نیچے اس کی ران میں زہر بھری سوئی کو چبھونا تھا۔

جوں ہی وہ کزیبا کے قریب پہنچا اس کے جوتوں کی کھٹ کھٹ سے لڑکی نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ اس کا حسین چہرہ مسرور تھا۔ کبیر کے قدموں کو کسی نے جکڑ لیا۔ چھتری اس کے ہاتھوں میں ڈھیلی پڑ گئی۔ لڑکی وہی تھی جسے کبیر نے کاؤنٹر کے پیچھے دیکھا تھا اور جو عائشہ کی ہو بہو تصویر تھی۔ کبیر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اس کی جھکی ہوئی نگاہیں قریب کے پرانے کیمروں کی دکان میں اس کی بزدلی کی وجہ تلاش کرنے لگیں۔ جب کبیر نے دوبارہ مڑ کر بے بسی سے اپنے شکار کی جانب دیکھا تو اسے کزیبا اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ ایک موڑ پر غائب ہوتا نظر آیا۔

جب دنیا کے تیور بدلے بدلے نظر آنے لگیں تو ہم اس کے سوا اور کیا کرسکتے ہیں کہ اپنے ادیبوں، افسانہ نگاروں سے دریافت کریں۔ جب "دنیا زاد" کی اس خصوصی اشاعت کا ڈول ڈالا گیا تو عہد ساز افسانہ نگار انتظار حسین سے بھی اس حوالے سے کسی تحریر کی درخواست کی۔ انتظار صاحب نے جواب میں اپنے اس اخباری کالم کا حوالہ دیا جس میں انہوں نے اخبار نویسوں کی اس عادت پر گلہ کیا تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر ٹیلی فون کرکے اس بارے میں تاثرات یا رائے پوچھتے ہیں۔ اشارہ کافی تھا، ہم ہنس دیے، ہم چپ رہے۔ تھوڑے دن کے بعد پھر ہنکارا بھرا کہ دنیا کے بعض بڑے بڑے ادیب ان حالات و واقعات کی تفہیم کررہے ہیں کہ یہ کام سیاست دانوں پر چھوڑا نہیں جاسکتا۔ انتظار صاحب نے ہماری بات سن لی مگر کہا کہ وہ اس طرح کی چیزیں نہیں لکھتے۔ پھر اچانک انہوں نے یہ مضمون لکھ کر ہمیں حیران کردیا۔ اس مضمون میں بھی انتظار صاحب کا اندازِ نظر ان کے مخصوص طرزِ بیان میں کار فرما ہے۔ یہ تحریر ان کے زیر طبع مجموعے میں شامل ہے جس کا عنوان اس پر قائم کیا گیا ہے۔

انتظار حسین

شہرزاد کے نام

میری کہانی ان دنوں مشکل میں ہے۔ جب لکھنے بیٹھتا ہوں تو ادبدا کر کوئی واردات گزر جاتی ہے۔ خبر ملتی ہے کہ فلاں مسجد پر دہشت گردوں نے ہلّہ بول دیا۔ مُنھ پر ڈھاٹے باندھے کلاشنکوفوں سے مسلح داخل ہوئے اور نمازیوں کو بھون ڈالا۔ یا یہ کہ امام بارگاہ پر حملہ ہوگیا۔ دم کے دم میں عزاخانہ مقتل بن گیا۔ یا یہ کہ فلاں لاری کے اڈے پر بم پھٹ گیا اور آتے جاتے مسافروں کے پرخچے اڑ گئے۔ بس ذہن پراگندہ ہوجاتا ہے۔ کہانی ہرن ہوجاتی ہے اور قلم رک جاتا ہے۔

مگر پھر میں سوچتا ہوں کہ میں کیا بیچتا ہوں اور میری کہانی کس گنتی میں ہے۔ اس عذاب میں تو ساری خلقت مبتلا ہے۔ تشدّد کا بول بالا ہے۔ دہشت گردوں کی بن آئی ہے ہم آپ چہ پدی چہ پدی کا شوربہ۔ انہوں نے تو سپر پاور امریکا میں جاکر ایسا اودھم مچایا اور وہ تباہی پھیلائی کہ پورا امریکا تراہ تراہ پکار اٹھا اور دنیا میں کھلبلی مچ گئی۔

کودا ترے گھر میں کوئی یوں دھم سے نہ ہوگا
وہ کام کیا ہم نے کہ رستم سے نہ ہوگا

جواب میں امریکا نے افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ وہ سیر تو یہ سوا سیر۔

یہ نقشے دیکھ کر وہ قدیم زمانے یاد آتے ہیں جب وحشی قبائل اچانک ان شہروں پر جو تہذیب کے گہوارے سمجھے جاتے تھے آن پڑتے تھے اور تہذیب و تمدن کے ان آشیانوں کو اجاڑ دیتے تھے۔ وہ قدیم زمانے کے وحشی تھے۔ اب ہم نئی بربریت کے زمانے میں سانس لے رہے ہیں۔ خیر سے اسے ٹیکنالوجی کی کمک حاصل ہے۔ اس زور پر اس نے کیا زور باندھا ہے کہ قدیم وحشی نئے وحشیوں کے سامنے بچے نظر آتے ہیں۔ ایٹم بم تو دور کی بات ہے۔ ان کی دسترس میں تو کلاشنکوف بھی نہیں تھی۔

نئے وحشیوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے ساتھ ایک اور کمک بھی حاصل ہے۔ نظریے کی کمک۔ قدیم وحشی محض اور صرف وحشی تھے۔ وحشت پر ملمع چڑھانا انہیں نہیں آتا تھا۔ ہمارے نئے زمانے کے وحشیوں نے اپنی وحشت کو ایک نظریاتی شان عطا کرنے میں کمال حاصل کیا ہے۔ دہشت گردی سے لے کر جنگ تک، تشدد کی ہر شکل کے لیے کوئی نہ کوئی اخلاقی جواز پیدا کر لیا جاتا ہے۔ قوم پرستی، نسل پرستی، مذہب ایسے تصورات سے تشدد کے مظاہرے وابستہ کر دیے جائیں تو ان کو ایک اخلاقی جواز حاصل ہو جاتا ہے۔ اب اگر ایک دہشت گرد یہ کہہ کر نمازیوں پر گولیاں برساتا ہے کہ یہ مسلمان نہیں، اصل میں کافر ہیں تو پھر یہ دہشت گردی دہشت گردی نہیں رہتی، کارِ ثواب بن جاتی ہے۔

تو ہمارا زمانہ خالی دہشت گردی کا زمانہ نہیں ہے۔ نظریے سے مسلح دہشت گردی کا زمانہ ہے۔ ابھی پچھلی صدی میں ایسا زمانہ گزرا ہے جب انقلاب کے نام پر ہر قسم کے تشدد کو روا سمجھا جاتا تھا۔ اب مسلمانوں میں ایسے گروہ سر اٹھا رہے ہیں جو اسلام کا نام لے کر دہشت گردی کرتے ہیں۔ وہ انقلابی تشدد تھا۔ اس تشدد کو کیا نام دیا جائے۔

ایسے میں لکھنے والا کیا کرے۔ نہیں، میں کیا کروں، میری کہانی کیا کرے۔ واحد متکلم کا صیغہ میں نے یہ سوچ کر استعمال کیا کہ ادب میں مشترکہ فیصلے نہیں ہوتے۔ ہر لکھنے والا اپنے فن، اپنے تخلیقی تجربے کے سلسلے میں اکیلا جواب دہ ہوتا ہے۔ موت اور تخلیقی تجربہ، ان دو کے روبرو آدمی اکیلا ہوتا ہے۔ موت سے تو خیر ہر فرد و بشر کا پالا پڑتا ہے۔ تخلیقی تجربے کی تنہائی اہلِ فن کی تقدیر میں لکھی گئی ہے۔ تو جیسے ہر فرد موت کے روبرو اکیلا ہوتا ہے، بس ویسے ہی ہر لکھنے والا اپنے تخلیقی تجربے کے روبرو اکیلا ہوتا ہے۔ ایک ادیب کی حیثیت سے اسے بہت سے فیصلے اکیلے کرنے پڑتے ہیں۔ مگر بیسویں صدی میں جو نظریاتی تحریکیں چلیں انہوں نے ادب کو لپیٹ میں لے لیا۔ اور کوئی تحریک انفرادی فیصلہ کی اجازت نہیں دے سکتی۔ ان تحریکوں کے اثر میں آنے والے ادیبوں کو یہ اجازت کیسے ملتی۔ اور کیوں ملتی۔

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے

شعر و افسانے کا معاملہ بھی آہ کا سا ہے اور وہ معشوق ہو یا جابر حاکم ہو، آہ بالعموم بے اثر رہتی ہے۔ پھر ایک بات بھرتری ہری نے کہی اور اقبال نے اسے دہرایا ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

مورکھوں پر کومل بول اثر نہیں کرتے۔

ایسی صورت میں نظریہ ساز اور ان کی تحریکیں ادب پر اعتبار کیسے کرتیں اور ادیبوں کو کھلا کیسے چھوڑ دیتیں۔ تو ادیبوں کے لیے مشترکہ لائحہ عمل مرتب کیے گئے اور لکھنے کے نئے نئے نسخے۔ ایسے لکھو اور ایسے مت لکھو۔ سعادت مند ادیبوں نے ان کا کہنا مانا۔ عہد کے مسائل پر بتائے ہوئے نسخہ کے مطابق مل جل کر لکھا۔ مگر اس ادیب کا بھی اثر کتنا ہوا۔ پھر کیا ہو ؎

نوا را تلخ تری زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

نو کو تلخ تر کیا، تند تر، تیز تر، اتنا کہ وہ نغمہ کی حد سے نکل کر نعرہ بن گئی۔ تحریکوں کو اور کیا چاہیے تھا۔ جلسے، جلوس، اخباری بیانات ؎

یہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

جنگ کے خلاف، ایٹمی دھماکوں کے خلاف، دہشت گردی کے خلاف مہمات چلائی گئیں ادیبوں دانش وروں نے امن مارچ کیے، نعرے لگائے، تقریریں کیں، اخباری بیانات جاری کیے۔ اچھا ہوا۔ ظلم کے خلاف آواز تو اٹھنی ہی چاہیے۔ آہ کا اثر نہیں ہوتا تو پھر چیخو، نعرہ لگاؤ۔ مگر میری کہانی پھر بھی مشکل میں ہے۔

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا

میں تو کہانی ہی لکھ سکتا ہوں۔ بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے۔ نعرہ نہیں لگا سکتا اور کہانی نہ دہشت گردی اور ایٹمی دھماکوں کے ماحول میں لکھی جا سکتی ہے نہ ان کے خلاف نعروں کے ماحول میں۔ یعنی دوسری صورت میں بھی کہانی تو نہیں لکھی جائے گی، نعرہ ہی لکھا جائے گا۔ مگر نعرہ تو لگانے کی چیز ہے، لکھنے کی نہیں۔ لکھا جائے گا تو خود بھی خراب ہوگا، شعر و افسانے کو بھی خراب کرے گا۔ افسانے کو زیادہ۔ شاعری تو ایسی بھی ہوتی ہے جو نعرے ہی کے زور پر چمکتی گرجتی ہے۔ مگر کہانی ایسی چھوئی موئی ہے کہ نعرے کا پرچھاواں بھی پڑ جائے تو مرجھا جاتی ہے۔

پھر کہانی کیا کرے۔ ایک طرف جنگ ہے، دہشت گردی ہے، بنیاد پرستی ہے، کلاشنکوف

ہے، ایٹمی دھماکے ہیں، نظریات ہیں جن کی چھتری میں یہ سرگرمیاں اخلاقی جواز حاصل کرتی ہیں۔ دوسری طرف اس کے خلاف نعرے ہیں، خطبے ہیں، تقریریں ہیں۔ چکی کا ایک پاٹ وہ، دوسرا پاٹ یہ۔ چلتی چکی دیکھ کے کبیرا رویا اور میرا قلم رک گیا۔ دمشق میں اس سے بھی بڑھ کر ہوا تھا۔ وہاں تو عشق کا باب ہی بند ہوگیا تھا۔ ایسی قیامت کا قحط پڑا کہ یار عشق و عاشقی ہی بھول گئے۔ مگر جہان آباد میں کیا ہوا۔ کبیر رویا تھا۔ سودا نے زہر خند کیا۔

فاقوں سے ہنہنانے کی طاقت نہیں رہی
گھوڑی کو دیکھتا ہے تو پادے ہے بار بار

مغل شہسواروں کے برق رفتار گھوڑوں کا اب یہ حال ہوگیا تھا۔ بس ان گھوڑوں سے ان کے حال کا قیاس کرلو۔ دلّی شہر ایک آشوب سے دوچار تھا۔ سودا نے اس آشوب کو بیان کیا اور خلاصہ یوں کیا۔

آرام سے کٹنے کا سنا تو نے کچھ احوال
جمعیت خاطر کوئی صورت ہو کہاں ہے
دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام
عقبیٰ میں یہ کہتے ہیں کوئی اس کا نشاں ہے
سو اس پر تیقن کسی کے دل کو نہیں ہے
یہ بات بھی گوئندہ ہی کا محض گماں ہے
یاں فکر معیشت ہے تو واں دغدغۂ حشر
آسودگی حرفیست نہ یاں ہے نہ وہاں ہے

اس سے میں نے اپنے زمانے پر قیاس کیا۔ جمعیت خاطر کوئی صورت ہو کہاں ہے۔ کہیں نہیں۔ صحیح کہا کہ آسودگی کا تو بس نام رہ گیا ہے۔ آسودگی حرفیست نہ یاں ہے نہ وہاں ہے۔ یہ تو وہی سودا والا زمانہ واپس آ گیا۔ اس سے بھی برا۔ نئے بٹ مار، نئے قزاق، لوٹیں ہیں دن رات بجا کر نقارہ، نفرت کا بول بالا۔ حرفِ محبت عنقا۔ کلامِ نرم و نازک بے اثر۔ کیسی شاعری، کہاں کی کہانی۔ دل میں خس کی برابر جگہ نہ پائے۔ کبیر رویا۔ سودا نے زہر خند کیا۔ اِدھر قلم رک گیا۔ اب میں دبدا میں ہوں۔ اسی قسم کی دبدا جو داستانوں کہانیوں میں وقتاً فوقتاً مہم جو شہزادے کو آلیتی ہے کہ پیچھے کھائی، آگے سمندر۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ پھر کیا کیا جائے۔ بس اچانک خواجہ خضر نمودار ہوتے ہیں کہ میری انگلی پکڑ اور چل۔ یا کوئی غیبی آواز آتی ہے کہ لوح کو پڑھ اور جو اس میں

لکھا ہے اس پر عمل کر۔ لوح۔ میرے پاس کون سی لوح ہے۔ ہاں ہاں ہے۔ الف لیلیٰ۔ میرے پاس یہی لوح ہے۔ لوح کہو، فکشن کا اسم اعظم کہو اور یہ اب کون سی آواز آئی۔ جیسے سنی ہوئی ہو۔ ارے یہ تو الف لیلیٰ کے ورقوں کے بیچ سے آ رہی ہے۔ بالکل شہرزاد کی آواز ہے۔ کیا کہتی ہے۔ کچھ بھی نہیں کہتی۔ نہ کوئی ہدایت نہ کوئی پیغام۔ نہ کوئی فلسفہ نہ کوئی نظریہ۔ بس کہانیاں سنائے چلی جا رہی ہے۔ ایک کہانی، دوسری کہانی، تیسری کہانی۔ سلسلہ ٹوٹنے ہی میں نہیں آ رہا۔ اے وزیر زادی، اے کہانیوں کی ملکہ۔ ایسے وقت میں تمہیں کہانیوں کی سوجھی ہے۔ جان کی خیر مانگو۔ یہ سب رات رات کا کھیل ہے۔ صبح ہوئے پر تمہاری گردن ہوگی اور جلاد کی تلوار۔ یہ سر بھی اسی طرح قلم ہو جائے گا جیسے پچھلی ظلم کی صبحوں میں کتنی حسینوں مہ جبینوں کا تم سے پہلے ہو چکا ہے۔ شہریار بادشاہ نے عجب وطیرہ پکڑا تھا کہ روز شام کو ایک کنواری کو محل میں لاتا، رات اس کے ساتھ بسر کرتا، صبح ہوئے پر اس کا سر قلم کرا دیتا۔ شہرزاد کے سر میں کون سا پھوڑا نکلا تھا کہ خود اپنی مرضی سے باپ سے ضد کر کے ڈولی میں بیٹھی اس نحوست بھرے محل میں آن اتری۔ آ کر اس نے کیا کیا۔ کچھ بھی نہیں کیا۔ بس کہانی سنانی شروع کر دی۔ شب عروسی ہے اور دلہن چھپر کھٹ پر بیٹھی کہانی سنا رہی ہے۔ رات کہانی میں بیت گئی۔ جب صبح کا تارا جھلملایا اور مرغے نے بانگ دی تو شہرزاد بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ بادشاہ نے بے چین ہو کر پوچھا، پھر کیا ہوا۔ بولی، اب تو صبح ہو گئی۔ کہانی دن میں تھوڑا ہی کہی جاتی ہے۔ کوئی غریب مسافر رستے میں ہوا تو رستہ بھول جائے گا۔ رات ہو جانے دو۔ پھر بتاؤں گی کہ آگے کیا ہوا ہے۔

بادشاہ نے دل میں کہا، چلو ایک رات کی مہلت اور سہی۔ کہانی پوری ہو لینے دیں۔ تو رات آئی اور شہرزاد نے کہانی جہاں چھوڑی تھی وہاں سے سرا پکڑا اور سنانی شروع کر دی۔ مگر کہانی کے بیچ پھر صبح کا تارا جھلملایا۔ پھر مرغا بول پڑا، اور کہانی پھر ایک نازک موڑ پر آ کر تھم گئی۔ پھر وہی سوال کہ پھر کیا ہوا اور پھر وہی جواب کہ اب تو مرغے نے بانگ دے دی، صبح ہو گئی۔ باقی بشرط حیات رات کو۔

اسی میں راتیں گزرتی چلی گئیں اور کہانی سے کہانی نکلتی چلی گئی۔ ہزار بار صبح ہوئی اور ہزار بار مرغے نے بانگ دی۔ ایک ہزار ایکویں رات میں کہیں جا کر کہانی ختم ہوئی۔ مگر اس عرصے میں بادشاہ کی کایا کلپ ہو چکی تھی۔ کہنے والے کا بھلا، سننے والے کا بھلا۔ شہرزاد کی جان بچی، لاکھوں پائے۔ بادشاہ نے عورتوں کے قتل سے توبہ کی اور فلاح پائی۔

تو یہ تھی الف لیلیٰ کی وجہ پیدائش۔ میں نے شہرزاد کے بھید کو پا لیا۔ کہانی رات کو اسی لیے سنائی جاتی ہے کہ وقت کٹے اور رات ٹلے۔ میں بھی ایک لمبی کالی رات کی بیچ سانس لے رہا ہوں۔

اس رات کا رشتہ شہرزاد کی راتوں سے ملتا ہے۔ تو گویا اس رات کا بھی توڑ یہی ہے کہ کہانی کہی جائے۔ جب تک رات چلے کہانی چلے اور اسی طور جو شہرزاد نے اختیار کیا تھا یعنی دیکھا کہ اردگرد کی فضا میں تو خون کی بو بسی ہوئی ہے۔ انسانی جانوں کی کوئی قیمت نہیں رہی۔ قتل ہیں، دہشت اور خوف کا سماں ہے۔ تب اس نے اردگرد سے ذہنی بے تعلقی کا رویہ اپنایا اور کہانیوں کی ایسی دنیا میں نکل گئی جس کی فضا حاضر و موجود سے یکسر مختلف تھی۔ میں نے سوچا چلو ہم بھی اسی راہ پر چلتے ہیں اور اس دنیا میں نکل جاتے ہیں جہاں بس رات تھی اور کہانی تھی۔ داستانیں، کتھائیں، کہانیاں۔ گل نے صنوبر کے ساتھ کیا کیا۔ حسن بانو نے حاتم سے کیا کیا سوال کیے اور حاتم کیا کیا جواب لایا۔ دیو کے قلعے میں قید شہزادی شہزادے کو دیکھ کر کیوں روئی اور کیوں ہنسی۔ کلیلہ نے دمنہ کو کیا نصیحت کی اور دمنہ نے اس کا کیا جواب دیا۔ جتنے سوال اتنی کہانیاں۔ ہر کہانی جوکھوں بھرے سفر کی بپتا۔ جھانک کر باہر دیکھا۔ اچھا شبِ فتنہ تو اور لمبی کھنچ گئی۔ تو پھر کہانی شروع ہوگئی۔ شہزادہ بنوں کی خاک چھانتا، نگر نگر گھومتا، خستہ و درماندہ ایک نرالے ہی نگر میں جا نکلا۔ دیکھا کہ ایک بلند و بالا قلعہ ہے جس کے کنگرے آسمان سے باتیں کرتے ہیں، کتنی کھوپڑیاں ان کنگروں میں لٹکی ہوئی ہیں۔ یہ دیکھ کر حیران اور ہراساں ہوا۔ چلتے چلتے ایک بزرگ کی صورت نظر آئی۔ شتابی سے اس کے پاس پہنچا اور پوچھا، اے صاحب یہ کون سا نگر ہے اور یہ قلعہ کیسا ہے جس کے کنگروں میں سر لٹکے ہوئے ہیں۔ جن کے سر قلم ہوئے وہ کون تھے۔ جس نے قلم کیے وہ کون ظالم ہے۔ بزرگ نے اسے سر سے پیر تک غور سے دیکھا۔ پھر یوں گویا ہوا کہ اے جوان مقرر، تو اس شہر میں نووارد ہے۔ تیری کمبختی تجھے اس شہر میں لے آئی ہے۔ اپنی جوانی پہ رحم کھا اور شتابی سے یہاں سے نکل جا۔ یہ شہر قیموس ہے۔ قلعہ یہ شاہ قیموس کا ہے کہ دختر بد اختر اس کی مہر انگیز ہے۔ حسن وہ پایا ہے کہ دنیا کے سات پردوں میں اس کا جواب نہیں۔ پر اپنے امیدواروں کے لیے شقی القلب، ہر امیدوار سے سوال کرتی ہے کہ گل باصنوبر چہ کرد۔ شرط لگا رکھی ہے کہ امیدوار کے لیے اس سوال کا جواب لازم ہے۔ صحیح جواب دے دیا تو اسے اپنا سرتاج بناؤں گی۔ نہ دے سکا تو سر قلم کرا کے قلعہ کے کنگرے میں لٹکاؤں گی۔ قلعہ کی ڈیوڑھی میں سنہری چوب اور نقارہ رکھا ہے۔ کتنے شہزادے آئے۔ انہوں نے نقارے پر چوب لگائی۔ شہزادی کے حضور میں ان کی طلبی ہوئی۔ وہی ایک سوال گل باصنوبر چہ کرد۔ اب تک کسی سے جواب بن پڑا نہیں ہے۔ بس یہ انہیں کی کھوپڑیاں ہیں جو تو کنگروں میں لٹکا ہوا دیکھتا ہے۔

شہزادے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ نقارے کی طرف لپکا۔ بزرگ چیختا چلاتا رہ گیا کہ ہائیں یہ

کیا کرتا ہے۔ کیوں اپنی ہیرا سی جان کو گنواتا ہے۔ اس نے کچھ نہ سنی۔ نقارے پہ ایسی چوب لگائی کہ پورا شہر گونج اٹھا۔ اہل شہر نے دہائی دی کہ ایک اور جان گئی، ایک اور سر کے قلم ہونے کی باری آئی۔ مگر یہ کیا ہوا۔ اچانک رونے پیٹنے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ الٰہی خیر، یہ کیسا شور ہے۔ کیسی کہانی، کہاں کے گل وصنوبر۔ محلّہ میں تو قیامت مچی ہوئی ہے۔ اے بھائی کیا ہوا۔ دہشت گرد۔ ارے کیا کہہ رہے ہو۔ دہشت گرد یہاں کہاں سے آگئے۔ بس آ گئے۔ ڈھاٹے باندھے کلاشنکوفیں تانے مسجد میں آن دھمکے۔ ٹھائیں ٹھائیں۔ دم کے دم میں کتنے نمازی خون میں لت پت مسجد کے صحن میں تڑپنے لگے۔

سننے والے دہشت زدہ رہ گئے۔ میرے حواس غائب، دماغ مختل۔ ایک بزرگ نے ٹھنڈا سانس بھرا ''کیا زمانہ آ گیا ہے۔ مسلمان مسلمانوں کا خون بہا رہے ہیں اور خانۂ خدا میں آ کر۔''

دوسرے بزرگ نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا ''میں نہیں مانتا کہ یہ مسلمان تھے۔ مسلمان مسلمانوں پر گولی نہیں چلا سکتا۔ اور پھر خانۂ خدا میں۔''

''پھر کون تھے یہ۔'' ایک نوجوان نے غصے سے کہا۔

''دشمن کے ایجنٹ،'' دوسرے بزرگ نے اعتماد سے کہا۔

''مولانا،'' نوجوان غصے سے کانپنے لگا۔ ''کب تک ہم ایسی باتیں کر کے اپنے آپ کو دھوکا دیں گے؟'' پھر رک کر بولا ''مسلمان مسلمان پر گولی نہیں چلا سکتا۔ مولانا آپ نے شاید مسلمانوں کی تاریخ نہیں پڑھی ہے۔''

''ہاں اب کل کے لڑکے ہمیں ہماری تاریخ پڑھائیں گے۔''

اس بحث نے میرے دماغ کو اور پراگندہ کر دیا۔ میں الٹے پاؤں گھر آیا۔ کیا کروں، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دماغ پراگندہ تھا۔ طبیعت پریشان۔ جمعیت خاطر کوئی صورت ہو کہاں ہے۔ مہینوں یہی احوال رہا۔ کہانی کا خیال ہرن ہو چکا تھا۔ پھر طبیعت اس طرف آئی بھی تو اس طرح کہ گل وصنوبر کے قصے سے مجھے وحشت ہونے لگی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ آخر اسی کہانی کی طرف میرا دھیان کیوں گیا۔ کیوں لکھنے کے لیے میں نے اس کہانی کی چنا جہاں ایک شہزادی دہشت گرد بنی بیٹھی ہے۔ جو نوجوان محبت کے جذبے سے سرشار اس کے سامنے آ کر سر نیاز خم کرتا ہے، یہ اس کا سر قلم کر دیتی ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ماضی قدیم کی طرف بھی جاتے ہیں تو اپنے عہد کے انگارے ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ یا یہ میری کمزوری تھی کہ میں نے اپنے زمانے کی تشدد بھری فضا سے رسہ تڑا کر پرانی کہانیوں کی دُنیا میں اماں چاہی مگر اس پر دھیان نہیں دیا کہ میرے زمانے کے

انگارے بھی میری ذات سے لپٹے لپٹے میرے ساتھ وہاں پہنچ گئے ہیں۔ میں نے پھر شہرزاد کو یاد کیا۔ اس نے کس کمال سے اپنے دل و دماغ کو اپنے اردگرد کے تشدد اور دہشت کی فضا سے آزاد کیا تھا اور کس طرح اپنی ذات سے اپنی کہانیوں کو الگ کیا تھا کہ اس کی سنائی ہوئی کہانیوں کو پڑھتے ہوئے یہ گمان تک نہیں گزرتا کہ یہ ایسی شخصیت کے تخیل کی پیداوار ہیں جس کی موت چند گھڑیوں کے فاصلہ پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ پتہ نہیں یہ شہرزاد کا کمال تھا یا ان داستان گویوں کا جن کے مشترکہ تخیل نے اس بے مثال کردار کو جنم دیا تھا۔ وہ داستان گو کون تھے، ان کا تو ہمیں پتہ نہیں۔ میرے لیے تو شہرزاد ہی الف لیلیٰ کا مرکزی کردار بھی ہے اور الف لیلیٰ کی خالق بھی۔ غالب نے اپنے خطوط میں کہیں کہا ہے کہ شاعری کی انتہا یہ ہے کہ فردوسی بن جائے۔ میرے حساب سے کہانی کار کی انتہا یہ ہے کہ شہرزاد بن جائے۔

خیر تو میں نے شہرزاد سے سند لے کر پھر کہانی کی طرف رجوع کیا۔ اب کے طے کیا کہ اپنے زمانے سے باہر نہیں جاؤں گا مگر اپنے زمانے کے انگاروں کو قریب نہیں پھٹکنے دوں گا۔ ڈیڑھ دو کہانیاں لکھ چکا تو ایک دانش ور دوست نے طعنہ دیا کہ خوب افسانہ نگار ہو۔ افغانستان میں بم برس رہے ہیں۔ پاکستان کی سرحدوں پر خطرے منڈلا رہے ہیں۔ دنیا کے اعصاب پر دہشت گرد سوار ہیں اور تم یہاں بیٹھے چڑے چڑیا کی کہانی لکھ رہے ہو۔ یہ فراریت پسندی نہیں ہے تو کیا ہے؟' اس ردعمل نے مجھے بہت مطمئن کیا یعنی حاضر کے آشوب سے یکسر بے تعلقی پیدا کر کے کہانی لکھنے کی میری کوشش کامیاب ہوئی۔ اسی ہنگام مجھے منیر نیازی کی ایک نظم یاد آئی۔ اس کا عنوان ہے، 'جنگ کے سائے میں جنتِ ارضی کا خواب'۔ نظم اس طرح ہے۔

کبھی جامن کی شاخوں میں
کبھی فرشِ زمرد پہ
یہ گل دم گا رہی ہے راگنی عہدِ محبت کی
کھلی چٹیل زمینوں سے
غبارِ شام میں اڑتی
صدائیں گھر میں واپس آ رہے مسرور لوگوں کی
افق تک کھیت سرسوں کے
گلاب اور سبز گندم کے
حویلی کے شجر پر شور چڑیوں کے چہکنے کا

عجب حیرانیاں سی ہیں
مکانوں اور مکینوں میں
کہ موسم آرہا ہے گاؤں کے جنگل مہکنے کا

اس نظم میں جنگ کہاں ہے۔ جنگ کی طرف کوئی اشارہ، کوئی کنایہ۔ کچھ بھی نہیں۔ مگر اسی میں تو نظم کی کامیابی کا راز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں تخلیقی ذہن نے جنگ کے خیال سے مغلوب ہونے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ گویا جنگ کے مقابلے میں تخلیقی ذہن کی فتح کا اعلان ہے۔

میں منیر نیازی کو داد دینے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی چڑے چڑیا کی کہانی پر داد دینے لگا تھا کہ ایک قاری نے اس کہانی کا کچھ اور ہی مطلب نکالا۔ اس نے اسے علامتی کہانی کے طور پر پڑھا اور اس میں ہمارے زمانے کی انسانی صورت حال کا ایک عکس دیکھ لیا۔ کہانی کی اس تعبیر نے مجھے پریشان کر دیا۔ میری تو ساری ریاضت پر پانی پھر گیا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اپنے زمانے کے انگارے کہانی میں پھر راہ پا گئے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ میں بالآخر فراری کہانی لکھنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اگر فراریت پسندی کی راہ کہانی کو بچایا جاسکتا ہے تو یہ سودا کیا برا ہے۔ لیکن اگر اس قاری نے اس کہانی کو اسی طرح سمجھا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب لاکھ اپنے زمانے سے بھاگیں زمانہ آپ کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ سات پردوں میں چھپ کر بھی کہانی لکھیں گے تو زمانے کے انگارے وہاں پہنچ کر کہانی کو آنچ دیں گے۔

میں نے ایک مرتبہ پھر شہرزاد سے رجوع کیا۔ اور کس سے رجوع کروں، کس سے پوچھوں۔ کہانی میں حرفِ آخر تو شہرزاد ہی ہے۔ شاعر کی انتہا ہے کہ فردوسی ہو جائے۔ کہانی کار کی انتہا یہ ہے کہ شہرزاد بن جائے۔ اس انتہا کو اور کس نے دیکھا ہے۔ میں کیا کھا کے اس انتہا کو چھوؤں گا۔ مگر آرزو کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ سو پھر اسی نیت کے ساتھ کہانی لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ مگر پھر وہی قصہ، اسی طرح کی کھنڈت۔ اور اب مجھے ایک خیال اور آیا۔ زمانہ تو تمہارا پیچھا نہیں چھوڑ رہا، اس سے کہاں تک بھاگو گے۔ تو ایک دفعہ یہ کڑوی گولی نگل لو۔ یعنی ہمارے زمانے میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے بھاگو مت۔ پہلے اس سب کچھ کو قبول کرو۔ پھر شاید اس سے گریز کی بھی راہ نکل آئے۔ تو اچھا یوں ہی سہی۔ قہر درویش بر جانِ درویش۔ یہ کر کے بھی دیکھ لیں۔ اور آخر مجھے جہاد تھوڑا ہی کرنا ہے، کہانی ہی لکھنی ہے، جب تک لکھی جاسکے اور جیسی بھی لکھی جاسکے۔ رات باقی۔ کہانی باقی سو جب تک بس چل سکے ساغر چلے کہانی چلے۔

اسد محمد خاں

انور خاں کے لیے

برادرم! تم دنیازاد میں اپنے، میرے دوست انور خاں کے لیے تعزیتی Notes دے رہے ہو۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔

اس زبان میں باکمالوں کی کون سی لمبی فہرست ہے۔ جو ہے وہ ہر دورِ آسماں سے مختصر ہوتی جاتی ہے۔ ایک ایک دو دو کر کے رخصت ہو رہے ہیں لوگ۔ مگر شکوہ کس سے اور کس بات کا؟

انور خاں سے زندگی میں دو یا تین بار ملا ہوں گا، ان کی کہانیوں سے سمجھو ایک سو مرتبہ مخفل رہی ہو گی۔ اور سو بار پڑھ کے پُر مایہ ہو لوں گا۔ ان کے گنتی کے خط سنبھال رکھے ہوں گے میں نے۔ وہ خط تم دوستوں کو دکھا کے خوش ہو لوں گا۔ اور بس۔ ایسا سچا کھرا لکھنے والا تھا انور خاں اور مجھے، تمھیں اور اردو کہانی لکھنے والے سب ہی دوستوں کو اپنی لکھت سے ایسا حوصلہ دے رہا تھا کہ دل سے دعا نکلتی تھی۔

اپریل انیس سو ننانوے میں اجمل کمال بمبئی جا رہے تھے تو میں نے ان کے ہاتھ دو صفحے کا رقعہ بھیجا تھا انور خاں کے لیے۔ اس کا ایک حصہ تمھیں اور سب کو سنانا چاہتا ہوں:

......اب جب کہ وقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے (کم سے کم میرے لیے تو گزر ہی رہا ہے) میں یہ چاہتا ہوں کہ اُن تمام خوب صورت لوگوں کو جنھوں نے اپنی باتوں تحریروں سے، اپنی محبتوں سے، محض اپنی موجودگی سے ہی میرے لیے زندگی کو بامعنی اور پُر ماجرا بنایا کچھ نہیں تو سنبھال سنبھال کے دانتوں پکڑ پکڑ کے تو رکھوں۔ انور خاں! عزیز گرامی آپ اُن میں سے ایک ہیں۔

مگر یہ بات میں اس طرح نہیں کہنا چاہتا تھا۔ میں ایک مختصر سی دعا مانگتا رہتا ہوں کہ مالک! میں نے قطرہ قطرہ شہد اکٹھا کیا ہے، جب تک میں یہاں ہوں میرے اِن شہد کے برتنوں کو سنبھال رکھنا......

بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔

عرفان عابد

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"
شعلوں میں آج کل ہے، یہ گلستاں ہمارا

ہر سو بھڑک رہی ہیں چنگاریاں فضا میں
سب شہر جل رہے ہیں، سب گاؤں جل رہے ہیں
آتش فشاں ہیں سینے، آنکھوں میں ہیں بگولے
ہے آگ راستوں پر، اور پاؤں جل رہے ہیں
دیکھیں کہاں کو جائے، اب کارواں ہمارا

بہہ جائیں خوں کی ندیاں جس پر بتاؤ کیسے
لائق عبادتوں کے ایسی جگہ ہے آخر
کچھ بھی بناؤ اس پر، مندر کہو یا مسجد
لاشوں پہ جو بنے گا وہ مقبرہ ہے آخر
پوجا کا گھر تھا ایسا آخر کہاں ہمارا

اس طرح رہ نماؤں کے جال میں رہے تو
اک روز اپنا سب کچھ یوں ہی گنوا نہ دیں ہم
تعمیر جس چمن کی اگلوں نے کی لہو سے
مٹی میں اس چمن کو اک دن ملا نہ دیں ہم
مٹ ہی نہ جائے اک دن نام و نشاں ہمارا

عامر حسین لندن میں مقیم ہیں اور اپنے انگریزی افسانوں کے لیے نمایاں ہیں جن کے دو مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ نائپال کے نوبل انعام کے حوالے سے یہ تبصرہ انہوں نے ''تہلکہ ڈاٹ کام'' کے انٹر نیٹ میگزین کے لیے لکھا تھا۔

عامر حسین

ترجمہ: آصف فرخی

نوبل انعام کی ستم ظریفی

میں نے نائپال کے ناولوں میں سے صرف چار ہی پڑھے ہیں اور میرے ردِعمل کا دائرہ اس کے اسلوب کے واضح انداز کے لیے، چند تحفظات کے باوجود، پسندیدگی سے لے کر اکتاہٹ اور ناپسندیدگی (مثلاً افریقا کی بدبوؤں کے بارے میں اس کا بیان) تک محیط ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ ''مسٹر بسواس کے لیے ایک گھر'' اس کی بہترین کتاب ہے مگر نائپال تک دیر میں پہنچنے کی وجہ سے یہ میری نظر سے چوک گئی۔

پھر وہ سفر ناموں والا نائپال ہے جن کے بارے میں اس کا دعویٰ ہے کہ یہ اس کے فکشن جتنے ہی عمدہ ہیں۔ یہ مجھے تعصب اور تنفر کے مارے ہوئے لگتے ہیں جن میں میری دل چسپی یا اہمیت کا کم ہی مواد ہے۔

اکثر یہ ہوتا ہے کہ اس طرح کے انعامات کسی ادیب کی پوری زندگی میں بڑی دیر سے دیے جاتے ہیں، جب کہ اس کا بہترین کام قصہ ٔ پارینہ بن چکا ہوتا ہے۔ نجیب محفوظ کے معاملے میں، یہ انعامات ''دوسری'' زبانوں کے ادب کو نظر انداز کیے جانے کے عمل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ بعض دوسری صورتوں میں۔ جیسے کہ یہ موجودہ صورتِ حال...... تو یہ محض مقدس قربان گاہوں پر شمع کا کام کرتے ہیں۔

اور پھر اس بات کی وحشیانہ ستم ظریفی کہ نائپال کو اب اس سال میں نوبل انعام دیا جارہا ہے کہ جس میں ہم ایسے واقعات کو برپا ہوتے دیکھ رہے ہیں جو اس کے سب سے زیادہ شدّت پسند نظریات کی عکاسی کر رہے ہیں...... طالبان اسی قسم کی ٹوٹی بکھری فوج ہے کہ جس کے بیان میں اسے بہت لطف آتا ہے۔

کیا نوبل انعام کی اب بھی کوئی اہمیت ہے؟ اگر ہے تو میں یہ دیکھنا چاہوں گا کہ ایسے قرۃ العین حیدر (ہندوستان) اور پریموئیڈ آنندا توئر (انڈونیشیا) جیسے عمدہ فن کاروں کو، ان کے حقیقی اور باقی رہنے والے اثر کے لیے بالآخر تسلیم کیا جائے۔

الف لیلیٰ کی شہرزاد کو ناول میں ڈھال لینے والی گیتھا ہری ہرن، معاصر ہندوستان میں انگریزی کے ممتاز ترین ادیبوں میں سے ایک ہیں۔ ان کا تعلق جنوبی ہندوستان سے ہے اور وہ دہلی میں رہتی ہیں۔ ایک نئے ناول پر کام روک کر انہوں نے وی ایس نائپال پر یہ مضمون لکھا جو ''فرنٹ لائن'' میں شائع ہوا اور مصنفہ کی اجازت سے اس کا ترجمہ یہاں شائع کیا جارہا ہے۔ آر کے نرائن کے بارے میں مصنفہ کا تعزیت نامہ دنیا زاد کی کتاب ۳ میں شائع ہوا تھا۔ مصنفہ نے یہ صراحت کی ہے کہ تلفظ کے اعتبار سے ان کے نام کا صحیح املا ''گیتھا'' ہے، قارئین تصحیح کرلیں۔

گیتھا ہری ہرن

ترجمہ: آصف فرخی

اعلیٰ انعام کی گھٹیا سیاست

اس سال کا نوبل انعام برائے ادب ملنے پر وی ایس نائپال نے دو ملکوں کو خراجِ تحسین پیش کرکے اپنا ردِعمل ظاہر کیا ہے، ایک انگلستان، جو اس کا ''گھر'' ہے اور دوسرے ہندوستان، جو اس کے ''پرکھوں کا گھر'' ہے۔ عجیب بات ہے کہ اس خراجِ تحسین میں ''غرب الہند کے جزیرے'' ٹرینی ڈاڈ کو ذکر کے قابل نہیں سمجھا گیا...... حالاں کہ وہ پیدا ہوا اور پلا بڑھا تو اسی جگہ اور ٹرینی ڈاڈ ہی اس کے ابتدائی اور پسندیدہ ترین کتابوں کا محلِ وقوع ہے، جن میں ''بھید بھرا مالشیا'' اور ''مسٹر بسواس کے لیے ایک گھر'' اور ''میگوئیل اسٹریٹ'' شامل ہیں۔ یا شاید یہ اس لحاظ سے عجیب بات نہیں ہے، کہ نائپال نے لکھا ہے کہ مجھے ٹرینی ڈاڈ کے بارے میں معلوم تھا کہ وہ غیر اہم، غیر تخلیقی، کلبیت زدہ ہے اور خامی ہی نہیں، خوبی سے بھی بے نیاز...... نائپال اپنے مآخذ سے سفر کرکے بہت دور نکل آیا ہے۔ وہ اپنی ابتدائی کتابوں کی چبھتی ہوئی پُر مزاح اور اپنی جڑوں سے مربوط دُنیا سے بھی بہت دور نکل آیا ہے۔ اس کی ابتدائی کہانیوں اور ناولوں نے غیر مغربی قارئین کی پوری ایک نسل کو سکھایا کہ غیر انگریزی مواد کے بارے میں لکھنے کے لیے انگریزی زبان کو کس طرح استعمال کیا

جائے اور اس سے بھی بڑھ کر کہ اپنے آپ کو ''مابعد نو آبادیاتی'' (Post-Colonial) کے طور پر کس طرح دیکھا جائے۔ نائپال کی تحریریں ان معاشروں...... اور ان لوگوں...... کی بوالعجبی اور تکلیف دہ تضادات سے شرما کر منہ نہیں پھیر لیتیں جو اپنی نئی زندگیوں کے لیے ایک مربوط اور زندگی آمیز بیانیہ تخلیق کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، وہ بھی اس انداز میں کہ لگ گیا تو تیر نہیں تو تکا۔ مگر خود نائپال اپنے ان ''فطری'' مخاطبین کے ساتھ زیادہ دیر نہیں رہا۔ اس کے بعد کے دور کے ناول اور خاص طور پر غیر افسانوی ادب کی معتدبہ تحریریں، اس کی تیز نظروں اور باوقار جملوں اور بولتی ہوئی تفصیلات پر اس کی بلاشبہ مہارت کو مقام دیگر پر لے گئیں۔ یہ مقامِ دیگر ایک تیرہ و تاریک اور ناخوش مقام ہے۔ اندھیرے کی حکمرانی ہے۔ روشنی ہوتی بھی ہے تو زخموں کو نمایاں کرتی ہے۔ بغاوتوں کی فراوانی ہے (غدر، بغاوت، دراندازی، مگر کہیں اختلاف یا تحریک یا جدوجہد نہیں)۔ مختصر یہ کہ انتشار ہے، امید کی کوئی چنگاری، کوئی رمق نہیں اور یہ انتشار بھری ''نیم دُنیائیں'' کہاں ہیں کہ جن میں نائپال اس قدر ادیبانہ درد اور خوف کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ یہ سب کی سب، بلا استثناء 'غیر مغربی' ممالک ہیں، جن میں سے کئی کو ابھی تک اپنے بھاری نو آبادیاتی ورثے سے پنپنے کا موقع نہیں ملا ہے۔ کئی ابھی تک اپنے موقع پرست یا برخود غلط تعصب پرست حکمرانوں کے نمٹنے کے مراحل میں ہیں جو نو آبادیاتی آقاؤں کی جگہ سنبھالنے کے لیے آ گئے تھے۔

نائپال نے اپنے آپ کو ان جدوجہد کرتی ہوئی اور ترقی پذیر دنیاؤں کے باہر رکھا ہے۔ وہ ان کو اپنی تنگ مزاجی کے ساتھ (جواب شہرۂ آفاق ہے) اور اس کی تشخیص اسی قدر غیر مصالحت انگیز ہے کہ جتنے اس کے الفاظ درشت۔ غیر تخلیقی اور ہیروز سے عاری ٹرینی ڈاڈ۔ زخم خوردہ ہندوستان۔ مستقبل سے محروم اور تاریک افریقا اور ہمیشہ، لامحالہ آفت رسا اسلام۔ یہ معاشرے جن کا خاکہ اڑایا گیا ہے...... غلیظ، انتشار سے پُر اور ان لوگوں سے بھرے ہوئے جو اپنے معاشروں سے قدم باہر رکھتے ہی غائب ہو جاتے ہیں...... ان معاشروں کا کم از کم ایک مقصد ضرور ہے۔ اندھیرے کے خطے اعلیٰ، نفیس اور مہذب یورپی مزاج کے لیے مستقل بنیادوں پر اس پشتے کا کام دیتے ہیں جو ان کی آب و تاب کو مزید نمایاں کرتا ہے۔

اگلے وقتوں میں جوزف کونریڈ کی ''قلب ظلمت'' نے......جس نے پھر جدید کلاسک کا مرتبہ حاصل کر لیا...... اس ''دُنیائے دیگر'' کو فرض کیے لینے کی روایت کو مستحکم بنایا، ایک ایسی دنیا جو یورپ

سے متضاد ہو۔ چنوا اچ بے نے افریقا کے بارے میں کونریڈ کے نقطہ نظر کی تعریف یوں بیان کی ہے: ''جو یورپ کا ...... اور لہٰذا تہذیب کا ...... عین متضاد ہے، ایک ایسا مقام جہاں فاتح حیوانیت انسان کی خود نمایانہ عقل اور شائستگی کا مذاق اڑاتی ہے۔'' یہ متضاد قلبِ ظلمات جو کونریڈ نے تخلیق کیا ہے، یہاں افریقی اس ''زمین کے باسی ہیں جس نے ایک نامعلوم سیّارے کا روپ دھار رکھا ہے۔'' یہ وہ جگہ ہے جہاں یورپ کے نمائندے ''ماقبل تاریخ میں بھٹکنے والے،'' بڑی مشکل سے ایک موڑ سے گزرتے ہیں تو دوسرے ''تاریک، ماقبل تاریخ کے مردوں اور عورتوں'' سے ان کا سامنا ہو جاتا ہے۔ ''وہ لوگ چیخیں مارتے اور چھلانگیں لگاتے، اور لٹو کی طرح گھومتے اور بڑے ڈراؤنے منھ بناتے۔ لیکن تمہارے دل میں اہتزاز پیدا ہوتا تو صرف اس انسانیت کے خیال سے ...... جو تمہاری جیسی ہی انسانیت تھی ...... اور اس خیال سے کہ اس وحشیانہ اور پُر جوش شور و شغب سے تمہارا دور دراز کا ناتا ہے۔ بھونڈا۔''

کونریڈ کا تصوّر اس حد تک پیچیدہ ہے کہ وہ اس میں نو آبادکاری منصوبے کے لیے لازمی پیراڈائم (Paradigm) کی خود آگہی کے لیے جگہ پیدا کرسکتا ہے۔ دوسری دُنیا سے مغرب کے تصادم کے بارے میں اس کا خیالی اظہار رنگ دار ضرور ہے مگر اس بات کو واشگاف انداز میں کہا جائے تو پھر یہ رنگ ضمیر نے بھرے ہیں۔ مگر کونریڈ کے ورثے کا یہ بیسویں اکیسویں صدی والا وارث، خاکی رنگت والا وارث، خاص طور پر بہت ظالمانہ سہوِ زمانی معلوم ہوتا ہے۔ بالکل جس طرح کونریڈ کے یورپی مسافر افریقا میں ''بھوتوں کی طرح اڑتے پھرتے ہیں''، اپنے ''ماحول کے فہم سے کٹے ہوئے''، اسی طرح نائپال بھی کسی اعصاب زدہ، ناخوش بھوت کی طرح اس ماقبل تاریخ دُنیا میں اڑتا پھرتا ہے جو کانگو سے بمبئی تک پھیلی ہوئی ہے اور جس میں بالعموم وہ جگہیں ہیں جہاں ''نم گرمی طاقت اور قوتِ ارادی کو برباد کر ڈالتی ہے۔'' ۱۹۶۰ء کے جزائر غرب الہند میں وہ دریافت کرتا ہے کہ ''ان جزیروں کی تاریخ کبھی قابلِ اطمینان طریقے سے بیان نہیں کی جاسکے گی۔ اس کام میں وحشت ہی واحد مشکل نہیں۔ تاریخ حصول، کام یابی اور تخلیق کے گرد بنی جاتی ہے اور جزائر غرب الہند میں کوئی چیز تخلیق نہیں ہوئی۔''

۱۹۶۵ء کے کانگو میں نائپال کو وہ ''مقامی لوگ'' ٹوک دیتے ہیں جو ''تہذیب کے کھنڈروں میں خیمے گاڑے ہوئے'' ہیں۔ نائپال کے افریقا میں، جس وقت وہ وہاں آ کر کھڑا ہوتا ہے تو جھاڑی بن پیچھے ہٹنے لگتا ہے۔ ہندوستان بھی اتنا ہی پُر خطر ہے۔ وہ ان کو سکیڑ کر ہجوم میں بے

چڑچڑے پن میں مبتلا کر دیتا ہے۔ بلکہ اس کی تکلیف کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہاں ہجوم میں ہر آدمی اسی کی سی شکل و شباہت رکھتا ہے اور جب ایسا ہو تو بھلا وہ باقی لوگوں سے نمایاں کیسے ہو؟ (ماضی سے کونزیڈ کی بازگشت: ''تمہارے دل میں اہتزاز پیدا ہوتا ہے تو صرف اس انسانیت کے خیال سے...... جو تمہاری جیسی ہی انسانیت تھی۔'') جن افراد سے نائپال ملتا ہے اور اسی قدر کٹیلے انداز میں لکھتا ہے، ضروری نہیں کہ وہ اسی چیز کے ''ٹائپ'' ہوں جس کی وہ نشانی معلوم ہوتے ہیں۔ کلرک، ہندوستان ''کلرک پانی کا گلاس بھی لاکر نہیں دے گا چاہے آپ بے ہوش بھی ہو جائیں۔'' ادنیٰ نوآبادکار (Colonial): انگریزی بول لیتا ہے اور شاید فنونِ لطیفہ کی تحسین بھی کر سکتا ہے مگر پکاسو کے برابر میں جامنی رائے کی تصویر ٹانگ دیتا ہے۔ وہاں کی اکثر و بیش تر آبادی: ''خود پسندی'' سے بھری ہوئی...... تنقید سے غیر اثر پذیری، دیکھنے سے انکار...... دوہری گفتگو اور دوغلی فکر؟'' فٹ پاتھ کی ضرورت'' سے انکار کا ہندوستانی رجحان ہو یا ''بمبئی کی گنجان آباد غریب بستیوں کا پس منظر''، یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہندوستان میں اس خواب ناک دُنیا کی کوئی نشانی باقی نہیں جو نائپال نے ''اپنے آباؤ اجداد'' کے گھر کے طور پر ذہن میں تعمیر کر رکھی تھی۔ جدید ہندوستان میں ''شِو نے اپنا رقص بند کر دیا ہے۔'' نائپال کو ہندوستان میں بہ ظاہر جس چیز کی کمی کا احساس ہو رہا ہے، وہ ایک خالص، صاف ستھری، روشن جگہ ہے۔ یہ خالص پنا اور یکسانیت، خدا کا شکر ہے کہ ہندوستان میں محدود ہیں، ہمارے ''خالص پنے کے تاجروں'' کی تمام تر کوششوں کے باوجود۔ مگر جس وقت تک نائپال نے ''ہندوستان، دس لاکھ بغاوتیں'' (India: A Million Mutinies Now) لکھی، اسے تبدیلی کی چند نجات دہندہ اور مثبت نشانیاں مل گئیں۔ اس سے پہلے، ''زخم خوردہ تہذیب'' میں نائپال نے لکھا تھا کہ ''ہندوستان کے بارے میں کسی بھی تفتیش'' کو چاہے وہ ایمرجنسی کے بارے میں تفتیش ہی کیوں نہ ہو، سیاست سے آگے لے جانا ضروری ہے۔ اس کو ہندوستانی رویوں کے بارے میں ہونا چاہیے، اسے اس پوری تہذیب کے بارے میں ہونا چاہیے۔'' مگر اس تہذیب کے بارے میں سیاست سے آگے بڑھ کر اس کا فیصلہ: باہر کی دنیا سے نمٹنے کے لیے کوئی بھی تہذیب اس حد تک لیس نہیں ہے: کسی ملک پر حملہ کرنا اور لوٹ لینا اتنا آسان نہیں جتنا کہ یہاں ہندوستان میں رہا ہے اور کسی ملک نے اپنی آفات سے اتنا کم سبق حاصل نہیں کیا ہے۔'' مگر بعد میں ''دس لاکھ بغاوتیں'' (جو ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی) لکھنے کے لیے ہندوستان میں سفر کرتے ہوئے نائپال دیکھ لیتا ہے کہ ''۱۹۶۲ء میں جو سمجھ نہیں پایا تھا یا فرض کر لیا تھا، وہ یہ بات تھی کہ اس ملک کو کس حد تک ازسرِنو تعمیر

کیا گیا ہے، اور یہ کہ خود ہندوستان بھی اپنے لیے کس حد تک بحال ہو چکا ہے، ''دورِ ظلمت'' کی اس شکل کے بعد، جس کا اسے سامنا کرنا پڑا، مسلمان حملہ آوروں اور شمالی ہند کی متواتر، تفصیلی تاراجی کے بعد، تغیر کا شکار سلطنتوں، جنگوں اور ۱۸ ویں صدی کے انتشار کے بعد۔ یہ لاکھوں بغاوتیں ''ہندوستان کی نشوونما، بحالی کا حصہ ہیں۔'' ظاہر یہ ہوتا ہے کہ شیو پھر رقص پر آمادہ ہو گیا ہے۔ یہ ملک ''نشوونما کی نشانیوں سے بھرا پڑا ہے۔'' جو سب کے سب ہندوستانی بلکہ خاص طور پر ہندو جاگرتی کی نشانیاں ہیں۔ ہندوستان کی امیدیں جس رُخ پر ہیں اور جہاں اسے جانا چاہیے، تا کہ شو مداخلت کے بغیر رقص کرتا رہے، وہ مقام ہے جہاں ہندو تہذیب بحال ہو سکے۔ ہندوستان نے اس مقام تک سفر کیا تھا اور یہ سفر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو پیش آیا تھا۔ اس دن اجودھیا میں جو ہوا اور اس کے بعد سے ملک کے دوسرے حصّوں میں پیش آ رہا ہے، وہ ہم میں سے بیش تر لوگوں کو کسی قسم کی بھی ثقافت کا کام محسوس نہیں ہوتا مگر نائپال نے بابری مسجد کی تباہی کو اس بات کی خوش آئند نشانی قرار دیا کہ ہندو انا اپنے آپ کو تسلیم کروا رہی ہے۔ لہٰذا یہ بالکل منطقی ہے اور اس بات پر نائپال کے مداحوں کو اس قدر شرمندہ اور غم زدہ نہیں ہونا چاہیے تھا...... کہ ۲۰۰۱ء میں جب دہشت گردوں نے نیویارک اور واشنگٹن پر حملہ کیا تو نائپال اسلام کے بارے میں (کسی مخصوص مذہبی رجحان کے حامل یا اس سے عاری دہشت گردوں کے خلاف نہیں) یہ الفاظ استعمال کرتا ہے کہ ''Calamitous'' ہے اور نوآبادیاتی یلغار کے مماثل ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ان تہذیب یافتہ ملکوں کے بارے میں کچھ نہیں کہتا جنہوں نے عام غارت گری کے ہتھیار منظم طور پر جمع کر رکھے ہیں۔ شاید وہ سب، سی این این کی گلیوں میں چیختے پکارتے داڑھی والوں سے کم آفت انگیز ہیں۔

نوبل انعام کے اعلان نامے میں نائپال کو بطور خاص سراہا گیا ہے کہ اس نے اپنی تصانیف میں باشعور بیانیے اور دیانت دارانہ تفتیش کو متحد کر دیا ہے جو ہمیں محکوم اور دبا دی جانے والی تاریخ کی موجودگی کو دیکھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ شہرت بنانے والے اور انعام دلوانے والے نقاد حضرات نائپال کو، اس کے ہنر اور بلند مقام کے ساتھ ایسی ہی ''محکوم تاریخوں'' کے مصنف کے طور پر دیکھتے ہیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، نائپال نے خود ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ مگر یقیناً وہ اس بات سے ناواقف نہیں ہو سکتا کہ ہر نئی کتاب کے ساتھ اسے یہ تصدیق حاصل ہوتی گئی ہے کہ اسے ان معاشروں کے نیم سرکاری گائیڈ کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے جنہیں وہ قابل نفرت حد تک وحشیانہ اور عجیب حد تک خالی قرار دیتا ہے۔ الزبتھ ہارڈ وک نے ''دریا کا ایک موڑ'' کے بارے میں لکھا تھا کہ نائپال کی

تصنیف ایک ''تخلیقی تفکر'' ہے جس کا مرکز تاریخی تیاری سے محرومی کی تباہ کاری، ان پورے پورے ملکوں اور افراد کا کرب جو برداشت نہیں کر پا رہے ہیں۔'' جوزف لیلی ویلڈ نے ''ایک لاکھ بغاوتیں'' کے بارے میں لکھا کہ ''مابعدِ نوآبادیاتی ہندوستان میں ذہانت سے وابستگی کا وقیع ترین اظہار (جو ہوا ہے، وہ یہ کتاب ہے) اور نائپال ''ہر اس شخص کے لیے ناگزیر ہے جو ہندوستان کے تجربے کو گرفت میں لانا چاہتا ہے۔'' جیمز وڈ نے یوں خلاصۂ کلام کیا: نائپال ''نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی مشکل (dilemma) کا سب سے بڑا زندہ تجزیہ نگار ہے۔'' قصہ مختصر یہ کہ نائپال کو ایک ماہر سمجھا جاتا ہے، صرف فنِ تحریر کے بارے میں نہیں بلکہ ہندوستان، اسلام، افریقا، ہندو طرزِ حیات، پورے پورے ملکوں اور افراد، ان کی مشکلات اور محکوم تواریخ کا ماہر۔ جن جگہوں کے بارے میں نائپال لکھتا ہے وہاں کے ادیب اور قاری اور ان کے ساتھ ساتھ نہ لکھنے اور نہ پڑھنے والے عام افراد، آسان ثنویت سے دور ہونے کی کوشش کرتے رہیں...... جیسے کالا اور گورا، ہندو اور مسلمان، مغربی اور غیر مغربی۔ مگر اپنے قابلِ ذکر ہنر اور تنفر اور طاقت کے مراکز کے ترجمان کی حیثیت سے اپنی قابلِ ذکر شہرت کے ساتھ نائپال ایسی تمام کوششوں کو دوبارہ نقطۂ آغاز پر واپس لے آتا ہے۔ دوسری آوازوں نے بھی نائپال کے اس نقطۂ نظر کا جواب دیا ہے جو دنیا کی تہذیبوں کے بارے میں اس کے اعلانات میں پورے طمطراق سے ظاہر ہوا ہے۔ اس کے ہم وطن کیریبین، ایوان وان سرٹیما نے لکھا: ''اس کی بذلہ سنجی سے مجھے انکار نہیں مگر میری رائے میں اسے ان انگریزی نقادوں نے ضرورت سے زیادہ اہمیت دے دی ہے جن کی حسیت کو وہ اپنے سامانِ تجارت سے مکھن لگاتا ہے: اپنے آپ سے نفرت۔'' کیریبین کے شاعر (نوبل انعام یافتہ) ڈیرک والکاٹ نے اپنی اس تعریف کی صراحت کی جب نائپال کو ''انگریزی فقرے کا بہترین مصنف'' قرار دیا تھا، کہ اس کی نثر کنٹھ مالا اور حبشیوں سے گھن کھانے کی وجہ سے داغ دار ہے۔'' (ڈیرک والکاٹ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ نائپال کو وی ایس نائٹ فال کہہ کر پکارتا ہے)۔ ایڈورڈ سعید نے بھی بڑے کاٹ دار انداز میں اس فرق کا جائزہ لیا ہے کہ دُنیا کے مختلف علاقوں میں نائپال کے کام کو کس نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جب کہ مغرب میں نائپال کو ''ماہر فن ناول نگار اور تیسری دنیا کے انتشار اور دوغلے پن کے عینی شاہد کے طور پر اہمیت دی جاتی ہے۔'' نوآزاد دُنیا میں اسے اسٹیریو ٹائپ کا فراہم کنندہ اور اس دُنیا سے نفرت کرنے والے کے طور پر نشان زد کیا جاتا ہے جس نے اس کو پیدا کیا تھا۔ گھر کے نزدیک آئیں تو نسیم ایزیکل نے ایک عمدہ مضمون لکھا تھا جسے

ہندوستان پر نائپال کی کتابوں پر تمتے کے طور پر منسلک کرنا چاہیے۔ ''نائپال کا اور میرا ہندوستان'' میں ایزکیل نے لکھا: ''تنقید حملہ آور ہوسکتی ہے، مذمت بھی کرتی ہے مگر انسانوں کی انسانیت سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ ''اندھیرے کا خطہ'' میں مسٹر نائپال اس کام کے خطرناک حد تک قریب آ گئے ہیں۔''

ان سوالوں کو اب کیوں اٹھایا جائے اور ''فریق مخالف'' کے ثبوت کے طور پر کیوں پیش کیا جائے؟ اس قدر اُجڑ گنوار کیوں ہوا جائے جب اس ادیب کو...... جس کے بارے میں اتفاقِ رائے ہے کہ بے حد عمدگی کے ساتھ لکھ سکتا ہے...... نوبل انعام کا حق دار ٹھہرایا گیا ہے؟ پہلی بات یہ کہ نائپال کو اس بار انعام دیا گیا ہے۔ اس کو یہ انعام ایسے وقت میں دیا گیا ہے جب ''تہذیبوں کے تصادم'' کے بارے میں عقابوں والے سخت گیر رویے کا شور وغوغا اور مسلمانوں کے خلاف تعصب بڑھتا جا رہا ہے، بلکہ ایسے ہر شخص کے خلاف جو شکلاً مشرقِ وسطیٰ کا معلوم ہوتا ہے۔ نائپال کو نوبل انعام، ۱۱/ستمبر کے المیے پر اس کے ردعمل کے فوراً بعد دیا گیا ہے جب اس نے اساطیر کو مستحکم کرنے والی اصطلاحوں میں تہذیب پر اسلام کے ''آفت انگیز'' اثر کی بات کی ہے۔

دوسرے یہ کہ نائپال کے نوبل انعام میں ایک موضوع کی بار بار تکرار ہوئی ہے اور اس کا معائنہ کرنے کی ضرورت ہے۔ نائپال کے بعض مداحوں نے اعتراف کیا ہے کہ اس نے شرمندہ کن، ناخوش گوار، جھگڑالو اعتراضات سے پُر، غلط فکر پر مبنی...... بلکہ جاہلانہ...... بیانات بھی دیے ہیں جن کے موضوعات اسلام سے لے کر افریقا تک پھیلے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ اس کی تحریروں نے مغرب اور غیر مغربی ممالک میں لبرل افراد کو ''شدت کے ساتھ بے اطمینان'' کیا ہے۔ مگر ان کا نتیجہ تکرار کے ساتھ آنے والا موضوع...... یہ ہے کہ ادیبوں کے بارے میں حکم ''محض ان کی تحریروں'' سے ہی لگایا جائے۔ اب یہ کس طرح ہوگا، یہ واضح نہیں ہے۔ کیا آپ مثلاً اس جملے کو پڑھ سکتے ہیں: ''سخاوت...... برابر کے آدمی کے لیے تحسین...... لہٰذا غیر معروف تھی، یہ ایسی صفت تھی جس کا علم مجھے محض کتابوں سے ہوا اور حاصل ہوئی تھی تو انگلستان میں۔'' اور اس میں موجود سخاوت کی شستہ تعریف کو پسند کریں، اپنے درست مقام پر لگے ہوئے ڈیش اور سیمی کولن کو پسند کریں، اس بات پر توجہ دیے بغیر کہ یہ جملہ کیا کہہ رہا ہے؟ اس میں موجود منفی بصیرت، ٹوٹ جانے والے شیشے میں بند نفیس نثر کا احساس کیے بغیر؟ ادیب کیا کہہ رہا ہے اور کس طرح کہہ رہا ہے، ان دونوں کے درمیان مصنوعی تفریق، تحریر کو دھو کر پاک کر دیتی ہے اور اس کے دانت نکال کر

بے ضرر بنا دیتی ہے۔ اس بات پر اعتبار کرنا مشکل ہے کہ یہ ادیب آخر خود کیا چاہتا ہے۔ یہ تسلیم کرنا زیادہ معقول ہوگا کہ مصنف کا منشا تنقید ہے اور وہ عمدہ فقروں کے وسیلے سے تنقید کی ترسیل کر رہا ہے۔

یہ ماننا بہتر ہوگا کہ اس کا اظہار افسانوی ادب میں ہو یا غیر افسانوی ادب میں، تنقید ادیب کے کام کا جزو ہے۔ کسی کو بھی سرکاری ادیبوں کی ضرورت نہیں ہوتی، سوائے شاید اس گروہ کے جو ان کو اپنے آلۂ کار کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ مگر کسی کو بزدل ادیب بھی درکار نہیں ہوتا جو مستقل اس بات پر پریشان ہے کہ وہ رواج میں ہے یا سیاسی طور پر دُرست ہے یا مارکیٹ میں اس کی طلب ہے۔ کسی کو بھی اس قدر مہمل نہیں ہونا چاہیے کہ اس بات پر اصرار کریں کہ ادیب کی سیاست اس کے ہر ہر لفظ سے پھوٹی پڑ رہی ہو، اور خطیبانہ یا پٹیش یا افتادہ نعرے لگا رہی ہو۔ مگر یہ معاملہ ہی اور ہے کہ ادیبوں سے کہا جائے کہ گھٹیا سامان قرار دے کر سیاست سے ماورا جانے کے لیے کہا جائے۔ یہ سمجھنا کہ اچھی تحریر گھٹیا سیاست کو پیچھے چھوڑ کر اعلیٰ ادب کی تخلیق کر سکتی ہے، ایسی قدر رومانوی تصور ہے کہ جتنا یہ سمجھنا کہ ادیب، وقت سے پہلے بالغ ہو جانے والا بچہ ہے جس کے ہاتھ میں ہُنر ہے۔ دونوں عقیدے ادب اور سیاست کو بڑی عافیت کے ساتھ ایک دوسرے سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔

اس میں یہ خیال مضمر ہے کہ ادب کے لیے ان باتوں میں کیا رکھا ہے؟ اگر ایسی بات ہے تو پھر نائپال کی سیاست کو (مروّت کے طور پر) ''شہرت کی حد تک بدمزاج'' قرار دے کر بات ختم کی جا سکتی ہے، خاص طور پر اس لیے بھی کہ مشہور بدمزاج، اخباروں کے لیے دل چسپ مواد فراہم کرتے ہیں اور یہی بات ہے تو وہ دانش ور جو سیاست سے نبرد آزما ہونے کے لیے لیس ہیں، اروِن دھتی رائے کی جانب توجہ دلا سکتے ہیں۔ وہ تجویز پیش کر سکتے ہیں کہ وہ ناول لکھنے کے طرف لوٹ جائے...... چھوٹی چھوٹی چیزیں...... اور بڑی بڑی باتوں میں مداخلت نہ کرے جیسے بم اور ڈیم اور عالمگیریت۔ ادیب کی بصیرت، عالمی نقطۂ نظر...... جو ادیب کی سیاست کے لیے کلاس روم کے محفوظ الفاظ ہیں...... اس کی تحریروں سے علیحدہ نہیں کیے جا سکتے۔ ادیب قاری کو (اور خود اپنے آپ کو) اس حقیقت پر مزید ایک اور گرفت فراہم کرتا ہے (کرتی ہے) جس کے بارے میں لکھا جا رہا ہے۔ گو کہ نائپال نے ہندوستان کی دانش وری کے بارے میں بے رحمانہ الزامات عائد کیے ہیں، نائپال کے نوبل انعام اور ادب کو انعامات سے نوازنے کی سیاست پر بحث کرتے وقت ہم کم از کم ان سیدھے سادے حقائق کو یاد کر سکتے ہیں۔

اسد محمد خان

شہرِ مُردگان

-۱-

[سال ۱۹۸۲میں پاکستان ٹیلی ویژن کراچی سینٹر نے ایک تاریخی ناول کی ڈرامائی تشکیل کے لیے سیّد سلیم احمد سے اور مُجھ سے کہا۔ میں بوجوہ اُس ناول کے مُندرجات پڑھنے سے قاصر تھا۔ سلیم بھائی نے اپنی خورد نوازی اور گشادہ دلی سے اِس معاملے کو یوں حل کیا کہ وہ ناول کے ابواب پڑھتے اور مجوزہ سیریئل کے ایک ایک اپی سوڈ کی آؤٹ لائن سی بنادیتے۔ مَیں ڈائریکٹر پروڈیوسر سیّد محسن علی سے ہفتے وار میٹنگز کر کے اسکرپٹ تیار کردیتا تھا۔ اس طرح سیریئل شاہین کی اسکرپٹنگ اور بعد ازاں رکارڈنگ پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ یہ سیریئل سلیم بھائی کی وضع داری اور میری مالی ضرورت کا شاہکار تھی۔

ناول کے مُصنّف سے سلیم بھائی مانوس تھے کیوں کہ وہ اُس کے ایک ناول کی ڈرامائی تشکیل کرچکے تھے۔ مصنّف کے مُنھ کو خون لگ ہی چکا تھا۔ اُسنے اپنے fan جنرل ضیاء الحق (طے شدہ شہید اور آخری جنگِ یو ایس ایس آر کے غازی) سے فرمائش کی کہ ٹی وی پر سلیم احمد سے میری فلاں ناول بھی کرادو۔ جنرل صاحب نے اُس جنرل سے، جو ٹی وی پر بٹھایا گیا تھا، کہلا بھیجا۔ ٹی وی جرنیل نے سلیم بھائی سے رجوع کیا۔ انھوں یہ کہہ کے معذرت کرلی کہ ناول اور میری صحت دونوں کمزور ہیں، کسی اَور سے کرالو۔ مصنّف کو سُن گن ملی، وہ دوڑا دوڑا بڑے جرنیل صاحب کے پاس گیا، مُختلِف جہادوں کی دُہائی دی اور تین چار ہفتے اِسلام آباد کے چکّر لگائے، جنرل صاحب کا جینا دوبھر کردیا۔ آخر کار جنرل شہید نے چھوٹے جرنیل کو پہلے عذابِ الٰہی پھر عذابِ اسلام آباد کی وعید دی اور ایک غیر مُصدّقہ روایت ہے کہ چھوٹے (ٹی وی) جرنیل نے ٹیلی فون پر سیّد سلیم احمد کے گوڈوں کو ہاتھ لگایا، اُس وضع دار سیّد نے ہامی بھرلی پھر مُجھے بلوا بھیجا۔ میں اُس زمانے میں (حسبِ معمول) کان پر قلم رکھ کے گھر سے نکلا ہوا تھا۔ میں نے اس شرط پر' کو-رائٹر 'بننا قبول کرلیا کہ مُجھے اصل تصنیف پڑھنے پر آمادہ/ مجبور نہیں کیا جائیگا۔ سلیم بھائی نے کہا چل ٹھیک ہے، نہیں کیا جائے

گا۔ غرض کام شروع ہوا۔ پہلی مُلاقات میں مُصنف مُجھے متکبر اور (اللہ معاف کرے) کم آگاہ لگا۔ میں نے جا بجا بے جا چٹکے لینا شروع کر دیے۔ یہ تک کہا کہ حضرت آپ کے establishment کی مُبیّنہ اسلامی جنگیں بیشتر Imperialistic Excursions تھیں۔ ہاں، میں نے کہا، بعض اپنے تیوروں میں heroic ضرور ہوں گی۔ اس لیے کہ کئی بار مسلم مجاہدوں نے ہم عصر ویتنامیوں جیسی "جی وٹ" سے کام لیا ہے۔ مُصنف نے مُجھے تقریباً دہریہ اور سرتا سر کرشتان declare کیا اور سلیم احمد پر دباؤ ڈالا کہ مجھے اس کام سے ہٹا دیا جائے۔ سلیم احمد نے کہلا بھیجا کہ کہو تو میں اپنا نام ہٹا لیتا ہوں۔ ویسے یہ سیریئل اگر میری نگرانی میں ہونا ہے تو اُسے وہ کرشتان ہی ۔ے گا۔

بعد میں مصنف نے اپنے پبلشر کے اُکسانے پر لاہور میں پریس کانفرنس کی اور کہا کہ میں ۔یم احمد کے کام سے بہت خوش ہوں تاہم "وہ دوسرا آدمی" گڑ بڑ کر رہا ہے اور تاریخ کو مسخ کر رہا ہے۔ دیگر یہ کہ بعض معتبر مسیحی حضرات میرے پاس وفد کی صورت میں آئے ہیں اُن کا کہنا ہے کہ "اس دوسرے آدمی" نے سیریئل میں وہ کچھ ڈال دیا ہے جو کتاب میں نہیں ہے۔ اس بات سے پ۔ستان کی مسیحی برادری شاکی بلکہ برہم ہے۔ { راقم الحروف نے اِنسائکلو پیڈیا برٹانیکا کی authority پر اسپینی Inquisition کی زیادتیوں کے کچھ نرم واقعات کو بُنیاد بنا کر سین لکھے اور شامل کیے تھے }۔ کراچی ٹی وی کے جنرل مینیجر نے Brittanica کے متعلقہ صفحات فوٹو اسٹٹ کرا کے اسلام آباد بھیج دیے۔ وہاں سے کسی مسخرے نے فون پر فرمائش کی کہ برٹانیکا سے کچھ اور واقعات سیریئل میں شامل کیے جائیں اس طرح سیریئل کے ڈرامائی تھرِل میں اضافہ ہو سکتا ہے وغیرہ۔ |

☆

سیدمُحسن علی کا خط۔ (تاریخ درج نہیں)

اسد بھائی۔ السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ واقعی اسد بھائی، آپ نے بڑی محنت اور بڑی کرم فرمائی کی۔

مُلاقات پر تفصیل عرض کروں گا۔ اب گذارش ہے کہ ایک تو بقایا سین جعفر میاں کو دے دیں۔ دوسرے مندرجہ ذیل دو سین اور لکھ دیں۔

اِضافی سین: ابو داؤد اور ابوعبداللہ کا گوشہ میں ایک سین جس میں ابوعبداللہ ابتداء میں ابو

داؤد سے کچھ کچھ ناراض رہتا ہے اور سین کے آخر میں ابوداؤد اس کو راضی کر لیتا ہے۔ اس سین کا اس طرح ہونے کا سبب یہ ہے کہ ابوعبداللہ جب قسطیلیہ میں تھا اس وقت ابوداؤد نے ابوعبداللہ کی رہائی کی کوئی کوشش نہیں کی تھی بلکہ ابوعبداللہ اپنے آپ کو قیدی سمجھتا رہا۔ دوئم یہ کہ ابوداؤد غرناطہ سے بھی بلا اجازت بھاگ گیا تھا۔ یہ دو سبب تھے جن کی وجہ سے ابوعبداللہ کچھ کچھ ابوداؤد سے شاکی ہوسکتا ہے۔ تو اب جبکہ فرنانڈس نے ابوعبداللہ کو لوشہ کا حاکم بنا (یا) ہے تو ابوداؤد لوشہ جا کر کچھ اور حق پڑ جاتا ہے۔

مطلب یہ کہ قسط نمبر ۲ کا جو اختتامی سین آپ نے لکھا تھا جس میں ابوداؤد، ابوعبداللہ کے سامنے ایک یکطرفہ تقریر کرتا ہے اس کی جگہ یہ مذکورہ سین آنا چاہیے۔

اضافی سین (ب): ابوداؤد فرڈیننڈ کا سین جس میں جیسے ہی فرڈیننڈ کو پتا چلتا ہے کہ ابو عبداللہ کو لوشہ کا حاکم بنا دیا گیا ہے وہ، یعنی فرڈیننڈ، ابوعبداللہ سے ملاقات کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ابوداؤد فوراً ابوعبداللہ کے پاس لوشہ جائے اور اُسے دوستی کے معاہدے پر قائل کر(ے)۔

اسد بھائی۔ یہ دونوں اضافی سین آپ فوراً لکھ کر کل سہ پہر ۳ بجے تک بھجوا دیں تاکہ میں کل شام ۷ بجے کے قریب ریکارڈ کرا لوں۔

باقی باتیں انشاءاللہ ملاقات پر   آپ کا نیاز مند۔ مُحسن علی

-۲-

'Shaheen' An 18 episode Television Drama Serial written by
Salim Ahmed and Asad Muhammad Khan

[میں نے اس سیریئل کا ڈھانچا سلیم بھائی کے layout کے مطابق ترتیب دیا تھا اور اُن ہی lines پر اسکرپٹس تیار کیے تھے کیوں کہ میرا خیال تھا کہ اس قسم کی ناولیں اپنے پڑھنے والے کا وژن distort کرنے میں ید طولیٰ رکھتی ہیں اور مجھے ایک co-writer with certain 'reservations' کا رول ادا کرنا چاہیے۔

میں نے بچپن میں اسلامی تواریخی ناولیں بہت پڑھی ہوں گی جبھی برسوں میرے ذہن میں اسلامی مُجاہد کی ایک تصویر یہ بنی رہی تھی کہ خون آلودہ شلوکہ تہبند پہنے گھٹے ہوئے سر کا ایک آدمی لمبی

سی تلوار پکڑے گھوڑے پر بیٹھا (یا ویسے ہی دوڑتا ہوا) کفار کو جہنم واصل کرتا چلا جا رہا ہے۔ (Quote: ''سر اور دھڑ کٹ کٹ کر گر رہے تھے'') ---(No insult intended) بھوپال کے قسائی کچھ اسی طرح کے ہوتے تھے۔ خیر۔

میں پھر کہتا ہوں کہ شاہین سیریئل سلیم بھائی کی محبت اور عالی ظرفی کی چھوٹی سی مثال ہے۔ میں خوش ہوں کہ اُنھوں نے اس میں میری شمولیت پر اصرار کیا۔ آج تک میں خود کو previleged سمجھتا ہوں کہ سلیم احمد کے منموہنے نام کے ساتھ اٹھارہ ہفتوں تک مجھ کم آگاہ کا نام آتا رہا۔ میں بہت سے سین بعض مخالفتوں کے باوجود سیریئل شاہین میں شامل کرنے میں کامیاب ہوا تھا جس پر اُس وقت مجھے عجب exhileration محسوس ہوتا تھا۔ ایک سین غرناطہ کے capitulation کے بعد کا مُجھے آج تک haunt کرتا ہے۔

رات میں ایک دلق پوش سایہ سا کوچوں میں ایک مجنونانہ مُسرّت کے ساتھ گشت کر رہا ہے۔ اُسے صوفی رقص کی ردم پر پڑھنے کو میں نے ایک آزاد نظم دی تھی جو کچھ اسطرح تھی کہ..... اے شہرِ بے مثال، اے شہرِ باکمال وغیرہ۔ نظم غرناطہ شہر کی شان و شکوہ کے بیان سے شروع ہوتی ہے پھر رفتہ رفتہ اپنے narration میں اُداس ہوتی جاتی ہے۔ دلق پوش غرناطہ کے ایک بڑے چوک پر اپنی لاٹھی کے سہارے تھک کے بیٹھتا اور اس بے مثال شہر کے برباد اور سرنگوں ہونے پر ماتم و گریہ کرتے ہوئے سر پہ خاک ڈالتا ہے پھر اُٹھ کے مجنونانہ رقص کرتا ہے کہ الوداع! الوداع! اے شہرِ کم سواد اے شہرِ مُردگاں اے شہرِ مُردگاں اے شہرِ مُردگاں... اداکار قاضی واجد نے heavy getup کے ساتھ دلق پوش کا رول کیا تھا۔ رکارڈنگ اوکے ہوئی تو میں نے سیٹ پر آ کر واجد سے معانقہ کیا۔ اُس کے رُخسار آنسوؤں سے تر تھے۔

اب میں وہ آخری Commentary نقل کرتا ہوں جس پر (راوی کی آواز میں) یہ سیریئل ختم ہوتا ہے۔]

☆

Last and Concluding Frame of the Serial Shaheen.

This commentary is read by the Narrator. Reading time: 45 seconds.

راوی: اِس معرکے میں بھی، ہمیشہ کی طرح، آگے آگے اُن کا امیر تھا جسے وہ شاہین کہتے

تھے۔ پھر وہ تین ہزار سوار تھے جنھوں نے اپنے لیے آزادی کی زندگی اور آزادی کی موت پسند کی تھی۔

یہ اُن کے بیٹے تھے جنھوں نے ایک پسماندہ سرزمین میں تہذیب اور علم و دانش کی فصل بوئی تھی، جو آٹھ سو برس تک اُس کی تاریک مٹی کو روشن کرتے رہے۔ اُس دن وہ میدان میں نکلے اور پھر لوٹ کر نہ آسکے، کیوں کہ وقت تو جابر اور مجبور سبھی کو فنا کے گھاٹ اُتار دیتا ہے۔ بس غیرت مندوں اور عزّت داروں کے نام اور اُن کے کام زندہ رہتے ہیں۔ وادیء الکبیر کے آزاد مردوں کی یہ کہانی انسانی تاریخ اُس وقت تک دُہراتی رہے گی جب تک غلامی سے انکار کرنے والا ایک بھی آدمی زمین پر اپنے قدم جمائے کھڑا ہے۔

(part of the script that AMK wrote)

-۳-

A quotation from Lane Poole's MOORS IN SPAIN

Translated by Hamid Ali Siddiqui Saharanpuri

قرطبہ کی حالت ایک سرحدی شہر کی حالت سے کم نازک نہیں جو غنیم کے سب سے پہلے حملے کی اُٹھتی ہوئی موج کے تھپیڑ سہتا ہے۔
باشندگان رات کو سوتے سوتے اکثر چونک پڑتے ہیں کیونکہ پولی کے خوں خوار سوار دریا کے اس طرف شبخون کرتے ہیں۔ بدنصیب کسانوں کی درد انگیز چیخیں جن کے مظلوم حلقوں پر ظلم کی تلواریں چلتی ہیں رات کی خاموشی میں صاف سُنائی دیتی ہیں۔ مُلک کی حالت مقامِ تباہی میں ہے۔ مُصیبتیں پر مُصیبتیں مسلسل نازل ہو رہی ہیں، قزاقی اور لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے بیوی بچے تک پکڑ کر غُلام بنائے جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ سلطان کے سِفلہ مزاج، ضعیف اور محض لاشئے ہونے سے رعایا الگ نالاں تھی، فوج الگ شکست مند تھی کیوں کہ مُدّت سے تنخواہیں نہ ملی تھیں۔ صوبے داروں نے خراج دینا بند کر دیا تھا شاہی خزانے بالکل خالی ہو گئے۔ جو روپیہ بطور قرض لیا گیا وہ اُن عربی سرداروں کی نذر ہوا جو ابھی تک مدد اور معاونت کے سبز باغ دکھلاتے

جاتے تھے۔

قرطبہ کے خاموش اور سرد بازار حسرت سے اپنی گذشتہ تجارت کی گرم بازاری یاد دلاتے تھے۔ ماکولات بیش بہا ہوتے ہوئے بے بہا ہو گئے۔ کسی فرد کو ایک دم کا بھروسا نہ تھا۔ ہر وقت سب کے دل یاس و نا اُمیدی سے لبریز رہتے تھے متعصب دیندار یا کہو کہ مُلّانے جو خلق اللہ کی تباہی کو ایک عذابِ الٰہی اور ابنِ حفصون کو (جلالِ الٰہی کا) چابک تصوّر کرتے تھے، اپنی جاں گزا پیش گوئیوں سے لوگوں کو الگ لرزا رہے تھے اور کہتے تھے "افسوس اے کم بخت قرطبہ! اے دنیا بھر کی آلائشوں اور خرابیوں کے منبع! اے مصائب و تکالیف کے مخرج! اے بے پُشت و پناہ، بے یار و مدد گار شہر!

جب وہ کریہہ المنظر دراز بینی کپتان جس کا پیش اسلامیوں سے اور پُشت مُشرکوں سے محفوظ ہوگی تیرے سہمے ہوئے شہر پناہ کے سامنے آئے گا تب تیری افسوسناک قسمت کا بالکل فیصلہ ہوجائے گا۔

AComment :

[اِس Collage کو کسی بھی comment کی ضرورت نہیں تھی اگر سرسری مطالعہ کرنے والے سے مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ وہ جہاد کے ذکر سے بدگمان ہو کر اور غرناطہ میں میرے دلق پوش کی موجودی سے، اُس کی نظم شہرِ مُردگاں کا حوالہ سن کر اور لین پُول کے مُندرجہ بالا اقتباس سے کوئی تاثُر لے کر ان شہروں غرناطہ اور قرطبہ کو کابُل شہر کا اِلتباس سمجھ بیٹھے گا۔

مشکل یہ ہے اِن دنوں اخبار بہت پڑھا جا رہا ہے۔ ٹی وی ریڈیو بہت دیکھا سُنا جا رہا ہے۔

جی نہیں یہ شہر کابُل نہیں ہے۔ وہ بدنصیب شہر تو ڈھائی سو برس سے خود کو قتل کرنے میں مصروف ہے۔ بسے گا کب، اُجڑے گا کب۔

قرطبہ کے بے یار و مدد گار شہر کو لین پول نے کسی کریہہ المنظر دراز بینی کپتان کی آمد کے خوف سے لرزتے بیان کیا ہے جو اُس بے پُشت و پناہ شہر کے سامنے آئے گا اور اُس کی افسوس ناک قسمت کا بالکل فیصلہ کردے گا۔

میرے لیے یہ حوالہ غور طلب ہوتا اگر مَیں اخبار پڑھتا، ٹی وی یا ریڈیو دیکھتا سنتا یا میں کم فہمی سے درازبینی کپتان کی آمد کو regional اور contemporary معنی پہنانے کی کوشش کرتا......یا اپنے خوش منظر الائیز سے خواہ مخواہ بدگمان ہوتا۔

بھائی میں نے تو ایک پرانے ٹی وی سیریئل کی بات سنائی ہے جو اب کسی کو یاد بھی نہیں ہے۔]

***

آصف فرخی

سرشتہ داری:
ایک منتی کہانی

بات یوں بھی بگڑ سکتی ہے، مجھے معلوم نہ تھا۔ اب کی بار عید پردیس میں ہوگی، سفر پر نکلتے ہوئے تشویش بس اسی بات کی تھی۔ اس بار دوری پر گھر والوں کی فکر۔ خود مجھے شاید یہ پریشانی بھی نہ تھی۔ بار بار دہرائے جانے سے محض ایک رسمی کارروائی بن کر رہ جانے والے معمول سے آزادی کا ایک احساس اندر دبا دبا سا ہوگا، ورنہ آدمی سفر پر نکلے ہی کیوں؟

اتنی سی بات ہی تو میں دانیال کو سمجھا نہیں پا رہا تھا۔ اس کی سات سالہ منطق اسی ایک سوال پر آ کر اٹک جاتی تھی: ''آپ وہاں جا رہے کیوں ہیں؟''

اب یہ کیوں اسے کیسے سمجھاؤں۔ سوال کہاں کا نہیں تھا۔ اس لیے کہ ہندوستان اسے معلوم تھا...... امیتابھ بچن، دلیر مہندی، زی ٹی وی، پھٹی ایڑی اور ملائم توچا کو چکنا کرنے کے لیے اور بھی ملائم اشتہار، شاہ رخ خان، کون بنے گا کروڑ پتی...... جتنا ''انڈیا'' اسے چاہیے تھا وہ ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبا کر اپنے کمرے میں لیٹے لیٹے ٹی وی اسکرین پر دیکھ سکتا تھا۔ اسکرین کے پار جانے کی ضرورت کیا پڑ گئی، میں نے اسے ڈلی کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتانا چاہا۔

یہ بھی وہ سمجھ سکتا تھا۔ مگر پھر اس سے آگے کیوں؟ ''لکھنا ہو؟ وہ کیا ہوتا ہے؟''

''میرے ابو جب تم سے بھی چھوٹے تھے، وہ وہاں رہتے تھے......'' میں بات کو بالکل پتلا پانی کر کے اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔

مگر اس کے پاس ہر بات کے جواب میں ایک سوال تھا۔ ''وہ وہاں کیوں رہتے تھے؟ وہ یہاں کیوں نہیں رہتے تھے؟''

''ان کا گھر پہلے وہاں تھا۔ وہ وہاں پیدا ہوئے تھے،'' میں اپنی بات کو اس سے سادہ نہیں کر سکتا۔

لیکن دانیال نہیں مانتا۔ ''Oh no, Dada is not an Indian!'' وہ سر ہلا دیتا ہے۔
وہ وہاں سے اٹھ کر برآمدے میں بال کھیلنے لگتا ہے، جس پر اس کی امّی اسے پھر ٹوک دیں گی۔

خلافِ معمول وہ مجھے چھوڑنے کے لیے گیٹ سے باہر تک آئے تھے۔ ورنہ میرا آنا جانا اتنا لگا رہتا ہے کہ انھوں نے اس کا زیادہ نوٹس لینا تقریباً چھوڑ ہی دیا ہے۔ ایئرپورٹ جانے کے لیے میں گاڑی میں بیٹھ گیا تھا، مگر ابوّ کے ہونٹوں کی حرکت ابھی تک جاری تھی۔
اب وہ کیا کہہ رہے ہیں، میں نے کھڑکی کا شیشہ اُتار لیا۔ وہ معمول سے بھی آہستہ بول رہے تھے۔ ''نادان محل سے آگے رکاب گنج کے پل کے سامنے ایک چڑھائی ہے۔ نیچے سے ریلوے لائن گزرتی تھی۔ چڑھائی جہاں ختم ہوتی ہے، اس کے سامنے والی قطار میں مکان تھا، میرا ننھیال۔ تمہاری دادی اس مکان میں آ کر رہا کرتی تھیں۔ دیکھنا کہ اب وہاں کچھ ہے بھی......''
وہ اپنی بات وہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ میں شیشہ اوپر کر لیتا ہوں۔ گاڑی چل پڑتی ہے۔

یہ سفر ہنسی خوشی شروع ہوا تھا۔ ایئرپورٹ کی انتظار گاہ میں عطیہ داؤد ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھیں۔ ہمہ وقت سنجیدہ اور بُردبار زاہدہ حنا کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کھلی پڑ رہی تھی جب ہم یہ ذکر کرتے کہ کس قدر مہمل اور فضول مراحل سے گزر کر عازم سفر ہو رہے ہیں۔
جب دعوت نامہ ملا تھا تو ہم تینوں میں سے کوئی بھی جانے پر آمادہ نہ تھا۔ وقت کی تنگی اور یہاں اپنے روزمرہ کے اُلجھاوے...... ہندوستان کے ویزا کی آرزو کون کرے اور پھر یہ ہفت خواں طے کرنے کے لیے صحراؤں میں سر پھوڑے؟ ہمارے میزبانوں کے پیہم اصرار، درمیان کے فاصلے انتظامات میں بدحواسی اور شتابی، یہ سب مرحلے بھی حارث خلیق کی بدولت طے ہو گئے، جو خود بھاگتے بھوت بھی ہیں اور لنگوٹی کے پکڑیّا...... میں اسلام آباد سے بھاگم بھاگ واپس آیا، ڈیڑھ دو دن میں اسباب سفر بندھ گیا اور ہم یہاں تک پہنچ گئے۔

مگر ہنوز دلّی دور است۔ پرواز میں تاخیر کا اعلان ہوتا ہے اور فلمی دُھن بجنے لگتی ہے۔ ''تم جگ جگ جیو مہاراج، ہم تیری نگریا میں آئے......'' عطیہ فوراً دُھن پہچان لیتی ہیں۔ ''بالکل حسب حال ہے'' زاہدہ حنا ایئرپورٹ کے عملے کی خوش ذوقی کی داد دیتی ہیں۔

تیری نگریا میں آئے؟ تو دِلی کیا مہاراج کی ہوگئی ہے؟ اپنی نگریا نہیں رہی؟ میں گڑ بڑا جاتا ہوں۔ پہلے ہی قدم سے یہ گڑبڑاہٹ نہ رہے، اس پر قابو پانا چاہیے، میں سوچتا ہوں۔

موسم کی خرابی کی وجہ سے پرواز میں تاخیر...... اناؤنسر کی آواز نور جہاں کی دُھن پر پھر حاوی آجاتی ہے۔

''کل صبح میں اسلام آباد کے ہوائی اڈّے پر انتظار کر رہا تھا۔ یہی آواز، یہی اعلان۔ وہاں بھی موسم خراب تھا۔ آج دلّی کا موسم خراب ہے دونوں جگہ وجہ ایک ہی، وہی دُھند...... یہ کیسا تعلق ہے......'' میں زیرِ لب کہتا ہوں۔ میری آواز شاید زاہدہ حنا تک نہیں پہنچتی کیوں کہ ''تیری نگریا میں آئے'' کی دُھن پھر بجنے لگتی ہے۔

ہوا کے دباؤ میں کمی آتی ہے نہ آکسیجن ماسک ہمارے سامنے گر پڑتا ہے۔ یہ خوشی دورانِ پرواز ہمارے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے بلکہ دلّی ایئرپورٹ پر اتر کر امیگریشن اور اندراج کے دوران بھی۔ میرا موڈ کسی بات پر خراب نہیں ہوتا...... ضلع بجنور، اتر پردیش کے محمد فاضل پر بھی نہیں، جو میرے برابر کی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہے اور ٹھیٹھ لہجے میں بتاتا ہے کہ دو سال کے بعد سعودی عرب سے گھر واپس جا رہا ہے جہاں بیوی بچےّ اس کے منتظر ہیں۔ مجھے اس سے کوئی یگانگت محسوس نہیں ہوتی، نہ تنگ پاجامے پہنے، رسّی سے بندھی گٹھریاں سنبھالے ان دو بڑھیوں سے جو ہانپتی کانپتی ہمارے پیچھے لائن میں ہیں اور ہر قدم پر کسی نہ کسی سے مدد مانگتی ہیں...... ان کے سفر کا محرّک کیا ہوسکتا ہے؟ شادی؟ غمی؟ سوگ؟ میں سوچنا بھی نہیں چاہتا...... ''آپ نے دلّی میں اپنا پتہ نہیں لکھا۔ آپ کہاں رہیں گے؟'' کاؤنٹر پر بیٹھی دلی پولیس کی لیڈی آفیسر ہم سے پوچھتی ہے۔

پتہ ہمیں خود معلوم ہوتو ہم بتائیں، میں یہ سوچ کر بالکل پریشان نہیں ہوتا۔

''آپ کو پتا ہیں اور ہم کوئی ہیں۔'' عطیہ داؤد اس کی نیم پلیٹ پڑھ کر اس سے کہتی ہیں۔ وہ ہمارے دعوت نامے دیکھ کر خود ہی خالی جگہ پُر کرنے لگتی ہے اور اس دوران زاہدہ حنا سے ہندوستانی ٹی وی سیریلز کی مقبولیت پر تبادلہ خیال بھی کر رہی ہے۔ ''آج کل کہانیاں فیملی کو لے کر ہونے لگی ہیں'' وہ ہمیں بتاتی ہیں۔ ''کیا آپ کے وہاں بھی ایسا ہے؟'' وہ سوال کرتی ہیں۔ یہاں اور وہاں...... سب کا یہی سوال ہے۔

''جو آپ کے یہاں ہے، وہ ہمارے وہاں بھی ہے'' میں بیچ میں بول اٹھتا ہوں۔ وہ سر ہلاتی

ہے اور کاغذوں پر ٹھپے لگا کر ہمارے حوالے کر دیتی ہے۔ اب ہم دِلّی میں داخل ہو سکتے ہیں۔

عطیہ داؤد کا کوئی فارم بھرنے سے رہ گیا۔ وہ خانہ پری کر رہی ہیں۔ میں آگے بڑھ کر چیکنگ سے نکل آتا ہوں اور سیاہ فام اژدھے کی طرح لپ لپ سرکتی پٹی سے سامان اتار کر ٹرالی پر رکھنے لگتا ہوں۔ کوئی گھبراہٹ ہے نہ پریشانی کہ دشمن ملک کی چیک پوسٹ پر ہیں......

کاغذات اور سامان سنبھالتے ہوئے ہم باہر نکلے تو کانفرنس کے نام کی تختی اٹھائے، ایک چھ فٹا، لمبا، اونچا سکھ نوجوان ہماری طرف لپکتا ہے۔ ''میں من جیت سنگھ ہوں'' وہ اپنا تعارف کرا کے ہمیں گاڑی میں بٹھا دیتا ہے۔ دلّی کی سڑکوں پر رواں ہوئے پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے کہ وہ ہمیں بتا دیتا ہے کہ اس کے ماں باپ سیالکوٹ سے آئے تھے۔ اس کی مسکراہٹ مجھے اور بھی زیادہ مخلص معلوم ہوتی ہے۔ باہر دِلی کی سڑکوں پر اجلی دھوپ پر پھیلا رہی ہے۔ اس پرندے کی طرح جو پرواز کی تیاری میں ہے۔

''واپسی کی تاریخ؟'' ریسپشن کے رجسٹر میں اندراج کرواتے ہوئے میں پھر گڑبڑا جاتا ہوں۔ اس وقت میں اس سوال کا جواب دینا بھی نہیں چاہتا۔ انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں سامان رکھ کر میں اس شہر سے اپنی شناسائی بحال کروانے نکل پڑتا ہوں۔ دلّی کی نرم نرم دھوپ میرے کانوں میں فاختہ کی طرح کن من کن من کر رہی ہے۔ ذرا دیر کی بات ہے کہ خلیل خان کی یہ فاختہ اُڑ جائے گی۔

سفر کے دوران گاڑیوں کی کھڑکیوں سے باہر دیکھنا کتنا اچھا لگتا ہے۔...... بدلتا ہوا منظر ساتھ چلتا رہتا ہے اور اپنے اندر گھل مل جانے کے لیے بلاتا رہتا ہے۔ اس بلاوے پر میں جا نہیں سکتا مگر اس کی دل کشی میں کھو تو سکتا ہوں۔ بڑی بڑی کانفرنسوں اور میٹنگوں سے اکتا کر میں کمرے کے باہر کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں۔ میں کانفرنسوں اور مقالوں پر دھواں دھار بحث سے جلد بے زار آ جانے والا آدمی ہوں۔...... میں یہ سب باتیں دہرا کر اپنے آپ کو باور کرا رہا ہوں۔ دلّی پہنچ کر کانفرنس کے پروگرام کی تفصیل ملی ہے۔ میرا مقالہ پہلے ہی دن ہے۔ یہاں آنے کی بھاگ دوڑ میں مقالہ لکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ صبح چار بجے سے اٹھ کر سفید کاغذ کو سامنے رکھے بیٹھا ہوں جو ایسے لمحوں میں مجھے اپنا زنداں معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہ سب کھکھیڑ کس لیے؟ کیا مجھے اس کانفرنس میں آنا بھی چاہیے تھا؟ کہیں اس کے ساتھ کوئی ڈور تو بندھی ہوئی نہیں؟ آنے سے پہلے میں نے یہ

ہر ایک کوئی نہ کوئی ہے، وہاں کون کیا ہے۔ ہندوستان کے صدر جمہوریہ آرہے ہیں، یہ سیکورٹی کا بندوبست ان کی وجہ سے ہے۔ دو سابق وزرائے اعظم، ایک آدھ وزیر، جانے کون کون وی وی آئی پی...... وی آئی پی اور سی آئی ڈی اور ایسے موقعوں پر نمودار ہونے والی اسی طرح کی مخلوق۔ مجمع کی ہلچل میں ایک اضطراب کی لہری اٹھتی ہے، پھر دب جاتی ہے۔ صدر صاحب آگئے۔ لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے، چرغم چرغم تھم گئی، معززین شہ نشین پر پکارے گئے، احترام کے ساتھ بٹھائے گئے۔ مہاشویتا دیوی اور بھیشم ساہنی نے آگ دکھائی، لیمپ روشن ہوا، جلسے کی کارروائی شروع ہوگئی۔ اجیت کور نے استقبالیہ کلمات ادا کیے۔ جذبات کا مظاہرہ کیا۔ خوش ونت سنگھ نے مختصر تقریر میں وہ سب کہہ دیا جو اس موقع پر کہنا چاہیے تھا۔ وی پی سنگھ بولے، اندر کمار گجرال بولے۔ تالیاں بجیں، اُردو کے شعر پڑھے گئے۔ اچھی اچھی باتیں ہوئیں۔ ایک سیکورٹی والا ٹانگ پسارے میرے سامنے ہی فرش پر بیٹھا تھا۔ اس کا موبائل فون بجنے لگا۔ ایک گھنٹی، پھر دوسری گھنٹی، متواتر آواز۔ میری توجہ بٹ گئی۔ گردن گھما کر دیکھا، پیچھے کی طرف نشستوں میں بھن بھناہٹ سی ہے، کچھ لوگ باتیں کررہے ہیں۔ ایک آدمی تیز تیز چلتا ہوا اسٹیج پر آتا ہے۔ صدر کے پیچھے کھڑے فوجی افسر سے کچھ کہنے لگا ہے۔ ایک سرگوشی سی اسٹیج پر گھومنے لگتی ہے۔ اجیت کور اپنی جگہ سے اٹھتی ہیں۔ پہلے اس سے، پھر کسی اور سے کھسر پھسر کرنے لگتی ہیں۔

"She is a fidgety old bird" میں اپنے آپ سے کہتا ہوں۔

But there's no stopping her- ساڑھی کا پلو اور شال سنبھالتی ہوئی وہ صدر جمہوریہ کے کان میں کچھ کہہ رہی ہیں۔ وہ وہاں سے ہٹ کر روسٹرم پر آتی ہیں اور صدر صاحب بھی اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے روسٹرم کی طرف آتے ہیں، پھر رُک جاتے ہیں۔ ''صدر جمہوریہ کو کسی وجہ سے جلدی جانا پڑ رہا ہے۔ پارلیمنٹ ہاؤس میں کوئی پرابلم ہوگئی ہے۔ اس لیے وہ رُک نہیں سکتے۔ مگر صدر جمہوریہ ادیبوں کی محفل کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے۔ اس لیے وہ انعام دے کر چلے جائیں گے'' اجیت کور ہمیں بتاتی ہیں۔

کیا ہوا ہے، حاضرین میں بیٹھے ہوئے لوگ آپس میں باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ''ہوا کیا ہے، ان کے پارلیمنٹ کے بارے میں کل بھی ہمارے ہاں خبر چھپی تھی۔ کہ تقریریں ہوتے ہوتے ہاتھا پائی ہونے لگی تھی۔ آج کرسیاں چل رہی ہوں گی۔ ان کی جمہوریت کا حال یہ ہوگیا ہے'' میں پیچھے بیٹھی ہوئی عطیہ داؤد سے کہتا ہوں۔

وہ جواب میں کچھ کہنا شروع ہی کرتی ہیں کہ اجیت کور سب کو چپ کروا کے انعامات کا اعلان کرنے لگتی ہیں۔ سارک ادبی انعام کے لیے زاہدہ حنا کا نام پکارا جاتا ہے۔ ہمیں پہلے پہل ایک خوش گوار حیرت ہوتی ہے۔ وہ اجیت کور کی بٹھائی ہوئی جگہ سے اٹھ کر صدر جمہوریہ سے انعام وصول کرنے کے لیے تالیوں کی گونج میں آگے بڑھتی ہیں۔ ہمیں لگتا ہے کہ ہمارا سر بھی فخر سے اونچا ہوگیا کہ یہ ہمارے ملک اور افسانہ نگاروں کی ہماری برادری کے لیے اعزاز ہے۔

باقی تین انعامات ہندوستان کے قبائلی اور دلت لوگوں کی صورت حال پر قلم اٹھانے والوں کے لیے ہیں۔ وہ پہلے مہاشویتا دیوی کے آگے جھکتے ہیں، پھر انعام وصول کرنے جاتے ہیں۔

''صدر جمہوریہ کو جانا ہے، اس کے بعد بھی جلسہ جاری رہے گا'' اجیت کور اعلان کرتی ہیں مگر شہ نشین سے لوگ اُتر اُتر کر جانے لگتے ہیں۔ بکھرتے ہوئے جلسے کو روکنے کے لیے اجیت کور کی آواز بھی ناکافی ثابت ہوتی ہے۔

جلسہ تتر بتر ہوجاتا ہے اور لوگ ادبدا کر باہر جانے لگتے ہیں۔ زاہدہ حنا کو مبارکباد دینے والے گھیرے ہوئے ہیں۔ میں بھی ان میں شامل ہونا چاہتا ہوں اور اتنی دیر کے بندھے رہنے کے بعد ایک پیالی چائے کی طلب بھی ہے۔ ''پارلیمنٹ ہاؤس میں گولی چل گئی ہے'' چائے کے دوران میں کسی کو کہتے ہوئے سُنتا ہوں۔ چائے کے رش اور لوگوں کی ریل پیل میں اور کسی بات کا پتہ ہی نہیں چلتا۔

کوئی کہتا ہے، سب ٹی وی پر دکھا رہے ہیں۔ چائے اور دانشور چھوڑ کر ٹی وی کے سامنے وان جائے۔ ہو رہے گا جو ہونا ہے۔ میں لوگوں سے باتیں کرتا رہتا ہوں اور کان میں بھنک بھی پڑتی رہتی ہے۔ جب میں اندر جانے لگتا ہوں تو سنٹر کے لاؤنج میں رکھے ٹی وی کے گرد جمع ہونے والے لوگوں کو دیکھ کر ٹھٹھک جاتا ہوں۔ ''پارلیمنٹ ہاؤس پر حملہ'' ٹی وی پر مسلسل بولتے ہوئے چہرے کے نیچے اس عبارت کی نیلی پٹی مسلسل حرکت کر رہی ہے۔ ایک خبر چیخ چیخ کر کچھ کہنے لگتی ہے۔ امیج بدلتی ہے: دیوار پر گولی کے نشان اور فرش پر خون۔ میری آنکھیں وہیں رُک جاتی ہیں اور پاؤں چلتے رہتے ہیں۔

گولی اور خون، پارلیمنٹ ہاؤس اور حملہ — یہ لفظ اچانک ایک دوسرے سے جڑ جاتے

ہیں...... میں کہاں کا ہوں اور اس وقت کہاں ہوں، اس احساس سے دفعتاً میں سراسیمہ ہو جاتا ہوں۔ لوگ میری طرف نہ دیکھنے لگیں...... کس کس کو بتاؤں کہ میں کیا جانوں، میں بھی تو دیکھ رہا ہوں...... پاکستان، پاکستان، ہر طرف سے آوازیں آ رہی ہیں۔ کانفرنس میں ملنے والا بیگ مضبوطی سے پکڑ کر میں باہر آنے لگتا ہوں۔ اس کے بعد جو سیشن ہے، اس میں مجھے مضمون پڑھنا ہے۔ دہشت گردی کی دہشت کو چھوڑ کر ایک اور خوف مجھے پکڑ لیتا ہے...... ناقدین کی دہشت۔

میرا خدشہ بے جا نہیں تھا۔ ادھر مضمون پڑھ کے ہٹا، ادھر بنگلہ دیش کے ممتاز نقاد کو غصہ آ گیا۔ ''پاکستان کے ایٹمی دھماکے پر خوش ہونے والے ہمارے ہاں بھی بہت لوگ تھے۔ مگر مضمون نگار نے بنگلہ دیش کا نام تک لینا گوارا نہیں کیا'' وہ میری طرف دیکھ کر گرج اٹھتے ہیں۔ ان کا اعتراض میری سمجھ میں کچھ آیا، کچھ نہیں آیا۔ وجہ ناراضگی نہیں معلوم، میں لوگوں سے یہی پوچھ رہا ہوں اور اس دوران جوں جوں حملے کی تفصیلات فلٹر ہو کر آ رہی ہیں، اپنے خوف کو ''منطقیانے'' کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر میری پریشانی لوٹ آئی ہے...... وہی گھبراہٹ، دل کا زور زور سے دھڑکنا، پیٹ میں چبھن...... اب کیا ہوگا؟ وہی سوال جس سے مجھے پیشہ ورانہ نفرت ہے۔

کانفرنس میں بڑی چہل پہل ہے۔ دھواں دھار مقالے، شعلہ بار نظمیں، اتنے بہت سے نامی گرامی ادیب...... جو خاتون پہلے ہی دن ناشتے کی میز پر بہت باتیں کرتی دکھائی دی تھیں، بنیرا گری ہیں، نیپال کی مشہور شاعرہ، جن سے کٹھمنڈو میں ملاقات ہوئی تھی۔ ٹوپی والے یہ بزرگوار الحمود ہیں، بنگلہ دیش کے ممتاز شاعر۔ سادہ اور پُر وقار، یہ ہیں مہاشویتا دیوی، جنہیں سب دیدی کہہ کر بلاتے ہیں۔ اوہو، یہ پنج سنگھ ہیں، جن سے لندن میں ملاقات نہیں ہو سکی تھی اس لیے کہ وہ ہندوستان گئے ہوئے تھے۔ دبلے پتلے اور us-assuming منگلیش ڈبرال، جو اُردو میں اپنی نظمیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ ''میں تھوڑی تھوڑی اُردو پڑھ سکتا ہوں مگر اب بھولنے لگا ہوں'' وہ مجھے بتاتے ہیں۔ ایک اچنبھے کے ساتھ میں اُدے پرکاش سے ملتا ہوں جن کی کہانیوں کا میں بڑا مداح ہوں۔ ''یہاں آنے سے تھوڑے دن پہلے میں نے ''پیلی چھتری والی لڑکی'' پڑھی ہے۔ کیا مزے دار ناول ہے اور پھر مادھوری دکشٹ کی پیٹھ......'' میں ان سے کہنا شروع کرتا ہوں، پھر اس ذکر پر رُک جاتا ہوں۔

وہ ہنستے ہیں اور مجھے بتانے لگتے ہیں کہ اس ناول پر بہت سے اعتراضات کیے جا رہے ہیں اور اس کے تیز لہجے نے بعض لوگوں کو ناراض کیا ہے۔

''کمال ہے، مادھوری دکشت کی پیٹھ کے باوجود؟'' مجھے بڑا تعجب ہوتا ہے۔ لوگوں کو پیٹھ پیچھے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔ خاص طور پر جب پیٹھ اور پیچھا مادھوری دکشت کا ہو۔

''میں، بائیس سال بعد میری شاعری کی نئی کتاب چھپی ہے'' پنچ سنگھ ایک ہاتھ سے ناشر کو تھامے، ایک ہاتھ میں کتاب اٹھائے آتے ہیں۔ میں شکریہ ادا کر کے کتاب رکھ لیتا ہوں۔

مہاشویتا دیوی کے پاس بھی مجھ سے کہنے کے لیے کچھ ہے۔ ''دیدی، ایک ہزار چوراسی کی ماں سے میں کراچی میں ملا ہوں۔ ''ایک ہزار چوراسی کی ماں'' کراچی کے حالات پر لکھی جانے والی سب سے اچھی اور سچی کتاب ہے'' میں ان سے کہتا ہوں۔ ''کوئی یقین نہیں کرے گا کہ یہ کتاب آپ نے کراچی کے بارے میں نہیں لکھی۔'' ان کی تحریر آنچ دیتی ہے مگر گفتگو میں بہت ٹھہراؤ ہے۔ ''میں کبھی ایسے شال نہیں اوڑھتی'' وہ اسٹیج پر اجیت کور سے تحفہ وصول نہیں کرتیں اور کتابوں پر دستخط کر کے آگے بڑھ جاتی ہیں۔

کانفرنس ہمارے گرد بُنا ہوا ایک کویا ہے۔ اجیت کور نے ریشم کے کیڑے کی طرح اسے ہمارے چاروں طرف تیار کر کے تان دیا ہے۔ اس کوئے کے باہر ایک شہر کا موڈ بدلتے ہوئے دیکھ رہا ہوں

حملے کا ابتدائی صدمہ، کنفیوژن کم ہونے نہیں پاتا کہ الزام تراشی شروع ہو جاتی ہے۔ کون ہے اس کا ذمہ دار؟ جہادی تنظیموں کے نام لیے جاتے ہیں، لشکرِ طیبہ جس کا نام نیوز کاسٹر کی زبان سے پھسل کر گولی ہو جاتا ہے، طوطے یا اور تلفظ کی کسی غلطی کے بغیر، دو ٹوک اور صاف، پاکستان، پاکستان۔ میں یہ نام سراسیمگی اور افسوس کے ساتھ بار بار سنتا ہوں۔ گڈ آدھ مجرم ہوں، گاہ کف افسوس ملتا ہوں۔ پر تشدد برق کی اور افسوس حاصل کا۔ افسوس، کوفت، تشویش، بے کلی، ندامت، شرمساری میں اپنے جذبات کے الجھے دھاگوں کو الگ الگ نہیں کر سکتا، بس ان کی یورش سے نڈھال ہو سکتا ہوں۔

بے کیفی بڑھ رہی ہے، اب دوستوں سے ملنا چاہیے...... دلّی سے اب میری شناسائی خوف کے سائے میں ہو رہی ہے۔ جہاں جاؤ یہی ذکر، یہی باتیں...... اتنے دن بعد یہاں آنے کا صدمہ اپنی جگہ۔

''آؤ جی، آؤ جی......'' مجھے آتا دیکھ کر اجیت کور دور سے آواز دیتی ہیں۔ کانفرنس اپنی رفتار پر آ گئی تو ان سے بھی بات کرنا ممکن ہوا۔ ہجوم اور انتظام سے دور، انہیں براہ راست گفتگو میں، یعنی فوجی اصطلاح میں ون ٹو ون کاؤنٹر میں دیکھا جائے تو ان کے اصل خدوخال نمایاں ہوتے ہیں کہ وہ ٹھیٹھ پنجابی اسٹائل کی کھلی ڈلی اور بے حد پرخلوص شخصیت ہیں۔ دکھ کے انگارے اندر دہک رہے ہیں جس پر راکھ کی تہہ ہے۔ پھر میں نے ان کا گھر دیکھا جس کا بیرون، ان کے اندرون کا عجیب طرح سے آئینہ دار معلوم ہوتا ہے۔ مگر میرے لیے اس سفر کی دریافت ارپنا کی تصویریں ہیں۔ مکان کے نچلے حصّے میں نمائش گاہ ہے جہاں ارپنا کی سلسلہ وار تصویریں ''سوہنی اور مہینوال'' دیواروں پر آویزاں ہیں۔ پیلے رنگ کی اداس دمک اور نیلے رنگ کی مدوّر گہرائی کو میں ایک ٹک دیکھے گیا۔

کانفرنس کے ہجوم میں اجیت کور مہمان نوازی کا کوئی موقع نہیں چھوڑتیں۔ ان کے ساتھ مستقل کام میں مصروف رہنے والوں میں سے ایک سردار جی اپنا تعارف کراتے ہیں۔ میں ان کا نام پہلی بار میں نہیں سمجھ پاتا۔ ''آپ مجھے نووی پکار لیں'' وہ مجھ سے کہتا ہے اور لکھنؤ کے سفر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی میری مشکل آسان کرتا ہے۔ ہندوستان کے دوسرے شہروں سے آئے ہوئے لوگوں میں ندا فاضلی بھی ہیں۔ ماحول میں تناؤ جتنا بھی بڑھتا جا رہا ہو، اس شام فرحت احساس اور میں، ندا فاضلی کی گفتگو سن رہے ہیں تو ایسا لگ رہا ہے کہ اردو شاعری کے لطفِ بیان کے علاوہ کوئی اور حقیقت وجود ہی نہیں رکھتی۔ ''دل گیا، تم نے لیا، ہم کیا کریں...... ذرا الفاظ کی نشست و برخاست پر غور کیجیے......'' ندا فاضلی بتا رہے ہیں اور ہم ان کی باتوں میں محو بیٹھے ہیں۔

دلّی کے مضافات سے بھی آگے نکل کر عبید صدیقی کے گھر۔ اتنی مدت کے بعد ان سے تجدید ملاقات ہوئی ہے کہ ان کے سر میں چاندی سی بکھر گئی ہے، جس نے انہیں اور باوقار بنا دیا

ہے۔ عبید صدیقی اور فرحت احساس، ہندوستان کے تازہ کار شاعروں میں اہم تر ہیں مگر ہمارے ہاں ان کا کلام بہت کم پہنچا ہے۔ فرحت احساس بہت عمدہ شاعر ہیں مگر چھپے بہت کم ہیں۔ اب انہوں نے اپنا مجموعہ ترتیب دے لیا ہے۔ میں ان دونوں کی نئی غزلیں ایک سوغات کی طرح لے کر جا رہا ہوں۔ محمد اعظم کی غزلیں نہ مل سکیں، جس کا مجھے افسوس ہے۔

''مجھے آپ سے بات کرنا ہے'' میرا مقالہ ختم ہونے کے بعد ایک معزز حلیے اور نکیلی مونچھوں والے صاحب تقریباً بازو پکڑ کر گھسیٹ لیتے ہیں۔ وہ مجھے کافی ٹیبل پر لے جاتے ہیں اور پنیر پکوڑے آرڈر کرتے ہیں۔ ''اچھا، تو آپ لاہور تو جاتے ہوں گے......'' وہ جلد ہی 'آمدم برسر مطلب' ہو جاتے ہیں۔ مگر آپ تو کراچی میں رہتے ہیں...... انہوں نے اپنے ایک اور دوست کو بھی بلا لیا تھا، وہ بھی گفتگو میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ''میں رکشت پوری ہوں'' وہ اپنی انگریزی نظموں کا مجموعہ دکھاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ۴۷ء سے پہلے میں کراچی میں پڑھتا تھا، سینٹ پیٹرکس اسکول میں۔ میں انہیں بتاتا ہوں کہ میں نے بھی اسی اسکول سے پڑھا ہے تو ان کی باچھیں کھل اٹھتی ہیں، وہ دیر تک اسکول اور آس پاس کے علاقے کا ذکر کرتے رہتے ہیں، اپنے پرانے گھر کا محل وقوع بتاتے ہیں۔

''آپ کراچی میں کہاں رہتے ہیں؟'' وہ مجھ سے پوچھتے ہیں۔

علاقے کا نام ان کو بتاتا ہوں تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس نام سے کیا جائیں گے، مجھے خیال آتا ہے۔ ''آپ کو ایرو کلب یاد ہے؟ کنٹری کلب روڈ پر۔ میں اس علاقے میں رہتا ہوں'' اب میں انہیں عین اس جگہ کا پتہ بتا سکتا ہوں۔

''ایرو کلب کے پاس؟ وہ تو ویران میدان تھا! کراچی اتنا پھیل گیا ہے؟'' وہ حیرت سے پوچھتے ہیں۔ اب میں ان کا تعارف اس کراچی سے کرا رہا ہوں جس کو انہوں نے یاد کیا ہے، دیکھا نہیں ہے۔

دلّی کی سڑکوں کے نام والے پتھروں پر جس طرح اردو میں نام لکھے گئے ہیں، وہ عہد قدیم کے ''غاروں کے نقش و نگار'' کی یاد دلاتے ہیں۔ اردو، اردو کی صورت حال...... مجھے میلان کنڈیرا کے ناول یاد آنے لگتے ہیں: الوداعی ضیافت۔ قہقہہ اور فراموشی کی کتاب۔ وجود کی ناقابل برداشت

لطافتیں۔ ''اردو کے نام پر ہر ریاست میں اکیڈمیاں بنی ہوئی ہیں۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ ہر سال اس کے کل بجٹ ملا کر کروڑوں روپے ہوجاتے ہیں۔ یہ سب انعامات میں اور ادیبوں کو فائدہ پہنچانے میں خرچ ہوجاتا ہے۔ بلراج مین را مجھے بتا رہے ہیں۔ وہ بڑھاپے میں بھی اینگری ینگ مین ہیں۔ ان کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ ''ہم نے جن چیزوں کے خلاف لڑنا شروع کیا تھا، ہمارے دوست اور ساتھی ان ہی چیزوں کا حصہ بن گئے......''

گفتگو کا یہی تانا بانا محبوب الرحمٰن فاروقی کے ساتھ بھی چلتا رہتا ہے جو اتنی محبت سے ملتے ہیں کہ مجھے عید کے دن کچھ دیر کے لیے گھر والوں سے دوری کا احساس بھول جاتا ہے۔ ان کے مضامین تلخ سہی مگر مبنی بر حقیقت ہیں۔ وہ پاکستان ہو یا ہندوستان، اردو کے لیے صرف سرکاری سطح پر ذمہ داری کی بات کیوں کر کے چپ ہوجائیں۔ جو لوگ اردو بولتے ہیں، ان کو اپنی کسی ذمہ داری کا احساس اس قدر کم کیوں ہے؟

''انتم ارنیے'' نرمل ورما اپنے نئے ناول کا نام بتا کر اس کا مطلب بھی بتاتے ہیں...... آخری جنگل۔ کیا ہم یہاں پہنچ گئے ہیں؟ کوروکشیتر سے آگے دلّی شہر میں؟

نرمل ورما کے علاوہ دلّی میں ہندی ساہتیہ کی قطب کرشنا سوبتی ہیں جن سے ملنے کے لیے انترا اور نروپاما کے ساتھ جاتا ہوں۔ بوٹا سا قد، لمبا سا چوغہ، فرغل کی رنگ برنگی ٹوپی، دھیمی دھیمی باتیں، وہ مجھے پہلی نظر میں بہت دلچسپ معلوم ہوئیں۔ وہ مجھے بتانے لگتی ہیں کہ اجیت کور کے اصرار کے باوجود کانفرنس کیوں نہیں آئیں۔ ''لیڈروں کی باتیں سننے کے لیے ہم کیوں جائیں؟ رائٹرز کا یہی کام رہ گیا ہے؟'' ان کے انداز میں نرمی ہے مگر قطعیت کے ساتھ۔

شوا ناتھ جی مجھے بتانے لگتے ہیں کہ انہوں نے میٹرک تک اردو پڑھی ہے۔ ''فاروقی صاحب'' وہ مجھے مخاطب کرتے ہیں۔ میں انہیں ایک بار پھر بتاتا ہوں کہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب سے میری رشتہ داری ہے نہ میں ان کا ہم نام ہوں۔ وہ مسکرانے لگتے ہیں، میں اٹھ کر واپس کانفرنس میں آجاتا ہوں جس کے اجلاس اب اختتام کی طرف مائل ہیں۔

کانفرنس کے دوران اور چائے کھانے پر بات ہو تو ادبدا کر ہم سے سیاسی سوال کیے جاتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر مجھے اچنبھا ہونے لگتا ہے مگر ایسی باتوں کا جواب دینے کا ملکہ مینو بھنڈارا کو

حاصل ہے۔ دیکھیے، اس وقت بھی ٹی وی کیمرے کی طرف منھ کیے، کس رسان سے کہہ رہے ہیں ''ہم نے بہت غلطیاں کی ہیں، ہم نے بہت سی غلط پالیسیاں اختیار کی ہیں مگر کبھی کوئی غلطی آپ بھی تو مان لیں......''

ہوئی کانفرنس کی دھوم دھام بھی۔ قرار داد منظور ہوئی، لوگ اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے۔ عطیہ داؤد گئیں، زاہدہ حنا گئیں، اکرام اللہ اور منو بھائی بھی چلے جائیں گے۔ ایک میں ہوں کہ ویزا کی مدت لکھ کر آیا ہوں وہ میرا بدا ہے۔

میں ان کا انتظار کہیں اور کرتا رہا۔ وہ کہیں اور بیٹھے رہے۔ نہ ملنے پر مایوس ہوکر میں واپس آنے لگا تو ریسپشن ڈیسک کے ساتھ صوفے پر نیم اندھیرے میں سے ایک مانوس آواز نے مجھے پکارا جس کا چہرہ یکسر اجنبی تھا۔ میں چونک گیا۔ آواز کا وہی طرارہ نہ ہوتا تو میں اس چہرے کو کیسے پہچانتا جسے وقت نے اتنا بدل دیا تھا۔

ایک بزرگ پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ فلاں صاحب کا بائی پاس ہوا ہے اور ٹانگ میں سے رگ کاٹ کر جہاں لگائی گئی ہے وہاں زخم ہرا ہوگیا ہے۔ ان کے گھٹنے پر کرکٹ کے کھلاڑیوں کا سا پیڈ بندھا ہوا ہے کہ چل نہیں سکتے۔ ان کا ہاتھ بے کار ہوگیا ہے، اب قلم نہیں پکڑا جاتا......

میں ایک ایک کر کے خیریت پوچھتا ہوں۔ اس لیے بھی کہ اپنا احوال نہ بتانا پڑے۔ مجھے اپنا آپ ہندوستان اس بار بیمار اور بوڑھا نظر آیا۔ فالج نے ہاتھ کپکپا دیے ہیں مگر زبان میں لکنت نہیں۔ خود میں کون سا ٹھیک رہا ہوں۔

دِلّی کے بعض کوچے ہیں جن میں وقت کی گردش زائل ہو جاتی ہے۔ ہمایوں کا مقبرہ، ٹریفک کے چوراہے پر ایک ڈھنڈار، ویران، آسیبی سی عمارت اور اس سے آگے بستی نظام الدین جہاں میں دھڑکتے دل کے ساتھ داخل ہوتا ہوں۔

امیر خسروؒ سے بھی پہلے خواجہ حسن نظامی والے حجرے کے ساتھ کی دیوار میرا راستہ روک لیتی ہے۔ اس پر اقبال کے چند اشعار کندہ ہیں۔ محبوب الٰہیؒ کی درگاہ میں پیش کی جانے والی ''التجائے مسافر'' کے مصرعے مجھے کہیں کہیں سے یاد آتے ہیں:

''چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثلِ نکہتِ گُل + ہوا ہے صبر کا منظور امتحان مجھ کو + چلی ہے لے

کے وطن کے نگار خانے سے+شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو+ نظر ہے ابر کرم پر، درختِ صحرا ہوں+کیا خدا نے محتاجِ باغباں مجھ کو......''

اور خدا بھلا کرے آپ کا، ''کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو'' اور وہ کیا تھا، ''مری زبانِ قلم سے......'' مگر اس بار میری نظریں اس مصرعے پر یوں اٹک گئیں جیسے یہ صحیح معنوں میں نوشتہ دیوار ہو:

محوِ اظہارِ تمنائے دِل ناکام ہوں

دفعتاً ایک شعلہ...... میں سر بچانے کے لیے جھک جاتا ہوں۔ ایک کوندا سا لپکتا ہے۔ جوئس کے بقول اپی فینی۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ میں جو لکھ رہا ہوں، وہ کس طرح لکھا جانا ہے۔ سو اس کج مج تحریر کا پیرایہ اقبال کا فیضان۔ اس کے بعد درگاہ میں جتنی بار آنا ہوا، خسروؒ سے پہلے میں اقبال کو سلام کرتا ہوں۔

پتہ نہیں مجھے پہچانیں گی بھی یا نہیں۔ میں ڈرتے ڈرتے قرۃ العین حیدر کو سلام کرتا ہوں۔

ان کے لہجے کی گرم جوشی کے بعد میں اپنے اندیشے پر شرمندہ ہو جاتا ہوں۔ کھانے کی دعوت قبول کرنے سے میں ہچکچاتا ہوں کہ زحمت ہوگی، تو وہ چمک کر کہتی ہیں، ''زحمت کیسی؟ مجھے کیا کنویں سے پانی بھر کے لانا ہے؟''

تھوری بہت گھومتی بھٹکتی سہی، ان کی گفتگو کی حلاوت اب بھی وہی ہے، چاہے کسی موضوع پر بات کر رہی ہوں...... مثلاً تخت ہی سہی۔ ''کراچی سے میری بھتیجی نے فون پر بتایا کہ اس کے ابا لکڑی کے تخت پر لیٹے رہتے ہیں۔ وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہے۔ پہلے یہ عام دستور تھا کہ گھروں کے اندر تخت بچھتا تھا، اس پر سب آ کر بیٹھتے تھے۔ پاندان رکھا رہتا تھا۔ بات چیت ہوتی تھی۔ دوسری طرف ڈرائنگ روم ہوتا تھا۔ ایک طرف ڈرائنگ روم، ایک طرف تخت، مغرب اور مشرق کا امتزاج تھا۔ اب تخت اور گاؤ تکیے ختم ہو گئے ہیں۔'' وہ اس وقت کا ذکر کر رہی ہیں جو اب طلسم معلوم ہوتا ہے۔

نہیں، نہیں، یہ تو جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے کی بات ہے۔ ہمارے پرانے گھر میں سامنے کے رُخ پر ڈرائنگ روم تھا اور اندر کی طرف صحن، جس کے ساتھ برآمدے میں تخت تھا۔ اس پر چاندنی بچھتی تھی اور گاؤ تکیہ رکھا رہتا تھا۔ میرے دادا اسی پر بیٹھتے تھے اور اسی پر بیٹھے بیٹھے وہ دُنیا جہان کے قصے سنایا کرتے تھے، جن کی معمولی تفصیل میں بھی رتی برابر فرق نہیں پڑتا تھا، بار بار سنائے جانے

پر وہی رہتی تھی کہانی۔

ہر بحران کی طرح اس بار بھی وہ مجھے نظر آئے۔ اس رات کے بعد دتی میں دکھائی دیے۔ ہمیشہ کی طرح، صحن کی طرف پاؤں کیے ہوئے، تخت پر نیم دراز...... ان کے انتقال کے بعد یہ تخت گھر کے کاٹھ کباڑ میں نکال دیا گیا۔ ہم سب کو کرسیوں کے مقابلے میں تکلیف دہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ بے مصرف ہوگیا تھا اور گاؤ تکیے کی جگہ فلور کشن بن گئے...... مگر اس خواب میں وہ اسی تخت پر لیٹے ہوئے تھے اور وہی قصہ سُنا رہے تھے جو اتنی دفعہ سنائے جانے کے بعد مجھے رٹ گیا ہے کہ میں سوتے ہوئے بھی یہ دُہرا سکتا ہوں:

"ہمارے والد کے سات بھائی تھے۔ محمد حسن، عرف ننھے میاں۔ محمد حسین، عرف منجھلے میاں۔ احمد حسن، عرف میاں۔ احمد حسین، عرف اپنے میاں۔ علی حسن۔ علی حسین، عرف اتی میاں اور ابرار حسن، جن کی کوئی عرفیت نہیں تھی......"

صدیوں، فرسنگوں کے فاصلے سے آتی ہوئی آواز کے دم خم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ کہانی کے تیور وہی ہیں۔ "ہمارے کارخانے میں ایک دفعہ شامیانوں کا بہت بڑا آرڈر آیا، امیر عبدالرحمان خاں کی طرف سے جو کابل کے امیر تھے۔ رات دن مزدور لگائے گئے، درزی بٹھائے گئے، شامیانے تیار ہوئے۔ مگر رقم جب ملتی ہے نہ تب۔ منجھلے میاں اور ان کے بڑے بھائی آخر کابل گئے۔ امیر نے بہت خاطر مدارات کی، مہمان رکھا۔ امیر نے تو اسی وقت رقم کی فراہمی کا فرمان جاری کردیا مگر اس کے عملے کی نیت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ اس رقم پر اپنا حق سمجھتے تھے...... پھر دوسری بار بھی آرڈر آیا۔ منجھلے میاں دوسری بار بھی کابل گئے۔ امیر کا چھوٹا بھائی ہندوستان آیا تو فتح گڑھ بھی آیا، اس کی دعوت کی گئی، بڑا بھاری جلسہ ہوا...... اصل میں، منجھلے میاں بڑے enterprising آدمی تھے۔ اندور اور پالن پور میں بھی کارخانے کھولے۔ مگر رجواڑوں کی طرف ان کا بہت پیسہ نکلتا تھا۔ اس کی ادائیگی نہیں ہوسکی۔ کارخانے کا دیوالیہ نکل گیا۔ منجھلے میاں قلاّش ہوگئے۔ لالہ بھارت اندو جو قرض کی رقم فراہم کرتا تھا، اس نے منجھلے میاں کی کوٹھی قرقی میں نیلام کروا دی۔ لاکھ کا گھر خاک ہوگیا۔ بڑی ماں تقریباً دیوانی ہوگئیں۔ ان کو یقین تھا کہ کوٹھی کے نیچے دفینہ ہے، وہ جب نکلے گا تو وارے نیارے ہوجائیں گے، وہ سب عزیز پیاروں کو حصے دیں گی۔ اسی حسرت میں وہ مرگئیں......" مشاق قصہ گو کی طرح دادا ابا سنائے جاتے اور ان کی آواز کے اُتار چڑھاؤ پر جذبات

کا شائبہ تک نہ پڑتا۔ میری حسرت کوٹھی منجھلے میاں کا دفینہ نہیں، کہانی کہنے کا یہ فن ہے، دادا ابا کے مخصوص انداز میں دھن کتھا المعروف فسانۂ گنج، المرقوم از ایں حقیر فقیر پر تقصیر، راویِ داستانِ بے بدل و بے نظیر...... زبانی کلامی ہی نہیں، دادا ابا نے وہ کاغذات بھی سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ وائسرائے کے نام خطوط کہ صاحب، ہمارا پیسہ دلوایئے اور تاج کے سُرخ کریسٹ والے کاغذ پر جواب کہ افسوس کے سوا ہم آپ کی کچھ مدد نہیں کر سکتے، رجواڑوں پر ہمارا زور نہیں چلتا اور امیر کابل اپنی مرضی کے مالک و مختار ہیں، ہمارے حکم کے تابع نہیں۔

خدا معلوم کہاں گیا وہ کاغذات کا پلندہ۔ اب مل بھی گیا تو اس دعوے کا دین دار کون ہوگا۔ افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے بعد وہاں بادشاہت کی بحالی کے لیے امریکا بہت کوشاں ہے لیکن یہ بادشاہ اگر آ بھی گیا تو پورے کے پورے ماضی پر فراموش گاری کا سفیدہ پھیر کر آئے گا۔ منجھلے میاں کی کوٹھی کی نیلامی کا معاوضہ یا محمد احسن کے خانوادے کے فرخ آباد سے اکھڑنے کا ہرجانہ وہ کیا ادا کرے گا۔ الٹا میں ہی اسپائک ملی گن کے سے اندازِ تمسخر میں اپنے پُرکھوں کی دھن کتھا کا اگلا باب تحریر کر کے عنوان رقم کر دوں گا...... افغانستان: میرے زوال میں اس کا حصّہ۔ جوں جوں میں امریکی طیاروں کی بم باری اور افغانستان کی بربادی کے منظر دیکھتا ہوں، ازراہِ تفنن منجھلے میاں کے کارخانے میں شامیانوں کی تیاری کے واجبات منسوخ کرتا جاتا ہوں۔ اصل رقم تمام ہوئی، اب حساب اُلٹا میری ہی طرف نکلتا ہے۔

کراچی سے افغانستان کی خبریں پابندی سے دیکھتا آیا تھا۔ یہاں یہ خبریں پس پشت جا پڑی ہیں اور ان کی جگہ سامنے نکل کر دِلّی آ جاتا ہے، دلّی جو ابھی تک پارلیمنٹ ہاؤس پر حملے سے چونک کر صدمے میں آ جانے والا شہر ہے۔ اس کا مرکز وہی رہے گا مگر میری دہشت کا ایک دائرہ اور بن رہا ہے، دلّی دہشت۔

صبح سویرے ہی میں سارا اخبار چاٹ ڈالتا ہوں۔ پاکستان شہ سرخیوں سے چھلکا پڑ رہا ہے: پاکستان جیش محمد اور لشکر طیبہ کے سربراہوں کو ہندوستان کے حوالے کر دے۔ پاکستان دہشت گردوں کی پشت پناہی سے باز آ جائے۔ پاکستان دہشت گردوں کی لاشیں طلب نہ کرے۔

لعل کرشن ایڈوانی گرج رہے ہیں: مشرف پرویز، Prove your honesty۔

پردھان منتری اٹل بہاری واجپائی جی منھ کا مزہ بدلنے کے لیے یہاں مسکرا رہے ہیں کہ سونیا گاندھی نے ان کی خیریت پوچھ لی ہے: ''اگر اپوزیشن کو حکمراں پارٹی کا اتنا خیال ہو تو ملک میں جمہوریت کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔''

آج سُرخی ہے: کشمیر میں گیارہ آتنک وادی ہلاک۔

پردھان منتری اٹل بہاری واجپائی: آخر یہ کھیل کب تک چلے گا؟ یہ سوال پاکستان کی طرف منھ کر کے پوچھا گیا ہے۔

دلّی پولیس کی حفاظتی تدابیر کی تفصیل روز چھپ رہی ہے۔ آج بتایا گیا ہے کہ کوئنک ری ایکشن ٹیمز حساس مقامات پر لگائی جائیں گی۔

خود حفاظتی سے انتقام تک کا فاصلہ تھوڑا ہی ہے۔ ایک اخبار کی سُرخ اعلان کر رہی ہے کہ پہلے خون کا وقت آ گیا۔ Time to draw first blood۔

ایڈوانی صاحب کا آج کا بیان: پاکستان ایک سیکولر، جمہوری، پلورلسٹک ہندوستان کو برداشت نہیں کر سکتا۔

عجیب بات ہے۔ ہندوستان پاکستان کے درمیان یہ حلال زادے، حرام زادے کی کہانی چل پڑی ہے۔ ہر ایک کو ضد ہے کہ میں وہ ہوں جو دوسرا نہیں ہے۔ دونوں نے اپنی اپنی جگہ بڑی محنت سے دوسرے کو ہوا بنا کر رکھا ہوا ہے، The Other کے طور پر Construct کیا ہے۔ سیاسی بیان اس فرق کو re-enforce کرتے رہتے ہیں جو سطح سے زیادہ گہرا نہیں۔

مگر یہ سُرخی کے پیچھے کیا ہے، کا کھیل مجھے چھوڑ دینا چاہیے۔ دلّی بدلا ہوا شہر ہے۔ آج کے ''ہندوستان ٹائمز'' میں نامہ نگار نے لکھا ہے کہ:

Spetember 11 changed New York, December 13 may have changed Delhi: its now a city on edge.

آج سنچار بھون میں کیا ہوا: کسی کو شک ہوگیا کہ یہ جو سفید رنگ کی ایمبیسڈر کار ہی میں چار میں سے تین لوگ Fatigues پہنے ہوئے ہیں، یہ ضرور ''گھس بیٹھیے'' ہیں۔ ذرا کی ذرا میں خبر پھیل گئی کہ غیر ملکی (جس کو ہر ایک اس طرح پڑھتا ہے: پاکستانی) ایجنٹ ایک اہم عمارت میں Storm

کر گئے ہیں۔ سائرن بجاتی اور جل بجھ، جل بجھ نیلی بتیاں چمکاتی ملٹری پولیس آ گئی۔ عمارت کو گھیرے میں لے لیا گیا۔ اخبار کے مطابق، Siege کا منظر تھا۔ پولیس اندر گئی تو وہاں ایک دفتر کے معمول کی صبح تھی۔ تھوڑی دیر میں بھیڑ چھٹ گئی۔

پارلیمنٹ ہاؤس کے لیے Iron-fist security کا اعلان کیا گیا ہے۔ مگر پورے دلّی میں سخت انتظامات ہیں۔ قدم قدم پر چیکنگ۔ ایسے میں ہرے پاسپورٹ سے زیادہ خطرناک کیا چیز ہو سکتی ہے؟ میں انڈیا انٹرنیشنل سینٹر سے نکلنے سے احتراز کر رہا ہوں۔ دلّی کی سڑکیں دلّی کی سڑکیں...... ہائے دلّی، وائے دلّی، بھاڑ میں جائے دلّی......

مگر دلّی جس بھاڑ میں بھی جائے، کیا میں اس سے دور رہ سکتا ہوں؟

ٹی وی چلا رہا ہے، اخبار چیخ رہے ہیں، سڑکوں پر ایک سونا سنّاٹا سا ہے...... سنّاٹے سے زیادہ ڈراؤنا تو یہ اخباروں کا شور ہے۔ پارلیمنٹ ہاؤس پر حملے کے بعد سے ان اخباروں نے وہ زبان اور لہجہ اختیار کر لیا ہے جو نیویارک میں ڈبلیو ٹی سی پر حملے کے بعد امریکی میڈیا کا تھا۔ ہر طرف یہی سرخیاں نظر آ رہی ہیں: Democracy Under Attack, A Nation Stunned خبروں کا لب و لہجہ اور انداز بیان پورے کا پورا وہیں سے حاصل کر لیا گیا۔

اب ہر طرف یہی تذکرہ ہے۔ میں جن لوگوں سے بات کرتا ہوں، ان میں سے کئی ایک کو شبہ ہے کہ یہ کام سرکاری سرپرستی میں ہوا ہے کہ اس سے سیاسی شہرت بٹوری جائے اور ''پوٹو'' (POTO) نامی قانون کو منظور کروایا جائے جس کو بہت سے لوگ، خصوصاً مسلمان، شہری آزادی پر حملہ تصور کر رہے ہیں۔

وجہ کچھ بھی ہو، دونوں طرف گرما گرمی ہے۔ سرحد پر فوجوں کی تعداد میں اضافہ، سرحدی آبادی کا انخلا، تیز تیز بیانات...... اخبار علم کی طرح بلند ہو رہا ہے۔ ٹی وی طبل جنگ کی طرف بج رہا ہے، گونج رہا ہے، جذبات ابل پڑنے کو بے قرار ہیں......

جنگ اگر ہوئی تو ہمارے حق میں کیا کانٹے بوئے گی، میں اپنے تئیں لوگوں کو باور کرانا چاہتا ہوں۔ شدت پسند عقاب حاوی آ جائیں گے کہ بہانہ ڈھونڈ رہے ہیں، ایوانِ اقتدار کی چٹانوں پر بسیرا کرنے کے لیے بے تاب ہیں اور میں...... میں...... پھنس جاؤں گا۔ دشمنوں کے درمیان ایک

اور شام۔

"آپ کے پاکستان آنے کا کیا پروگرام بنا؟" رخصت ہوتے وقت میں ایک صاحب سے رسماً پوچھتا ہوں۔

"دیکھیے، شاید آنا ہو" وہ قدرے لاتعلقی سے کہتے ہیں۔ شاید کیوں۔ میں قدرے تعجب سے پوچھتا ہوں۔ جنوری کے آخر میں کراچی میں ان کے بھتیجے کی شادی ہے۔

"اگر جنگ نہ چھڑ گئی تو......" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیتے ہیں۔

کوئی بہانہ کیے بغیر میں وہاں سے اٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور کمرے میں آ کر اپنے دستی بیگ میں سے اپنے بچوں کی تصویر نکال کر دیکھتا ہوں۔ یہ تصویر میں نیر مسعود صاحب کو دکھانے کے لیے لایا تھا۔ چلتے وقت انوشا نے تصویر بدل کر اس کی جگہ ایک اور تصویر رکھ دی تھی، جس میں اس کے ساتھ اس کی پسندیدہ گڑیا بھی تھی۔ اس موٹی، پھپھس گڑیا کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے چہروں کو دیکھتا ہوں۔ کیا میں ان کو دیکھے بغیر کچھ دن گزارنے کے لیے تیار ہو سکتا ہوں؟ میرے پیٹ کی تہوں میں بل پڑنے لگتے ہیں۔ میں اس امکان کے بارے میں بھی نہیں سوچنا چاہتا۔ اب میں بڑی بے چینی سے اپنی واپسی کے دن گن رہا ہوں۔

لذتِ آوارگی نہیں، اس بار میں دلّی کی سڑکوں، گلیوں سے وجہ بے گانگی پوچھ رہا ہوں۔ سڑکوں پر میری چاپ کے ساتھ کوئی اور آواز بھی گونجتی ہے، جیسے میرے پیچھے پیچھے کوئی آ رہا ہو۔ میں پلٹ کر دیکھتا ہوں۔ یہ سایہ ہے یا واہمہ؟ میں ٹیلی فون اٹھاتا ہوں، کلک کی آواز آتی ہے، دوسری جانب سے کوئی میری آواز سن کر فون رکھ دیتا ہے۔ اجیت کور برابر فون کر کے میری خیریت پوچھے جا رہی ہیں۔ اس پوری بھگدڑ میں ایک ان کے ساتھ مکالمہ ہے جو ختم ہو کر نہیں دیتا۔

محبت کے شہر، خوف اور بے گانگی کے شہر...... محبت سے شروع ہو کر شہر حافظے کا عذاب کیسے بن جاتے ہیں، یہ سوال مجھے اپنے ابو سے پوچھنا چاہیے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ان کا معمول ہے۔ نیند کی ایک جھپکی لینے سے پہلے بستر پر لیٹ کر یوپی کا ریلوے ٹائم ٹیبل پڑھنے لگتے ہیں۔ اس وقت وہ مجھے سسی فس کا ایک "مسخاکہ" معلوم ہوتے ہیں جو یہ دہرائے جانے پر مجبور ہے: فتح گڑھ، کمال گنج، گرسہائے گنج، قنوج، شیوراج پور، منجھنا، انور گنج، کانپور، اناؤ، اموسی، لکھنؤ۔

اور وہ بھی ریل کے اس سفر میں جو ناموں کی گردان تک محدود ہے، صفحے الٹنے تک۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ جلدی سے ٹائم ٹیبل تکیے کے نیچے اُڑس لیتے ہیں اور بچوں کی طرح آنکھیں میچ لیتے ہیں۔ ''آپ کب تک یہی دہرائے چلے جائیں گے، سندیلہ، خورجہ، ٹونڈلہ...... آپ نے کبھی ٹنڈو الہ یار اور خیر پور ناتھن شاہ کے بارے میں اس طرح کیوں نہیں سوچا؟'' میری جھنجلاہٹ بھی سیاسی ہو جاتی ہے، مجھے احساس ہے۔ اسی لیے میں یہاں سے آگے کا سفر ریل سے کرنا چاہتا تھا۔ ناسٹلجیا کا سفر۔ چھک پک چھک پک کرتی ریل گاڑی سے ان ہی اسٹیشنوں کو دیکھوں جن کے نام میرے بچپن کی بوریت کا حصّہ ہیں...... اور بریلی میں اسٹیشن پر خالد جاوید مل جائیں گے جنہوں نے بہت remarkable افسانے لکھے ہیں، میں نے فون پر ان سے طے کر لیا تھا۔ آدھے راستے کی ملاقات طے ہو سکتی ہے، مگر سفر نہیں...... دو، تین دن انتظار کرنے اور اپنے آپ کو ٹھیلتے رہنے کے بعد مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا۔

میرا ارادہ ناشتے کی میز پر زیرِ گفتگو آتا ہے۔ ''آپ لکھنؤ جا رہے ہیں؟'' منّو بھائی مسکرا کر پوچھتے ہیں۔ ''ایک سردار جی اتفاق سے لکھنؤ پہنچ گئے۔ وہاں بات کرتے کرتے اس کا سانس رُک گیا۔ بڑی مشکل سے گلا کھلوا کر دیکھا گیا۔ حلق میں قاف پھنس گیا تھا......'' میں کافی کا ایک گھونٹ اور بھرتا ہوں۔

اکرام اللہ کا فیسی نیشن امرتا شیر گل ہے۔ وہ اور میں پوسٹر میں ایک فوٹوگراف کے سامنے کھڑے ہیں، جس کے نیچے تفصیل درج ہے کہ پینٹنگ کرنے کے دوران اس کے باپ نے یہ فوٹو کھینچی تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں میں تصویر بناتے بناتے خود تصویر بن جانے کی حیرت۔

قرۃ العین حیدر سے مزید گفتگو۔

راستے میں چیکنگ سے میری مشکلات کا اندازہ کر کے وہ خود انڈیا انٹرنیشنل سینٹر آئی ہیں۔ جاڑے کی شام کے لحاظ سے گرم کپڑوں میں لدی پھندی...... ''ایک گدھے کے برابر بوجھ'' وہ کوٹ اور مفلر اتار کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہتی ہیں۔

''کہیے، پاکستان کا کیا حال ہے؟'' وہ چھوٹتے ہی مجھ سے پوچھتی ہیں۔

''پاکستان کے لوگ اب کیا سوچتے ہیں؟ انٹلکچوئل کیا کر رہے ہیں؟ ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں ان کا رویّہ بدلا کہ نہیں؟ آپ کو یہاں اور وہاں کیا فرق محسوس ہوا؟ آپ لوگوں میں ہندوستان سے نفرت کم ہوئی؟'' وہ بار بار یہی سوال کرتی ہیں پھر بھول جاتی ہیں کہ وہ اس سے ملتا جلتا سوال کر چکی ہیں، پھر پوچھتی ہیں۔

سوال ان کی گفتگو کو مزید animate کیے دے رہے ہیں۔ مگر ایک سوال پر میں ہنس پڑتا ہوں۔ ''کیا میں چاکلیٹ آئس کریم کھالوں؟'' وہ پوچھتی ہیں۔ پھر میرے ہنسنے پر خود بھی ہنستی ہیں۔ ''ڈاکٹروں کی طرح ذمّہ داری سے جواب دینا۔''

''میں تم کو راز کی ایک بتاؤں'' وہ چاکلیٹ آئس کریم کھاتے ہوئے Stage Whisper میں کہتی ہیں۔ ''یہ ہرگز کسی سے مت کہنا۔ مجھے پتہ چل گیا ہے۔ مسلمانوں کو زمین سے محبت نہیں ہے۔ ان کا وطن صرف اسلام ہے۔''

عینی آپا ہنس رہی ہیں مگر چشمے کے پیچھے ان کی آنکھوں میں کوئی مسکراہٹ نہیں ہے۔ ''کیا آپ کے یہاں شاعر حضرات جہلم اور چناب کی محبت میں نظمیں لکھتے ہیں؟'' وہ ایک اور مشکل سوال کر دیتی ہیں۔

مجھے فوراً اس حوالے سے کوئی نظم یاد نہیں آتی۔ یوں بھی ایسی صورتِ حال میں میری یادداشت جواب دے جاتی ہے۔ میں ان کے سامنے خواجہ حسن نظامی کا فقرہ دہراتا ہوں جو عید کے دن حسن میاں (خواجہ حسن ثانی نظامی) سنایا تھا۔ حسن نظامی نے لکھا تھا کہ مسلمانوں میں بہت سی گڑبڑ توحید کے تصور سے پیدا ہوئی ہے۔ ''ہم مل کر کام نہیں کر سکتے۔ ہم میں سے ایک آدمی کام کرتا ہے۔ باقی اس کے مقلد ہیں یا مخالف۔''

ردولی اور بارہ بنکی، اودھ کے قصبوں، چھوٹے شہروں میں پرانی تہذیب کے جو آثار زندہ ہیں، عینی آپا مجھے بتا رہی ہیں۔ میرے دھیان میں ایک کتاب آئی، مشیر الحسن کی ''جان کمپنی سے جمہوریہ تک: جدید ہندوستان کی کہانی'' جس کا ترجمہ شمیم حنفی صاحب نے انتظار صاحب کے لیے دیا ہے۔ کل یوں ہی اس کے ورق الٹتے ہوئے نظر آیا کہ مترجم نے اپنے طریقِ کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ اردو، فارسی کے جو اقتباسات نظر آئیں گے، وہ اور جنل ہوں گے۔ ''بندے ماترم کا کوئی مستند اُردو ترجمہ مجھے نہیں مل سکا، اسی طرح رانی جھانسی سے متعلق لوک گیت بھی دستیاب نہیں تھا اس لیے ان دونوں کا ترجمہ میں نے خود کر دیا۔''

مگر عینی آپا اب لکھنؤ کا ذکر کر رہی ہیں جہاں مجھے کل صبح روانہ ہونا ہے۔ ''اتنے سے دن؟ آپ دھیا چھونے کے لیے کیوں آئے ہیں؟''

میں اس کا کیا جواب دوں؟ مگر سوال کے بعد ایک اور سوال۔ ''آپ پہلے جب آئے تھے تو لکھنؤ میں کیا دیکھا؟ امام باڑے دیکھے؟ لا مارٹنیر نہیں دیکھا؟ لکھنؤ یونیورسٹی بھی نہیں دیکھی؟ پھر آپ نے کیا دیکھا؟''

میں ان کو اپنا یہ تاثر بتاتا ہوں کہ دلّی ہو یا لکھنؤ، میرے لیے سب سے زیادہ مشکل وہاں سے واپس آنا ہے۔ میں جب ۸۲ء میں پہلی مرتبہ دہلی گیا تھا تو دہلی ریلوے اسٹیشن کی پلیٹ فارم پر مجھے یوں لگا تھا کہ کیلنڈر میں تاریخ ۱۹۴۷ء ہے اور میں شاہد احمد دہلوی ہوں کہ ''دلّی کی بپتا'' دل میں لیے رخصت ہو رہا ہوں۔ ''پتہ نہیں لوگ کیسے اس شہر کو چھوڑ آئے؟'' میں کہتا ہوں۔

''اور لکھنؤ؟ اس کو کیسے چھوڑ دیا کہ یہ سب دوسروں کا ہے، ہمارا نہیں ہے؟'' عینی آپا سوال کرتی ہیں۔

وہ جتنی دیر باتیں کرتی رہتی ہیں، میں سنتا رہتا ہوں۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر چلی جاتی ہیں۔ میں انہیں خدا حافظ کہہ کر پلٹتا ہوں تو میرا ذہن لاینحل سوالوں کی آماج گاہ بن کر رہ گیا ہے۔

دلّی ایئرپورٹ کے راستے میں بل بورڈز۔ کیبل ٹی وی کے پروگراموں کا اعلان کر رہے ہیں۔ جیسے پہلے نت نئی کنزیومر پروڈکٹس کا اشتہار دیا کرتے تھے۔ اب یہی نئی کموڈٹی ہیں۔ انگریزی حروف میں بڑا بڑا لکھا ہوا ہے:

HAQEEQAT

تصویر کے ساتھ ڈسکرپشن ہے۔ جلی حروف میں محض ایک جملہ:

No actors. only victims.

میں اس کے سامنے سے گزرنے لگتا ہوں تو مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ میرے لیے کہانی کا مسئلہ اب کیا ہے۔ مجھے ایک ایک کر کے سارے مکوٹھے اتار دینے ہیں۔ نوچ کر پھینک دینے ہیں۔ پھر اپنے آپ کو زمین پر ڈھیر کر دیتا ہے کہ کہانی مجھ پر تانڈو نرت کر سکتے۔ مجھے اس ناچنی، اس اردھانگنی کے پاؤں کی نرت سے غرض ہے۔ اس کے نام سے نہیں کہ وہ کون ہے، کتھا ماں، بھارت

ماتا، My mad mother Kali۔

یہ سب تیرا ہی Sport ہے آقا کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے۔

لکھنؤ کے لیے نکل پڑا ہوں۔ ایئرپورٹ میں وہی سیکورٹی کے تھکا دینے والے مرحلے۔
میں تھک ہار کر ٹی وی اسکرین کے سامنے بیٹھ گیا ہوں جہاں راجیش کھنہ، ملٹی کلر شرمیلا ٹیگور سے کہہ رہا ہے، گنگنا رہے ہیں بھونرے کھل رہی ہے کلی کلی...... مگر کلی کھلنے بھی نہیں پاتی کہ کوئی چینل بدل دیتا ہے۔ آتنک وادی کے پریوار کا وہی انٹرویو ری پیٹ ہو رہا ہے جو میں بہت بار دیکھ چکا ہوں۔ آنکھوں پر ترمرے سے ڈال کر ان کی شناخت چھپا دی گئی ہے مگر ان کے لفظ بہت واضح ہیں۔ سنتے سنتے میں پریشان ہونا شروع ہو جاتا ہوں۔ اسکرین پر چہروں کی جگہ نقشہ آ جاتا ہے، جس پر ہندی ناموں کو میں پڑھ نہیں سکتا مگر لہجے کی گھن گرج سب کچھ بتا رہی ہے۔ اب میں خود ہی ریموٹ لے کر پچھلے چینل پر واپس آ جاتا ہوں۔ راجیش کھنہ کے گانے کا کلپ چل رہا ہے۔ ہونٹ ہلتے ہیں اور موسیقی ڈیپارچر لاؤنج میں پھیل جاتی ہے۔ ''یہ مت پوچھو کیسے مندر ٹوٹا سپنوں کا۔ یہ اوروں کا کام نہیں، یہ دوش ہے اپنوں کا......'' یہ تو گانے بھی سیاسی ہو گئے ہیں، میں اس Canned موسیقی سے بے زار ہو کر اپنی سیٹ ہی بدل لیتا ہوں۔

میں اس وقت کہاں ہوں؟ وہی پالم جہاں تک تھی سلطنتِ شاہ عالم۔ میں ڈیپارچر لاؤنج میں سامان لیے پابہ رکاب بیٹھا ہوں۔ قدم قدم پر چیکنگ، سیکورٹی کے مراحل۔ کئی بار اسکرین کرنے کے لیے میٹل ڈیٹکٹر میں سے گزارا گیا، پھر جامہ تلاشی۔ باوردی سپاہی جوں ہی میری طرف بڑھتا ہے، میں reflex عمل کے طور پر ہاتھ اوپر کر دیتا ہوں۔ وہ میری جیبیں، جانگھیں تھپتھپانے لگتا ہے۔ میں نروس ہوا جا رہا ہوں۔ فلائٹ کے اعلان پر کان لگائے ہوں اور حواس باختہ ہو رہا ہوں۔ پھر میرا نام پکارا جاتا ہے۔ میں نے خود سنا۔ بڑے واضح طور پر ٹی وی اسکرین پر میرا نام لیا گیا...... آصف، آصف...... میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ اب مجھے اس پر دکھایا جائے گا، ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے، چہرہ خانوں میں بٹا ہوا اور ہندی میں لکھا ہوا: پاکستانی۔ کوئی اور تو مجھے پہچان نہیں رہا؟ وہ تھپتھپانے والا سپاہی، ہندوستانی وردی میں میری طرف بڑھ تو نہیں رہا؟ میں یقین نہ کرتے ہوئے بھی پھر اسکرین کی طرف دیکھتا ہوں۔ ''یلغار ہو!'' وہاں پرتھوی راج تلوار

سوتنے ہوئے فوج کو بزن کا حکم دے رہا ہے اور مدھو بالا آہ بھر کر سینے پر ہاتھ رکھ رہی ہے۔" دی میکنگ آف مغلِ اعظم" کے نام سے کسی دستاویزی فلم کا اسپاٹ دکھایا جا رہا ہے کہ فلمی یدھ کے لیے کے، آصف نے بھارتی سینا کے پانچ ہزار جوان اسٹنٹ مین سے ٹرین کروائے...... کے آصف نے یہ کیا اور سلیم اور اکبر اعظم کے ہاتھی آمنے سامنے کھڑے ہیں لتا منگیشکر کی آواز بیک گراؤنڈ میں فیڈ ان ہوتی ہے، محبت کی جھوٹی کہانی پہ روئے، بڑی چوٹ کھائی، ہوں اوں پہ روئے...... اتنی دیر میں لکھنؤ کی فلائٹ کا اعلان ہو جاتا ہے۔ میں اٹھ کر چل پڑتا ہوں۔ اپنے یدھ کی جانب۔

جہاز کی کھڑکی سے مجھے کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ بس بادل ہی بادل، ان شہروں کا نام و نشان نہیں جن کے ناسٹلجیا میں مجھے سفر کرنا تھا۔ مجھے اونگھ آ جاتی ہے۔ میں ایک بار پھر اجودھیا نگری میں ہوں۔ کیکئی ماتا کو دیے ہوئے قول نے گھر سے بے گھر کر دیا۔ بھرت تخت پر کھڑاویں رکھے ہوئے ہے اور میرے لیے بن باس ہے، بن باس اور مہا بھارت...... میرا دل بیٹھا جا رہا ہے، میری ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ سامنے فوج کھڑی ہے۔ ایک آواز مجھ سے کہے جا رہی ہے، یدھ کر! یدھ کر! اے مور مکٹ والے، مرلی کے بجیا تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔ میں ان دو کہانیوں کے بار بار دہرائے جانے سے اور ہر پھر کے اسی صورت حال میں چلے آنے سے اوبھ گیا ہوں۔ مجھے نئی کہانی دو۔ مہاراج، مجھے نئی کہانی مل جائے۔

لکھنؤ روغنی تصویر تھا، آبی رنگوں سے بنا ہوا نہیں۔ داخلہ نہیں ملا۔ میں چوک سے الٹے پیروں واپس آ گیا۔ ہر چیز بہت واضح تھی، اور اپنی زندگی میں مگن، مکمل۔ میرے لیے کہیں کوئی گنجائش نہیں تھی۔

نئی کہانی مجھے لکھنؤ میں نیر مسعود صاحب نے سنائی۔ نہیں، میں ان کے تازہ افسانے کا ذکر نہیں کر رہا جو "شب خون" میں چھپا ہے اور نہ وہ لوک کہانی جو انہوں نے بچپن میں گھر کے ایک پرانے نوکر سے سنی تھی اور اب لکھ کر مجھے دی ہے۔ یہ منّتی کہانی تھی۔ مولا علی مشکل کشا اور لکڑہارے کی کہانی سے گزرے، دس بیبیوں کی کہانی سے گزرے، بی بی چٹ پٹ کی کہانی سے گزرے، تیسرے چاند کی کہانی سے گزرے، امام جعفر صادق کے معجزے اور نیاز کی کہانی سے گزرے۔ بی بی

سکت کی کہانی پر وہ ٹھہر گئے:

''ایک غریب بیوہ کی ایک لڑکی تھی۔ اس کی اولاد نہیں ہوئی۔ بہت منت مرادیں مانگیں۔ سب پریشان تھے۔ اتنے میں ایک عورت آئی اور دریافت کیا کہ پریشان کیوں ہے۔ لڑکی سے معلوم کر کے فرمایا، بی بی سکت کے نام سے اٹھا کر دو پیسے رکھو۔ اسی وقت لڑکی کی ماں نے باوضو ہو کر یہ نیت کر لی کہ میری لڑکی کو اولاد ہو تو ہم یہ کہانی سنیں گے۔

خدا کی قدرت سے اسی ماہ حمل قرار پایا۔ نو ماہ پورے ہوئے اور لڑکا تولّد ہوا۔ یہ لوگ بی بی سکت کی کہانی سننا بھول گئے۔ ایک دن یکا یک لڑکا غائب ہو گیا: اب وہ کمہار کے آوے میں چھپا رہا اور کمہار نے آوے میں برتن پھیلا کر بند کر دیا۔ برتن پکانے کی غرض سے آوے میں آگ بھی لگا دی۔ لڑکے کی ماں اور نانی کو خیال آیا کہ ہم نے بی بی سکت کی کہانی نہیں سُنی۔ پھر منت کی کہ لڑکا مل جائے تو کہانی کریں گے۔ یہ نیت کر کے دونوں جا کر مکان میں بیٹھ گئے...... ''

کہانی یوں آگے چلتی ہے کہ جس نے بی بی سَکت کی کہانی مانی اور مان کر نہیں سنائی، اس کے ساتھ کیا ہوا، کیسے نصیحت ہوئی اور جب کہانی سنائی تو ان کے دن کیسے بدلے۔ بی بی سکت کون تھیں اور ان کی کہانی ہے کیا، یہ اب مجھے کون بتائے گا؟ سو اب میں اس دبدھا میں ہوں کہ منت مان لی ہے اور کہانی معلوم نہیں۔

اس میں خود میرے لیے اور جملہ حاضرین و ناظرین کے لیے عبرت ہے کہ پیسے کے تل اور پیسے کا گڑ منگوا کر کہانی سن کر کھایے اور نصیحت پکڑیے کہ کہانی کی منت ادا نہیں کی گئی ہے۔

لکھنؤ ایئرپورٹ پر فلائٹ میں پہلے آدھ گھنٹے، پھر دو گھنٹے، پھر کئی گھنٹے کی تاخیر۔ ایئر لائن کے میکانکی اعلان کی آواز...... سہارا ایئر لائنز، اموشنلی یورز...... عجیب بے تکا اشتہار ہے کہ ہر اعلان کے انجام پر ٹانک دیا جاتا ہے۔ اس وقت اموشنل سہارے کا دعویٰ بھی بہت غنیمت ہے۔ ایئرپورٹ کے بے حد drab ریستوران میں تھکے ہوئے سینڈوچز اور کیچڑ جیسی کافی۔ میں اکتایا ہوا بیٹھا ہوں اور اپنی صورتِ حال پر خفت، ندامت، نہ جانے کیا محسوس کیے جا رہا ہوں اور پھر یہ بلاوجہ تشویش بھی کہ مجھے پہچان نہ لیا جائے۔ بیرے کے بلّے پر کندہ نام ''انعام الحق'' عجیب طرح سے تسکین بخش معلوم ہو رہا ہے۔ میں اسے سر کے اشارے سے سلام کرتا ہوں۔ وہ سونف اور مصری کی تھالی میرے آگے رکھ کر چلا جاتا ہے۔ ''جنگ ہوگی کہ نہیں؟ جنگ ہوگی کہ نہیں؟'' میری کن پٹیوں میں خون

سنسنا رہا ہے۔ ایک گھسا پٹا ریکارڈ ذہن میں گھومے جا رہا ہے۔ ''ہمیں بڑی جانے کیا ہے کہ آپ کو جانے کیا ہوا...... '' اناؤنسر کی آواز اسپیکر سے گونجتی ہے اور گاڑھی ہندی میری چندی کر جاتی ہے۔ دلّی سے سلام رُخصت۔ تیرتے آنسوؤں نے درگاہ حضرت نظام الدین کے ہجوم کو دھندلا دیا ہے۔ حسن میاں کم عرصے رُکنے کی بزرگانہ شکایت شروع کرتے ہیں پھر چپ ہو جاتے ہیں۔ محوِ حیرت ہو کر میں اقبال کے مصرعے دہرا رہا ہوں پھر امیر خسروؒ کو سلام کے لیے آگے بڑھتا ہوں۔ فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہوں تو زبان سے دوہا جاری ہوتا ہے:

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس

خسروؒ چل گھر اپنے، سانجھ بھئے چھوں دیس

گوری کی سیج تو بچی رہے گی، مکھ پر کیس دیکھنے کے لیے میں نہ آؤں گا۔ میں رنگ سے بے حال ہوا۔ خسروؒ پیا، اب تم اور دیس ہم اور دیس...... اب میں چلتا ہوں۔

کراچی ایئر پورٹ سے گھر جاتے ہوئے مانوس چیزوں اور جگہوں کو دیکھ دیکھ کر یوں ہی تصدیق کر رہا ہوں کہ میرے شہر میں سب ویسے کا ویسا ہی ہے، جنگ کے خوف نے سٹّی گم تو نہیں کردی۔ لکھنؤ کے نظامی پریس والی جنتری میں ہدایت درج تھی کہ اگر ضرورت ہو تو ۱۴۵ دفعہ ''یا مہیمن'' پڑھوں جس کی تاثیر بتائی گئی تھی کہ ''سفر جہاز، وبائی امراض، بندوق، چھری اور گولی سے زندہ سلامت رہنے کے لیے مفید ہے۔''

کراچی اسی طرح ہے۔ تخلیق انگیز اور تخلیق پذیر، مانوس پن اور بے زاری کا معجون مرکب، جنگ کے ہسٹیریا کا نام و نشان تک نہیں۔ میں کچھ بھی نہیں پڑھتا۔ ہاں، ایک مانوس لینڈ مارک مجھے نظر نہیں آ رہا۔ حسن اسکوائر کے ٹریفک آئی لینڈ پر مڑنے سے پہلے، لال بتّی کے عین نیچے جہاں وہ بیٹھا رہتا تھا، میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں۔ یونیورسٹی روڈ پر مُڑ جانے کے بعد اخبار فروش کے کیبن کے عین سامنے وہ مجھے نظر آتا ہے جہاں ''ایکسپو سینٹر میں ۵ روزہ نماز تراویح'' کا بینر پرانا ہو کر جھول گیا ہے۔ A tactical mistake، جگہ کی تبدیلی کے بارے میں میرا پہلا تاثر یہی ہے۔ یہاں موٹریں نہیں رُک سکیں گی اور اسے پیسے بھی کم ملیں گے۔ مگر وہ اسی طرح بیٹھا ہوا ہے۔ موٹا تازہ، سرخ و سفید چہرے، سیاہ داڑھی اور پگڑی، اُجلی قمیص والا افغان، جس کے گھٹنے بعد میں نظر آتے ہیں کہ درمیاں میں ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ ٹانگ، گرے ہوئے درخت کے ٹھنٹھ کی طرح ہے۔ ننھی سی کرسی پر بچہ بیٹھا

ہوا ہے۔ رنگین پگڑی، چھوٹی سی واسکٹ، دولہا سا بنا ہوا، آنکھوں میں دھڑیوں سُرمہ۔

"پیسے جمع کر کے اس کو مجاہد بناؤں گا۔ یہ جنگ پر جائے گا۔ ہماری جگہ لے گا۔ آپ بھائی لوگ کا امداد چاہیے......" اس نے ایک مرتبہ اپنی ٹوٹی پھوٹی اُردو میں یہ بتایا تھا۔ مگر میں اس وقت بھی دہل گیا تھا۔ میں اپنی گاڑی کی کھڑکی سے دیکھ رہا ہوں، کچھ گاڑیاں رُک رہی ہیں، کچھ جا رہی ہیں، وہ بچہ مُڑے تُڑے نوٹ سیدھے کر کے رکھ رہا ہے۔ اتنے میں ہمارا سگنل بھی کھل گیا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی ایک جھلائی ہوئی آواز میرے قدم روک لیتی ہے۔ "پاکستان نے دلّی سے اپنا سفیر واپس بلا لیا ہے۔ سمجھوتہ ایکسپریس بند کر دی گئی۔ ہوائی جہاز بھی رُکنے والے ہیں۔ جنگ چھڑنے کو ہے۔ ضمیر نیازی صاحب نے فون کیا ہے۔ فہمیدہ ریاض دو مرتبہ فون کر کے خیریت پوچھ چکی ہیں۔ ان کو اندازہ ہے۔ وہ سرحد کے غلط طرف پھنس چکی ہیں......" ابا مجھ پر برس پڑتے ہیں۔ "تمہیں حالات کا اندازہ ہے؟ تم اس وقت لکھنؤ کیوں گئے تھے؟" میرے لیے یوں بھی مشکل ہے اور وُوں بھی۔ مجھے غلط وقت پر غلط جگہ موجود ہونے کا ملکہ حاصل ہے۔ میں جان لیتا ہوں کہ اب تک جو کچھ ہوا وہ مستقبل تھا۔ اب جو ہوگا وہ تاریخ ہے۔

مگر میری منّتی کہانی کا کیا ہوگا؟ آدمی سفر پر نکلے ہی کیوں؟ بات یوں بھی بگڑ سکتی ہے، مجھے معلوم نہ تھا۔

(دسمبر ۲۰۰۱ء)

پاکستان میں واقع مہاجر کیمپ سے تصویر: جوزتہ مان

''آج کے دور میں سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ یہ احساس اور تصور کہ انسان کیا ہے، گم ہوکر نہ رہ جائے۔'' سیاہ فام امریکی ادیب رچرڈ رائٹ نے ۴۰ء کی دہائی میں ژاں پال سارتر سے کہا تھا اور اس فقرے کو سیاہ فام امریکی ادیبہ ایلس واکر نے اپنے پہلے ناول کے سر نامے پر درج کیا۔ ایلس واکر کو شہرت اس کے ناول ''اودا رنگ'' سے ملی جس میں سفید فام اکثریت کے ہاتھوں غلامی کے تجربے کو بہت منفرد انداز سے تحریرکیا گیا تھا۔ ایلس واکر کی سماجی اورسیاسی تحریروں کا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ یہ تحریراس کتاب میں شامل ہے اور گیارہ ستمبر کے بارے میں چومسکی اور دیگر ادیبوں کے تاثرات کے مجموعے میں بھی شامل ہے۔ یہاں اس تحریر کا آخری حصہ شامل کیا گیا ہے۔ ان ہولناک اور انسانیت سوز واقعات کے تریاق کے طور پر محبّت کی بات کرنا کیا ایک طرح کی سادہ لوحی معلوم نہیں ہوتی؟ اس عہد میں الہٰی محبّت کو کیا ہوا؟

ایلس واکر

ترجمہ: آصف فرخی

زمین کی جانب سے

ہم کہاں سے آغاز کریں؟ ہم کس طرح اس دنیا سے ایک مناسب تعلق کی بازیافت کریں؟

جنوبی افریقا کے بابمبا قبیلے میں ہم کوئی شخص غیر ذمہ داری یا ناانصافی کرتا ہے تو اسے گاؤں کے مرکز میں لے جاکر بٹھا دیا جاتا ہے، اکیلا اور زنجیروں سے عاری۔ سارا کام تھم جاتا ہے اور گاؤں کا ہر مرد، عورت اور بچّہ ایک بڑے دائرے میں مُلزم کے گرد جمع ہوجاتا ہے۔ پھر قبیلے کا ہر فرد اس ملزم سے بات کرتا ہے، ایک وقت میں ایک شخص، اور دائرے کے مرکز میں بیٹھے ہوئے آدمی کو وہ تمام اچھی باتیں یاد دلاتا ہے جو اس نے اپنی زندگی میں کی ہیں۔ ہر واقعہ، ہر تجربہ جو کس قدر وضاحت اور تفصیل کے ساتھ یاد کیا جاسکتا ہے، دُہرایا جاتا ہے۔ اس کے تمام مثبت خواص، نیک

اعمال، خوبیاں اور خوش اخلاقی بڑی احتیاط اور پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں۔

قبیلے کے یہ رسم اکثر اوقات کئی دن تک متواتر جاری رہتی ہے۔ انجام کار یہ دائرہ ٹوٹ جاتا ہے، ایک پر مسرت جشن کا اہتمام ہوتا ہے اور اس شخص کو علامتی اور لغوی طور پر قبیلے میں واپس خوش آمدید کہا جاتا ہے۔

یہ انجام اسامہ بن لادن کا نہیں ہوگا جس پر شمالی امریکا پر حملے کے ماسٹر مائنڈ ہونے کا الزام ہے۔ افغانستان سے جنگ میں یا تو وہ زندہ بچ جائے گا جب کہ ہزاروں غربت کے مارے، خوف زدہ لوگ، جن میں بڑی تعداد عورتوں اور بچوں اور بوڑھوں کی ہے، اس کے چاروں طرف بم باری کا نشانہ بن کر مٹائے جا رہے ہیں، یا پھر وہ بم باری کے نتیجے میں ہلاک ہوجائے گا، جس کے لیے، جہاں تک میں خبروں سے اندازہ لگا سکی ہوں، وہ روحانی طور پر بالکل تیار ہے۔ اپنے ذہن میں وہ ریاست ہائے متحدہ امریکا کے خلاف مقدس جنگ لڑ رہا ہے۔ اس کے خلاف جنگ میں مرجانا اس کے لیے بڑے اعزاز کی بات ہوگا۔ اس کا یہ فقرہ نقل کیا گیا ہے کہ وہ امریکا کو ''اپنی ہی پرچھائیں'' بنا کر رکھ دینا چاہتا ہے، جیسے کہ اس نے سوویت روس کو، جس نے افغانستان میں جنگ ہاری تھی، اپنی ہی پرچھائیں بن کر رہ جانے میں مدد دی تھی۔ درحقیقت، وہ سوویت روس کو ریزہ ریزہ ہوجانے میں مدد دینے کا دعویٰ کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ذاتی طور پر میں اس کو یہ سمجھنے میں مدد دینا چاہتی ہوں کہ وہ ہمارے لیے جس پرچھائیں کی خواہش کر رہا ہے، غُربت، خوف، دہشت کا ایک مستقل عالم، یہ پرچھائیں محض وہ امریکا ہے جو ہم میں سے بہت زیادہ لوگ پہلے ہی سے جانتے ہیں۔ یہ یقینی طور پر وہی پرچھائیں ہے کہ جس کے ساتھ میرے پُرکھوں نے سینکڑوں برس زندگی گزاری ہے۔

لیکن اُس کی اس زرہ بکتر کا کیا ہوگا اگر اس کو وہ تمام اچھی اور غیر متشدد باتیں یاد دلائی جائیں جو اس نے اپنی زندگی میں کی ہیں؟ مزید یہ کہ اگر اسے کسی طرح سے ان زندگیوں کے قیمتی ہونے کا احساس دلایا جائے جن کو اس نے تباہ کیا ہے، تو اس کا کیا ہوگا؟ میں اس بات پر پختہ یقین رکھتی ہوں کہ واحد سزا جو کارگر ہوتی ہے، وہ محبت ہے۔ یا پھر جیسے کہ مہاتما بدھ نے کہا ہے:

نفرت کبھی نفرت سے ختم نہ ہوگی۔ صرف محبت سے یہ زخم بھرتا ہے۔

(اقتباس)

والٹ وٹمین
ترجمہ: قیوم نظر

بیتی جنگ کے خواب

آدھی رات کو خواب میں، دُکھیا چہروں کو
جان لیوا زخموں کو پانے والوں کی اولیں صورت کو
(وہ صورت جس کا بیاں ناممکن ہے)
پھیلی ہوئی بانہوں والے چت لیٹے ہوئے مردوں کو،
میں دیکھتا ہوں، میں پیہم خواب میں دیکھتا ہوں۔

فطرت کے، میدانوں کے، کہساروں کے مناظر کو
طوفان کے بعد حسین افلاک کو، غیر ارضی تابندگی والے
رات کے چاند کو،
جو نرمی سے چمکتا ہے، اس خاک کی سمت چمکتا ہے، ہم جس میں خندقیں کھودتے
ہیں، ڈھیروں کو فراہم کرتے ہیں،
میں دیکھتا ہوں، میں پیہم خواب میں دیکھتا ہوں۔

مدت ہوئی ان کو بیتے ہوئے، اُن چہروں، خندقوں اور میدانوں کو،
جب قتل و غارت کی دنیا میں سنگ دلی سے پھرتا تھا، یا دور چلا جاتا تھا گھائل
ہونے والوں سے،
اس وقت میں اُن کو چھوڑ کے آگے نکل جاتا تھا...... لیکن رات کو اب ان کی
صورتوں کو،
میں دیکھتا ہوں، میں پیہم خواب میں دیکھتا ہوں۔

امریکی مزاج اور ٹھیٹھ امریکی کرداروں کی تصویر کشی جس طرح مارک ٹوئین نے کی ہے شاید ہی وہ کسی اور ناول نگار کے حصے میں آئی ہے۔ مارک ٹوئین کو امریکا میں ''ادیبِ قوم'' کا سا درجہ حاصل ہے (یعنی اگر مزاح نگار نہ ہوتا تو امریکیوں کا تقریباً حکیم الاُمت ہوتا) مگر 'قومی ادیبوں' کا اکثرالمیہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا احترام زیادہ کیا جاتا ہے، پڑھا کم جاتا ہے۔ شاید مارک ٹوئین کے ساتھ اب یہی صورتحال درپیش ہے۔

مارک ٹوئین نے یہ کہانی اپنے آخری دور میں اس وقت لکھی تھی جب امریکا نے ۱۸۸۹ء سے لے کر ۱۹۰۲ء تک فلی پینز میں فوج کشی کی جس کے نتیجے میں ۴۲۰۰ امریکی اور ۲۷۲۰۰۰ فلی پینی ہلاک ہوئے۔ اس کہانی کے لکھنے کے بعد مارک ٹوئین نے اپنے قریبی دوست ایلزڈ بگلو پیس سے، جو بعد میں اس کا سوانح نگار بھی ہوا، یہ کہا کہ اسے اس کہانی کی اشاعت روک دینے کے لیے کہا گیا ہے۔ ٹوئین نے بگلوپیس سے کہا کہ ''میں نے اس میں پورا سچ بیان کیا ہے اور اس دنیا میں پورا سچ صرف مُردے ہی بیان کرسکتے ہیں۔ یہ کہانی میرے مرنے کے بعد چھپ سکے گی۔''

مگر یہ کہانی مارک ٹوئین کی موت کے بعد بھی فوراً نہیں چھپ سکی۔ بگلوپیس نے اس کے چند اقتباسات ٹوئین کی سوانح میں شامل کیے جو ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ کہانی اپنی مکمل حالت میں ۱۹۱۶ء تک شائع نہیں ہوسکی، جب یہ پہلی مرتبہ ''ہارپرزمیگزین'' میں پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کے خلاف احتجاج کے طور پر شائع ہوئی۔

تحریر کے ایک صدی بعد امریکی جنگی جوئی کا انداز بدلا ہے نہ اس ممتاز امریکی ادیب کے اسلوب کی اثر انگیزی میں کمی آئی ہے۔ اس تحریر کے لیے ''چودہ کروڑ کی مناجات'' والے اسد محمد خان سے زیادہ مناسب اور کون ہوسکتا ہے اور موجودہ دور کی دہشت گردی کے ہمارے اس جائزے کے لیے اس سے بہتر نقطۂ اختتام اور کیا ہوسکتا ہے؟

مارک ٹوئین
ترجمہ: اسد محمد خان

دُعائے جنگ

زبردست جوش و خروش کے دن تھے، مُلک ہتھیار بند ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جنگ جاری تھی۔ لگتا تھا ہر دل میں حُبّ وطن کی آگ روشن ہے۔ اِدھر نقارے پر چوب پڑتی تھی اُدھر بینڈ بج رہے تھے۔ کہیں کھلونا پستول پھٹ پھٹ کرتے اور پٹاخے سُلگتے چٹختے تھے۔ ہر ہاتھ میں جھنڈا تھا۔ دور تک جاتی چھتوں چوباروں کی دھندلی پڑتی بچھات پر لہراتے پرچموں کا ایک دشت ـ بے نہایت دھوپ میں پڑا لشکتا تھا۔

بھڑک دار نئی نفیس وردیوں میں نوجوان رضاکاروں کے جیش چوڑی شاہراہ سے قواعد پریڈ کرتے روز گزرتے تھے۔ یہ ٹکڑیاں جھولتی لہراتی برابر سے نکلتیں تو اُن پر ناز کرتے ماں باپ بہنیں اور محبوبائیں فرطِ جذبات سے پھنسی ہوئی اور مسرت سے چھلکتی آوازوں میں تحسین کے نعرے سر کرتے تھے۔ راتوں کو عام جلسوں میں جہاں تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی لوگوں کے ہانپتے ہوئے ہجوم حبِ وطن میں ڈوبی خطابت سُنتے۔ یہ خطابت دلوں کو ہلا کے رکھ دیتی، اور گہرائیوں میں اُترتی تو سب کچھ اتھل پتھل کر دیتی۔ پھر اگر ایک لمحے کا وقفہ بھی آتا تو لوگ اُسے تابڑ توڑ تالیوں سے بھرتے جاتے۔ اس دوران میں آنسو ان کے رُخساروں پر لکیریں بنا کے بہتے رہتے۔

گرجا گھروں میں خطیب اور پادری صاحبان اپنی خطابت سے اس قیامت کا طوفان اُٹھا رہے تھے کہ رہے نام مالک کا۔ وہ مُلک اور پرچم سے وفاداری کی تلقین کرتے۔ خُدائے حرب و جدال کی دہائی دیتے اور اس سے التجا کرتے کہ اس عظیم مقصد میں وہ ان کی مدد فرمائے۔

بے شک یہ دور مسرتوں کا اور خداوند کی عنایتوں اور بخششوں کا دور تھا۔ تاہم چار چھ ناعاقبت اندیش افراد نے جنگ کو ناپسند کیا اور اس نیک و صالح صراطِ مستقیم پر شک سا ظاہر کرنے لگے۔ ان کو ایسی غضبناک وارننگ دی گئی کہ دوبارہ یہ سب کرنے اور لوگوں کی خفگی مول لینے کی اُن کی پھر ہمت نہ ہوئی۔

اتوار کی صبح ہوئی۔ اگلے روز فوجی دستوں کو محاذ پر جانا تھا؛ گرجا گھر میں تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی؛ سبھی رضا کار موجود تھے، اُن کے چہرے حقیقت کے رنگوں میں رنگے ہوئے خوابوں سے روشن تھے جن میں سخت پیش قدمی اور رفتار پکڑتی، لپکتی یلغار اور لشکتی شمشیروں کی تصویریں تھیں اور شور و غوغا کے اور غنیم کی پسپائیوں، گھیرتے ہوئے دھوئیں اور غضب ناک تعاقب سے لے کر ہتھیار ڈالنے تک کے زندہ مناظر تھے! اِن خوابوں میں میدانِ جنگ سے گھر لوٹتے دلاوروں کے سنولائے ہوئے چہرے تھے کہ جن کے سواگت میں خوب جے جے کار ہوئی تھی، جنھیں خوب سراہا گیا تھا، جنھیں عظمت و اقبال مندی کے سنہرے سیلاب میں گلے گلے ڈبو دیا گیا تھا۔

رضا کاروں کے ساتھ اُن کے عزیز پیارے بیٹھے تھے... بہت مغرور و شاداں۔ اُن کی قسمت پر وہ ہمسائے اور دوست رشک کرتے تھے جنھیں عزّت کی رزم گاہ میں بھیجنے کے لیے وہ بیٹے اور بھائی نصیب نہیں تھے جو یا تو پرچم کے لیے فتح یاب ہو کر لوٹتے یا انتہائی بلند رتبہ موت سے سرفراز ہوتے۔

عبادت کا آغاز ہوا؛ عہد نامہ عتیق سے جنگ کے ایک باب کی تلاوت کی گئی۔ دُعائے اوّل پڑھی گئی؛ جس کے بعد ارگن باجے کے سُر اِس شِدّت سے پھوٹے کہ گرجا کی عمارت لرزنے لگی۔ حاضرین ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دھڑکتے دلوں اور چمکتی آنکھوں سے انھوں نے خدائے مُنتقِم کی دُہائی دی، اُس کی زبردست جبروت کی ثنا اور استمداد اِس طَور سے کی کہ اے صاحبِ جلال، اے قہّار! بجلی کا کڑکا تیری نفیری، اُس کا لشکارا تیری تلوار ہے! سو ہمیشہ تیرا ہی امر نافذ رہے۔

اِس کے بعد ''دُعائے طویل'' شروع ہوئی۔ کسی کو یاد نہیں کہ اتنی گرم و پُر جوش اِستدعا اتنے رِقّت انگیز اسلوب میں پہلے کبھی کی گئی ہو۔ اس التجا میں ٹیپ کا بند یہ تھا کہ ہمیشہ کرم کرنے والا ہمارا ارحم الراحمین باپ ہمارے عالی رُتبہ نوجوان سپاہیوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے، ان پر اپنی برکتیں نازل فرمائے اور حُبّ الوطن کے اس فرض کی ادائی میں ان کی اعانت کرے، ہمّت دے، ان کا حوصلہ بڑھائے؛ انھیں اپنے دستِ زور آور کی پناہ میں لے لے۔ اِس خوں ریز پیکار میں انھیں مضبوط ثابت قدم، اور ناقابلِ تسخیر رکھے؛ غنیم کو کچلنے میں ہر طرح ان کی مدد فرمائے۔ انھیں، ان کے پرچم اور مُلک کو لازوال سربلندی اور شکوہ عطا کرے۔

اُسی وقت ایک عمر رسیدہ اجنبی گرجا میں داخل ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ بے آواز قدموں سے

نشستوں کے درمیانی رستے پر بڑھنے لگا۔ اُس کی نظریں پادری پر لگی ہوئی تھیں، اُس کا لانبا قد پیروں تک آتے لبادے سے ڈھکا تھا۔ سر کھلا تھا اور سفید بال جھاگ اُڑاتے چشمے کی طرح شانوں تک آرہے تھے، جھریوں بھرا چہرہ غیر فطری زردی لیے ہوئے تھا، یوں لگتا تھا جیسے مُردنی چھائی ہو۔ سب آنکھیں جاننے کے اشتیاق میں اُس پر لگی تھیں۔ وہ خاموشی سے چلتا رہا؛ بے رُکے سیڑھیاں چڑھ کر پادری کے برابر جا کھڑا ہوا اور انتظار کرنے لگا۔

اس کی موجودگی سے بے خبر، آنکھیں بند کیے، پادری نے اپنی رقّت انگیز دُعا جاری رکھی۔ آخر کار ولولہ انگیز استدعا کے ساتھ اِن لفظوں پر اُسے ختم کیا اور کہا: "اے مالک اے خداوند! اے مُلکِ عظیم اور پرچم کے مُحافظ، اے ہمارے باپ! ہمارے ہتھیاروں پر نزولِ برکت فرما، ہمیں فتح مندی عطا کر۔"

آنے والے نے پادری کا بازو چھوا، اسے ایک طرف ہونے کا اشارہ کیا۔ بدحواسی میں پادری نے تعمیل کی۔ اجنبی نے اُس کی جگہ سنبھال لی۔ چند لمحوں تک اُس نے اپنی گمبھیر آنکھوں سے، جن میں ایک پُر اسرار جوالا روشن تھی، سحر زدہ حاضرین کا جائزہ لیا پھر گہری گونجیلی آواز میں کہا:

"میں تختِ عُلاء کا فرستادہ، باری تعالیٰ کا پیغام لے کر آیا ہوں۔"

اُن لفظوں سے حاضرین کو جیسے جھٹکا سا لگا۔ آنے والے نے محسوس کیا ہوگا تو بھی اُس نے توجہ نہ دی، کہنے لگا:

"وہ فرماتا ہے کہ اُس نے اپنے خادِم، تمہارے گلّہ بان کی یہ دُعا سُن لی اور قبولیت عطا کی ... یعنی یہ عاجز پیغام رساں اِس دُعا کے مُضمرات... سارے ہی مُضمرات، تمہیں سمجھا چکے گا تب پہ بھی اگر تمہاری یہی خواہش ہوئی تو باری تعالیٰ دُعا قبول فرمائے گا۔ کیوں کہ انسانوں کی کتنی ہی دُعاؤں کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا ہے کہ مانگنے والا حقیقت میں جو طلب کرتا ہے دُعا اُس سے زیادہ مانگ لیتی ہے۔ اِس لیے ایک بار رُکنا اور سوچنا ضروری ہے۔

"خداوند کا اور تمہارا خادِم اپنی دُعا کر چکا ہے۔ پر کیا یہ دم بھر کو رُکا ہے، کیا غور کیا ہے اس نے؟ اور سوچو کیا یہ ایک دُعا تھی؟ نہیں، یہ دو دُعائیں تھیں۔ ایک وہ جو زبان سے ادا کی گئی، دوسری وہ جو نہیں کی گئی۔ دونوں اُس سامعِ مُطلق کے گوشِ شنوا تک پہنچیں جو تمام اِلتجائیں سُنتا ہے، زبان سے ادا کی گئی دُعا بھی اور ادا نہ کی گئی دُعا بھی۔ یہ بات سوچو، ذہن نشین کر لو۔ جب تم اپنے لیے ایک برکت کی اِلتجا کر رہے ہوتے ہو، خبردار! کہیں ایسا تو نہیں کہ ٹھیک اُسی وقت تم، قصد و ارادے کے

بغیر، کسی ہمسائے کے لیے قہرِ الٰہی مانگتے ہو۔ اگر تُم اپنی فصل کے لیے رحمتِ باراں کی دُعا کرتے ہو، جس کی اُسے ضرورت ہے، تو اس عمل سے ممکن ہے کسی ہمسائے کی فصل کے لیے، جسے باراں کی ضرورت نہیں، جو اس سے برباد ہو سکتی ہے، تُم عذاب و زحمت طلب کر رہے ہو۔

''اپنے خادم کی دُعا تم نے سُنی -- یعنی اُس کا وہ حصّہ جو زبان سے ادا ہوا۔ مُجھے خداوند کا حکم ہے کہ اُس دوسرے حصّے کو لفظوں کا جامہ پہناؤں جو پادری نے، اور تم نے بھی، اپنے دلوں میں خاموشی کے ساتھ، بہت شوق اور ولولے سے مانگی تھی۔ اور اپنی لاعلمی میں، بے سوچے سمجھے مانگی تھی؟ خدا کرے ایسا ہی ہوا ہو... تم نے یہ الفاظ سُنے: 'اے مالک! اے خداوند! ہمیں فتح مندی عطا کر! بس یہ کافی ہے۔ ادا کی گئی پوری دُعا ان پُر معنی لفظوں سے پیوستہ ہے۔ تفصیلات اور وضاحتیں ضروری نہیں تھیں۔ جب تُم نے جیتنے کی دُعا مانگی، تم نے بیان نہ کیے گئے اُن بہت سے نتائج کی بھی دُعا کی جو فتح کے بعد ظاہر ہوتے ہیں، لازماً ظاہر ہوتے ہیں، رہ نہیں سکتے۔ دُعا کا وہ حِصّہ جو لفظوں میں بیان نہ ہوا تھا سامعِ مُطلق کے گوشِ شُنوا تک پہنچا۔ اُس نے مُجھے حُکم دیا ہے کہ اُسے لفظوں میں بیان کر دوں۔ تو سنو!

(تُم نے یہ دُعا مانگی کہ)''اے مالِک، اے باپ ہمارے! دیکھ یہ جواں سال مُحِبّ وطن، ہماری آنکھوں کے تارے، دِلوں کے سُرور رزم گاہ میں نکلتے ہیں، تُو اُن کے نزدیک رہ! ہم بھی، اپنے پیارے گھر آنگنوں کا دلاویز امن اور شانتی چھوڑ کر، دُشمن پر ضرب لگانے صورتِ جاں ساتھ چل پڑے ہیں۔ اے مالک ہمارے خداوند! ہماری مدد کر تا کہ ہم اپنے گولوں سے اُن کے (حرامی) سپاہیوں کے چیتھڑے اُڑا دیں۔

اِعانت فرما کہ ہم ان کے مسکراتے کھیتوں میں اُنھی کے مُردہ مُحِبّ وطنوں کے زرد لاشے بچھا دیں۔ درد میں تشنج کرتے اُن کے زخمیوں کی چیخوں سے توپوں کی گھن گرج کو دبانے میں، خداوندا! ہماری معاونت فرما۔ مدد کر ہماری کہ ہم اُن کے ادنیٰ گھروں کو ایک آگ کے طوفان میں نیست و نابود کر دیں۔ اُن کی بے ضرر بیواؤں کے دل ایک رنجِ لا حاصل سے اچھی طرح کچلنے مسلنے میں بارِ الٰہا! ہماری اِعانت فرما۔ اُنھیں اُن کے چھوٹے بچّوں کے ساتھ گھروں سے ہنکا کر بے چھت، بے یار و مددگار کرنے میں اور خود اُن کی اپنی اُجڑی ہوئی زمینوں کے خرابوں سے چیتھڑوں میں لپیٹ کر بھوک اور پیاس کا سہن کراتے ہنکاتے، اور ہنکاتے رہنے میں اے مالکِ کُل! ہمارا ہاتھ بٹا۔ کچھ ایسا ہو کہ وہ (سُور کے تُخم) گرما میں شعلہ زن آفتاب کا اور سرما میں تند اور یخ ہواؤں

کا کھیل بن جائیں۔ اپنی روح میں کچلے ہوئے، جاں کاہ مشقت سے تھکے ہوئے، قبر کی پناہ کے لیے وہ تجھ سے التجا کریں اور جواب میں تیرا انکار ہی سُنیں۔ ہماری خاطر، کہ جو تیری پرستش اور تیری ثناء کرتے ہیں، اے آقا! اُمیدیں اُن کی خاک میں ملا دے، اُن کی زندگیاں مُرجھا دے، اُن کی کڑوی مسافت کو طویل تر بنا، بار الٰہا! اُن کے قدموں کو گراں بار کردے، اُن کے رستے میں خود اُن کے آنسوؤں کا چھڑکاؤ کر اور سفید برف کو اُن کے زخمی پیروں کے خون سے لالہ رنگ کردے! ہم یہ سب اُس کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر طلب کرتے ہیں کہ جو سرچشمہ ہے محبت کا، جو ہر حال میں اور ہمیشہ وفا کرنے والا دوست ہے، جو کبھی گھر جانے والوں کی اور عاجز و پشیماں دِلوں کے ساتھ مدد چاہنے والوں کی پناہ گاہ ہے۔ آمین۔

تُم نے یہ دُعا مانگی تھی۔ اگر اب بھی تم یہی چاہتے ہو تو کہہ دو۔ رَبّ العُلاء کا یہ حقیر پیغام رساں انتظار کر رہا ہے۔"

بعد میں لوگوں کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ آدمی پاگل تھا، کیونکہ جو کچھ اُس نے کہا اُس کی کوئی تک نہیں تھی۔

دنیا نے تباہ کاری و تاراجی کے ایسے عبرت خیز مظاہرے دیکھے ہیں جن کے سامنے گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء، ۸:۴۸ صبح، نیویارک شہر، ممکن ہے زیادہ بڑی حیثیت نہ رکھتا ہو۔ مگر بعض خصوصیات ایسی ہیں جن کی وجہ سے یہ حادثہ اور اس کے عواقب ہمارے زمانے کی ایک تشکیلی حقیقت بن گئے ہیں۔ ایک تو اس سلسلے کا طریقۂ واردات، دوسرے اس کا پیمانہ اور اثر کا دائرہ کار۔ آہستہ آہستہ نمایاں ہوتے ہوئے واقعات نے ایسی لفظیات بلکہ اندازِ خطابت کو جنم دیا جس نے جنگی جنون اور تاریخ کے بوسیدہ صفحات میں خوابیدہ تعصبات سے قوت حاصل کی اور جوابی کارروائی و انتقام نے بہت دور کے ایک چھوٹے سے ملک کو اس طرح نشانہ بنایا کہ پرائے گھر کے شعلوں کی آنچ ہمارے آنگن تک آ پہنچی۔

دہشت کا رنگ ہمارے ہوش و حواس پر چڑھتا جا رہا ہے اور فالج جیسی نیند ذہن پر چھائی جا رہی ہے۔ یہ سوال جان لیوا ہیں مگر ان کا سامنا مزید ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ شاید وہ لمحہ ہے کہ دنیا جس پر ٹکی ہوئی ہے، گائے وہ سینگ بدل رہی ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کی یہ کیفیت پاکستان پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے جہاں ہمیں دہشت گردی کی مختلف صورتوں کا سامنا ہے۔

اس رنگ بدلتی دنیا کو سمجھنے سمجھانے کے لیے **دنیا زاد** کی خصوصی اشاعت "**دنیا دنیا دہشت ہے**" ایک ابتدائی کوشش ہے۔

قیمت ۲۵۰ روپے